A THESIS TITLED

جوش ملیح آبادی: ایک رجحان ساز نثر نگار

یہ مقالہ پی ایچ ڈی کی جزوی تکمیل کے سلسلے میں جی سی یونیورسٹی،
لاہور کو سند عطا کیے جانے کے لیے پیش کیا گیا

پی۔ایچ۔ڈی
IN
اردو

By

شہناز اختر

رجسٹریشن نمبر
026-GCU-Ph.D-U-11

شعبہ اردو

گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

A

A THESIS TITLED

جوش ملیح آبادی: ایک رجحان ساز نثر نگار

نام: شہناز اختر

رجسٹریشن نمبر

026-GCU-Ph.D-U-11

شعبۂ اردو

گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

DECLARATION

I,Mr. / Ms. شہناز اختر RegistrationNo. 026-GCU-Ph.D-U-11

hereby declare that the matter printed in the thesis titled جوش ملیح آبادی: ایک رجحان ساز نثر نگار

is my own work and has not been submitted and shall not be submitted in future as research work, thesis for the award of similar degree in any University, Research Institution etc in Pakistan or abroad.

At any time, if my statement is found to be incorrect, even after my Graduation, the University has the right to withdraw my PhD Degree.

Dated: 28.4.2019

Shahnaz

Signatures of Deponent

PLAGIARISM UNDERTAKING
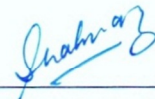
I,Mr. / Ms. شہناز اختر RegistrationNo. 026-GCU-Ph.D-U-11 solemnly declare that the research work presented in the thesis titled جوش ملیح آبادی: ایک رجحان ساز نثر نگار is solely my research work, with no significant contribution from any other person. Small contribution / help wherever taken has been acknowledged and that complete thesis has been written by me.

I understand the zero tolerance policy of HEC and Government College University Lahore, towards plagiarism. Therefore I as an author of the above titled thesis declare that no portion of my thesis has been plagiarized and any material used as referene has been properly referred / cited.

I understand that if I am found guilty of any formal plagiarism in the above titled thesis, even after that award of PhD Degree, the University reserves the rigth to withdraw my PhD Degree and that HEC/ University has the right to publish my name on HEC / University website, in the list of culprits of plagiarism.

Dated: 28-4-2019

Shahnaz

Signatures of Deponent

RESEARCH COMPLETION CERTIFICATE

Certified that the research work contained in this thesis titled ______________________
جوش ملیح آبادی: ایک رجحان ساز نثر نگار

has been carried out and completed by Mr. / Ms. شہناز اختر
Registration No. 026-GCU-Ph.D-U-11 under my supervision. The Thesis has been submitted in partial fulfillment of the requirements for the award of Degree of Doctor of Philosophy in ____________

____
Date

Supervisor

Submitted Through
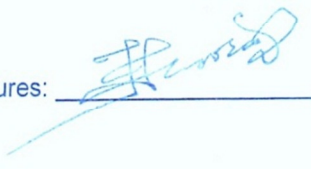
Prof.________________
Chairperosn
Department of______________
GC University Lahore.

Controller of Examinatons
GC University Lahore.

CERTIFICATE OF APPROVAL

Certified that the research work contained in this thesis titled "Josh Malih Abadi: Rujhan Saaz Nasar Nigar" was conducted by Ms. Shehnaz Akhtar Registration No. 026-GCU-PhD-U-2011 under the supervision of Dr. Shaista Hameed.

It has been evaluated and the quantum and quality of the work contained in this thesis is found to be adequate for the award of Degree of Doctor of Philosophy in Urdu.

Board of Examiners for Viva Voce	
External Examiner Name: Prof. Dr. Fakhar Ul Haq Noori Designation & Office Address: Chairperson, Department of Urdu, Oriental College, University of the Punjab, Lahore.	Signatures: ________
External Examiner Name: Prof. Dr. Qazi Abid Designation & Office Address: Chairperson, Department of Urdu, Bahauddin Zakariya University, Multan.	Signatures: ________
Internal Examiner (Supervisor) Name: Dr. Shaista Hameed Designation & Office Address: Department of Urdu, GC University, Lahore.	Signatures: ________
Convener Name: Prof. Dr. Khalid Mahmood Sanjrani Designation & Office Address: Chairperson, Department of Urdu, GC University, Lahore.	Signatures: ________

بسم الله الرحمن الرحيم
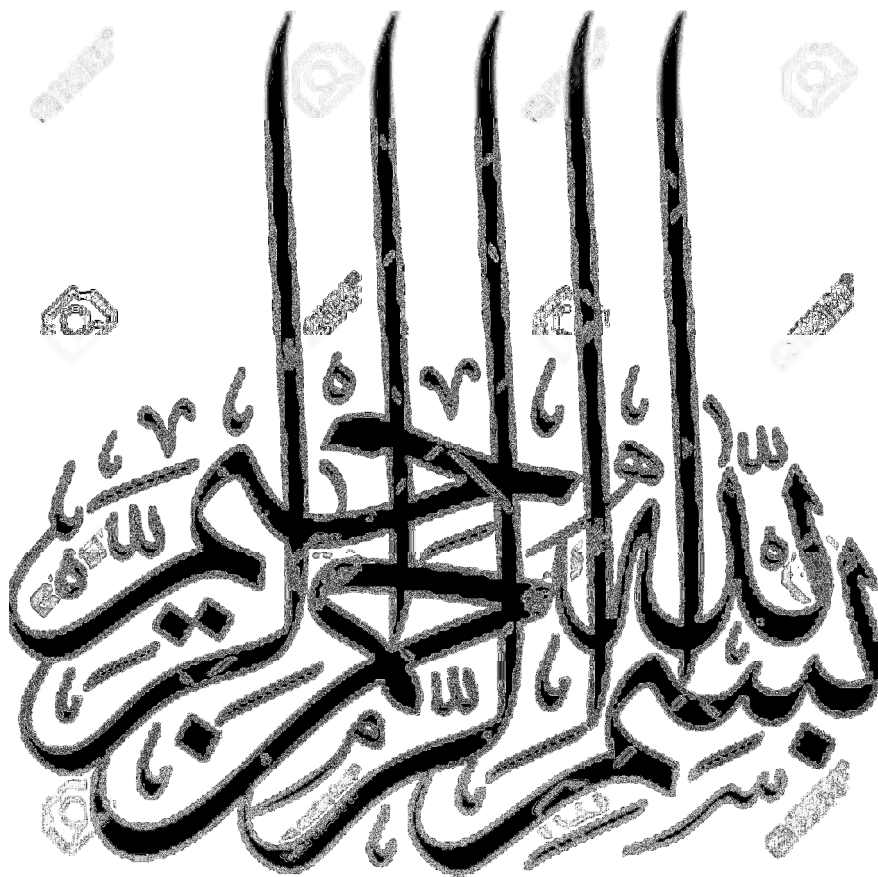
جوش ملیح آبادی ۵ دسمبر ۱۸۹۴ تا ۲۲ فروری ۱۹۸۲ء

فہرست

انتساب

"اللہ"

پروردگارِ عالم کے نام

جو رحمن بھی ہے اور رحیم بھی

جو علیم بھی ہے اور خبیر بھی

جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا

اور اپنے بندوں کی اصلاح کے لیے نبی بھیجے

جس نے انسانِ کامل کو ہماری ذہنی، قلبی، روحانی اور سماجی اصلاح کے لیے مبعوث کیا

قرآن کو ہمارا راہبر و راہنما قرار دیا

اور اُمتوں میں سے بہترین اُمت ہمارے لیے منتخب کی

جو بے سہاروں کا سب سے بڑا سہارا ہے

وہ رب ذوالجلال جو سب سے بہترین وارث بھی ہے

جو غائب بھی ہے، حاضر بھی

جس نے مجھے بہترین سرپرست، دادا، دادی اور ماں باپ کے روپ میں عطا کئے

اور مشفق ترین اساتذہ کی شاگرد بنایا

پیار، احترام اور ساتھ نبھانے والا مونسِ زندگی دیا

دعا کے پھول بکھیرنے والے بہن، بھائی دیئے

مفید مشورے دینے والے دوست

اور جو بھی میں نے مانگا، وہ سب دے دیا

شکریہ اللہ، میں تیری کس کس نعمت کا شکر ادا کروں

پیش لفظ

تحقیق کے بنیادی اصولوں سے شناسائی جہاں سود مند ہوتی ہے وہاں محقق کی مشکلات بھی بڑھا دیتی ہے۔ تحقیق کا کوئی بھی میدان ہو، مسائل راستے میں حائل ہو جاتے ہیں لیکن ادبی تحقیق میں معاملہ زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ٹھوس اور مستند معلومات کا حصول تحقیقی مقالے کی اولین شرط ہے۔ تحقیق میں مواد کو ایک خاص معیار پر جانچنا، اس کی اہمیت اور حیثیت کا تعین کرنا اور جدید تقاضوں کے مطابق مفید نتائج بر آمد کرنا بے حد ضروری ہو جاتا ہے۔

شبیر حسن خان متخلص بہ جوش ملیح آبادی اپنے دور کا ایک معتبر نام ہے۔ جوش بیسویں صدی کے اردو شعراء میں ایک قد آور شاعر کے طور پر ابھرے ان کی شعری بلند قامتی نے ان کی نثر نگاری کو دبا لیا لیکن جہاں ان کی شاعری میں بے شمار خوبیاں موجود ہیں وہیں ان کی نثر بھی ان تمام نثری خصوصیات سے آراستہ ہے جو عمدہ نثر کا خاصہ ہوتی ہیں۔ ان کی نثر کی جادوگری قاری کو کسی اور سمت متوجہ نہیں ہونے دیتی۔ ان کی شاعری اگر ایک گلدستے کی مانند ہے تو ان کی نثر سبدِ گل فروش ہے۔ جہاں ان کی شاعری پر سینکڑوں مضامین تحریر کیے گئے ہیں وہیں ان کی نثر پر لکھے جانے والے مضامین کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ اسی بات کو مد نظر رکھتے ہوئے جوش کی نثر نگاری کی مختلف جہتوں کو اس مقالے میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ بحیثیت نثر نگار جوش کا مقام و مرتبہ متعین کیا جاسکے۔

خطوط نویسی، مقالہ نگاری، تنقید نگاری ترجمہ نگاری، کالم نگاری، لغت نویسی، مصاحبے، تقریظیں، تنقید نگاری، پیش لفظ اور سب سے بڑھ کر آپ بیتی نگاری میں جوش کی نثر کی رنگین بیانی، شوخ گفتاری، فطرت نگاری، فصاحت و بلاغت، روزمرہ و محاورہ، مترادف و متضاد کا استعمال، عربی و فارسی تراکیب کا بر محل استعمال اور جرأت و بے باکی کو بیان کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں جوش کی شاعری کے مختلف پہلوؤں یعنی مرثیہ نگاری، رباعی و قطعہ نگاری، انقلابی، سیاسی و رومانی شاعری پر بھی مختصر نظر ڈالی گئی ہے۔ مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

جوش کے آباؤ اجداد، حالاتِ زندگی، وفات، تاریخ وفات، جوش کے شخصیت و کردار، جوش کا ادبی سرمایہ، جوش اور اس کے عہد کو بیان کیا گیا ہے۔

اول باب: جوش کے آباؤ اجداد، حالاتِ زندگی، وفات، تاریخ وفات، جوش کے شخصیت و کردار، جوش کا ادبی سرمایہ، جوش اور اس کے عہد

باب دوم: آپ بیتی کا فن

باب سوم: مقالہ نگاری

باب چہارم: خطوط نویسی

باب پنجم متفرقات ہیں

محاکمہ

کتابیات

ضمیمہ جات

سپاس گزاری کے ضمن میں سب سے پہلے ڈاکٹر سعید مرتضیٰ زیدی مرحوم کی ڈاکٹر ہلال نقوی، پروفیسر وسیم عباس، پروفیسر خادم حسین، ڈاکٹر ریاض قدیر، ڈاکٹر کامران، ڈاکٹر ہارون عثمانی کی شکر گزار ہوں۔ مسز شائستہ واصف کا شکریہ کہ انہوں نے ہر موقع پر تعاون کیا اور مقالے کے لیے ہمیشہ حوصلہ افزائی کی اور ڈھیروں دعائیں دیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ڈاکٹر سعادت سعید، ڈاکٹر شفیق عجمی، ڈاکٹر ہارون قادر، ڈاکٹر خالد محمود سنجرانی، ڈاکٹر ثاقف نفیس، ڈاکٹر اختر علی، میجر خان اشرف کی ممنونِ احسان ہوں جنہوں نے پی ایچ ڈی کی تدریس کے دوران بہت مشفقانہ رویہ رکھا۔ مسز فوزیہ مقبول، مس رفقہ، مس کوثر، مس عشرت سلطانہ، طاہرہ فاطمہ، شگفتہ صابر کی دوستی کا شکریہ۔ خصوصی شکریہ مسز جمیلہ نگہت اور مسز ثمینہ صفدر کی دعاؤں اور محبت کا۔ ڈاور نٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے میجر صاحب، مسز سیما، محمد اقبال، محمد یونس اور باباجی بشیر کی شکر گزار ہوں۔ جی سی یونیورسٹی لائبریری سے چیف لائبریرین محمد نعیم، محمد عمر، محمد عمران، اسماء شہزادی اور دیگر عملہ کے تعاون کی شکر گزار ہوں۔ میں کوئین میری کالج سے محمد ریاض اور محمد ظفر اقبال کی بھی شکر گزار ہوں میں اپنے بھائیوں محمد نواز صدیقی، محمد ریاض صدیقی اور حافظ ذوالقرنین، اپنی بہنوں مسز ریحانہ طاہر، مسز عشرت مظفر اور نائلہ صدیقی کی محبت کی مقروض ہوں۔ میں اپنے شوہر میاں محمد صابر کی شکر گزار ہوں جن کی حوصلہ افزائی اور عملی تعاون نے مجھے ایم فل اور پی ایچ ڈی کرنے کا حوصلہ بخشا۔

میرے دادا ابّا محمد رشید، میرے والد محمد عمر صدیقی، میری دادی اماں اور والدہ نے جو لگن میرے دل میں لگائی تھی آج اس مقالے کی صورت اس کی تکمیل ہو گئی۔ اللہ پاک آپ سب کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور درجات بلند کرے۔ آپ سب کے لیے یہ کہہ سکتی ہوں کہ

رات دن تیری محبت میری خدمت گر رہی
میں تیری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی
آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

میں اس مقالے کے کمپوزر جمال احمد کا خصوصی شکریہ ادا کروں گی جن کی محنت اور گھر والوں کے خلوص و محبت کی احسان مند ہوں، آپ نے تقریباً ڈیڑھ برس تک صبر و برداشت سے میرا ساتھ دیا۔

جن اصحاب نے میری اس مقالے کے سلسلے میں مدد فرمائی ان سب کا شکریہ۔ اللہ پاک اس مساعی کو قبول فرمائے۔ امید ہے کہ یہ تحقیقی و تنقیدی سعی اہلِ علم و ادب کی نظر میں قابلِ وقعت ٹھہرے گی۔

مقالہ نگار

شہناز اختر

۵ جون ۲۰۱۷ء

ملا جو موقع تو روک لوں گا جلال روزِ حساب تیرا
پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا
(جوش ملیح آبادی)

باب اول

سوانحی حالات

جوش کے آباؤاجداد

جوش ملیح آبادی کے آباواجداد درہ خیبر سے ۷یا۸ کلو میٹر مغرب میں شریکرہ تیراہ کے آفریدی قبیلہ آدم خیل کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے جو کہ علی خیل کہلاتا ہے۔ جوش کے مورثِ اعلیٰ یار بیگ خان تھے جن کے ایک بیٹے محمد بلند خان جوش کے جدِ امجد تھے، اور دوسرے بڑے بیٹے محمد نام دار خان جو کہ درہ خیبر میں رہ گئے جبکہ میں بلند خان اپنے دو بیٹوں محمد عوض خان اور فقیر محمد خان کو ساتھ لے کر ۱۲۳۴ھ میں عازمِ ہندوستان ہوئے۔ (۱) اور قائم گنج ضلع فرخ آباد میں سکونت اختیار کی بعد میں اودھ پہنچ کر نواب غازی الدین حیدر کی فوج میں ملازمت اختیار کی، اسی دوران انہوں نے ملیح آباد کے ایک محلے کنول ہار میں مکان بنوا کر رہنا شروع کیا۔ محمد عوض خان اور فقیر محمد خان نے اندور کے راجہ ہُلکر کی ملازمت اختیار کی اور سخت بہادری کے کارنامے انجام دیئے جس پر نواب میر خان والئ ٹونک نے مہاراجہ ہُلکر سے دونوں بھائیوں کے لیے درخواست کی مہاراجہ نے محمد عوض خان کو خود رکھ لیا اور فقیر محمد خان کو والئ ٹونک کے پاس بھیج دیا۔ جہاں وہ رسالدار ہو گئے۔ ٹونک میں اس وقت فارسی و عربی علماء کا ہجوم تھا۔ فقیر محمد خان وقت نکال کر ان علماء سے اکتساب علم کرنے لگے۔ بعد میں والئ اودھ کے ہاں ملازم ہو گئے۔ پہلے پچیس ہزار سواروں کے رسالدار بنے کچھ دن بعد وزارتِ مال بھی ان کے سپرد کر دی گئی اور انہیں سرکار خیر آباد کا گورنر بنا دیا گیا۔ غازی الدین حیدر نے گولہ گنج میں زمین کا ایک بڑا قطعہ اُن کے حوالے کر دیا جس کے انہوں نے دو احاطے تعمیر کروائے۔ احاطہ پختہ فقیر محمد و احاطہ خام فقیر محمد نامۂ مظفری میں لکھا ہے کہ ''دو ہزار روپے ماہوار تنخواہ تھی۔ بہت سی خدمتیں مثل تقسیم تنخواہ محلاتِ شاہی ان کے متعلق تھیں۔ نظم و نسق ملکی و مالی میں وہ دخیل تھے۔ بسوان وغیرہ کی نظامت وچکلے داری... کا انتظام سب ان کا ساختہ پرداختہ ہوتا۔ اس کے علاوہ چار سو گھوڑے بارگیر، جن کی اسامی تین تین سو روپیہ تھی، خان صاحب کی ذاتی ملکیت میں تھے، خان صاحب معتمد الدولہ بہادر وزیراعظم کے خاص مصاحب و دستِ راست تھے۔ (۲)

انہوں نے اپنی جان پر کھیل کر آغا میر کی جان بچائی جس پر شاہِ اودھ نے ان کی بہت تعریف کی۔ سات پارچے خلعت سے نوازا اور نواب حسام الدولہ، تہور جنگ کا خطاب عطا کیا۔ سید نور الحسن خان نے لکھا ہے کہ: ''گویا اس دور میں امرائے نامی شمار ہوتے تھے''۔ (۳) منشی مظفر حسین سلیمانی نے لکھا ہے کہ:

> '' گویا کا پیشہ سپہ گری تھا۔ وہ ذہین، شجاع اور دلیر آدمی تھے۔ دستورِ زمانہ کے مطابق انہوں نے تعلیم پائی تھی۔ لیاقت علمی کا یہ عالم تھا کہ عربی ایسی فصیح بولتے تھے کہ مادری زبان معلوم ہوتی تھی۔''(۴)
>
> حکیم نجم الغنی نے لکھا ہے کہ: شعر و سخن کا بہت ذوق و شوق تھا (۵)

کھلے دل کے دبنگ اور صاف گو آدمی تھے۔ کبھی کسی معاملے میں بھی کلمۂ خیر کہنے سے نہیں رکتے تھے۔ بات چیت میں بادشاہ اور وزیر کا رعب نہیں مانتے تھے۔ اپنے بارے میں خود کہا ہے۔

وہ ایسا نہیں ، چپ رہے بات سن کر
کوئی اور ہووے گا، گویا نہ ہو گا

ایک بار سرکاری حکم سے تمام سرداران فوج نے اپنے ہتھیار کھول ڈالے مگر فقیر محمد گویانے جواب دیا"میں اہل جنگ کے زمرے میں ہوں اگر ہتھیار کھول دوں گا تو کیا طبلہ اور سارنگی لے کر دربار میں حاضر ہوا کروں گا۔ باغبانی کا بہت شوق تھا۔ کہتے ہیں کہ ملیح آباد کا مشہور آم "سفیدہ" انہی کی پیوند کاری کا ثمر ہے۔ خود بھی شعر کہتے تھے اور شعراء کی سرپرستی کرتے تھے۔ گویاناسخ کے شاگرد تھے۔ قاضی عبدالودود نے تذکرۂ شعراء میں لکھا ہے کہ "سراپا سخن" مصنف نے ۱۲۶۹ھ میں گویا کو مرحوم لکھا ہے اور صبح گلشن ۱۲۹۴ھ میں مرقوم ہے کہ وفات کو تقریباً (۳۰) تیس برس ہوئے ہیں اور قیاس کیا ہے کہ ۱۲۶۵ھ میں فوت ہوئے ہوں گے گویا کے حقیقی بھانجے اور داماد مرتضیٰ خان وصل کی تحریر کردہ تقریظ میں جو محمد احمد خان احمد کے دیوان موسومہ مخزنِ آلام مطبوعہ ۱۸۹۰ء میں لکھی ہے گویا کا سالِ وفات ۱۲۶۸ھ ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ناسخ کے دیوانِ اوّل میں محمد بلند خان کی وفات کے تین قطعات درج ہیں جن سے تاریخ وفات ۱۲۴۰ھ نکلتی ہے۔

فقیر محمد خان گویانے قصیدے، منقبت، سلام، مرثیہ بھی لکھا اور ترکیب بند اور مخمسن میں بھی طبع آزمائی کی لیکن جو اہمیت غزل اور "بستانِ حکمت" کی ہے وہ کسی اور صنف کی نہیں ہے۔ جب گویانے نثر لکھی اس وقت اس کے سامنے نہ سرور کی "فسانہ عجائب" تھی جو ۱۲۵۹ھ میں پہلی بار شائع ہوئی۔ نہ مہجور کی "گلشن نوبہار" تھی جو ۱۲۶۹ھ میں پہلی بار شائع ہوئی جبکہ "بستانِ حکمت" پہلی بار ۱۲۵۱ھ میں مکمل ہوئی اور نظر ثانی کے بعد ۱۲۵۴ھ میں شائع ہوئی۔ اس اعتبار سے "بستان حکمت" اردو نثر میں تاریخی اہمیت کی حامل نثری کتاب قرار پائی ہے۔

دیوانِ گویا ۱۲۴۲ھ میں مرتب ہوا اور پہلی بار کانپور سے ۱۲۴۶ھ بمطابق ۱۸۳۱ء میں شائع ہوا۔ دیوانِ گویاناسخ کے رنگ جدید یعنی "تازہ گوئی" یا طرز جدید میں مرتب ہوا تھا۔ اس طرز میں باطن سے زیادہ خارج کے بیان پر زور دیا جاتا ہے۔ عشق کی داخلی کیفیت کی بجائے ظاہری روپ کو اولیت دی جاتی ہے۔ سعادت یار خان ناصر کے تذکرہ "خوش معرکہ زیبا"، شیفتہ کے "گلشن بے خار" کریم الدین کے "طبقاتِ شعرائے ہند" اور گلشن ہمیشہ بہار میں گویا کے ناسخ کا شاگرد ہونے کا ذکر ہے۔

گویا سپہ گری، نظامت، امارت اور اقتدار کے ساتھ ساتھ شاعر اور ادیب بھی تھے۔ شاعری میں "دیوانِ گویا" اور نثر نگاری میں "بستان حکمت" ان سے منسوب ہیں۔ بستانِ حکمت فارسی کی مشہور کتاب "انوار سہیلی" کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب اس سے پہلے بھی ترجمہ ہو چکی ہے۔ مگر گویا کا ترجمہ سب سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاک وہند، اردو ادب، جلد سوم میں گویا کی نثر کی خصوصیات یوں بیان کی گئی ہیں۔

> ..."فقیر محمد گویا لکھنؤ کے روساء میں سے تھے اس کے باوجود ان کے ہاں اس دور کے دوسرے مصنفین مثلاً سرور کی طرح قافیہ پیمائی نہیں ہے۔ لیکن الفاظ و فقرات کی ترتیب میں قدامت کا اثر ضرور ہے مگر یہ خصوصیت اس دور میں عام تھی۔(۶)

نواب محمد احمد خان بہادر، احمد صاحبِ تعلقہ دار کسمنڈی تھے۔ جوش نے "یادوں کی برات" میں اپنے دادا کی غیر معمولی جسمانی و جنسی طاقت کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کی پچیس تیس بیویاں تھیں جن میں سے چار نکاحی اور باقی لونڈیاں، باندیاں تھیں۔ ان کے ایک سو بارہ بچے تھے۔ جوش کے پاس پچاسی بچوں کے نام درج تھے۔ انتہائی وضع دار شخص تھے۔ ان کے دیوان کو دیوان احمد یا مخزنِ آلام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ خود انہوں نے ایک مطبع قائم کر کے ملیح آباد سے اپنا دیوان چھپوایا تھا اور خاندان میں تقسیم کر دیا تھا۔ مخزنِ آلام کے ٹائٹل پر مندرجہ ذیل عبارت تحریر ہے۔

"من نتائج افکار، سخن سنج، معجز بیاں و عالی خاندان، الادودمان جناب محمد احمد خان صاحب بہادر، تعلقہ دار و آنریری مجسٹریٹ، خلف الرشید، دست گیر افتادگان، جنت مکاں حضرت فقیر محمد خان صاحب بہادر گویا مرحوم و مغفور"۔

دیوان کی ضخامت پانچ، چھ سو صفحات سے کم نہیں تھی۔

عدم سے جانب ہستی جو بو تراب آیا ہوا یہ شور جہاں میں کہ آفتاب آیا
جب سے عاشق ہوئے تمہارے ہم لگ گئے گور کے کنارے ہم

(یادوں برات ص ۷۲)

انگریز لیفٹیننٹ گورنر نے انہیں تعلقہ داری کی سند کے ساتھ ساتھ آنریری مجسٹریٹ (درجۂ اوّل) بھی بنا دیا۔ وہ مہینے میں ایک بار مجسٹریٹی کے فرائض بھی ادا کرتے تھے۔ جوش کہتے ہیں کہ جس طرح ببول پر ململ کی چادر ڈال کر زور سے کھینچ کر تار تار کر دی جاتی ہے اسی طرح انہوں نے اپنی جائیداد کے ٹکڑے اڑا کر رکھ دیئے۔

جوش کے والد کا نام نواب بشیر احمد خان تھا۔ تخلص بھی بشیر تھا۔ محمد احمد خان کے بیٹوں میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ تھے۔ فارسی زبان اور تاریخ اسلام پر عبور رکھتے تھے۔ سعدی، حافظ، نظیری، فانی اور فردوسی کا کلام ازبر تھا۔ میر تقی میر اور میر انیس کے شیدائی تھے۔ خود بھی شاعر تھے۔ انہوں نے میرزا داغ کی شاگردی اختیار کی اور ان سے شاعری میں اصلاح لی۔ امیر مینائی اور جلال نقوی کے بھی شاگرد ہوئے۔ بشیر احمد خان کے انتقال کے بعد جوش کے بڑے بھائی شفیع احمد خان نے ان کا تمام کام یکجا کر کے "کلامِ بشیر" کے نام سے شائع کر دیا۔ بشیر احمد خان بچوں کی تربیت کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ بچوں کو ادب آداب اور زبان دانی سکھانے میں کردار ادا کیا۔ ابتداء میں جوش کو والد کی طرف سے شاعری کی اجازت نہ ملی لیکن بعد میں اجازت ملی تو بشیر احمد کی ہمراہی میں مولانا رضا فرنگی محل کے مشاعرے میں باپ اور بیٹا دونوں نے بطور شاعر شرکت کی۔ مشاعرے میں جوش کو والد سے زیادہ داد و تحسین ملی، واپسی پر بشیر احمد خان نے کہا کہ آئندہ سے ہم دونوں ایک ساتھ کسی مشاعرے میں شرکت نہیں کریں گے۔ غضب خدا کا، بیٹے کو باپ سے زیادہ داد ملے۔ دینی اعتبار سے بشیر احمد سنّی تھے لیکن اہل بیت کی محبت کو جزو ایمان سمجھتے تھے اور حضرت علیؓ کو تینوں خلفاء پر بمراحل ترجیح دیتے تھے۔ ان کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

جنت میں بھی کبھی دل سہہ نہیں سکتا یہ رشک کے صدمے تیرا گھر ہو تو میں رہ نہیں سکتا
ذرا مجھے میرے احباب قبلہ رو کرتے دم ان کے سامنے نکلے دل یہ دعا مانگوں گا

(یادوں کی برات ص ۷۷)

ایک مشاعرے کے سلسلے میں جوش کو پشاور جانا پڑا۔ خیبر کی پہاڑیوں پر نظر کر کے جوش نے "میرے اجداد" کے نام سے ایک نظم تحریر کی جسے خاطر غزنوی نے اپنے مضمون "جوش آفریدی اور دلِ آباء کی دھڑکنیں" میں تحریر کیا ہے۔ مشاعرہ اپریل ۱۹۶۵ء میں منعقد کیا گیا تھا جس میں یہ نظم پڑھی گئی۔

اے میرے پاک وطن، میرے بزرگوں کے وطن
اے کہ ذروں میں تیرے بوئے ختن، رنگ سمن
اے کہ مٹی میں تری تاب و تبِ درِ عدن
ہاں مجھے سن! کہ ترے ساز کی آواز ہوں
آفریدی ہوں، علی خیل ہوں، جانباز ہوں(۷)

جوش کی پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے۔ "یادوں کی برات" میں جوش ملیح آبادی نے اپنی تاریخ پیدائش اس طرح درج کی ہے۔

> ..."میرے خاندان میں بچوں کی تاریخ ولادت درج کرنے کا رواج ہی نہ تھا۔ البتہ میری دادی جان نے جو خاندان کی مورخ تھیں، مجھ سے میری ولادت کا جو سن بتایا تھا وہ سن عیسوی کے حساب سے ۱۸۹۶ء تھا یا ۱۸۹۸ء تھا۔ یہ بھی یاد نہیں رہا، بہر حال اپنی عمر کو دو سال بڑھا دینے میں نقصان ہی کیا ہے۔ اس لیے آپ یہ سمجھ لیں کہ میں ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوا تھا، دو برس اور بوڑھا ہو گیا۔ ہو جانے دیجئے جوتی کی نوک سے البتہ یہ بخوبی یاد ہے کہ دادی نے بتایا تھا کہ بیٹا تو صبح چار بجے پیدا ہوا تھا۔ (یادوں کی برات ص ۴۱)

مختلف لوگوں نے جوش کی پیدائش کا سن مختلف لکھا ہے۔

صہبا لکھنوی نے افکار "بیادِ جوش" میں جوش کی تاریخ پیدائش ۵ دسمبر ۱۸۹۸ء درج کی ہے اور تحریر کا عکس بھی دیا ہے۔ (۸) ڈاکٹر یحییٰ احمد نے جوش کی تاریخ پیدائش ۵ دسمبر ۱۸۹۸ء درج کی ہے یعنی ۵ دسمبر ۱۹۹۸ء صبح چار بجے، یوم دوشنبہ ۲۰ رجب المرجب ۱۳۱۶ھ، م ۲ بہمن ۱۳۰۸ف (۹) اردو انسائیکلوپیڈیا میں جوش کی تاریخ پیدائش ۱۸۹۴ء درج ہے۔ (۱۰) خلیق ابراہیم خلیق نے اپنی خود نوشت، منزلیں گرد کی مانند میں جوش کی تاریخ پیدائش کا سن ۱۸۹۸ء درج کیا ہے۔ پروفیسر محمود بریلوی نے جوش کی تاریخ پیدائش ۱۸۹۴ء درج کی ہے۔ (۱۱) خادم حسین نے اپنے مقالے "جوش ملیح آبادی کی نثر کا اسلوبیاتی مطالعہ" میں جوش کی تاریخ پیدائش ۵ دسمبر ۱۸۹۸ء درج کی ہے۔ (۱۲) تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند اردو ادب جلد پنجم میں جوش کی تاریخ پیدائش ۵ دسمبر ۱۸۹۸ء ملیح آباد، (نواحِ لکھنؤ) تحریر کی ہے۔ (۱۳) سید زوار حسین زیدی نے "اردو شاعروں کا البم" میں جوش کی تاریخ پیدائش ۱۸۹۴ / ۱۳۱۲ھ درج کی ہے۔ (۱۴) اپنی نظم "بہن کی یاد میں" جو کہ ۱۹۳۳ء کی تحریر کردہ ہے۔ جوش لکھتے ہیں۔

جیتے جیتے ہو چکے جوش کو چھتیس سال۔۔۔۔ ایک دل اور اتنے مہ و سال کا پُر ہول بار (۱۵)

ڈاکٹر سید عبد اللہ نے اپنی کتاب "اردو ادب ۱۹۵۷ء تا ۱۹۶۶ء میں جوش کی تاریخ پیدائش ۱۸۹۴ء درج کی ہے۔ (۱۶) حکیم محمد سعید نے اپنی مرتبہ کتاب "مقالاتِ شام ہمدرد میں جوش کی تاریخ پیدائش ۵ دسمبر ۱۸۹۸ء شمسی بیان کی ہے۔ احتشام حسین نے پہلی بار جوش کا سنِ ولادت ۱۸۹۶ء درج کیا۔ (۱۷) اپنی نظم "جلال و جمال" میں جوش نے جو کہ ۱۹۴۸ء میں تحریر کی ہے، اس میں جوش نے لکھا کہ

"انچاسویں برس میں ہے گو عمر کا قدم" اس حساب سے جوش کا ولادت کا سن ۱۸۹۹ء ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر ہلال نقوی نے مختلف شہادتوں اور ثبوتوں کے حوالے سے جوش کی تاریخ ولادت ۵ دسمبر ۱۸۹۴ء طے کی ہے "روحِ ادب" جو کہ ۱۹۲۰ء میں طبع ہوئی اس میں کیننگ کالج لکھنؤ کے پروفیسر رفیع احمد خان نے پہلی مرتبہ جوش کے سنہ ولادت کو تحریر کیا جو کہ ۱۸۹۴ء ہے اور ایک اور مقام پر یہ بھی بتایا گیا کہ اس وقت جوش کی عمر چھبیس سال ہے۔ "مقالاتِ زریں" جو کہ ۱۹۲۱ء میں طبع ہوئی اس میں جوش کے ستائیسویں برس میں قدم رکھنے کا تذکرہ ہے۔ ڈاکٹر ناہید عارف نے اپنے مقالے "خاندانِ گویا کی ادبی خدمات" میں جوش کی تاریخ پیدائش ۱۸۹۴ء درست تسلیم کی ہے۔ جوش چھ بہن بھائی تھے۔ جوش دوسرے نمبر پر تھے۔

جوش کی دادی ہرمزی بیگم نے جو کہ ایک اثنا عشری گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں انہوں نے پوتے کا نام غلام شبیر رکھا۔ گھر میں بھی انہیں غلام شبیر پکارا جاتا رہا۔ بعد میں جوش کے والد اپنے نام کی مناسبت سے شبیر احمد پکارنے لگے۔ جوش نے سنِ شعور میں آتے ہی شعری ضرورت کے تحت اپنا نام بدل کر شبیر حسن خان رکھ لیا۔ چونکہ جوش یہ سمجھتے تھے کہ زندہ اور بیدار قوموں کے شعراء کے تخلص مردہ دلی کی بجائے زندہ دلی اور جوش و جذبے سے عبارت ہوتے ہیں اس لیے انہوں نے اسی خیال کے پیش نظر جوش تخلص اختیار کیا۔

جوش کی ابتدائی تعلیم و تربیت کا اہتمام گھر پر ہی کیا گیا۔ گھر کا ماحول شعر و ادب سے مملو تھا۔ کم عمری میں ہی گلستان، بوستان، سکندر نامہ، دیوانِ حافظ، داغ و انیس سے رشتہ استوار ہو گیا تھا۔ گھر پر اساتذہ عربی اور فارسی پڑھانے آتے تھے۔ فارسی کے معلم تھے مولوی نیاز علی صاحب خان اور اردو اور انگریزی کے معلم تھے۔ ماسٹر گومتی پرشاد۔ ڈاکٹر عقیل احمد جوش کے تعلیمی سلسلے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"جوش کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اس کے لیے مولوی نیاز علی خان ان کے پہلے استاد مقرر ہوئے۔ ان کے علاوہ دوسرے معلم مولانا طاہر علی، مولوی قدرت اللہ بیگ ہیں جنہوں نے جوش کو عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم دی۔ ماسٹر گومتی پرشاد نے انہیں انگریزی کی تعلیم دی اور مرزا ہادی رسوا نے انہیں فارسی عربی کی تعلیم دی۔ بعد میں ان کے والد نے مانی جانسیؔ کو بھی جوش کا ٹیوٹر مقرر کیا" (۱۸)

۱۹۰۷ء میں جوش سیتا پور سکول میں داخل ہوئے اور ڈیڑھ سال تک وہاں تعلیم حاصل کی۔ والد نے جدائی برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے بلوا کر حسین آباد ہائی سکول نمبر 4 میں داخل کرا دیا۔ ۱۹۱۲ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے لیکن شرارتوں کی بنا پر نام خارج کر دیا گیا۔ لکھنؤ آکر جوبلی ہائی سکول میں داخل ہوئے جو کہ چرچ مشن کا ادارہ تھا۔ پھر کرسچئن کالج میں داخلہ لیا۔ ۱۹۱۴ء میں سینٹ پیٹرسن کالج میں داخل ہوئے اور سینئر کیمبرج پاس کیا۔ ۱۹۱۸ء میں ٹیگور کی دعوت پر شانتی نکیتن گئے جہاں ٹیگور سے انہوں نے فطرت پرستی کا اثر قبول کیا۔ چھ مہینے بعد وہاں سے بھی کوچ کیا۔

جوش کی دادی مرزا غالب کے خاندان سے ہونے کی بنا پر جوش کے والد کی اور جوش کی اردو دانی میں مہارت کا سبب تھیں۔ والد غلط لفظ بولنے پر تھپڑ رسید کر دیا کرتے تھے۔ والدہ بھی میر انیس کی شیدائی تھیں۔ اسی لیے جوش کو بچپن ہی سے علمی و ادبی ماحول ملا تھا اور وسیع المشربی بھی۔ یادوں کی برات میں درج ہے کہ جوش نے نو برس کی عمر سے ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ جوش کا پہلا شعر یہ تھا۔

شاعری کیوں نہ آئے راس مجھے۔ یہ میرا فن خاندانی ہے

ابتداء میں جوش کے والد نہ چاہتے تھے کہ جوش شعر کہیں لیکن پابندیوں کے باوجود جوش منع نہ ہوئے تو اجازت دے دی۔ ابتداء میں والد نے خود اصلاح دی اور بعد میں جوش کی فارسی تراکیب دیکھ کر عزیز لکھنوی کے سپرد کر دیا۔ یہ سلسلہ پانچ چھ برس کے اندر منقطع ہو گیا۔ جوش کو احساس ہو گیا کہ عزیز لکھنوی کی اصلاح میں شعر کیا لفظی حسن تو نکھر جاتا ہے لیکن اُس کی معنویت ختم ہو جاتی ہے۔ اور "روحِ ادب" کی اشاعت کے وقت عزیز لکھنوی کی اصلاح قلم زد کر کے اس کی اصلی صورت میں پیش کیا۔

۱۹۰۷ میں جوش کا نکاح اشرف جہاں بیگم سے ہوا تھا جس وقت یہ نکاح ہوا جوش عقیدۃً "سُنی" تھے لیکن بعد میں انہوں نے شیعہ مسلک اختیار کر کے اپنا نام تبدیل کر کے شبیر حسن خان رکھ لیا۔ تو سسرال والوں نے تنسیخِ نکاح کا مقدمہ دائر کر دیا۔ مقدمہ تقریباً چھ سال تک چلا۔ ۱۹۱۶ء میں جوش کے والد کا انتقال ہو گیا تو اس کے کچھ دن بعد یہ مقدمہ ختم ہوا۔ طے پایا کہ جوش اپنی بیگم کو شیعہ بننے پر مجبور نہیں کریں گے۔ یادوں کی برات میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"میری بیوی آج تک سُنی ہیں اور میں نہ شیعہ رہا نہ سنّی اور اب میں مسلمان بھی ہوں کہ نہیں؟ اس کا فیصلہ کون کرے؟ "

(یادوں کی برات ص ۱۶۰)

جب جوش سینٹ پیٹرسن کالج میں زیر تعلیم تھے تو اسی دوران ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ (۱۹۱۶ء میں جب ان کے والد کی عمر بیالیس برس تھی) جائیداد کا بٹوارہ ہوا اور بڑے بھائی نے دھوکہ دہی سے جوش کی آدھی جائیداد اپنے نام ہبہ کرا لی۔

جائیداد سے محرومی کے بعد اپنے سوتیلے چچا آصف خان سے امانی گنج میں دو بیگھہ زمین خرید کر ایک نہایت خوبصورت دو منزلہ کوٹھی بنوائی جس کا نام "قصرِ سحر" رکھا تا کہ وہاں سے طلوعِ سحر کا نظارہ کیا جا سکے۔ ملیح آباد ریلوے اسٹیشن کے قریب یہ جگہ واقع تھی۔

جوش نے پہلی ملازمت دکن میں کی جہاں وہ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۳ء تک قیام پذیر رہے۔ جوش نے بیان کیا ہے کہ انہیں خواب میں رسول اللہ ﷺ نے دکن جانے کا حکم دیا۔ جوش نے ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، اکبر الہ آبادی اور مولانا سید سلیمان ندوی سے سفارشی خطوط تحریر کروائے اور مہاراجہ کشن پرشاد کے ہاں حاضر ہو گئے۔ مہاراجہ نے کہا کہ وہ آصف سابع کے معتوب ہو چکے ہیں۔ مختلف وسیلوں سے ملاقات کے بعد مہدی یار جنگ کے والد عماد الملک کی وساطت سے جوش کو ۲ جون ۱۹۲۴ء کو عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ دارالترجمہ کے ناظم عنایت اللہ نے پولیٹیکل اکانومی کے مترجم کی حیثیت سے تقرر کا مژدہ سنایا۔ جوش نے پولیٹیکل اکانومی سے لاتعلقی کا اظہار کیا اور انگریزی ادب کے مترجم کی حیثیت سے کام کرنے کی خواہش ظاہر کی جسے نظام نے قبول کر لیا۔ دس سال حیدر آباد میں گزارے اور ۱۹۳۴ء میں شہر بدر کر دیئے گئے جس کا سبب جوش اپنی نظم "غلط بخشی" قرار دیتے ہیں لیکن اس سے پہلے کچھ اور اسباب بھی تھے ایک یہ کہ جوش اپنی بے توقیری کا رونا اپنی بیگم کے سامنے روتے رہے اور نظام کے جاسوس اس کی اطلاع نظام تک پہنچا دیتے تھے۔ دوم یہ کہ ایک رسالے کے مدیر نے جوش کی ایک بہاریہ نظم قصیدہ بنا کر نظام کی سالگرہ کے موقع پر شائع کر دی۔

کبھی جوش کے مدح فرما   کبھی گل رخوں کی ثنا خوانیاں کر

سوم شہزادی سے گہرے مراسم بھی ایک سبب تھا۔ چہارم غلط بخشی نے طوفان اٹھا دیا۔ نظام نے بار بار موقع دیا کہ جوش معافی مانگ لیں لیکن جوش نے معافی نہ مانگی اور انہیں حیدر آباد سے رخصت ہونا پڑا۔ سید علی اختر، سید ابوالخیر مودودی اور سید ابوالاعلیٰ مودودی رخصت کرنے اسٹیشن آئے۔

جوش نے خود کو ایسا صاحبِ کردار بنا کر پیش کیا ہے جو برے سے بڑے جابر حکمران کے سامنے سر نہیں جھکاتا ہے لیکن "آج کل" میں ڈاکٹر سید داؤد اشرف کا ایک تحقیقی مقالہ "جوش اور سابق ریاست حیدر آباد" طبع ہوا جس میں سید داؤد اشرف نے حیدر آباد میں محفوظ سرکاری کاغذات کی بنا پر لکھا ہے کہ جوش کا معافی نامہ آج بھی آندھرا پردیش آرکائیوز میں محفوظ ہے۔(۱۹)

حیدر آباد میں جوش ان پابندیوں کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے جو اسلام کی طرف سے عائد ہوتی تھیں۔ جوش کو غیر اسلامی اور غیر اخلاقی زندگی کی طرف لے جانے میں حیدر آباد کی زندگی کا بڑا ہاتھ تھا۔ مائل ملیح آبادی جوش کی شراب نوشی کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں کہ:

> "جوش صاحب اپنی شراب خوری کو چار جاموں کا پابند رکھیں یا چار سو جاموں تک لے جائیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ شراب پی کر بہکتے ہیں اور ایسی ایسی حرکتیں کر جاتے ہیں جو ان کے سے عظیم انسان کے لیے شرمناک ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خود محسوس نہ کریں لیکن ان کے مداحوں اور خوردوں کی نگاہیں جھک جاتی ہیں۔(۲۰)

جوش ملیح آبادی خود کو یادوں کی برات میں کتنا ہی چار جاموں تک محدود رہنے والا اور شراب پی کر غل غپاڑہ نہ کرنے والا ثابت کریں لکن اس بات کو ان کے بہت سے دوستوں اور ملنے والوں نے تسلیم کیا ہے کہ وہ شراب پی کر بہکتے ہیں۔ مغلظات، فحش حرکات اور فحش گفتگو پر انہیں اختیار نہیں رہتا۔ عصمت چغتائی، قراۃ العین حیدر، شاہد احمد دہلوی، اور امرتا پریتم نے جوش کے پی کر بہکنے کا ذکر کیا ہے۔ سحاب قزلباش نے اپنے مضمون "جوش چا" میں اس بات کا اقرار کیا ہے کہ جوش شراب پی کر جام منڈیر سے باہر لڑھکا دیتے تھے اور سورج غروب ہونے کے بعد انہیں جوش کے کمرے میں جانے کی اجازت نہ تھی۔(۲۱) جوش وضعدار تھے اور اسی وضعداری کی بنا پر وہ نہیں چاہتے تھے کہ سحاب اُس وقت ان کی محفل میں بیٹھیں جب وہ شغل مے میں مصروف ہوں۔ جوش حیدر آباد سے دھول پور اپنے دوست روپ سنگھ کے پاس گئے جس نے ملازمت کی کوئی صورت نہ نکلنے تک پانچ سو روپے دینے کی پیشکش بھی کی۔ دھولپور کے مہاراجہ نے دو شرطوں پر ملازمت کی پیشکش کی ایک یہ کہ

شراب چھوڑ دو، دوسرے یہ کہ سردار روپ سنگھ سے دوستی ختم کر دو۔ جوش نے دونوں شرائط رد کر دیں۔ اور وہاں سے دہلی کا رخ کیا۔ دہلی میں سروجنی نائیڈو کے ایما پر ۱۹۳۵ء میں رسالہ ''کلیم'' کا اجراء کیا پہلے جوش اس کا نام ''کاخ بلند'' رکھنا چاہتے تھے لیکن دوستوں کے مشورے سے ''کلیم'' نام رکھا۔ پہلے پرچے کی اشاعت کے بعد ہی اقتصادی مشکلات کی وجہ سے لالہ شیونرائن سے حصہ داری کرنی پڑی۔ اسی دوران حیدر آباد سے معتوبی وظیفہ بھی جاری ہو گیا لیکن اچانک لالہ شیونرائن نے شراکت ختم کر دی تو مجبوراً جوش نے ''کلیم'' اپنے پڑوسی محمود علی خاں جامعی کے سپرد کر دیا جنہوں نے مہینے بھر بعد نوے (۹۰) روپے جوش کے حوالے کئے کہ جوش حیران رہ گئے۔ مہاراجہ پٹیالہ نے بھی جوش کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ دہلی واپسی پر جوش ''آدتیہ بھون'' میں ٹھہرے اور ''کلیم'' کی اشاعت کی ذمہ داری سنبھالی۔ ۱۹۳۹ء میں جوش نے ''کلیم'' کو ملیح آباد منتقل کر دیا۔ ادارت کی ذمہ داری اپنے بھانجے اور داماد التفات احمد کے سپرد کر دی لیکن جب دیکھا کہ داماد صاحب بالکل نکھٹو ہیں تو اسے مجاز، علی سردار جعفری اور سبط حسن کے رسالے ''نیا ادب'' میں ضم کر دیا اور رسالہ ''کلیم و نیا ادب'' کے نام سے لکھنؤ سے جاری کیا۔ اس بارے میں جوش نے لکھا۔

> اگر ''نیا ادب'' اور ''کلیم'' کے ادبی مقاصد میں ذرہ برابر بھی اختلاف ہوتا یا ترقی پسند مصنفین کی پالیسی پر ذرا بھی مختلف ہوتی تو ظاہر ہے کہ ان دونوں پرچوں یعنی نیا ادب اور کلیم کو کسی عالم میں یک جان و دو قالب نہیں بنایا جا سکتا تھا... مجھے امید ہے کہ دوئی کو ہٹا کر ہم لوگوں نے جو یہ وحدت پیدا کر دی ہے اس کے نتائج نہایت مفید اور شاندار ثابت ہوں گے۔''(۲۲)

۱۹۴۱ء میں جوش نیا ادب سے لاتعلق ہو گئے۔ دسمبر ۱۹۴۲ء تک نیا ادب لکھنؤ سے شائع ہوتا رہا اس کے بعد ممبئی سے جاری ہونے لگا۔ جوش بھی لکھنؤ سے ممبئی آ گئے اور فلمی دنیا سے وابستگی اختیار کر دلی۔ سجاد ظہیر کے گھر پر شالیمار پکچر کے مالک احمد صاحب نے جوش و ساغر نظامی کو گانے لکھنے کی پیشکش ایک اچھی تنخواہ کے عوض کی۔ جوش و ساغر نظامی نے اس کو قبول کر لیا اور پونے چلے گئے۔ طاہر پیلس میں رہنے لگے لیکن دو ڈھائی سال کے بعد احمد صاحب کے پاکستان سدھارنے پر پونے کو خیر باد کہہ کر ممبئی آ گئے اور پنڈت نہرو کی سفارش پر سرکاری رسالے ''آج کل'' کی ادارت سے وابستہ ہو گئے۔ سردار پٹیل جو کہ محکمہ اطلاعات و نشریات عامہ کے وزیر تھے، نے جوش کو انٹرویو کے لیے بلایا۔ انٹرویو بورڈ میں عظیم حسین خان اور اجمل خان شامل تھے۔ جوش کی تنخواہ گیارہ سو روپے مقرر ہوئی۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۵ء تک جوش ''آج کل'' سے وابستہ رہے۔ ۱۹۵۵ء میں قوم پرست شاعر ہونے کی وجہ سے حکومت ہند نے جوش کو اعلیٰ سرکاری اعزاز پدم بھوشن بھی دیا۔ جوش مالی آسودگی اور بچوں کے مستقبل کے تحفظ کے لیے پاکستان منتقل ہونا چاہتے تھے۔

کراچی کے چیف کمشنر نے جہانگیر روڈ پر ایک بڑے پلاٹ کو جوش کے مکان اور سینما کے لیے الاٹ کر دیا۔ باغ نصب کرنے کے لیے پچاس ایکڑ زمین بھی الاٹ ہوئی۔ جوش کے پاکستانی شہریت قبول کرتے ہی جوش کی مخالفت شروع ہو گئی۔ جوش کو باغ کی زمین اور سینما کا پلاٹ واپس کرنا پڑا۔ جوش نے قرطاس و قلم ''Academy of Letters'' کا منصوبہ بنایا اور وزیر اعظم سہروردی کے زمانے میں پیش کیا۔ تعلیمات کے سیکرٹری زبیری صاحب کی سفارشات کے ساتھ منصونہ فنانس سیکرٹری ممتاز حسین کے پاس پہنچا تو انہوں نے جوش کو مشورہ دیا کہ اسے تدوینِ لغت تک محدود کر دیا جائے۔ یوں ترقیٔ اردو بورڈ کا قیام عمل میں آیا اور جوش مشیر ادب کے عہدے پر مقرر کیے گئے۔

۱۹۶۷ء میں جوش ملیح آباد، ہندوستان گئے اور ایک متنازعہ انٹرویو کو بنیاد بنا کر جوش کو ترقیٔ اردو بورڈ سے برطرف کر دیا گیا۔ اس دوران جوش فیڈرل بی ایریا کراچی میں اپنا مکان بنوا چکے تھے۔ صدر ایوب کے زمانے میں جوش معتوب رہے۔ ۱۹۷۲ء میں جوش کراچی چھوڑ کر اسلام آباد آ گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں پہلے ان کی تقرری نگران مطبوعات پاکستان کے طور پر وزارت اطلاعات میں کر دی گئی۔ ان کے بنیادی فرائض یہ تھے کہ رسالوں، پرچوں اور اخبارات کے مواد کی نگرانی کریں اور جس مواد کو وہ ملک و قوم کے لیے مفید نہ سمجھتے ہوں اس کی نشاندہی

وزارتِ نشر و اشاعت کو کر دیں لیکن وزارتِ اطلاعات کے سیکرٹری نسیم احمد کی شکایت پر ۱۹۷۳ء میں ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت نے انہیں وزارتِ تعلیمات میں تعینات کر دیا۔ اور تنخواہ دو ہزار روپے سے بڑھا کر ڈھائی ہزار روپے کر دی۔ ۱۹۷۷ء تک جوش کی زندگی پر سکون رہی۔ جنرل ضیاء کے دور میں بھی جوش سے تعرض نہ کیا گیا جو تنخواہ بندھ گئی تھی وہی ملتی رہی۔ ریڈیو پاکستان نے جوش سے اس شرط پر ایک انٹرویو لیا تھا کہ ان کی وفات کے بعد نشر ہو گا لیکن ایک سازش کے تحت جوش کی حیات میں ہی اُس کو نشر کر دیا گیا۔ جوش پر نشر و اشاعت کی پابندی لگا دی گئی۔ لوگوں نے ملنا جلنا بند کر دیا۔ تنہائی، بوڑھاپے اور سرکاری اور غیر سرکاری مخالفت نے جوش کو ذہنی اور جسمانی طور پر سخت اذیت سے دوچار کر دیا۔ اگرچہ حکومت کی طرف سے ملنے والی مراعات بحال تھیں لیکن محفلوں کا اجڑنا جوش کو اندر ہی اندر کھاتا چلا گیا۔ ان کی صحت گرتی چلی گئی۔ تبسم اخلاق لکھتی ہیں۔

> "مارشل لاء کا دور تو یوں بھی بڑا پُر آشوب تھا اور جوش صاحب پر تو جلد یا بدیر قیامت ٹوٹنا ہی تھی سو وہ قیامت کی گھڑی آن پہنچی۔ اخبارات، رسائل، جریدے، مراسلے، جوش کے خلاف زہر اگلنے لگے گویا زلزلہ اتنا شدید تھا کہ زمین لاوا اگلنے لگی بابا تو ان باتوں کے عادی تھے مخالف سمت سے آنے والے ہزاروں، لاکھوں اور کروڑوں تیر اپنے سینے پر سہہ لیتے تھے۔
> لیکن اب وہ عمر کے اس حصے میں داخل ہو چکے تھے جہاں انسان کو ضرورت سے زیادہ پیار اور دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے اور بابا کو یہ پیار اور خلوص ان کے احباب ہی دے سکتے تھے مگر میں نہایت معذرت کے ساتھ یہ بات تحریر کر رہی ہوں کہ جوش صاحب کے برسوں پرانے احباب نے مالی تو کُجا اخلاقی مدد بھی نہیں کی۔ آندھیوں کی زد پر تھرانے والے اس چراغ کو کسی نے ہاتھوں کی آڑ دے کر بجھنے سے روکنے کی کوشش نہیں کی۔" (۲۳)

جوش کے دوستوں نے ان سے کنارا کشی اختیار کی لیکن حکومت نے عتاب کے باوجود جوش کو سرکاری مراعات سے محروم نہیں کیا۔ تنویر قیصر شاہد اس حوالے سے رقمطراز ہیں کہ

> "حکومت نے مہربانی کر کے اگرچہ ان کی مراعات واپس لیں نہ ان کی رہائش گاہ ضبط کی لیکن اتنا ضرر ہوا کہ جوش صاحب سرکاری تقریبات سے بلیک لسٹ کر دیئے گئے۔ ادبی نصابی کتابوں سے ان کا ذکر بھی غائب ہو گیا۔ وہ تنہائی کا شکار بھی بنا دیئے گئے۔ اس عرصے میں لکھے گئے ان کے خطوط کا مطالعہ کیا جائے تو عیاں ہوتا ہے کہ جوش صاحب کو اس بات کا شدید قلق ہے اور گلہ تھا کہ ان کے ہم عصر اور ادبی دوست وہم ونوا انہیں "ریسکیو" کرنے کے لیے آگے نہ بڑھ سکے۔"(۲۴)

اپریل ۱۹۸۱ تک جوش کی طبیعت اتنی خراب ہو گئی کہ جوش کو ہسپتال داخل کرانا پڑ گیا۔ جوش کو خون کی قے ہوئی تھی، معدے کا السر پھٹ گیا تھا۔ تقریباً ایک ماہ ہسپتال رہنے کے بعد جوش کو گھر بھیج دیا گیا۔ زبان بات کرنے میں لڑکھڑانے لگی تھی۔ ٹیلی فون پر بات بمشکل سمجھ میں آتی تھی۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۸۱ء کو ممتاز حسین، سحر انصاری، سحاب قزلباش اور پروفیسر مجتبیٰ حسین جوش سے ملنے گئے۔ مجتبیٰ حسین اُس منظر کی تفصیل یوں بتاتے ہیں۔

> "اوپر کمرے میں جوش صاحب کو گاؤ تکیے سے لگا کر بٹھا دیا گیا تھا۔ جوش صاحب پر نظر پڑی تو دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ قوی ہیکل گٹھڑی بن کر رہ گئے تھے۔ آنکھیں چپ تھیں۔ ہم لوگ چپ تھے۔ کمرہ چپ تھا۔ سحاب سے رہا نہ گیا۔ باہر نکل کر رونے لگیں۔ پھر آنکھیں پونچھتی ہوئی اندر آئیں، جوش صاحب آہستہ سے بولے "رو رہی ہو؟ ہاں یہی ہوتا ہے"۔(۲۵)

۲۰ فروری ۱۹۸۲ء کو خون کی قے ہوئی۔ ہسپتال میں داخل کرا دیئے گئے۔ ایسے عالم میں ڈاکٹروں نے جواب دے دیا اور دعا کرنے کو کہا۔ خون کا دباؤ بہت کم ہو گیا تھا۔ ۲۲ فروری ۱۹۸۲ء بروز پیر رات تین بجے جوش نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور ابدی سفر پر روانہ ہو گئے۔(۲۶)

نصیر احمد ترابی نے جوش کے ہی ایک مصرعے سے تاریخِ وفات نکالی۔ "میں شاعرِ آخر الزماں ہوں اے جوش"(۲۷)

جوش کی وفات:

مغیث الدین فریدی نے جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری دونوں کی تاریخ وفات یوں نکالی۔

ماتمِ مرگِ شیریں کلام ۱۴۰۲ھ

بحرِ علم و دانش جوش ملیح آبادی و فراق گورکھپوری ۱۹۸۲ء

اردو زبان کے لب پر ہے غالب کی یہ فغاں "ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے"(۲۸)

کنور مہندر سنگھ بیدی نے مرثیۂ جوش تحریر کیا۔

وہ جاہ و جال وہ چہرہ وہ خال و خد
اے ربِ ذوالجلال ، اے داور اے کردگار
تیری عنایتوں کا تعین نہ کچھ شمار
جب تک تیرا کرم ہو میسر نہ سازگار
جز و تیری ذات کس کو گناہوں سے ہے فرار
باب قبول کی اسے خدمت نصیب کر
یا رب ہمارے جوش کو جنت نصیب کر(۲۹)

جوش ملیح آبادی کی لوحِ مزار پر جوش کی دو رباعیاں اور ایک شعر جوش کے نام، ولدیت، تاریخ پیدائش، مقام پیدائش، تاریخ وفات اور مقامِ وفات کے ساتھ کندہ ہیں۔ سب سے اوپر 'اللہ' لکھا گیا ہے پھر بسم اللہ الرحمن الرحیم ہے پھر جوش کا مشہور شعر

کام ہے میرا تغیّر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

اس کے بعد جوش کا نام شبیر حسین خاں جوش ملیح آبادی ولد نواب بشیر احمد خان، تاریخ پیدائش ۸ دسمبر ۱۸۹۸ء مطابق ۲۱ رجب ۱۳۱۶ھ ملیح آباد، تاریخ وفات ۲۲ فروری ۱۹۸۲ء بروز پیر مطابق ۲۷ ربیع الثانی ۱۴۰۲ھ اسلام آباد

۱۹۳۰ء میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے اپنے اخبار "ہند" میں انہیں شاعر انقلاب کے نام سے یاد کیا۔ کانپور کے رسالے "زمانہ" کے مدیر منشی دیانرائن نگم نے ۱۹۳۵ء میں جوش کو "شاعر اعظم" لکھا۔ فراق گورکھپوری نے اس کی توثیق کی اور اپنی کتاب کے انتساب میں دوہرایا۔ ۱۹۵۵ء میں حکومتِ ہند نے "پدم بھوشن" کا سرکاری اعزاز دیا۔ ۱۸ جون ۱۹۷۹ء کو کراچی پریس کلب کی طرف سے جوش کی حریتِ فکر کے حوالے سے پریس کلب کی دوامی رکنیت دی گئی۔

جوش کے قد و قامت اور حُلیے کے بارے میں مختلف لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں مختلف خیالات کا اظہار کیا۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر لکھتے ہیں۔ "کشادہ پیشانی، غلافی آنکھیں، لب و لہجے میں گھن گرج، متناسب جسم، خوبصورت خدوخال یہ ہیں جوش ملیح آبادی"(۳۰)

ڈاکٹر اعجاز حسین نے ۱۹۳۴ء میں جوش کے خدوخال اور حلیے کو اس طرح بیان کیا۔

موٹے تازے آدمی، چوڑا چکلا سینہ، بڑا طباقی چہرہ، چہرے پر شادابی اور جوانی کی لہریں، آنکھیں نہایت حسین اور سر کافی بڑا۔ پیشانی غیر معمولی بلند، سر پہ بال زیادہ نہ تھے مگر جو کچھ بھی تھے قاعدے سے اپنی جگہ پر تھے۔ ان کی شخصیت مردانہ حسن کا بہترین نمونہ تھی۔ تیور کے لحاظ سے وہ شاعر سے زیادہ سپاہی معلوم ہوتے تھے۔ ان کا جثہ اور قد دیکھ کر یہ خیال ہوتا تھا کہ یہ شخص کسی فوج کا سپہ سالار ہے"(۳۱)

ساغر نظامی نے اپنے ایک انٹرویو میں جوش کے حلیے کو بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"آج بھی میرے سامنے جوش کے اس وقت کے تمام خد و خال روشن ہیں، وہ آلتی پالتی مارے سیکنڈ کلاس کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اچکن کے تمام بٹن لگے تھے۔ رخسار قدرے پچکے ہوئے، گورا رنگ... سر پر استری شدہ ترکی ٹوپی اور مونچھیں ایسی جیسی آج کل کے نوجوان رکھتے ہیں۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پیوست کرتے اور نکالتے۔(۳۲)

جوش کھانا بہت رغبت سے کھایا کرتے تھے اور اعتدال کا خیال رکھا کرتے تھے۔ مرغ اور بٹیر کا گوشت مرغوب تھا۔ کباب شوق سے کھایا کرتے۔ ریفریجریٹر میں رکھے گئے کباب اور رات کے بچے ہوئے کباب بھی اسی شوق و رغبت سے کھا لیا کرتے تھے۔ ناشتے میں چائے کے ساتھ روغنی روٹی پسند کرتے تھے۔ سبزیوں میں بھنڈی اور اروی پسند کرتے تھے۔ شلغم پسند تھے اور ماش کی دال مرغوب تھی۔ غالب کی طرح آم کے شوقین تھے۔ راغب مراد آبادی نے جوش سے ان کے پسندیدہ کھانوں کا پوچھا تو جواب دیا۔

"سیخ کے کباب، بریانی، تنجن، قیمہ بھرے کریلے اور بالائی پر تو ہم مرتے ہیں مگر بالائی اب کہاں"(۳۳)

کسی انسان کی شخصیت کی تعمیر میں وراثت (جین) نفسیات، مذہب، معاشرہ اور جبلت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ بچپن کے حالات و واقعات اس کی شخصیت پر منفی یا مثبت اثرات مرتب کرتے ہیں۔ جوش کی شخصیت کی تشکیل میں معاشرتی عوامل، وراثتی خصوصیات، نفسیاتی امور اور مذہبی عوامل نے اپنا کردار ادا کیا۔

جوش نے اپنے بارے میں خود کہا ہے کہ میری زندگی کے چار بنیادی میلانات ہیں۔ شعر گوئی، عشق بازی، علم طلبی اور انسان دوستی۔ جوش کی زندگی کے یہ غالب رجحان ہیں۔

شعر کی دیوی بچپن ہی سے جوش پر مہربان رہی۔ جدِ امجد صاحب دیوان شاعر تھے۔ چار پشت سے شعر کہے جا رہے تھے۔ ادبی محفلیں گھر میں سجتی تھیں۔ شاعر و ادیب گھر آیا کرتے تھے۔ جوش لکھتے ہیں

"شاعری وہ بد بلا ہے کہ ہر موزوں طبع تخلیق کار کے کان میں یہ افسوں پھونک دیتی ہے کہ بیٹا تم اپنے دور کے سب سے بڑے شاعر ہو۔ جھوٹ کیوں بولوں میرے گوش مبارک میں بھی شاعری یہ افسوں پھونک چکی ہے کہ حضور اقدس و اعلیٰ، اس بیسویں صدی کے سب سے عظیم شاعر یعنی اشعر الشعراء ہیں"۔

(یادوں کی برات ص ۱۴)

لیکن عقل کہتی ہے کہ انائے شاعری کے فریب ہیں۔

جوش کی شخصیت میں مزاح کا عنصر بھی پایا جاتا تھا۔ وہ اپنے دوستوں کے حلقے میں بذلہ سنج مشہور تھے۔ اردو کے بڑے ظرافت نگاروں میں جو حس مزاح پائی جاتی ہے ویسی ہی حسِ مزاح جوش کی طبیعت میں موجود تھی۔ ساغر نظامی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"سنجیدہ باتیں بہت ہو گئیں آیئے کچھ بیہودگی کر لیں"(۳۴)

جوش کے ایک دوست نے ادھیڑ عمری میں ایک بیوہ سے شادی کر لی۔ یار دوستوں نے خوب مذاق اڑایا کہ تم نے اگر شادی کرنی ہی تھی تو کسی جوان لڑکی سے کی ہوتی اور پھر بیوہ سے کیا شادی کیا کوئی کنواری لڑکی نہ ملی تو جوش نے فوراً کہا

آخری عمر میں ایک بیوہ سے شادی کر لی
ٹوبہ ٹوٹی بھی تو ٹوٹے ہوئے پیمانے پر(۳۵)

ڈاکٹر ہلال نقوی جوش کی حسن مزاح کے بارے میں اس طرح رقمطراز ہیں۔

''ان کی افتادِ طبع میں ایک ایسی حسِ مزاح ہے جس نے ان کی تحریروں میں ظرافت کے ان گنت رخ پیدا کر دیئے ہیں۔ اس حوالے سے جب ان پر سنجیدگی سے کام کیا جائے گا تو وہ اردو کے بڑے ظرافت نگاروں میں شمار ہوں گے...''(۳۶)

مسعود حسن رضوی ادیب خود بھی جوش کی ذہانت کے قائل تھے۔ اپنی یادداشتوں میں انہوں نے یک واقعہ درج کیا ہے کہ

''ایک مرتبہ ریل کے سفر میں ان کا اور جوش کا ساتھ ہو گیا۔ شام ہوئی تو جوش صاحب نے شراب کے لوازم نکالے اور مسعود کو بھی شراب نوشی میں شرکت کی دعوت دی۔ مسعود نے انکار کر دیا اور جوش اکیلے پیتے رہے۔ اس کے بعد کہنے لگے۔ مسعود صاحب اس وقت میں آپ سے بہتر حالت میں ہوں اس لیے کہ آپ نے شراب نہیں پی۔ مسعود صاحب نے اس کی وضاحت طلب کی تو کہنے لگے۔ شراب پینا گناہ ہے۔ میں اس گناہ کا ارتکاب کر چکا ہوں اس لیے اب مجھ میں گناہ کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ آپ اس گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے لہٰذا آپ میں صلاحیت گناہ باقی ہے۔ اب آپ صلاحیت گناہ کے ساتھ سوئیے گا۔ میں اس کے بغیر سوؤں گا۔''(۳۷)

جوش کی ظرافت اور بزلہ سنجی کے بارے میں کلیم نشتر لکھتے ہیں:

تقسیم ہندوستان سے پہلے جوش اور حفیظ جالندھری لاہور میں اندرون شاہ عالمی کی تنگ و تاریک ہندو آبادی سے گزرتے ہوئے ہری چند اختر کے مکان پر جا رہے تھے۔ حفیظ جالندھری نے جوش صاحب کی توجہ دلائی۔ ''جوش صاحب!'' آپ سن رہے ہیں اونچی چھتوں پر کھڑی ہندو کنیائیں کیا کہہ رہی ہیں؟'' جوش نے پوچھا ''کیا کہہ رہی ہیں؟'' ''وہ مجھے دیکھ کر کہہ رہی ہیں کہ اردو کا بہت بڑا کوّی جا رہا ہے۔'' حفیظ نے جواب دیا۔ جوش نے فوراً اس پر کہا۔ ''نہیں حفیظ! تمہاری سماعت نے غلطی کی ہے۔ وہ کہہ رہی ہیں اردو کا بہت بڑا کوّا جا رہا ہے۔''(۳۸)

کے۔ ایل نارنگ ساقی نے ''ادیبوں کے لطیفے'' میں جوش کے بارے میں کچھ لطائف درج کئے ہیں۔

عبدالحمید عدم کو ایک بار کسی نے جوش سے ملایا۔ ''آپ عدم ہیں؟'' عدم کافی تن و توش کے آدمی تھے۔ جوش نے ان کے ڈیل ڈول کو بغور دیکھا اور کہا ''عدم یہ ہے تو وجود کیا ہو گا؟''(۳۹)

ایک مولانا کے جوش ملیح آبادی سے بہت اچھے تعلقات تھے، کئی روز کی غیر حاضری کے بعد ملنے آئے تو جوش نے وجہ پوچھی۔ ''کیا بتاؤں جوش صاحب، پہلے ایک گردے میں پتھری تھی اس کا آپریشن ہوا، اب دوسرے گردے میں پتھری ہے۔''۔ ''میں سمجھ گیا'' جوش نے مسکراتے ہوئے کہا ''اللہ تعالیٰ آپ کو اندر سے سنگسار کر رہا ہے''!!(۴۰)

جوش کی زندگی کا بہت سا حصہ رندی و سرمستی کے عالم میں بسر ہوا۔ جوش نے اپنے دوست تاراچند اور روپ سنگھ کی صحبت میں شراب نوشی کی ابتداء کی۔ شراب کے بارے میں جوش کا خیال ہے کہ یہ خواص کے لیے آبِ حیات اور عوام کے لیے زہر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لیے جوش کا نظریہ ہے کہ انہی لوگوں کو شراب پینی چاہیے جو اس کی ایک مقررہ مقدار سے تجاوز نہ کر سکیں۔ جوش کے متعلق یہ مشہور ہوا کہ سورج غروب ہو تو جوش صاحب طلوع ہوتے ہیں۔ کیونکہ جوش غروب آفتاب کے بعد ہی مے خوری کرتے تھے۔ شاہد احمد دہلوی نے اپنے متنازعہ مضمون میں جوش کو بلانوش کہا ہے کہ وہ اکثر پانچ چھ پیگ پیتے تھے لیکن جوش نے اس کی تردید کی انہوں نے لکھا

''جو شخص وقت کی طوالت اور شراب کی مقدار پر حاوی رہنے کی خاطر گھڑی سامنے رکھ کر چار پیگ نہ سہی پانچ چھ پیگ پیتا ہو، کیا ایسے شخص کو بلانوش کا خطاب دیا جا سکتا ہے۔''(۴۱)

جوش کی مے خواری کے ذکر کے بغیر ان کی شخصیت کو سمجھنا مشکل ہے۔ ان کی شخصیت میں مے خواری کی وجہ سے عجب تضاد کی کیفیت بھی دکھائی دیتی ہے۔ حالت نشے میں انہوں نے بعض اوقات ایسی حرکات بھی کی ہیں جس پر بعد میں نادم بھی ہوئے ہیں، کنور مہندر سنگھ بیدی نے اپنی سوانح "یادوں کا جشن" میں ایک واقعہ تحریر کیا ہے جب جوش نے نشہ بندی کے خلاف گورنمنٹ کی پالیسی پر نہرو جی کو مخاطب کر کے سخت رباعیاں سنائیں اور صبح ہوش میں آنے پر معذرت خواہی کے لیے بیدی کو ساتھ لے کر نہرو کے ہاں جا پہنچے۔ (۴۲) اسی قسم کا ایک واقعہ ڈاکٹر عقیل احمد نے ساغر نظامی کے حوالے سے بھی قلمبند کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "میں اور فضلی سجاد ظہیر کے مکان پر پہنچے۔ محفل جمی ہوئی تھی، شراب کا دور چل رہا تھا اور لطیفوں اور پھبتیوں کا دور بھی ... جوش یا تو اتنے بدمست ہو چکے تھے یا حسب عادت انہوں نے فضلی کی خوب درگت بنائی۔ کبھی بدھو کہا اور بونا اور جو کچھ کہا وہ کیوں کہا، مگر آفرین ہے فضلی کی برداشت اور ظرفِ شرافت پر وہ شخص مسکراتا ہی رہا۔ (۴۳)

جوش نے اپنے خاندان کی مالی مشکلات، بیٹی کی تنگدستی، بیٹے کی کم آمدنی، محدود ذرائع آمدنی کے باوجود افسردگی اور بے دلی کو اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیا۔ انہوں نے زندگی کے مسائل سے گھبرا کر راہِ فرار حاصل کرنے کی سعی نہیں کی بلکہ اپنے اہل خانہ کو حوصلہ مندی کا درس دینے کے ساتھ ساتھ جان توڑ کر محنت بھی کی۔ گھر میں نواسے، نواسیوں اور پوتے پوتیوں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے۔ ان کے پیار کے نام سے ان کو بلاتے، ان کے لیے آمدنی کے ذرائع تلاش کرتے انہیں زیادہ سے زیادہ آسائش مہیا کرنے کے لیے مشاعروں میں شرکت کرتے۔ جہاں جانا جوش کو پسند نہیں تھا صرف اس لیے کہ وہاں سے جو روپیہ حاصل ہوتا اس سے گھر کے کئی کام بن سکتے تھے۔ جوش کی بیٹی سعیدہ خاتون کہتی ہیں۔

> "وہ بہت ہنسی مذاق کی باتیں کرتے تھے۔ کبھی رنج کبھی ملال کی باتیں نہیں کرتے تھے، اگر کبھی کرتے تو بڑی فلسفیانہ باتیں ہوتیں، بڑی اونچی باتیں کرتے تھے تاکہ ہم لوگ زمانے سے ٹکرا سکیں۔" (۴۴)

جوش کی شخصیت کی نمایاں ترین خوبی یا خامی ان کی شخصیت کا تضاد ہے جس کے سحر سے وہ ساری زندگی چھوٹ نہ سکے۔ وراثتی لحاظ سے جنگجوئی، وحشت و بربریت اور تہذیبی لحاظ سے نرمی، شائستگی اور رکھ رکھاؤ نے انہیں دو مخالف سمتوں میں بانٹ دیا تھا۔ یہ تضاد شروع سے آخیر تک ان کے ہمراہ رہا۔ ان کے شعری مجموعوں کے نام بھی اسی تضاد کے عکاس ہیں۔ شعلہ و شبنم، فکر و نشاط، آیات و نغمات، حرف و حکایات، عرش و فرش، رامش و رنگ، سنبل و سلاسل، سیف و سبو، قطرۂ و قلزم، الہام و افکار، سرود و خروش اور محراب و مضراب میں یہی تضاد جلوہ فگن ہے۔

جوش کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ان کا باغیانہ مزاج بھی ہے۔ بغاوت کا میلان بچپن ہی سے جوش کی شخصیت پر حاوی ہے۔ رسم و رواج سے بغاوت، مذہبی عقائد سے بغاوت معاشرتی قدروں سے بغاوت نے جوش کی شخصیت کو متنازعہ بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ جاگیردارانہ نظام اور سرمایہ دارانہ نظام سے بغاوت کے نتیجہ میں جوش حکومت وقت کے باغی کے روپ میں ظاہر ہوئے اور جدوجہد آزادی میں اپنی نظموں سے دلوں کو گرما کر شمولیت اختیار کی۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی کتاب 'جوش کا نفسیاتی مطالعہ" میں جوش کی بغاوت کا ذمہ دار جوش کے والد کی سخت گیری کو ٹھہرایا ہے۔ باپ کی مخالفت کے باوجود شاعری سے باز نہ آئے۔ جائیداد کی پروا کئے بغیر اپنے آبائی مسلک کو ترک کر کے شیعہ مسلک اختیار کیا اور پھر الحاد کی طرف آئے۔ بغاوت کے سبب ہی حیدر آباد کی ریاست سے شہر بدر کر دیئے گئے۔ اسی بغاوت کے سبب جوش اپنی ملازمتوں سے نکالے گئے یعنی ترقی اُردو بورڈ سندھ، کراچی کی ملازمت جوش کے ایک متنازعہ انٹرویو کی وجہ سے ختم ہوئی۔ بغاوت کا یہی جذبہ جوش کو امرد پرستی کی طرف لے گیا اور پھر عشقِ شہوانی جیسی بلائے بد میں مبتلا کر دیا۔

جوش کی زندگی میں اعتدال کے بجائے لااُبالی پن دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے اگرچہ ہر چیز کے لیے وقت مقرر کر رکھا تھا۔ سیر چمن کے لیے وقت، مے کشی کے لئے وقت، حلقۂ عرفاں اور شہر ہنر و کوئے ادیباں میں جانے کا بھی وقت مقرر ہے۔ لیکن اس کے باوجود بہت سے معاملات میں غیر سنجیدگی کا مظاہرہ کیا۔ کبھی روپے پیسے کی قدر نہیں کی۔ بھائی نے جائیداد کے کاغذات پر دستخط کروالئے، دوستوں اور شراب پر وقت اور پیسہ لٹادیا، ملازمت میں بھی سنجیدگی کا رویہ نہیں برتا۔ ہر بات پر ''برپاپوش قلندر'' کہہ کر گزر گئے۔ جوش کی بیگم نے ہر چیز کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں نہ رکھا ہوتا تو جوش نے جس رکھ رکھاؤ کے ساتھ زندگی گزاری اور جو کتب طبع کرائیں وہ نہ کرواسکتے کیونکہ جوش کی بیگم نے ان کا تمام تر سرمایہ سنبھال رکھا تھا۔

اخلاق احمد دہلوی نے اپنی کتاب ''یادوں کا سفر'' میں جوش کی خوش معاملگی اور شرافت کا ایک واقعہ قلم بند کیا ہے کہ ایک مرتبہ جوش بابا ذہین شاہ کے پاس آئے اور کہا کہ مجھے پچیس ہزار روپے کی اشد ضرورت ہے۔ ذہین شاہ نے کہا کہ ''چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں، میرے پاس پچیس ہزار روپے ہوتے تو میں بیاہ نہ کرلیتا'' یہ جواب سن کر جوش کا منہ اتر گیا۔ باباصاحب نے آواز دی 'ارے بھئی، کوئی ہے، ادھر آنا، اس آواز پر انور پیر بھائی صاحب (ذہین صاحب کے موجودہ جانشین انور شاہ تاجی) لپکے ہوئے حاضر ہوئے۔ حضرت نے جوش کی طرف اشارہ کر کے کہا ''ان کو پچیس ہزار روپے کی ضرورت ہے''۔ جوش صاحب نے تشریح میں کہا ''قرض چاہیے''۔ پانچ منٹ بعد پچیس ہزار روپے کا چیک جوش کو پیش کر دیا گیا۔ کم و بیش ایک سال بعد جوش صاحب آئے اور پچیس ہزار روپے کے نوٹ نکال کر حضرت ذہین شاہ کے سامنے رکھ دیئے۔ جوش نے کہا یہ وہ قرض ہے جو میں آپ سے لے گیا تھا۔ باباصاحب نے کہا مگر میں نے آپ کو کوئی قرض نہیں دیا تھا۔ جوش نے یاد دلایا کہ آپ کے حکم پر ایک صاحب نے مجھے پچیس ہزار روپے کا چیک دیا تھا۔ انہیں بلایئے تاکہ شکریے کے ساتھ میں یہ رقم ان کی خدمت میں پیش کر دوں۔ لیکن جب انہیں بلا کر رقم دی گئی تو انہوں نے رقم لینے سے انکار کر دیا۔

اخلاق احمد دہلوی نے جوش کی خوش تر معاملگی کا بھی ایک واقعہ رقم کیا ہے جو کہ جوش واہل خانہ کی ایک الگ رخ سے نقاب اٹھاتا ہے۔ جوش نے مدنی صاحب کمشنر کراچی کو شکایت کی کہ مالک مکان بہت تنگ کر رہا ہے۔ انہوں نے پولیس میں افسر اپنے بھائی کو تفتیش کے لیے روانہ کیا۔ دومنزلہ مکان میں بالائی منزل پر جوش اور زیریں منزل پر جوش کے مکان مالک رہائش پذیر تھے۔ جوش کی شکایت سننے کے بعد واپس ہو رہے تھے کہ مکان مالک نے اپنی بات سننے کے لیے بلایا اور ٹیپ ریکارڈر چلا دیا۔ مکان مالک کی مری ہوئی، دبی دبائی آواز آرہی تھی جبکہ جوش اور اہل خانہ کی ڈانٹ ڈپٹ، دھمکیاں اور گالیاں چھائی ہوئی تھیں۔ حالات کے تضاد پر بغیر کسی کارروائی کے جوش کی شکایت کی مسل داخلِ دفتر ہو گئی۔ (اخلاق احمد۔ یادوں کا سفر، ص ۱۲۳۔ ۱۲۲)

جوش کا ادبی سرمایہ

ڈاکٹر ہلال نقوی نے جوش کی ادبی زندگی کو چھ ادوار میں تقسیم کیا ہے جبکہ ماہر القادری نے جوش کی ادبی زندگی کے چار ادوار کیے ہیں۔ (۴۵)

ڈاکٹر ہلال نقوی نے جوش کی ادبی زندگی کے چھ ادوار کئے ہیں۔

(۱) پہلا دور ۱۹۰۳ء سے ۱۹۲۳ء تک، آغازِ سُخن سے ملیح آباد اور لکھنؤ میں قیام کا دور، (۲)، ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۴ء حیدر آباد کے قیام کا زمانہ، دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی سے وابستگی اور دکن کی سکونت ترک کرنے تک، (۳) ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء تک، دہلی میں قیام اور ماہنامہ کلیم کے اجرا سے قیام پاکستان تک کا زمانہ (۴) ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۵ء ماتمِ آزادی کی تشہیر سے سرکاری رسالے ''آج کل'' کی ادارت تک (۵) ۱۹۵۶ء تا ۱۹۷۱ء تک، پاکستانی شہریت اختیار کرنے سے یادوں کی برات کی اشاعت تک (۶)، ۱۹۷۲ء تا ۱۹۸۲ء، اسلام آباد میں بطور نگران مطبوعات تا وفات، لیکن ماہر القادری نے ماہنامہ ''ساقی'' کے جوش نمبر میں جوش کی ادبی زندگی کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) عروج (۲) اعادہ (۳) ٹھہراؤ (۴) پستی،

شعری مجموعے۔

روح ادب۔ ۱۹۲۰ء:

جوش کی شاعری کا اولین مجموعہ "روح ادب" کے نام سے میتھوڈیسٹ پریس لکھنؤ سے ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا۔ عام طور اسے ۱۹۲۱ء یا ۱۹۲۲ء میں طبع ہونے والا شعری مجموعہ کہا جاتا ہے لیکن ڈاکٹر ہلال نقوی نے روحِ ادب کے اولین ایڈیشن پر کتاب کے نام کے نیچے درج تحریر سے اس کا سال اشاعت ۱۹۲۰ء طے کیا ہے۔(۴۶) تحریر کچھ یوں ہے کہ "نتیجۂ فکر مصورِ جذبات جناب شبیر حسن صاحب جوش رئیس ملیح آبادی لکھنؤ جولائی ۱۹۲۰ء۔ اس مجموعے کا تذکرہ خود جوش ملیح آبادی نے اپنی خود نوشت میں کیا ہے اور اس کا سن تصنیف ۱۹۲۱ء یا ۱۹۲۲ء قرار دیا ہے۔(۴۷) جوش نے روح ادب کو اپنے دور تصوف و تقشّف کی یادگار قرار دیا ہے۔(۴۸)

یہ مجموعہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں نثر بھی نظم کے ہمرکاب ہے۔ نظم ۹۷ صفحات پر محیط ہے اور نثر کے لیے ۵۶ صفحات مختص کیے گئے ہیں۔ یہ مجموعہ جوش کے آئندہ تخلیقی اور فکری زاویوں کو متعین کرنے کے لیے بنیاد کا کام کر رہا ہے۔

۲۔ جذبات فطرت ۱۹۲۱ء

اس کتابچے کو رسالہ ارتقاء کے جوش سیمینار نمبر میں نثری مجموعوں کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔(۴۹) لیکن یہ شاعری پر مشتمل ہے اور جوش کی وہ طویل نظم ہے جس میں انہوں نے اردو شعرا کو پرانی روش ترک کرنے کی دعوت دی ہے۔ جوش کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہنامہ کلیم کے اکتوبر ۱۹۳۸ء کے شمارے میں اس کے متعلق یہ اشتہار طبع ہوا۔

> "جذباتِ فطرت حضرتِ جوش کی وہ معرکتہ آلاراء نظم ہے جس میں مظاہرِ قدرت کی طرف سے شعرائے اردو کی خدمت میں یہ اپیل کی گئی ہے کہ وہ پرانی روش کو ترک کر دیں۔"(۵۰)

ڈاکٹر ہلال نقوی نے اپنی کتاب جوش ملیح آبادی شخصیت اور فن میں جوش کے چھوٹے بھائی رئیس احمد خان کی طرف سے ایک اشتہاری اعلان کا حوالہ دیا ہے جو کہ "آوازۂ حق" میں طبع ہوا۔ اس میں لکھا تھا کہ

> ..."یہ حضرت جوش کی نہایت معرکہ آراء سلیس نظم ہے۔ مظاہر قدرت کی طرف سے شعراء کی خدمت میں اپیل کی گئی ہے کہ وہ زلف و کمر کے شکنجوں کو توڑ کر نیچر کے وسیع میدان میں نکل آئیں اور کارخانۂ قدرت میں غور کرنے کی سعادت حاصل کریں۔(۵۱)

۳۔ "آوارۂ حق"

دسمبر ۱۹۲۱ء میں اصح المطابع تھوئی ٹولہ لکھنؤ سے یہ مرثیہ شائع ہوا۔ یہ جوش کا پہلا مرثیہ ہے۔ شعلہ و شبنم میں "جذباتِ فطرت"، "آوارۂ حق" اور "پیغمبر اسلام" جیسی مشہور نظمیں شامل کر لی گئیں۔ شعلہ و شبنم ۱۹۳۶ میں طبع ہوئی۔ یہ نظم ۹۲ بندوں پر مشتمل ہے۔ انتساب نواسۂ رسولؐ کے نام ہے۔

زہرا کی دہائی ہے پیغمبر کی دہائی
پھٹتا ہے جگر خالقِ اکبر کی دہائی(۵۲)

(۴) شاعر کی راتیں: ۱۹۳۰ء

جوش کا یہ مجموعہ جو کہ دہلی سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ اس میں تمام نظمیں رات سے متعلق ہیں۔ یہ تمام نظمیں پہلے حصے میں شامل ہیں۔ ان کی تعداد پچیس ہے۔ ان میں سے بارہ غزل کی ہیئت میں اور تیرہ مثنوی کی ہیئت میں ہیں۔ اس کا دوسرا حصہ ''شب تشبیہہ اور استعارے میں'' ہے۔ اس میں بائیس رباعیات ہیں۔

تیسرا حصہ ''شہ پارے'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں پندرہ قطعات شامل ہیں۔ کل صفحات ۹۶ ہیں۔ آخری صفحے پر یہ شعر درج ہے۔

آپ کو نیند آتی جاتی ہے
ختم ابھی دل کی واردات نہیں(۵۳)

جوش ملیح آبادی کے ایک دوست اعجاز الحق قدوسی نے جوش کی اجازت سے ان کی بیاضوں سے رات کے متعلق جس قدر نظمیں، رباعیاں اور قطعات ملے انہیں ایک خاص ترتیب سے نقل کیا۔ بعض نظموں کے عنوان بھی تبدیل کیے اور اپنے موضوع کے مطابق بنا کر اس پر ایک چھوٹا سا مقدمہ لکھا اور عنوان ''شاعر کی راتیں'' رکھا۔(۵۴) کچھ مشہور نظموں کے عنوانات یہ ہیں: التفات کی رات، برسات کی رات، غربت کی رات، ربودگی کی رات وغیرہ۔

(۵) پیغمبر اسلام ۱۹۳۶ء

۶۸ اشعار کی یہ نظم ایک کتابچے کی صورت میں مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی نے شائع کی۔ ۱۹۳۰ میں ''شاعر کی راتیں'' میں اس کا تعارف ان لفظوں میں کرایا گیا۔

> ...خواجۂ دوجہاں سرور کائنات آنحضرت محمد مصطفیؐ کی ولادت اور رسالت پر شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کا یہ وہ غیر فانی شہ پارہ ہے۔ جس کی رفعت و عظمت کے سامنے قصرِ کفر سرنگوں ہوتا ہے۔ ثبوت پیغمبری کے باب میں اس لافانی شاہکار کے استدلال دل میں تیر کی طرح اترتے چلے جاتے ہیں۔(۵۵)

جوش کی اس نعتیہ نظم میں صداقتِ پیغام اور حقانیت رسولؐ شعریت کے فکری اظہار کی صورت ہے۔

اگر صدا اس نبیؑ اُمّی کی، آسمانی صدا نہیں ہے
تو پھر کہاں سے یہ فیض پہنچا؟ جواب اس بات کا نہیں ہے
عرب کے ہیرو، عجم کے سلطاں، نظامِ ارض و سما کے والی
زمیں پہ لطف و کرم کی تُو نے عجب بنائے لطیف ڈالی
چلا جو دوش صبا پہ تیرا پیام ابر بہار بن کر
تمام باطل کے سنگریزے مہک اٹھے برگ و بار بُن کر(۵۶)

نقش و نگار ۱۹۳۶ء

یہ مجموعہ مکتبۂ جامعہ دہلی سے شائع ہوا۔ ۱۹۳۶ میں مقدمہ لطیف الدین، احمد اکبر آبادی نے تحریر کیا۔ مجموعے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کے کئی ایڈیشن ہیں۔ زیر نظر ایڈیشن تیسرا ایڈیشن ہے جو جولائی ۱۹۴۳ء میں مکتبۂ اردو لاہور سے شائع ہوا۔ اس کے صفحات ۱۷۵ ہیں۔ اس مجموعے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب ''نگار خانہ'' ہے۔ دوسرا ''حمزیات'' ہے۔ تیسرے باب کا عنوان ''تاثرات''

ہے۔ چوتھا ’’مطالعہ نظر‘ کے عنوان سے ہے جس میں قطعات ہیں۔ پانچواں باب ’’نصیب‘‘ کے عنوان سے ہے۔ چوتھے باب کے علاوہ تمام ابواب نظم پر مشتمل ہیں۔ ’’شاعر کی راتوں‘‘ میں سے کچھ نظمیں مختلف عنوان کے ساتھ اس مجموعے میں موجود ہیں۔ شاید یہ وہی نظمیں ہیں جو اعجاز الحق قدوسی نے مختلف عنوان بدل کر مرتب کی تھیں۔ شہری رات کو شب نشاط سے اور مست رات کو رقاصہ ٔمیکدہ کے نام سے شامل کیا گیا ہے۔

مادی عہد میں یہ ناداری
کون اپنی کرے گا غم خواری
کس طرف جائیں کس سے بات کریں
ہر طرف اک جمود ہے طاری(۵۷)

شعلہ و شبنم(۱۹۳۶)

یہ مجموعہ کلام ۱۹۳۶ء میں دہلی سے پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ اپنے مواد کی وجہ سے یہ مجموعہ اہم ہے۔ زیر نظر مجموعہ کتب خانہ تاج آفس، محمد علی روڈ، ممبئی کا شائع کردہ ہے۔ اس پر ایڈیشن کا نمبر اور سال اشاعت موجود نہیں ہے۔ ’’شکستِ زنداں کا خواب‘‘، بغاوت، ’’ملکوں کار جز‘‘، ’’کسان‘‘، ’’مقتل کانپور‘‘، بادشاہ کی سواری، ذاکر سے اور شریک زندگی سے خطاب‘‘ مشہور نظمیں ہیں۔ جوش نے اپنے کتابچہ نما مجموعوں جو کہ ایک ایک طویل نظم پر مشتمل تھے، اُن کو بھی اس مجموعے کی زینت بنایا ہے جو پیغمبر اسلام، آوارۂ حق اور جذباتِ فطرت نامی مجموعے تھے۔ یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب آتشکدہ ہے دوسرا باب ’’رنگ و بو‘‘، تیسرا باب ’’اسلامیات‘‘ اور چوتھا باب ’’بادہ سرِ جوش‘‘ کے عنوان سے ہے۔ اس کے صفحات کی تعداد ۳۶۰ ہے۔

لے لیا دل اک ہوش ربا نے کانِ شوخی جان حیا نے
آفت مانے، فتنۂ شہر، جان جہاںنے، روحِ روا نے(۵۸)

ڈاکٹر وحید اختر شعلہ و شبنم پر تجزیاتی مضمون میں لکھتے ہیں۔

شعلہ و شبنم میں چھیالیس نظمیں مناظر فطرت پر ہیں... پیغمبر فطرت کے عنوان سے صبح پر جو نظم ہے مسدس میں وہ انیس کے مشہور مرثیے، ’’جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے‘‘ کے منظر صبح کا چربہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ایک چیز جو جوش کو دوسروں سے ممتاز اور منفرد بناتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں مناظر ذی حیات اور خود فطرت بھی جذبات رکھتی ہے۔ نظیر کے لہجے کا اثر بھی ان کی نظموں میں نمایاں ہے۔‘‘(۵۹)

جوش کے سو شعر ۱۹۳۶ء

اس کتابچے میں جوش کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مجموعوں سے ایک سو اشعار منتخب کر کے لکھے گئے ہیں۔ کلام پر مختصر تبصرہ اور سوانحی حالات بھی درج کیے گئے ہیں۔

اس مجموعے کے حوالے سے ڈاکٹر ہلال نقوی نے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی رائے درج کی ہے جو یوں ہے۔

...’’ترتیب میں حسن کلام کا لحاظ نہیں رکھا گیا بلکہ مقصد یہ ہے کہ ایسی نظمیں ملیں جن میں سو سے کم یا زیادہ شعر نہ ہوں۔ اس پابندی کی وجہ سے اس میں صرف ایک نظم شامل کی جا سکی ہے جو واقعی جوش کی اچھی نظموں میں سے ہے۔ ہماری مراد ’کسان‘ سے ہے۔ اس مجموعے کو دیکھ کر کوئی انجان جوش کے کمالات کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا۔‘‘(۶۰)

فکر ونشاط ۱۹۳۷ء

یہ مجموعہ ۱۹۳۷ء میں دہلی سے شائع ہوا۔ اس میں جوش کی تقریباً ۸۰ نظمیں موجود ہیں۔ زیر مطالعہ مجموعہ کتب خانہ تاج آفس محمد علی روڈ ممبئی سے شائع کردہ ہے۔ اس پر سال اشاعت اور ایڈیشن درج نہیں ہے۔ اس مجموعے کے کل صفحات ۱۱۶ ہیں۔ ابتداء میں نہ کوئی انتساب ہے نہ مقدمہ۔ اس مجموعے سے شاعرانہ تعلّی اور احساس عظمت جوش کے ہاں نظر آتا ہے۔ شمع فروزاں اور آوازۂ شاعر میں اس کا احساس جھلکتا ہے۔ مولوی پر طنز بھی اس مجموعے میں ملتا ہے۔ زیادہ نظمیں مثنوی کی ہیئت میں ہیں۔ قطعات، رباعیات بھی ہیں۔ مسدس، مخمس اور مثلث کی ہیئت بھی استعمال کی گئی ہے۔ جوش کی نظم "تحسین کے پھول" تخیل و تخلیق کے درمیان کی الہامی کیفیت کو بیان کرتی ہے۔

کوئی پراسرار قوت روحِ محتشم
شعر کہنے کو میرے ہاتھوں میں دیتی ہے قلم

اس نظم کے بارے میں وارث علوی نے رائے دی ہے کہ الہامِ شعر پر غالب اور دوسرے شعراء کے یہاں بہت اچھے اشعار دیکھنے کو مل جاتے ہیں لیکن اتنی اچھی نظم کہیں نظر نہیں آئی۔(۶۱) اس مجموعے کی تعریف کرنے سے نیاز فتح پوری بھی باز نہ رہ سکے۔ نیاز نے اس مجموعے کی ایک نظم "فریب ہستی" کے بارے میں نگار کے ایک شمارے میں یوں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے:

"اگر جوش اس نظم کے سوا اور کچھ نہ بھی کہتے تو بھی میں حالی و اقبال کی صف میں لاکر انہیں بٹھا دیتا۔"(۶۲)

جنون و حکمت:(۱۹۳۷)

رباعیات پر مشتمل جوش کا یہ مجموعہ شاعری ۱۹۳۷ء میں کلیم بک ڈپو دریا گنج دہلی سے شائع ہوا۔ جنون و حکمت میں ۴۰۲ رباعیاں موجود ہیں۔ زیر مطالعہ ایڈیشن مکتبۂ اردو لاہور کا شائع کردہ ہے۔ اس میں سال اشاعت اور ایڈیشن نمبر کا اندراج نہیں ہے۔ اس کے آغاز میں ہی جوش خورشید پر ہاتھ ڈالنے کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس کتاب کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ "حقائق" ہے جس میں مختلف عنوان کے تحت ۱۴۸ رباعیاں لکھی گئی ہیں۔ دوسرے حصے حسن و عشق میں ۶۰ رباعیاں شامل ہیں۔ تیسرے حصے کا عنوان "پیران سالوس" ہے اس میں ۲۰ رباعیاں موجود ہیں۔ جوش نام نہاد پیروں کی مخالفت کرتے ہیں اور ان کو بے سمجھ لوگوں کا مال کھانے والے قرار دیتے ہیں۔ عرس اور میلوں ٹھیلوں کی مخالفت بھی دکھائی دیتی ہے۔

چوتھے حصے کو "خیام" کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس میں ۱۰۸ رباعیاں شامل ہیں۔ تمام مضامین اس سے متعلق ہیں۔ آخری حصہ "متفرقات" کے حوالے سے ہے۔ اس میں کل ۶۶ رباعیاں شامل ہیں۔ چند اخلاقی مضامین بھی یہاں ملتے ہیں۔ ڈاکٹر کمال الدین احمد صدیقی نے اس مجموعے کے بارے میں اس رائے کا اظہار کیا ہے۔

...رباعیات کا غالب حصہ ایسا ہے کہ جس کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ اگر حافظ اور خیام نے اردو میں رباعیاں کہی ہوتیں تو وہ جنون و حکمت کی رباعیاں ہوتیں"(۶۳)

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنے ایک مقالے میں فراق گورکھپوری کو سب سے زیادہ رباعی نگار قرار دیا ہے۔ انہوں نے فراق کی رباعیوں کی تعداد ۳۵۱ اور جوش کی رباعیوں کی تعداد ۲۵۰ قرار دی ہے۔(۶۴) حالانکہ جوش کے مجموعے جنون و حکمت میں ہی کل ۴۰۲ رباعیاں ہیں، باقی اور مجموعوں میں بھی رباعیاں شامل ہیں اور رباعیوں کے اور مجموعے بھی آئے ہیں۔ علاوہ ازیں جوش کی رباعیوں کا ایک صاف شدہ مسودہ ایک مشاعرے میں چوری ہو گیا تھا۔ جس کے چوری ہونے کا رنج جوش کو ساری عمر رہا۔(۶۵)

حرف وحکایت ۱۹۳۸ء

کتب خانہ رشیدیہ دہلی سے شائع ہونے والا یہ مجموعہ نظموں کی تعداد کے اعتبار سے درجہ اوّل کے منفرد مجموعوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس میں موضوعات کا تنوع نہیں ہے بلکہ پہلے مجموعوں سے ملتا جلتا مجموعہ ہے۔ اس میں ۱۲۰ سے زیادہ نظمیں ہیں۔ اہم نظمیں ''سرشکِ تبسم''، ''شباب مرعوبِ شیب ہے'' ان کی شہرۂ آفاق نظم ''پھٹ پڑا بدکار بھی'' اس مجموعے کی زینت ہے۔ جوش کی وہ نظم جو ان کے بقول ان کے اور نظام حیدر آباد کے درمیان غلط فہمی کی وجہ بنی۔ ''غلط بخشی'' وہ بھی اس مجموعے میں شامل ہے۔ منظر نگاری اور سراپا نگاری میں ان کی نمائندہ نظم ''جادو کی سرزمین'' اور ''الہڑ'' کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔(۶۶)

حسین اور انقلاب ۱۹۴۱ء

فروری ۱۹۴۱ء سرفراز قومی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ جوش نے اپنے پہلے مرثیے ''آوارۂ حق'' کے تقریباً بیس سال بعد یہ مرثیہ لکھا۔ ہندوستان کے کئی شہروں سے اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ ۶۷ بندوں پر مشتمل اس مرثیے کے ہمراہ جوش کی پانچ رباعیاں اور دو سلام بھی طبع ہوئے۔ ادبی دنیا کی طرف سے اس مرثیے کو پذیرائی ملی۔

اتنی حدّت میں بھی آہنگِ زمستاں تھے حسین
آب و رنگِ چمن و ابرِ بہاراں تھے حسین
کشتِ آئینِ رسالت کے نگہباں تھے حسین
فرق سے تابہ قدم موسم باراں تھے حسین
جھوم کر چرخ پہ قبلے سے گھٹا آئی تھی
بات کرتے تھے تو جنت کی ہوا آتی تھی(۶۷)

آیات ونغمات ۱۹۴۱ء

یہ مجموعہ کلام ۱۹۴۱ میں نامی پریس لکھنؤ سے طبع ہوا۔ ناشر مکتبۂ اردو لاہور تھا۔ صفحات کی کل تعداد ۳۲۸ تھی۔ زیر مطالعہ ایڈیشن مکتبۂ اردو لاہور کا طبع کردہ ایڈیشن ہے جس پر سال اشاعت ۱۹۴۴ درج ہے۔ ایڈیشن نمبر نہ ہے۔ پہلا حصہ ۲۸۴ صفحے تک ہے جس پر مختلف ہیئتوں میں ۶۷ نظمیں موجود ہیں۔ اس مجموعے کی خاص بات یہ ہے کہ ان کا شہرہ آفاق ''حسین اور انقلاب'' اس میں شامل ہے۔ سلام بہ حضور سرور کائناتؐ اور امام حسینؓ کی خدمت اقدس میں سلام'' بھی اس مجموعے کی زینت ہیں۔ ''خود پرست لیڈر''، روح تخریب کی آواز، باغی روحوں کا کورس، خلوتی اسرار کو اربابِ عقل کی دعوت اور ''الوہیت کا ارمان'' جیسی فکر انگیز نظمیں مشہور نظمیں ہیں۔ اس مجموعے میں جوش نے سیاست، مذہب، تہذیب، انسانی عظمت، حسن وعشق کو اپنا موضوع سخن بنایا ہے۔ مرثیہ کی سوگواریت کے ہمراہ حسن وعشق کی سرشاریت کا نشاطیہ طرز نمایاں ہے۔ تو اگر واپس نہ آتی، رندِ ہزار شیوہ، بارگاہ قدرت میں ایک اشتراکی رند کا مشورہ'' جیسی نظموں نے جوش کی رومانی وفکری شناخت متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ایک اور نظم ''دیدنی ہے آج'' مختصر ہونے کے باوجود قاری کے ذہن پر ایک اچھا تاثر چھوڑتی ہے۔ میراجی نے اسے اچھے سے اچھے ایک مختصر افسانے پر بھاری قرار دیا ہے۔(۶۸) اس مجموعے کے دوسرے حصے میں ۸۶ رباعیاں موجود ہیں۔ ترقی پسندانہ نظریات کے حوالے سے ان کی نظم ''مہاجن اور مفلس'' اور سیال عکس کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک نظم سردار روپ سنگھ کی وفات پر ''نقش دوام'' کے نام سے لکھی

بھونکتے ہیں میرے افکار پردہ خانہ خراب
خود کو علامہ و شاعر کا جو دیتے ہیں خطاب(۶۹)

روح ادب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۲ء میں لاہور سے مکتبۂ اردو کے زیر اہتمام طبع ہوا۔ اس میں پروفیسر رفیع الدین کا مقدمہ اور تصویریں موجود نہیں ہیں۔ جوش نے "باز گلبانگ پریشاں می زغم" کے عنوان سے دیباچہ تحریر کیا ہے۔

عرش و فرش ۱۹۴۴ء

یہ مجموعہ ۱۹۴۴ء میں کتب خانہ تاج آفس، محمد علی روڈ، ممبئی سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلے حصے میں صرف نظمیں شامل ہیں جن کی تعداد ۵۰ ہے۔ دوسرا حصہ ۱۰۷ رباعیات پر مشتمل ہے اور تیسرا حصہ "آوارہ خیالات" کے نام سے ہے جس میں مختلف حوالوں سے الگ الگ اشعار درج ہیں۔ اشعار کی تعداد ۱۰۵ ہے۔ صبح اور شاعر، آزردگی بے سبب، ہولناک تبدیلی، مظاہر فطرت پر اور واقعاتی نظمیں بھی اس مجموعے میں ملتی ہیں۔ ترقی پسندانہ خیالات کے زیر اثر "یہ امیروں کے مصاحب" اور "کارل مارکس" اہم نظمیں ہیں۔

جوش کے افکار کو مانے گی مستقبل کی روح
آج اگر رسوا یہ مرد مسلماں ہے تو کیا
یہ آب و رنگ سخن ہائے جوش ہے واللہ
کہ آج ہم سرِ شیراز ہے ملیح آباد(۷۰)

اس مجموعے کا دوسرا حصہ رباعیات ہے جس میں خاص موضوع عشق ہے۔

رامش و رنگ ۱۹۴۵

۱۹۴۵ میں قومی دارالاشاعت ممبئی سے شائع ہوا۔ یہ کتاب ۲۶۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ تقسیم موضوعات کے حوالے سے نہیں بلکہ اصناف کے حوالے سے ہے۔ پہلے حصے میں تین ہیئتوں یعنی غزل، مثنوی اور مسدس کو موضوعات کے بیان کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ پہلی دو نظموں سے جوش کی ترقی پسندی سامنے آتی ہے۔ اس حصے میں "خدا کی پہلی آواز" کے عنوان سے نظم ہے جو کہ جوش کی طویل ترین نظم "حرفِ آخر" کا ایک حصہ ہے۔ یہ ایک طویل حصہ ہے جو کہ ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ حاشیے میں نثر کی صورت میں مختلف مناظر کی تشریح بھی کی گئی ہے۔ دوسرا حصہ رباعیات پر مشتمل ہے۔ ۶۸ صفحات پر ۱۳۶ رباعیاں ہیں۔ ۷۰ صفحات پر کچھ نظمیں ہیں، آخری چالیس صفحات پر گیتوں کا انتخاب ہے جن میں سے بیشتر فلمی گیتوں کے طور پر مشہور ہو چکے ہیں۔

سجاد ظہیر نے "روشنائی" میں اس مجموعے کا تذکرہ یوں کیا ہے۔

> قومی دارالاشاعت ممبئی نے جوش ملیح آبادی کا نیا مجموعہ کلام رامش و رنگ شائع کیا جس میں ان کی بیشتر وہ نظمیں تھیں جو ان کے پونا اور ممبئی کے قیام کے دوران میں کہی گئی تھیں اور جن میں سے کئی "نیا ادب" میں چھپی تھیں اور ہمارے جلسوں میں بار بار پڑھی گئی تھیں۔(۷۱)

اس مجموعے میں جوش کی تاریخ وفات والی رباعی بھی ہے۔ عمر کے بڑھ جانے کا احساس جوش کے ہاں نمایاں ہے۔ جوش کا مشہور فلمی گیت نگری میری کب تک یونہی برباد رہے گی" بھی شامل ہے۔

حرفِ آخر کا ایک منظر "خدا کی پہلی آواز "
اے میری تخیل! بن جا کائناتِ ہست و بود

ہاں پہن اے جذبۂ ایجاد تشریفِ وجود
اے عدم اٹھ گامزن ہو شکلِ موجودات میں
اے میرے اجمال آ جا رنگِ تفصیلات میں(۷۲)

سنبل وسلاسل ۱۹۴۷ء

۱۹۴۷ء میں یہ مجموعہ کتب خانہ تاج آفس، ممبئی سے شائع ہوا، کل صفحات ۳۸۷ ہیں۔ اس کی تقسیم دو حصوں میں کی گئی ہے۔ پہلے حصے میں مختلف موضوعات پر ۲۰ نظمیں ہیں۔ دوسرے حصے میں رباعی ہے۔ جوش کی مشہور نظم "وقت کی آواز" بھی اسی مجموعے کی زینت ہے۔ اس نظم میں جوش نے پاکستان کے قیام کی حمایت کی تھی۔ یہ نظم مسدس صورت میں ہے اور 9 بندوں پر مشتمل ہے۔ کانگریس سے خطاب، لیگ سے خطاب اور کمیونسٹ سے خطاب اسی نظم کے حصے ہیں۔ "لیلائے آزادی"، "تثلیثی فریب"، "عارضی حکومت نے حلف وفاداری دی"، جوش کے سیاسی نظریات کی درست تفہیم کے لیے نہایت اہمیت کی حامل نظمیں ہیں۔ وقت کی آواز سجاد ظہیر کے مقدمے کے ساتھ ۱۹۴۷ میں علیحدہ چھپ چکی تھی اسے بھی جوش نے اس مجموعے میں شامل کرنا ضروری سمجھا۔ اس مجموعے میں رباعیوں کی کل تعداد ۳۸۰ ہے۔ جنہیں سات حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ انتساب "امیر فکر و تخیل نٹشے اعظم" کے نام ہے۔ جوش کے نظریہ حیات پر نظر ڈالیں تو یہ انتساب اہمیت کا حامل نظر آتا ہے۔(۷۳)

سیف وسبو(۱۹۴۷)

یہ مجموعہ ۱۹۴۷ء میں لاہور سے مکتبہ اردو کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ یہ جوش کی گذشتہ شاعری کا انتخاب ہے اور یہ انتخاب جوش نے خود کیا ہے۔ "انتخاب وانتقاد" کے نام سے تفصیلی دیباچہ جوش نے خود تحریر کیا ہے۔ اس دیباچے سے جوش کی انتقادی فکر کے زاویے قاری پر روشن ہوتے ہیں۔ جوش نے اس انتخاب میں جو معیار ملحوظ رکھا ہے اس کی وضاحت اس دیباچے میں اس طرح کی ہے

> "اب تک میری جتنی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ تقریباً ان سب کا انتخاب اس میں شائع کیا گیا ہے لیکن اس کا نہایت سختی سے اہتمام کیا گیا ہے کہ انتخاب نہایت ہی مختصر رہے۔ ظاہر ہے کہ اس انتہائی اختصار کی بنا پر سینکڑوں ایسی نظموں کو نظر انداز کر دینا پڑا ہے جو اس مجموعے کی نظموں کے بالکل مساوی اور ہم پلہ وہم وزن ہیں۔"(۷۴)

کل صفحات ۲۸۸ ہیں۔ اس مجموعے میں ۸۴ نظمیں، ۸ غزلیں، ۱۳۶ رباعیات اور ۱۹ قطعات کا انتخاب کیا گیا ہے۔ نظمیں آتش کدہ، افکار، رنگ وبو، مطالعۂ نظر، تاثرات، نگار خانہ، وارداتیں اور بادۂ سرجوش کے عنوانات کے تحت تقسیم کی گئی ہیں۔ انسان کا ترانہ، نیا میلاد، باغی انسان، بغاوت، بار گاہِ قدرت میں اشتراکی رند کا مشورہ، نظامِ نو، شکست زنداں کا خواب، فریب ہستی، بدلی کا چاند، کسان، سہاگن، بیوہ، گلبانگِ نو، یہ کون اٹھا ہے شرماتا، یار پری چہرہ اس مجموعے کی نمائندہ نظمیں ہیں۔

سرود وخروش(۱۹۵۲)

یہ مجموعہ دہلی سے شائع ہوا۔ ناشر منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لمیٹڈ ہیں۔ یہ مجموعہ ۳۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدائے فہرست سے پہلے ۵ رباعیاں ہیں اور مختلف موضوعات پر ۵۲ نظمیں اس میں شامل ہیں۔ مثنوی اور مسدس کی ہیئت کا استعمال زیادہ ہے۔ مشہور نظمیں "دریوزۂ کرم، سناٹے، رنگین رات کا پچھلا پہر، ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ، ترانۂ آزادئ وطن، استقلالِ میکدۂ نور ماتمِ آزادی" مشہور نظمیں ہیں۔ "ماتم آزادی" چوالیس بندوں پر مشتمل ہے۔ یہ آزادی سے ایک ماہ بیشتر لکھی گئی۔ ایک اور طویل نظم "پند نامہ" ہے جس میں جوش کی قادر الکلامی اور بھاری بھر کم الفاظ کا استعمال بھی واضح ہے۔ اس مجموعے میں فسادات کی ہولناکیوں سے مفادات کے تحفظ تک کا سارا منظر دکھائی دیتا ہے اور بے وطنی

کے احساس کا کرب جھلکتا ہے۔ ''برپاپوش قلندر'' نامی نظم میں اشتراکی خیالات کی نمائندگی اور لہجے کی تلخی عیاں ہے۔ ''نئے چہرے'' کرپس مشن کے قیام کے موقع پر لکھی گئی ہے۔ اس مجموعے سے جوش کی شاعری اور شخصیت کے ایسے زاویوں کی نشاندہی ہوتی ہے جہاں ان کے افکار و نظریات کی ایک نئی دنیا دکھائی دیتی ہے۔

خبر کیا تھی کہ جب خاک چمن پر رنگ برسے گا
لہو روئے گی چشمِ شاعرِ ہندوستاں پھر بھی(۷۵)

اس دور میں زندگی کے مختلف مسائل کے متعلق جوش کے اندازِ فکر میں تبدیلی پیدا ہو چکی تھی جو کہ اس مجموعے سے عیاں ہے۔ زندگی کی تاریکیاں آزادی کی فضاؤں میں چھائی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

ماہنامہ آج کل میں اس کے متعلق جوش کا بیان ہے کہ:

...''صرف عورت ہی نہیں زندگی کے بے شمار مسائل کے متعلق میری رائے میں اس قدر انقلاب آ چکا ہے کہ میں اب تقریباً دوسرا آدمی ہو چکا ہوں۔''(۷۶)

سموم وصبا۔ مئی ۱۹۵۵ء

یہ مجموعہ مئی ۱۹۵۵ء میں سلطان حسین اینڈ سنز کے زیرِ اہتمام بندر روڈ کراچی سے طبع ہوا۔ اس مجموعے کی تقسیم دو حصوں میں کی گئی ہے۔ اولین حصے میں ۲۶ نظمیں مختلف عنوان کے تحت ہیں جبکہ دوسرا حصہ رباعیات پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ جوش کے اس دور کی دین کی ہے جس میں جوش فکری و فنی پختگی حاصل کر چکے تھے۔ اس مجموعے کی نظمیں مختلف ہیئتوں میں لکھی گئی ہیں۔ سب سے اہم مثنوی اور غزل ہے۔ مذہبی اداروں کی مخالفت اور ان پر کھلی طنز جو ان کی نظموں کے خاص مضامین میں سے اہم ترین موضوع ہے۔ ان کی ترقی پسندانہ خیال کی نظمیں جشنِ استقلال اور دعوتِ انقلاب ہیں۔ اس مجموعے کا سنِ اشاعت اگرچہ ۱۹۵۵ء ہے لیکن نظموں پر درج سنین سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھی نظم ۱۹۵۰ء کے بعد کی نہیں ہے۔ زیادہ تر نظمیں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء کے دوران کہی گئی ہیں۔ ''بلکتی یادیں، کیا کروں، فریاد، وہی رفتار، برسی ہوئی آنکھیں، درمانِ درد انگیز، تین فریادیں، میرے بعد'' اس مجموعے کی خاص نظمیں ہیں۔

زندہ افکار کا پرتو نہ رہا ذہنوں پر
مردہ ہے انجمن دیدہ وراں میرے بعد
چاندنی تک ہے خرابات میں دھندلی دھندلی
یوں سیہ پوش ہیں رندانِ جہاں میرے بعد
(میرے بعد)

جوش کی یہ نظم پڑھ کر بے ساختہ غالب کی غزل کی یاد آتی ہے۔ یہاں جوش غالب کے مقلد کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر ہلال نقوی نے تاسف کا اظہار کیا ہے کہ بعض نقاد اپنے غیر معتدل رویے سے جوش کی شاعری کو صحیح پرکھ نہیں سکتے اور سموم وصبا کی ۲۳۸ رباعیوں پر رشید حسن خاں نے یہ رائے دی کہ ان میں دو چار کے علاوہ سب ناقابلِ ذکر ہیں۔(۷۷)

طلوعِ فکر ۱۹۵۷ء

پاکستان آنے کے بعد جوش کی یہ پہلی طویل نظم شائع ہوئی اس کے ناشر بھی جوش ہی ہیں۔ یہ نظم ۱۱۰ بندوں پر مشتمل ہے اور مسدس شکل میں حضرت علیؓ کی چودہ سو سالہ ولادت کی یادگار کے موقع پر لکھی گئی منقبت ہے۔ امروز کراچی نے اس مسدس پر تبصرہ یوں شائع کیا۔

..."جوش ملیح آبادی جو کراچی آکر خاموش ہو گئے تھے) کی پہلی طویل نظم منظر عام کا حصہ ہے۔ یہ لمبا چوڑا مسدس حضرت علیؓ کی مدح میں اس تقریب کے لیے لکھا گیا۔

شروع کے ۲۵،۳۰ بند میں صبح کا منظر کھینچا گیا ہے۔ جوش محاکات کے بادشاہ ہیں۔ کراچی میں رہ کر بھی جہاں کی صبح اور شام بڑی بے رونق اور روکھی ہوتی ہے۔ انہوں نے صبح کا جو منظر دکھایا ہے وہ آپ اپنی مثال ہے...

مدح طویل ہے اور جوش کے خاص رنگ میں ہے۔ یعنی الفاظ کی نشست، ترکیبوں کا دروبست، محاوروں کا استعمال اور روزمرہ کا صرف ہی قابل توجہ نہیں بلکہ نادر تشبیہات بھی ہیں اور بے مثل استعارے اور کنایے بھی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریا فرازِ کوہ سے شور مچاتا ہوا بہتا چلا جا رہا ہے۔"(۷۸)

موجد و مفکر ۱۹۶۰ء

جوش نے پاکستان میں یہ پہلا مرثیہ لکھا لیکن شائع ملیح آباد سے ہوا جسے اشفاق حسن خاں نے طبع کروایا۔ اس مرثیے کے ۱۱۶ بند ہیں۔

مسکرا کر جب ہوئی طالع تمدن کی سحر
جنگلوں سے، شہر کی جانب، مُڑی فکرِ بشر
رسمسائی، آرزوئے بام، چونکا ذوقِ در
کشتِ خاکِ تار سے اُگنے لگے شمس و قمر
خوشۂ حسنِ زمیں یوں ناز سے، پکنے لگا
داب کر دانتوں میں انگلی، آسمان تکنے لگا(۷۹)

قطرہؔ و قلزم ۱۹۶۳ء

۳۰۳ رباعیات پر مشتمل رباعیوں کا یہ مجموعہ دریا گنج دہلی سے ۱۹۶۳ء میں طبع ہوا۔ ابتدائیہ جوش نے خود لکھا ہے۔ جوش اپنی کتاب طبع کروانے سے پہلے کئی کئی مرتبہ نظر ثانی کیا کرتے تھے لیکن دیباچے میں انہوں نے اقرار کیا ہے کہ زندگی کی گوناگوں مصروفیات کی بنا پر وہ ان رباعیات پر نظر ثانی نہیں کر سکے۔ جوش لکھتے ہیں۔

"میری یہ غیر مطبوعہ تازہ رباعیاں جو اس پاکٹ ایڈیشن میں شائع ہو رہی ہیں میری زندگی کا تقریباً نچوڑ ہیں لیکن ادبی دیانت کے ساتھ یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ مشاغل و مکروہات کے زہرہ گداز ہجوم کی بنا پر میں اب تک ان پر نظر ثانی نہیں کر سکا ہوں۔(۸۰)

الہام و افکار ۱۹۶۶ء

یہ مجموعہ پہلی بار ۱۹۶۶ء میں جوش اکیڈمی کراچی سے شائع ہوا۔ زیر مطالعہ نسخہ میں تقسیم کار کے طور پر مکتبۂ ادب جدید لاہور درج ہے۔ اس مجموعے میں ۳۸ منظومات شامل ہیں۔ الہام و افکار میں موجود نظموں کے عنوان سے ہی جوش کی فکری و فنی پختگی کا کچھ سراغ مل جاتا ہے۔ مثلاً "بنام قوت و حیات، عروج انسانی، ایک مکالمہ، جنون و حکمت اور امواج تخیل" وغیرہ جوش کا رجائی لہجہ یہاں عیاں ہے۔ اقبال کے مکالماتی رنگ کی جن شعرا نے کامیاب تقلید کی، ان میں جوش شامل ہیں۔ جوش کی نظم ایک مکالمہ (باتیں بندہ و خدا) کو بطورِ مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کا خطابیہ انداز "قبل از وقت" نظم میں نظر آتا ہے۔ جوش نے بعض نظموں کے عنوانات کے ساتھ ساتھ ذیلی عنوان بھی درج کیے ہیں

اور کرداری تجسیم بھی کی ہے۔ ڈاکٹر وحید اختر پروفیسر فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اپنے مضمون "جوش اردو کا آخری کلاسیکی شاعر" میں لکھتے ہیں۔

"جوش کے ہاں الفاظ و اصوات باہم مدغم ہو کر ایک فضا پیدا کرتے ہیں۔ یہ تصویریں اکثر جگہ جامد و ساکت سہی۔ لیکن بہترین شاعری ہیں۔ وہ لفظوں ہی کے نہیں، آوازوں کے بھی مزاج شناس ہیں۔"(۸۱)

کل فرق پہ چترِ شبِ مہ گھوم رہا تھا
اب ذہن میں گہوارۂ آفاق ہے گرواں
اب مصحفِ خوباں کے عوض، بہتر تامل
زانو یہ ہے انجیل تو ہاتھوں پہ ہے قرآں(۸۲)

نجوم وجواہر ۱۹۶۷ء

جنوری ۱۹۶۷ء میں جوش ملیح آبادی کی رباعیات پر مشتمل مجموعہ نجوم و جواہر کے نام سے شائع ہوا۔ اس کی اشاعت جوش اکیڈمی کراچی کے زیر اہتمام ہوئی۔ یہ مجموعہ ۳۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی تقسیم گیارہ حصوں میں کی گئی ہے اور ہر حصے کا علیحدہ عنوان درج ہے۔ اس مجموعے میں رباعیوں کی تعداد ۶۲۰ ہے۔ جوش نے اس مجموعے کو گیارہ حصوں کو گیارہ غرفے قرار دیا ہے جو یوں ہیں۔ اندیشہ و ادراک، وقت، فنکار، دہقان و تہذیب، جمالیات، طلوعِ صبح، غروب جمال، جلوسِ غم، نوبہ نو، نالۂ تشنگی اور کربِ سوال وغیرہ۔ ایک جگہ جوش اس طرح رقمطراز ہیں:

"جوانی کے تلخ و شیریں عشق پر تو ہزاروں دیوان موجود ہیں لیکن وقت گزیدہ عشق پر غالباً اب تک کسی شاعر نے قلم نہیں اٹھایا ہے۔ شاید میں پہل کر رہا ہوں۔"(۸۳)

ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے "نجوم و جواہر، الہام و افکار اور محراب و مضراب" کو جوش کے ایسے مجموعے قرار دیا ہے جو جوش کو اہم شاعر کی حیثیت سے زندہ رکھنے کو کافی ہیں۔"(۸۴)

اس مجموعے میں جوش کی فنی، فکری اور لسانی پختگی عروج پر ہے، مصطفیٰ زیدی نے ان رباعیوں پر یوں اظہار خیال کیا ہے:

"چار مصرعوں کی بوتل میں زندگی کے اجنبی پن کو بند کرنے کی جو سلیمانی قوت جوش صاحب کے حصے میں آئی وہ دنیا بھر کے شعر و ادب میں کسی کو نصیب نہ ہو سکی۔ جمالیات کی اوٹ میں ہار سنگھار اور تصوف کے پردے میں وصل و شراب کے مضامین باندھنے والوں کو خار و خزف کے سامنے حکمت و دانش کا یہ مجموعہ "نجوم و جواہر" ایک نیا معیار اور نئی علامتیں پیش کرتا ہے۔(۸۵)

جوش ملیح آبادی کے مرثیے ۱۹۸۰ء

یہ مجموعہ ضمیر اختر نقوی نے ترتیب دیا۔ مرتب نے "آوازۂ حق، حسین اور انقلاب، موجد و مفکر، وحدتِ انسانی، طلوعِ فکر، عظمتِ انساں، موت محمد و آلِ محمد کی نظر میں، پانی اور آگ کو اس مجموعے میں شامل کیا ہے۔ مرتب نے پروف خوانی میں زیادہ تردّد نہیں کیا جس کی وجہ سے صحت الفاظ اور مصرع کے غیر موزوں یا خارج از بحر ہو جانے کی پرواد کھائی نہیں دیتی۔ "پانی" نامی مرثیہ جوش کی آواز میں ریکارڈ تھا اس کو کاغذ سے منتقل کرتے ہوئے جوش سے یا احباب جوش سے رجوع نہیں کیا گیا۔ اس لیے یہ کتاب اغلاط سے پاک نہیں ہے۔ ادارہ فیض ادب کراچی

سے یہ کتاب شائع کی گئی۔ انیسویں صدی میں انیس و دبیر نے مرثیہ کی صنف کو بامِ عروج تک پہنچایا۔ مرثیہ نگاروں نے ایک عرصے تک انیس و دبیر اور روایتی مرثیے کی پیروی کی مگر جوش نے ۱۹۱۸میں ''آوازۂ حق'' کے نام سے مرثیہ لکھ کر اس حصار سے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ اس مرثیہ کے کل ۹۲ بند ہیں۔ جوش کے ہاں مرثیوں کے عنوان کا التزام ملتا ہے۔ پہلے ۲۸ بند مناظر فطرت اور توحید و تصوف پر ہیں۔

دوسرا مرثیہ حسین اور انقلاب ۱۹۴۱ء میں تصنیف ہوا۔ اس کے کل ۶۸ بند ہیں۔ پہلے یہ علیحدہ صورت میں اور پھر آیات و نغمات میں طبع ہوا۔ اس کا چہرہ ۱۹ بند پر مشتمل ہے۔ جوش کا تیسرا مرثیہ ''موجد و مفکر'' ۱۹۵۶ء میں تحریر کیا گیا۔ اس کے کل بند ۱۵۵ ہیں۔ چوتھا مرثیہ ''وحدتِ انسانی'' کے عنوان سے ہے۔ اس کے بند ۷۶ ہیں اس کے سال تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔ ۱۹۵۷ء میں جشن مرتضوی کے موقع پر منقبت تحریر کی اور اس کو چھپوا کر مجمعِ عام میں تقسیم کیا گیا۔ اس کا عنوان ''طلوع فکر'' ہے۔ اس میں حضرت علیؓ کی پیدائش سے متعلق بیان قلمبند ہے۔ اس کے آخر میں کربلا اور شہدائے کربلا کا تذکرہ ہے اس لیے اس کو مرتب نے مرثیوں کے ضمن میں شامل کیا ہے۔ ڈاکٹر ہلال نقوی نے مرتب کے اس عمل پر اپنی ''کتاب جوش ملیح آبادی شخصیت اور فن'' میں اعتراض کیا ہے کہ اگر اس کو شامل کیا گیا ہے تو پھر ''ذاکر سے خطاب'' اور ''سوگواران حسنؓ سے خطاب'' کو بھی مختصر مرثیہ کی ذیل میں رکھنا چاہیے۔(۸۶)

''عظمتِ انسان'' جوش کا چھٹا مرثیہ ہے اس میں ۸۸ بند ہیں۔ سالِ تصنیف درج نہیں ہے۔ ۱۹۶۵ء میں مرثیہ ''زندگی و موت محمدؐ اور آلِ محمدؐ کی نظر میں'' تحریر کیا گیا۔ جوش کا آٹھواں مرثیہ ''پانی'' ہے۔ سالِ تصنیف ۱۹۷۱ء ہے۔ جوش کے نویں اور آخری مرثیے کا عنوان ''آگ'' ہے۔ اس کے صرف ۱۳ بند لکھے گئے ہیں اور یہ نامکمل حالت میں ہے اس کا سال تصنیف ۱۹۵۹ء ہے۔ مرتب نے نامکمل ہونے کی وجہ سے اُس کو آخر میں رکھا ہے۔ جوش کا یہ مرثیہ ایک عرصہ تک گوشۂ گمنامی میں رہا۔

تمام مراثی میں مسدس کی ہیئت اختیار کی گئی ہے۔ جوش کے ہاں مرثیہ فلسفیانہ اور مفکرانہ حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ جوش مرثیوں کی نمایاں خوبی اختصار ہے اور جوش کے صرف دو مرثیوں کے بند ۱۰۰ سے زائد ہیں۔ جوش کے ہاں حضرت امام حسینؓ کے بارے میں زیادہ مراثی موجود ہیں۔ جوش ملیح آبادی نے اپنے ایک خط کے ذریعے سے ضمیر اختر نقوی کو یہ مجموعہ شائع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی اور یہ خط ۱۳ اپریل ۱۹۷۸ کا مرقوم ہے۔

محراب و مضراب ۱۹۹۳ء

جوش میموریل سوسائٹی کی طرف سے جنگ پبلشرز کے زیر اہتمام فروری ۱۹۹۳ میں جوش کا غیر مطبوعہ کلام محراب و مضراب کے نام سے طبع کیا گیا۔ اس مجموعے میں جوش کا ۱۹۵۵ سے ۱۹۷۱ تک کا کلام موجود ہے۔ اس مجموعے کے آٹھ ابواب ہیں صفحات کی کل تعداد ۷۰۳ ہے۔ ابتداء میں ''پیش لفظ'' جوش کی نواسی اور جوش میموریل سوسائٹی کی صدر تبسم اخلاق کا تحریر کردہ ہے۔ اس میں انہوں نے علی احمد تالپور صاحب کا شکریہ ادا کیا ہے جنہوں نے بزم روح ادب کی سرپرستی کی ان کے انتقال کے بعد مولانا کوثر نیازی نے اُس بزم کی سرپرستی کی اور پھر علیحدہ ہو گئے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ جوش کی دوسری غیر مطبوعہ کتاب ''محمل و جرس'' کے علاوہ غیر مطبوعہ رباعیات اور مرثیے بھی چھاپے جائیں گے۔(۸۷)

جوش کے بیٹے سجاد حیدر فروش کا ایک خط ہے جس میں انہوں نے جوش کی غیر مطبوعہ کتب کی اشاعتکی ذمہ داری تبسم اخلاق کے سپرد کی ہے۔ جوش کے اس کتاب کے ابواب کو غرفوں کے عنوان سے تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے غرفوں کی تعداد ہشتم ہے لیکن تبسم اخلاق نے

پیش لفظ میں کتاب کے ابواب کی تعداد سات بتائی ہے۔(۸۸) سجاد حیدر خروش نے الفاظ کے چناؤ کے لیے جوش کے محل استعمال پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک رباعی تحریر کی ہے جو درج ذیل ہے۔

لیلائے سخن کو آنکھ بھر کر دیکھو
قاموس و لغات سے گزر کر دیکھو
الفاظ کے سر پر نہیں اڑتے معنی
الفاظ کے سینے میں اتر کر دیکھو

زیر نظر مجموعہ کتابی دنیا، ترکمان گیٹ، دہلی ۶ سے ۲۰۰۴ میں طبع ہوا۔(۸۹)

غرفہ اول صفحہ نمبر ۱۳ تا صفحہ نمبر ۱۲۴۔ کل ۲۸ نظمیں ہیں۔ غرفہ دوم میں کل گیارہ نظمیں ہیں، غرفہ سوم صفحہ نمبر ۱۸۹ تا ۳۰۸ ہے، اس میں کل اٹھارہ نظمیں ہیں۔ غرفہ چہارم صفحہ نمبر ۳۰۹ تا ۳۴۲ پر محیط ہے۔ اس میں چار نظمیں ہیں، غرفہ پنجم کو ''باہنگِ غزل'' کا نام دیا گیا ہے اس میں ۵۸ غزلیات موجود ہیں۔ غرفہ ششم ۴۷۵ تا ۴۹۴ صفحات پھیلا ہوا ہے اس حصے میں تین نظمیں ہیں۔ غرفہ ہفتم صفحہ نمبر ۴۹۵ء تا ۶۱۸ صفحات پر محیط ہے۔ اس حصے میں ۳۱ نظمیں ۴۶ رباعیاں موجود ہیں۔ رباعیاں ''فتنۂ آخر الزماں'' کی شان میں کہی گئی ہیں۔ غرفہ ہشتم کو ''رباعیات گوناگوں'' کا عنوان دیا گیا ہے۔

صابر کے موتی

ڈاکٹر ہلال نقوی نے صابر تھاریانی کی گجراتی شاعری اور جوش کی منظوم ترجمہ نگاری کو ''صابر کے موتی'' کے عنوان سے مرتب کیا۔ ۱۲۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۰ صفحات پر ڈاکٹر ہلال نقوی نے مقدمہ تحریر کیا ہے۔ یہ کراچی، الفاظ فاؤنڈیشن، ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔

شعری انتخاب

جوش کی وفات کے بعد کلام جوش کے جو انتخاب شائع ہوئے وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ **انتخابِ کلام جوش: ۱۹۸۳ء**

عصمت ملیح آبادی کا مرتب کردہ انتخاب کلامِ جوش
اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ سے ۱۹۸۳ء میں طبع ہوا۔

۲۔ **عروسِ ادب (جلد اول) ۱۹۸۳ء**

عین الحق نے بزم جوش کراچی کے زیر اہتمام جوش کی شاعری کا انتخاب شائع کیا۔

۳۔ **عروسِ ادب (جلد دوم) ۱۹۸۴ء**

عین الحق نے بزم جوش کراچی سے جوش کی شاعری سے انتخاب کی دوسری جلد ۱۹۸۴ میں شائع کی۔

۴۔ **انتخابِ کلام جوش س ن**

نریش کمار شاد نے جوش کی شاعری کا ایک انتخاب، انتخابِ کلامِ جوش کے عنوان سے دہلی سے مکتبہ اردو پاکٹ سے طبع کیا۔

۵۔ **انتخابِ کلیاتِ جوش ۱۹۸۹ء**

جوش کی شاعری کے انتخاب کا کلیات ڈاکٹر فضل امام نے مکتبہ جدید، دہلی سے طبع کرایا۔

۶۔ عرفانیات جوش ۱۹۹۲ء

ڈاکٹر ہلال نقوی نے احیاء ثمراتِ اسلامی، کراچی سے "عرفانیاتِ جوش" کے نام سے جوش کی شاعری کا انتخاب طبع کیا۔

جوش ملیح آبادی کا غیر مطبوعہ کلام

حرفِ آخر طویل نظم (غیر مطبوعہ)

یہ نظم اپنے فکری رجحان، عصری موضوعات، عقلی استدلال اور ارتقائے انسانی کی ازلی صداقت کی عکاس ہے۔ یہ نہ صرف اپنی طوالت بلکہ اپنی امتیازی خصوصیات کی وجہ سے اردو شاعری کے لیے حرف آخر ثابت ہو گی۔ جوش نے اس نظم کے بارے میں کہا ہے کہ انہوں نے عہد بہ عہد انسانی شعور کے ارتقاء کا ایک عقلی اور سائنسی تجزیہ اس نظم میں پیش کیا ہے۔ اس نظم کے کچھ حصے جوش کی مختلف شعری کتب اور ادبی رسائل میں طبع ہوئے مگر ۱۹۴۰ء سے شروع ہونے والی نظم وفاتِ جوش تک مکمل نہ ہو سکی۔ کبھی کہا گیا کہ پانچ چھ ہزار اشعار پر مشتمل ہو گی۔(۹۰) جوش نے اس نظم کے لیے ادیانِ عالم اور تاریخِ کائنات کے مطالعہ کے لیے مذہب، فلسفہ اور سائنسی کتب سے مدد لی اور تخلیقِ کائنات، خدا کی پہلی آواز، ارادۂ تخلیقِ انساں، معترض فرشتوں کے باغی لہجوں کی منازل طے کرتی ہوئی یہ نظم آگے بڑھتی رہی لیکن ارتقائے انسانی کو قدم بہ قدم بیان کرنے سے قاصر رہی۔ علی سردار جعفری اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" میں اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"علمی سنجیدگی، فلسفیانہ وقار، تشبیہوں اور استعاروں کی رنگینی اور ندرت، پر شکوہ ترنم اور پر عظمت روانی، معنی آفرینی اور خیال آرائی کا امتزاج یہ وہ معجزہ ہے جو اردو شاعری اس سے پہلے پیش نہیں کر سکی۔"(۹۱)

بہادرو وہ خم ہوئیں بلندیاں بڑھے چلو، بڑھے چلو
پئے سلام جھک چلا وہ آسماں بڑھے چلو، بڑھے چلو
فلک کے اٹھ کھرے ہوئے وہ پاسباں بڑھے چلو، بڑھے چلو
یہ ماہ ہے، وہ مہر ہے، یہ کہکشاں بڑھے چلو
لیے ہوئے زمین کو کشاں کشاں بڑھے چلو(۹۲)

"حرفِ آخر نظم" کے ایک حصے ارتقاء کا اعلان میں جوش چاہتے ہیں کہ آج کا انسان اس حصے میں دیئے گئے پیغام کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لے۔

محمل و جرس

جوش کا آخری غیر مطبوعہ مجموعہ کلام ہے۔ جب محراب و مضراب طبع ہوئی تبسم اخلاق نے پیش لفظ میں اعلان کیا تھا کہ

حضرت جوش کا یہ مجموعہ کلام "محراب و مضراب" ۱۹۵۵ سے ۱۹۷۱ء تک کے کلام پر مبنی ہے۔ اس کے سات ابواب ہیں اور یہ تقریباً ۷۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اب اس کے بعد ارادہ ہے کہ ان کی دوسری غیر مطبوعہ کتاب "محمل و جرس" کے علاوہ غیر مطبوعہ رباعیات اور مرثیے بھی چھاپے جائیں۔(۹۳)

جوش چاہتے تھے کہ ان کا یہ مجموعہ بھی زیور طبع سے آراستہ ہو اور اس سلسلے میں وہ اپنے دوستوں سے مشورہ بھی کیا کرتے تھے۔ جب ان پر کوئی دھن سوار ہوتی تھی تو خواب میں بھی اس کی تکمیل کے منصوبے زیر غور رہتے تھے۔ اپنے دوست خورشید علی خاں کے نام خط میں اس کا ذکر کیا کہ آج خلاف معمول بیدار ہوا اور جلد سو گیا دماغ سوتے میں تمام رات باتیں کرتا رہا اور میرے آخری مجموعہ کلام کا دیباچہ لکھتا رہا۔(۹۴)

ایاغ وچراغ غیر مطبوعہ رباعیات کا مجموعہ

کراچی کے ایک مشاعرے میں جو کہ ریڈ کراس کے زیر انتظام منعقد ہوا تھا۔ جوش کی رباعیوں کا ایک مجموعہ چوری ہو گیا تھا۔ انہوں نے قطرۂ و قلزم اور یادوں کی برات میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ جوش ان رباعیوں پر نظر ثانی کر چکے تھے اور یہ صاف شدہ رباعیاں تھیں جو چُرائی گئیں۔ جوش چور سے آگاہ تھے لیکن انہوں نے نام نہیں بتایا۔ اس کا سراغ ابھی تک نہیں مل سکا۔

شوکتِ عثمانی غیر مطبوعہ

جوش شاہنامہ کی طرز پر تاریخ دکن منظوم صورت میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ اس کا غیر مطبوعہ نسخہ مائل ملیح آبادی کے پاس ہے جو اسے زیور طبع سے آراستہ کرنا چاہتے ہیں۔(۹۵)

جوش کی ایک نظم جو کہ امیر خسرو پر کہی گئی اس کا عنوان ہے ''موت کا احسان'' فراست رضوی سے دستیاب ہوئی اور قومی زبان نے اسے طبع کیا۔ ۲۰۰۳ء میں۔

جوش کا بہت سا کلام اور دیگر تحریریں ملیح آباد، لکھنؤ، دکن، دہلی، کراچی اور اسلام میں موجود ہیں جو کہ دوستوں، جوش پرستوں اور جوش کے رشتہ داروں کے ہاں موجود ہیں لیکن کس کے پاس ادبی سرمائے میں سے کیا کیا موجود ہے۔ واللہ عالم۔ کیونکہ جوش بہت زود گو تھے طبیعت زور پر ہوتی تھی تو تواتر سے شعر کہتے چلے جاتے تھے۔ دوستوں میں سے کوئی لکھ لیتا یا خود بیاض میں لکھ لیتے تو خیر وگرنہ بہت سا کلام ضائع ہو گیا۔ فی البدیہہ شعر کہنے میں انہیں ملکہ حاصل تھا۔

جوش کے مرثیے ''آگ'' کے بارے میں کافی عرصے تک کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ کدھر ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ عیش ٹونکی کے پاس ہے۔

آگ گوہر کی تجلی، آگ، جوہر کی چمک
آگ، پریت کا دھندلکا، آگ، برکھا کی دھنک
آگ، راگوں کا تموّج، آگ، رنگوں کی ہمک
دل کی دھڑکن، سانس کی رفتار، نبضوں کی دھمک
انگروں میں جاگتی، ذرات میں سوتی ہوئی
رات کو اندھے فلک پر انکھڑیاں بوتی ہوئی(۹۶)

جوش ملیح آبادی کی نثری تصانیف

چونکہ ہمارا موضوع جوش کی نثری تخلیقات سے متعلق ہے اس لیے ہم یہاں مختصر سا تعارفی خاکہ پیش کریں گے۔ تفصیلی جائزہ مختلف اصناف میں تقسیم کے تحت لیا گیا ہے۔

ا۔ روحِ ادب ۱۹۲۰ء

جوش کی یہ کتاب نظم و نثر پر مشتمل ہے اس کتاب کا آغاز نثری حصے سے کرنا اس بات کا غماز ہے کہ جوش نظم کا شاعر ہونے کے باوجود نثر کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ جوش کی یہ کتاب میتھیوڈیسٹ پریس لکھنؤ سے ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی۔ پروفیسر رفیع احمد خاں کے مقدمے کے علاوہ اکبر الٰہ آبادی اور شرر لکھنوی کی رائے بھی درج ہے۔ صفحات کی تعداد ۱۵۳ ہے۔ اس میں سترہ تصاویر بھی دی گئی ہیں۔

۲۔ مقالاتِ زرّیں ۱۹۲۱ء

یہ مجموعہ جوش کے ۲۶۴ اقوال پر مشتمل ہے۔ یہ نایاب ہے صرف اس کا ایک نسخہ سید علی کرار نقوی کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے۔ یہ پاکٹ سائز ایڈیشن میں طبع ہوا۔ رسالہ کلیم میں یہ مقالات چیدہ چیدہ طبع ہوئے۔ چند مقالات درج ذیل ہیں۔

ا۔ تمول بے اطمینانی کا جاسوس ہے ۲۔ دل قدرت کا بہترین لطیفہ ہے ۳۔ شاعری عظمتوں کا ایک لبریز خزانہ ہے۔ ۴۔ حرص کے پہیّے نے گھوم کر ایک عالم کو گھما دیا۔ ۵۔ خوبصورت چہرے خوش تقریری اور موسیقی کے مدرسے ہیں۔ ۶۔ خوشی کے لمحے پردار اور غم کی گھڑیاں لنگڑی ہوتی ہیں۔ ۷۔ حقیقی عظمت وہیں ہے جہاں حقیقی سچائی ہے۔ ۸۔ موت پیدائش کی تکمیل ہے۔ ۹۔ ضمیر، اخلاق وعادات کی نبض ہوتی ہے۔ ۱۰۔ خود کشی، بزدلی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ ۱۱۔ زندگی حیرتوں کا ایک سلسلہ ہے۔ ''ماخوذ مقالات زریں''

(کلیم جولائی 83 ص ۲۸)

۳۔ اوراق سحر ۱۹۲۱ء

یہ جوش کے وہ چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں جو انہوں نے صبح کاذب کے وقت لکھے ہیں ان اوراق میں صبح سویرے بیدار ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔ یہ کتاب بھی نایاب ہے۔

۴۔ اشارات ۱۹۴۲ء

نگارستان ایجنسی اردو بازار دہلی سے یہ مجموعہ دہلی سے طبع ہوا۔ اس میں جوش کے وہ تمام اداریے اور مضامین شامل ہیں جو کلیم (ماہنامہ) کے چار سالہ دور میں شائع ہوئے۔

۵۔ یادوں کی برات ۱۹۷۰ء

یادوں کی برات پہلی بار ۱۹۷۰ء میں جوش اکیڈمی کراچی سے طبع ہوئی۔ ابتدائی طور پر اس کی کچھ کتابیں طبع ہوئی تھیں کہ جوش نے کچھ ردوبدل کے بعد اس سوانح عمری کو باقاعدہ طبع کروایا۔ باقاعدہ طباعت میں اس کا سن اشاعت ۱۹۷۱ء ہے۔ اس کتاب پر بحث سوانح نگاری کے حوالے سے مفصل طور پر ہوگی۔

۶۔ نقدِ اخلاص ۱۹۷۶ء

سنگ میل پبلی کیشنز سے یہ کتاب طبع ہوئی۔ یہ کتاب میر عترت حسین کے نام جوش کے خطوط پر مشتمل ہے جسے ڈاکٹر صفدر حسین ملک نے مرتب کیا ہے۔ پچاس خطوط کا یہ مجموعہ ۱۹۵۷ء تا ۱۹۷۴ء تحریر کیے گئے ہیں۔

۷۔ مقالاتِ جوش ۱۹۸۲ء

پروفیسر سحر انصاری نے یہ مقالات اردو محل پبلشرز کراچی کے زیر اہتمام شائع کی۔ سحر انصاری نے جوش کے اکثر مقالات کو کتابی صورت میں مرتب کیا۔

۸۔ مکالماتِ جوش وراغب ۱۹۸۸ء

راغب مراد آبادی نے جوش اور اپنے درمیان وقتاً فوقتاً ہونے والی گفتگو کو مکالماتِ جوش و راغب کے نام سے مرتب کر کے جوش لٹریری سوسائٹی کیلگری، کینیڈا سے شائع کیا۔

۹۔ جوش بنام ساغر ۱۹۹۱ء

خلیق انجم نے ساغر نظامی کے نام جوش کے خطوط کو ۱۹۹۱ء میں مرتب کر کے مونو مینٹل پبلشر دہلی کے زیر اہتمام طبع کیا۔

۱۰۔ جوش ملیح آبادی کی نادر و غیر مطبوعہ تحریریں ۱۹۹۲ء

ڈاکٹر ہلال نقوی نے جوش کی نادر اور غیر مطبوعہ تحریروں کو یکجا کر کے کتابی شکل میں حیات اکیڈمی کراچی سے طبع کرایا۔ ان تحریروں میں جوش کے خطوط، مقالات، تعزیت نامے، خاکے اور پیش لفظ شامل ہیں جو مختلف جگہوں پر رسائل و اخبارات میں طبع ہوئے۔

۱۱۔ خطوط جوش ملیح آبادی ۱۹۹۳ء

راغب مراد آبادی نے جوش ملیح آبادی کے خطوط کو مرتب کر کے ویلکم بک پورٹ، کراچی کے زیر اہتمام ۱۹۹۳ء میں طبع کیا۔

۱۲۔ جوش ملیح آبادی کے خطوط ۱۹۹۸ء

خلیق انجم نے خطوط کا یہ مجموعہ ۱۹۹۸ء میں مرتب کر کے انجمن ترقی اردو ہند سے طبع کرایا۔

۱۳۔ اشاراتِ جوش ۲۰۰۱ء (دوسرا ایڈیشن)

ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے جوش کی کتاب اشارات کا دوسرا ایڈیشن ادارہ نیا سفر، الہ آباد سے طبع کرایا۔

۱۴۔ اوراقِ جوش ۲۰۱۰ء

ڈاکٹر ہلال نقوی نے اس کتاب میں جوش کی نادر غیر مطبوعہ تحریریں اظہار سنز لمیٹڈ، کراچی سے طبع کرائیں۔

۱۵۔ یادوں کی برات کا قلمی نسخہ ۲۰۱۳

ڈاکٹر ہلال نقوی نے یادوں کی برات کے گمشدہ قلمی نسخے کی اشاعت بک کارنر جہلم سے ۲۰۱۳ء میں کرائی۔ اس کا کچھ حصہ جوش کی نواسی صبوحی خاتون سے اور کچھ حصہ رفیق احمد نقش سے ڈاکٹر ہلال نقوی کو دستیاب ہوا۔

جوش اور اس کا عہد

۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے نتائج سے بیسویں صدی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں کو جب برصغیر پاک وہند میں قدم جمانے کا موقعہ ملا تو انہوں نے اس بغاوت سے اندازہ لگالیا کہ جب تک مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک دوسرے کے خلاف نہیں کیا جائے گا یعنی ان میں نفاق پیدا نہیں ہو گا اس وقت تک ہندوستان میں نو آبادیاتی نظام کو مضبوطی سے قائم رکھنے کے لیے جو بھی سیاسی و انتظامی قدم اٹھایا جائے گا خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہیں ہو گا۔ ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء میں اے او ہیومن کی سر کردگی میں آل انڈیا کانگریس کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد ہندوستانیوں کے بڑھتے ہوئے سیاسی شعور کو محفوظ اور دستوری راہ عمل دینے اور عوامی بغاوت کو روکنا قرار دیا گیا لیکن جلد ہی یہ واضح ہو گیا کہ کانگریس کے پیش نظر صرف انگریزوں اور ہندوؤں کا مفاد ہے۔ مسلمان آہستہ آہستہ اس جماعت سے الگ ہونے لگے۔

ایسے وقت میں سر سید احمد خاں مسلمانوں کے ہمدرد اور بہی خواہ کے روپ میں چند نظریات لے کر ابھرے تھے۔ انہوں نے افادی ادب کا نعرہ لگایا اور ادب کو اصلاح قوم کے لیے استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ ادب میں چند نئی اصناف کو متعارف کروایا۔ سر سید احمد خان نے انگریزی تعلیم اور تہذیب کے سامنے بند باندھنے کی بجائے اس کے ساتھ چلنے کا مشورہ دیا۔ اس تحریک کے حوالے سے شعر و شاعری کے مروج نظریات کے خلاف باقاعدہ رد عمل کی صورت میں ''مقدمہ شعر و شاعری'' سامنے آیا۔ اس میں کسی رومانی کی آرزومندی اور جذباتیت کی بجائے سماجی پس منظر کو پیش کیا گیا ہے۔ حالی کا نقطہ نظر بغاوت نہیں بلکہ اصلاح ہے۔ سر سید تحریک نے فلسفہ اور سائنس سے استفادے کا اجتماعی راستہ پیدا کیا اور حقیقت نگاری کو متعارف کروایا۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو ہندو اکثریت اور مسلم اکثریت کی بنیاد پر بنگال کو تقسیم کر دیا گیا جس کا رد عمل ملکی سطح پر ظاہر ہوا۔ اسی دوران سودیشی تحریک کا نظریہ اور سوراج حاصل کرنے کا تصور پیش ہوا جسے حکومت نے رد کر دیا۔ دسمبر ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا ابتدا میں اس میں بھی اعلیٰ طبقے کے مسلمان اور زمیندار شریک ہوئے لیکن بعد میں اس میں ہر طبقے سے مسلمان شامل ہونے لگے۔ جون ۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی۔ جرمنی اور اٹلی عالمی سطح پر برطانیہ اور فرانس کے بعد غالب قوتیں بن کر ابھر رہے تھے۔ دنیا کی بڑی طاقتیں اپنی نو آبادیات پر قابض رہنے کے لیے ایک دوسرے سے جنگ کر رہی تھیں۔ برطانیہ کی حمایت کے لیے ہندوستان سے کانگریس کے اعتدال پسند اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسی دوران یہ نعرہ بلند ہوا کہ ''حکومتِ خود اختیاری میرا پیدائشی حق ہے'' جس کا اس دور کے ادب پر اثر دکھائی دینے لگا۔ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ معاہدہ ہوا جس کے تحت جداگانہ انتخاب کا حق تسلیم کر لیا گیا۔ انگریزی حکومت نے ہندوستان کو جنگ کا صلہ دینے کے لیے ۱۹۱۹ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نافذ کیا۔ جنگ کے بعد کسانوں، مزدوروں اور عام آدمیوں کی حالت خراب ہو گئی۔ حکومت نے نئے نئے ٹیکس لگا کر لوگوں کا جینا دوبھر کر دیا۔ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۴ء تک مسلم لیگ اور کانگریس میں تعلقات خوشگوار رہے لیکن تحریک خلافت کے دوران ہی سے لوگ الگ الگ دھڑوں میں بٹ گئے کیونکہ گاندھی نے عدم تعاون اور ترکِ موالات کی تحریک کو یکدم روک دیا تھا۔ اسی دوران ۱۹۲۰ء میں ٹریڈ یونین کانگریس قائم ہوئی تھی اور ۱۹۲۱ء میں کانگریس کے احمد آباد اجلاس میں مولانا حسرت موہانی نے مکمل آزادی کی قرارداد پیش کی تھی جو گاندھی جی کی مخالفت کی وجہ سے پاس نہ ہو سکی۔ اس اجلاس میں جوش ملیح آبادی نے بھی شرکت کی تھی اس اجلاس میں یہ طے پایا تھا کہ جب تک گورنمنٹ پنجاب میں مظالم اور زیادتی کی تلافی نہ کرے اور سوراج کا قیام عمل میں نہ آئے اس وقت تک شدت کے ساتھ پُرامن ترکِ موالات کی تحریک جاری رہے گی۔ ۱۹۲۸ء میں عوام نے سائمن کمیشن کے خلاف مظاہرہ کیا۔ اسی سال ۲۶ پارٹیوں کے اجلاس میں موتی لال نہرو کی قیادت میں ایک سب کمیٹی کو ہندوستان کے لیے ایک متفقہ دستور بنانے کا کام سونپا گیا۔ اس کمیٹی کی رپورٹ میں (جسے نہرو رپورٹ کہا گیا) ہندوستان کے لیے

ڈومینین کا مطالبہ کیا گیا۔ نہرو رپورٹ کے کچھ حصوں پر مسلم لیگ کو اعتراض تھا۔ اس لیے ۱۴ نکاتی تجویز پیش کی گئی تھی۔ قائداعظم محمد علی جناح کی طرف سے، جسے رد کر دیا گیا یوں ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں ناکام ہو گئیں اور مسلم لیگ نے مسلمانوں کے لیے الگ ملک بنانے کا مطالبہ کر دیا۔ ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس منعقد کی گئی۔ اسی سال علامہ اقبال نے خطبہ الہ آباد میں آزاد وطن کے قیام کا مطالبہ کر دیا۔ دوسری اور تیسری گول میز کانفرنس سے بھی کوئی خاص نتائج بر آمد نہ ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت ہندوستانی، وفاقی اور صوبائی خود مختاری کی بنیاد پر نئی حکومتیں قائم ہوئیں۔ ستمبر ۱۹۳۷ء میں دوسری عالمگیر جنگ شروع ہو گئی۔ ۱۹۳۹ء میں ہندوستانی فوج کو مصر اور سنگاپور میں جنگ لڑنے بھیج دیا گیا جس کے احتجاج میں صوبائی حکومتوں نے استعفے دے دیا۔ ممبئی میں نوے ہزار مزدوروں نے ہڑتال کی اور فوج کے ساتھ اظہار یکجہتی کیا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ میں لاہور میں قراردادِ پاکستان منظور ہوئی۔ ۱۹۴۵ میں کیبنٹ مشن ہندوستان آیا اور اہم سیاسی جماعتوں کو حکومت بنانے کی دعوت دی لیکن مسلم لیگ نے تجویز نامنظور کر دی اور کانگریس نے ذمہ داری قبول کر کے ۱۹۴۶ء میں جواہر لال نہرو کی رہنمائی میں حکومت تشکیل دی۔ ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو محمد علی جناح نے صاف لفظوں میں کہا ''آج ہم جملہ آئینی طریقوں کو خیر باد کہتے ہیں۔ ''(۹۷) اس کے بعد کلکتہ، نوا کھالی اور بہار کے متعدد شہروں میں فسادات شروع ہو گئے۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان ایک آزاد ملک کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر اُبھرے۔

۱۹۴۸ء میں ہندوستان میں گاندھی کو گولی مار دی گئی۔ ۲۶ جنوری ۵۰ء کو ہندوستان میں نیا آئین نافذ ہوتے ہی ہندوستان سیکولر جمہوریہ بن گیا اور پاکستان ۱۹۵۶ء کے آئین کے تحت اسلامی جمہوریہ بنا۔ ۱۹۷۷ء تک ہندوستان میں مرکز میں کانگریس کی حکومت رہی۔ ۱۹۸۰ء میں دوبارہ الیکشن ہوا اور کانگریس کی حکومت پھر سے قائم ہو گئی۔ ہندوستان نے اس دوران تین جنگیں لڑیں ایک چین کے ساتھ اور دو پاکستان کے ساتھ۔ پاکستان نے ۶۵ء اور ۷۱ء کی جنگیں ہندوستان کے ساتھ لڑیں۔ ستمبر ۷۱ء میں پاکستان دولخت ہو گیا اور بنگلہ دیش مشرقی پاکستان کی جگہ وجود میں آیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کے اہم واقعات قائداعظم محمد علی جناح کی وفات، لیاقت علی خان کی شہادت، مارشل لا کا نفاذ، بھٹو کی حکومت اور پھر جنرل ضیا کا اقتدار پر قبضہ ہیں۔

رومانی تحریک، ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق کی تحریک جوش کی زندگی کے دوران پروان چڑھیں۔ اگرچہ جوش اپنی انفرادیت کی وجہ سے پوری طرح کسی تحریک سے وابستہ نہیں لیکن ان تحریکوں سے جو مجموعی ادبی ماحول بنا اس سے جوش کسی نہ کسی صورت وابستہ نظر آتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سر سید اور ان کے رفقاء افادی ادب اور نیچرل شاعری کا علم بلند کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے قومی سطح پر تحرک پیدا کیا اور ادب میں پرانے اور مروجہ نظریات پر کاری ضرب لگائی۔ سر سید احمد خان نے انگریزی تہذیب و تعلیم کو اپنانے پر زور دیا۔ شعر و شاعری میں مروج نظریات کے خلاف باقاعدہ رد عمل کی صورت ''مقدمہ شعر و شاعری'' کی شکل میں سامنے آئی۔ حالی کا نقطہ نظر بغاوت نہیں بلکہ سماجی اصلاح تھا۔ فلسفہ اور سائنس سے استفادے کا راستہ اسی تحریک کی بدولت دکھائی دیا۔ ادب میں حقیقت نگاری نے جنم لیا۔ سادہ نگاری کے فروغ کے ساتھ ساتھ نئے موضوعات ادب میں شامل کیے گئے اور اخلاقیات کو ادب کا حصہ سر سید تحریک نے ہی بنایا۔ جذبہ و تخیل کی وہ رو جس کے آگے سر سید تحریک نے بند باندھنے کی کوشش کی گئی اس کے خلاف رد عمل سر سید تحریک کے عروج میں ہی ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا۔

اس رد عمل کو مثبت اور جذباتی سطح پر سب سے پہلے محمد حسین آزاد، میر ناصر علی اور عبدالحلیم شرر نے ظاہر کیا۔ انھوں نے اسالیب کو آگے بڑھایا جن میں جذبہ و تخیل کی اہمیت مرکزی تھی۔ آزاد کے تخیل کا سرچشمہ انگریزی انشا پردازی ہے۔ انھوں نے تخیل کو پابند کرنے کی

بجائے آزادی دی اور یہ آزادی ہمیں نیرنگ خیال کے مضامین میں دکھائی دیتی ہے۔ مگر ڈاکٹر انور سدید کے خیال میں یہ آزادی یعنی رومانیت کسی رد عمل کی نہیں بلکہ ان کی اپنی افتادِ طبع کی نقیب ہے۔ میر ناصر علی کے ہاں یہ رد عمل شعوری ہے۔ انہوں نے سرسید کے مشن پر بھرپور تنقید کی اور ساتھ ہی شگفتہ اسلوب کو متعارف کروایا۔ انہوں نے تہذیب الاخلاق جیسی خشک، مقصدی اور استدلالی تحریروں کے مقابلے میں "تیرھویں صدی"، "فسانۂ ایام" اور "صلائے عام" جیسے رسالے جاری کیے۔ اگرچہ اس دور میں رومانیت کی اصطلاح منظر عام پر نہ آئی تھی مگر میر ناصر علی کے ہاں رومانیت کے ابتدائی نقوش دیکھے جاسکتے ہیں۔

عبدالحلیم شرر نے مسلمانوں کے اجتماعی زوال کے خلاف آواز بلند کی اور ماضی میں سکون اور آسودگی تلاش کرنے کی سعی کی۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں اس عہد کو زندہ کر دیا۔ شرر نے نظم کی پابند ہیئت کو توڑا اور نظم معریٰ کی بنیاد ڈالی۔ اس لحاظ سے شرر کی رومانویت نظم و نثر دونوں میں ظاہر ہوئی۔ یہ رد عمل تمام بڑے ادبی مراکز یعنی لاہور، دہلی اور لکھنؤ میں ظاہر ہوا۔ شیخ عبدالقادر نے اپنے رسالے "مخزن" کے ذریعے سے رومانی تحریک کو فروغ دیا اور ہندوستان کی علمی، ادبی اور ثقافتی زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا۔ انیسویں صدی کا ربع آخر کئی ایسی تحریکوں کو پروان چڑھانے کا باعث ہوا جن میں فرد اجتماعیت کی طرف راغب ہوا۔ انگریزی زبان کو نصاب کا حصہ بنانے کی وجہ سے مقامی لوگوں کو براہ راست رومانی شعراء کے مطالعے کا موقع ملا "احیائے مذہب" کی تحریک شروع ہوئی۔ روایتوں اور قدیم اقدار کے خلاف نوجوان ذہن کا رد عمل رومانوی نظریات و تصورات کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے نزدیک رومانی تحریک کے فروغ کی ایک اہم وجہ سائنس کی صورت حال ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

> "بیسویں صدی میں علوم کی ترقی نے انسان کے سارے تیقن کو پارہ پارہ کر دیا اور اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ مرکز کائنات نہیں رہا... اور ماحول کے ساتھ اس کا رشتہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔"(۹۸)

رومانیت میں فرد کا اہم مقصد پر اسرار یوٹوپیا کا ایک خوبصورت اور خوب تر جہاں تخلیق کرتا ہے۔ اسی طرح ہندوستانی فرد میں یہ جذبہ حصول آزادی کی صورت میں بدرجہ اتم پیدا ہو گیا۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں۔

"سائنس نے انسان کے تیقّن کو پارہ پارہ کیا تو اس کے رد عمل میں اولین سطح پر اس کی شخصی انا مجروح ہوئی۔ ثانیاً وہ نیابتِ الٰہی کی بلند مسند سے اتر کر زمین پر گر پڑا۔ ثالثاً زمین کے ثقافتی بوجھ نے اس کی روح کو گرانبار کر دیا... نتیجہ یہ ہوا کہ بے بسی کے عالم میں وہ حقائق سے گریز کرنے اور خوابناک فضا میں سانس لینے پر آمادہ ہو گیا"(۹۹) اقبال نے قیام انگلستان و جرمنی کے دوران مغرب کے رومانی شعراء کا مطالعہ کیا اور اس شاعری سے متاثر ہو گئے۔ چنانچہ وہ اس بات کا خود بھی اقرار کرتے ہیں کہ طالب علمی کے زمانے میں انہیں دہریت سے بچانے والا ورڈزورتھ ہے۔ اقبال کے ہاں فطرت کے جمال کی تصویر کشی کرنے کی بجائے اس کے باطن میں جھانکنے کی دعوت ملتی ہے۔ وہ آنکھ کو کھلا رکھ کر زمین، فلک اور فضا کے مشاہدے کی ہدایت کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے اس دور کے کلام میں سرمستی، سرخوشی اور سرشاری کی کیفیت نمایاں ہے۔ اس دور میں وہ شاعر فطرت نظر آتے ہیں۔ ان کی رومانیت کا دوسرا زاویہ ماضی کی عظمتوں کو اجاگر کرنا ہے۔ انہوں نے عقل اور عشق کے جذبوں سے نیا جہاں بنایا اور فکر اور وجدان پر زور دیا۔ اقبال کا فلسفۂ خودی اور مردِ مومن کا تصور دونوں رومانیت کے زیر اثر ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

> "وہ شیلے اور کیٹس سے نہیں نطشے سے زیادہ قریب ہیں۔ ان کی فکر رومانی دائرے میں رقصاں ہے"۔(۱۰۰)

اقبال نے چند رومانی کردار بھی تخلیق کیے۔ مثبت سطح پر مرد مومن اور منفی سطح پر ابلیس کے کردار متعارف کروائے۔ اقبال کی رومانیت نے فرد کے متزلزل یقین کو سہارا دیا۔ ان کے ہاں مذہبی اور ماورائی اعتقادات کی فضا رومانیت کی آئینہ دار ہے۔ اسی دور میں ابوالکلام آزاد اہم رومانوی نثر نگار کی شکل میں نمودار ہوئے۔ بیسویں صدی کے ربع اول میں آزاد نے "الہلال" کا اجراء کیا تو ان کی رعب اور دبدبے سے

بھرپور آواز نے پورے ہندوستان کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ان کی نثر عرب کی تہذیب سے عبارت ہے۔ یہ نثر عظمتِ رفتہ اور سطوت و جلالت کی آئینہ دار ہے۔ اسلوب کے لحاظ سے انہیں تخیل کے آذر کہا جاتا ہے۔ ٹیگور، اقبال اور ابوالکلام آزاد کی رومانوی انفرادیت نے اردو ادب کو ایک نیا ذہن عطا کیا۔ رومانیت کو عروج تک پہنچانے والے ادباء میں سجاد حیدر یلدرم، سجاد انصاری، مہدی افادی، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی اور نیاز فتح پوری کے نام شامل ہیں۔ مجنوں گورکھپوری کی افسانہ نگاری کا آغاز نیاز کے زیر اثر ہوا۔ مہدی افادی نے فطرت کے تمام حسن میں عورت کو دیکھا۔ سجاد انصاری نے رومانی جملہ لکھنے کی طرح نکالی۔ حجاب امتیاز علی نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں اور مرزا ادیب نے داستان میں رومانویت کو سمونے کی کامیاب کوشش کی۔

تراجم کے ذریعے بھی مغرب کے افسانوی ادب کو اردو میں لایا گیا۔ صادق الخیری اور منصور احمد نے مغربی تہذیب کی خواب آرائی اور منظر نگاری سے متاثر ہو کر رومانوی افسانوی کے تراجم کیے۔ چراغ حسن حسرت، خواجہ حسن نظامی اور دیگر ادیبوں نے تاریخ کے مستند واقعات کو افسانوی رنگ میں پیش کر کے ماضی کو زندہ کرنے کی کوشش کی۔

اختر شیرانی کی آواز رومانیت کی توانا آواز ہے۔ انہوں نے عورت کے مرئی وجود کو مابعد الطبیعاتی وجود عطا کیا۔ اسی لیے انہیں شاعر رومان کا نام دیا جاتا ہے۔ حفیظ جالندھری بھی رومانی شعراء میں سے ایک ہیں ان کے شاعری کے سوتے مشرقی روایات سے مستعار ہیں۔ ارض وطن سے محبت ان کی رومانیت کا ایک اہم پہلو ہے۔ عظمت اللہ خان کی بے قرار طبیعت اظہار کے نئے سانچوں کی تلاش میں تھی اسی لیے انہوں نے اردو شاعری میں ہیئت کے تجربات کیے اور نئی بحروں میں متفرق کوافی کی ترتیب سے نظمیں لکھیں۔ مزید برآں اردو میں ہندی بحروں کو رائج کیا۔ چکسبت کے ہاں یاد ماضی اور وطن پرستی کا رجحان غالب رہا۔

اقبال اور ٹیگور کے بعد جوش ملیح آبادی اس دور میں ایک بڑے رومانی کی صورت میں اُبھرے۔ اپنی پہلی شعری و نثری تصنیف ''روحِ ادب'' میں وہ انتساب سے ایک ایسے رومانی کے روپ میں دکھائی دیتے ہیں جو فطرت سے بے پناہ محبت کرتا ہے وہ اس کتاب کو فطرت کی نذر کرتے ہیں اور یوں لکھتے ہیں:۔

> اے صبح صادق! اے عروسِ فطرت! میں اس ناچیز تصنیف کو تیرے نورانی قدموں سے مَس کرنے لایا ہوں... اسے قبول کر... اگر تو نہ مسکرائی تو کارخانۂ قدرت میں غور کرنے والا شاعر لوح محفوظ کا مطالعہ کبھی نہ کر سکتا اور نہ ہی شاہد معنی کا رخسار دیکھ سکتا۔ میں ہوں تیرا پرستار: جوش۔(۱۰۱)

اس انتساب کے ذریعے سے جوش فطرت سے اپنی محبت اور اُنسیت کا اظہار کرتے ہیں اور یہی ان کے ادب کا امتیازی نشان بن جاتا ہے۔ وہ فطرت کے مختلف مظاہر کو بیان کر کے فطرت کے حسن کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ''وقتِ سحر'' ان کا پسندیدہ ہے۔ ان کے کلام کا کوئی مجموعہ یا ان کی کوئی ادبی تحریر ایسی نہیں ہے۔ جہاں وہ ایک رومانوی طبیعت شاعر اور ادیب کے روپ میں دکھائی نہ دیتے ہوں۔ خاص طور پر ان کے پہلے چار پانچ مجموعوں میں تو ان کی رومانوی طبیعت کا رنگ اور پر تو بہت غالب ہے۔ ان مجموعوں میں وہ اول تا آخر رومانوی نظر آتے ہیں۔ ان کی تمام زندگی مختلف قسم کی بغاوتوں سے مملو ہے۔ اس کی واضح مثال خاندانی روایات سے بغاوت، والد کے کچھ ناپسندیدہ احکامات سے بغاوت، مذہبی اعتقادات سے بغاوت اور مروجہ روایات اور اقدار سے بغاوت کے ساتھ ساتھ مروجہ شعری روایت سے بغاوت بھی ان کو رومانی ثابت کرتی ہے۔ انہوں نے صنفِ غزل سے منہ موڑ کر صنفِ نظم سے ناتا جوڑا۔

جوش کے ہاں جذبے اور خیال کی آزادہ روی اور اظہارِ ذات کے لیے مروجہ اقدار سے بغاوت انہیں رومانی تصورات پر عمل کرنے والا شاعر اور ادیب ثابت کرتی ہے۔ ان کا جذبہ زمین کی سطح سے ابھرتا ہے اور بلند پروازی پر مائل ہوتا ہے۔ وہ اپنے اندر کی کائنات میں گم نہیں

ہوتے بلکہ اس کائنات کے ذریعے سے مظاہر قدرت میں اپنے خالق کی صناع کاری کی داد قدم قدم پر دیتے ہیں۔ انہوں نے نئے نئے لفظوں سے اردو ادب کے دامن کو وسعت دینے کے ساتھ ساتھ جدت آفرین خیال سے روح پرور ادب کی تخلیق میں کردار ادا کیا۔ صبح کا وقت شاعر کے تخیل کو اپنے دامن میں پناہ دیتا ہے اور ان کا ذہن چھوٹی چھوٹی اشیا کو قابل غور بنا دیتا ہے۔ خیالات کا لامتناہی سلسلہ چل نکلتا ہے اور صبح کا سماں ان کے لیے ''ثبوتِ حق'' بن جاتا ہے یہاں ان کی آواز ورڈز ورتھ سے مل جاتی ہے۔

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

جوش مختلف مناظر کی تشکیل سے ایک نگار خانہ بناتے ہیں جہاں نظر آنے والی ہر تصویر پہلی سے زیادہ دلکش اور نظر فریب ہوتی ہے۔ منظر نگاری ان کی شاعری کا مابہ الامتیاز ہے۔ اردو ادب میں قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی کی صنف کے علاوہ دیگر اصناف سخن میں منظر نگاری کا استعمال کم ہے۔ نظم میں اس کی گنجائش زیادہ ہے۔ جوش کے ہاں منظر نگاری ذاتی مشاہدات کی صورت میں موجود ہے۔ اس لحاظ سے وہ نظیر اکبر آبادی کے زیادہ قریب دکھائی دیتے ہیں لیکن نظیر کے ہاں تفصیلات کی اتنی فراوانی نہیں ہے جتنی کہ جوش کے ہاں موجود ہے۔ انہوں نے استعارات کے ذریعے سے تفصیلات کا کام لیا ہے۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی انہیں نظیر پر ترجیح دیتے ہیں اور اسی لیے وہ جوش کو انیس کا مقلد قرار دیتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''جوش کو نظیر پر برتری اس بنا پر حاصل ہے کہ انہوں نے نہایت پاکیزہ، شستہ اور حسین الفاظ میں مناظرِ فطرت کو پیش کیا ہے۔ یہ فن انہوں نے میر انیس سے سیکھا ہے۔ میر انیس کی زبان کی پاکیزگی، شیرینی اور لوچ جوش کے کلام میں بھی موجود ہے۔ اس لیے ان کی منظر نگاری زیادہ حسین اور دلکش ہوتی ہے۔(۱۰۲)

انگریزی شاعری میں شیلے، کیٹس اور ورڈز ورتھ کے ہاں منظر نگاری کا اہتمام ہے۔ کالی داس اور تُلسی داس کے ہاں ہندی رنگ میں منظر نگاری ہے۔ سودا نے فارسیت کے زیر اثر ہندوستان کے موسمی اثرات بیان کیے۔ میر انیس نے صناعی سے کام لے کر سادہ اور فطری انداز میں فطرت کے چہرے سے نقاب اٹھائی۔ ٹیگور نے مختلف مناظر کو فطرت کی خوبصورتی سے لگاؤ کی صورت میں قلمبند کیا۔ جوش نے اپنے پیش رووٴں سے فطرت سے محبت کرنا سیکھا اور فطرت کے حسن کو مختلف اوقات کے لحاظ سے بھی متنوع موضوعات میں پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ سحر کے ساتھ ساتھ رات کے متعلق بھی جوش کے ہاں بڑی تعداد میں نظمیں موجود ہیں۔ حسن و عشق بھی جوش کی شاعری کا محبوب موضوع ہے۔ حسن لطیف کے بیان میں ان کی نظم ''جنگل کی شہزادی'' اہم ہے۔ حسن کے بیان کا جمالیاتی پہلو ان کے ہاں نظر آتا ہے اور ڈاکٹر عبادت بریلوی نے کہا کہ اردو شاعری میں اتنا بڑا خالق جمال پیدا نہیں ہوا۔(۱۰۳) حسن کے بیان میں تخیل کا کمال، جزئیات نگاری اور تراکیب کی ندرت ان کی اپنے فن پر دسترس کی دلیل ہے۔

ہر رومانوی کی طرح جوش کو بھی اداسی اور غم سے ایک خاموش لگاؤ ہے مگر اس کی نوعیت کلاسیکی اساتذہ سے مختلف ہے۔ دوستوں کا جدا ہونا، تصورات کا ٹوٹنا اور جواں مرگی کی خواہش کا اظہار، زندگی سے بیزاری کی کیفیت بھی انہیں ایک رومانی ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ اپنے مضمون ''الفاظ اور شاعر'' میں شاعروں کے قدیم انداز سے انحراف کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ غزل کے سانچے کو اپنے بیان کی وسعت کے لیے ناکافی تصور کرنے والا جوش قدم قدم پر اقدار، روایات، رسم و رواج سے بغاوت کرتا دکھائی دیتا ہے۔

وقت کی تبدیلی کا احساس، جوانی کا گزرنا اور بڑھاپے کا قریب آنا، عزیزوں، ساتھیو اور دوستوں کی موت کا احساس ان کے حساس دل کو کچلتا رہتا ہے۔ تہذیبوں کا مٹنا اور زوال کا زمانی و مکانی فریم میں جکڑا ہوا منظر ان کے قلب و نظر میں انقلاب برپا کر دیتا ہے۔ ان کی اسی ماضی پرستی کو سراج مُنیر اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

> جوش صاحب کی حیثیت ایک مٹتی ہوئی تہذیب کے شاعرِ آخر کی ہے بلکہ انہیں تہذیب کے زوال کا شاہد کیوں کہیے، شہید کہیے، بلکہ ہمیں دیکھنا ہو گا کہ اس چیز نے ان کی شخصیت کے محمل میں کیا صورت اختیار کی ہے مثلاً اس سلسلے میں اقبال مسلم تہذیب کے زوال کا بنیادی احساس رکھتے ہیں لیکن انہیں رنج اصلی تہذیب کے مٹنے کا ہے۔ چنانچہ یہ چیز ان کے اندر ایک تاریخی یادِ ماضی کو جنم دیتی ہے ار وہ اس تہذیب کے ملکوت ولاھوت کی سیر کرتے ہیں۔ جوش صاحب کے ہاں بنیادی وابستگی اشیا سے ہے۔ تہذیب کے زوال کا مطلب ان کے نزدیک اشیا اور انسانوں کے روابط کے موجود منظر کا زوال ہے۔ ایک ایسا منظر جو اپنے زمانی اور مکانی فریم میں جڑا ہوا ہے اور اس فریم سے باہر اس کے کوئی معنی نہیں۔(۱۰۴)

آگے چل کر سراج منیر نے جوش کے اس طرز احساس کو ان کا ذاتی احساس قرار دیا ہے اور انہیں تاریخ کی بجائے تہذیبی شخصیت کہا ہے جب ہم ان کی طویل نظموں کو دیکھتے ہیں تو وہ ان کے بیان کے وقت بلندی پر ہوتے ہیں۔ جب وہ تہذیبی منظر، یا اس قسم کے خاص لفظیات کو استعمال کرتے ہیں اور پھر یادِ ماضی ان کے حافظے پر نقش ہے۔ اس کے دہرائے جانے کی خواہش کا ایک احساس ان کے ہاں نظر آتا ہے۔ گزری ہوئی عظمت اور خاندانی تفاخر کا احساس بھی ان کے ہاں نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی خود نوشت سوانح ''یادوں کی برات'' اس کی خوبصورت مثال ہے۔ ان کے مضامین خُمر اس رومانوی کیفیت کے بھرپور آئینہ دار ہیں۔ شراب سے متعلق کیفیات کا تذکرہ ان کے کلام میں ملتا ہے۔ یہی مضامین جب آگے بڑھتے ہیں تو شیخ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ بھی ان میں شامل ہو جاتی ہے۔ ان کے ذریعے وہ اس کے مختلف افعال کو نشانۂ تنقید بناتے ہیں۔ اس چھیڑ چھاڑ کے بعد وہ خدا اور مذہب پر بھی بات کرنے سے نہیں چُکتے۔ ابتدا میں تشکیک میں تذبذب کی کیفیت ہے۔ آگے چل کر یہی تشکک کھلے بندوں خدا پر طنز کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ انسان کو درد و غم میں مبتلا دیکھ کر جوش بے ساختہ چلّا اٹھتے ہیں۔

نہیں جہاں میں کوئی آسرا فقیروں کا
کہ بے نیاز بہت ہے خدا فقیروں کا

بعد میں جوش انسانی خباثتوں کو بیان کرتے ہیں اور یہ تمام باتیں مل کر مذہب سے انحراف کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ جوش اپنی رومانیت میں سماج کے خلاف اعلان جنگ بھی کرتے ہیں۔ شاعرانہ تعلّی اور احساس عظمت بھی ان کے ہاں پایا جاتا ہے۔ اسی احساس عظمت کے زیر اثر انہیں زمانے کی ناقدری کا احساس ہونے لگتا ہے لیکن ناامید پھر بھی نہیں ہوتے بلکہ مستقبل سے بہتر نتائج کی توقع کرتے ہیں۔

روسو کے افکار سے جوش بے حد متاثر تھے۔ روسو کے افکار کا گہرا اثر جوش کی ابتدائی دور کی شاعری اور ان کے افکار پر ہے۔ جوش بھی روسو کی طرح یہ سمجھتے ہیں کہ بہادری اور جسمانی صحت و طاقت ہی سے اچھی زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ جوش کی دور اوّل کی نظموں میں حسن کا تعلق بغاوت سے ہے۔ آزادی کے جذبے کی ترجمانی ہوتی ہے۔ رومانیت کے ہی زیرِ اثر آزادی کا جذبہ بیدار ہوا اور حسن پرستی اور روحانیت کا سبق سیکھا گیا۔

جوش نے ہندوستان کی سیاسی کشمکش اور تحریک آزادی کی حمایت کی۔ اشتراکی اثرات سے جوش کا فلسفۂ زندگی بھی نکھرا۔ فطرت نگاری کے ساتھ ساتھ زندگی کی تلخ حقیقتوں کا شعور ان کے ہاں واضح نظر آتا ہے۔ معاشرتی اور سماجی برائیوں کی نشاندہی اور ان کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا جوش ہی کا خاصہ ہے۔

جوش تشبیہہ، استعارے کے بادشاہ کہلاتے ہیں اور انہیں اردو میں نئی محاکات شامل کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے کیونکہ جوش سے پہلے اردو میں محاکات بہت محدود اور زیادہ تر تصوراتی ہیں لیکن جوش چونکہ فطرت پرست ہیں اس لیے ان کے محاکات حقیقی ہیں۔ جوش کی رومان پسند طبیعت نے اردو میں محاکاتی عنصر اور اس کی تفصیلات کو فروغ دیا۔ ڈاکٹر ظلِ حسین عابدی لکھتے ہیں۔

> ''جوش نے اس میدان میں بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھایا۔ تشبیہات کی رنگینی اور استعارات کا تنوع، ان کے ہاں خصوصاً بڑے دلکش و خوبصورت انداز میں رونما ہوا۔(۱۰۵)

جوش فطرت کے حسن کی محاکاتی تصویر پیش کرتے ہوئے بہت لطف اندوز ہوتے ہیں۔ فطرت کے ماحول میں وہ اپنے عشق کا بیان بھی بے باکی اور والہانہ انداز سے کرنے میں بہت جوش و مسرت محسوس کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی اپنے مقالے ''جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' میں جوش کی رومانی طبیعت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

''جوش کی پہلی شناخت رومانیت ہے اور اسی لیے تو وہ شدت جذبات کے پرستار ہیں وہ اپنے دور کے دیگر رومانوی شعراء سے مختلف بھی ہیں۔ دوسروں کی طرح جمالیات اور تلاش حسن۔ ایک غیر واضح افسردگی، نسوانیت پرستی، اور ماورائیت کی بجائے وہ رومانیت میں سے انقلاب کو چُن لیتے ہیں اور پھر اس میں ہر رنگ بھر دیتے ہیں۔ جس میں سب سے شوخ رنگ فطرت نگاری بھی ہے۔''(۱۰۶)

ناقدین کہتے ہیں کہ جوش کے ہاں فکر کی گہرائی کی بجائے جذبات کی فراوانی ہے اور انقلابی نغموں کا آہنگ موجود ہے لیکن نذر الاسلام کی طرح سیاسی شعور نہیں ہے وہ ایک رومانوی انقلاب پسند کی طرح ظلم و جبر کی مضبوط دیوار کے خلاف آواز تو بلند کرتے ہیں لیکن لوگوں کو اس انقلاب کے بارے میں بتاتے تو ہیں لیکن کوئی واضح لائحہ عمل ان کے سامنے نہیں رکھتے اور نہ ان کے مسائل کا حل بتاتے ہیں۔ ان کے ہاں فکر و عمل کی بجائے جذبات اور احساسات کی ترجمانی پر زور ہے لیکن ڈاکٹر محمد حسن کے خیال میں جوش نے لوگوں کے سرد جذبات میں ہلچل مچادی اور یوں اپنا ایک منفرد مقام بنالیا وہ لکھتے ہیں۔

> ''اردو شاعری میں انقلابی نفسِ مضمون کو جاگزین کرنے اور تشبیہات میں ایک ہلچل سی مچادینے کی وجہ سے انہوں نے (یعنی جوش نے) اپنے لیے ایک لازوال جگہ پیدا کرلی۔''(۱۰۷)

جوش کے ہاں انقلابی توانائی اور قوت اپنے عہد کی اس اجتماعی خواہش کی نمائندہ ہے جو سیاسی و سماجی پابندیوں کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ وہ غلامی سے نفرت اور آزادی سے محبت کرتے ہیں اور یہی ان کے انقلابی ذہن کے آئینہ دار ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

> ''مساوات ان کا نصب العین ہے۔ غلامی سے وہ نفرت کرتے ہیں۔ فرقہ پرستی انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ محبت ان کا مذہب ہے۔ انسان دوستی پر وہ ایمان رکھتے ہیں۔ خیر ہی اُن کی سب کچھ ہے۔ شر کی ان کے ہاں کوئی جگہ نہیں ہے... محبت کے خیال کو عام کرنے اور آزادی کے تصور کو پھیلانے کے لیے انہوں نے انقلاب کا پیغام دیا ہے۔''(۱۰۸)

جوش نے اُس دور میں جبکہ وہ انقلاب کی آواز بن رہے تھے، اپنے ہم عصر شعراء کے برعکس مذہبی تنگ نظری، اجارہ داری اور بھید بھاؤ کے خلاف آواز بلند کی۔ اس دور میں انہوں نے ''میر انعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب'' کی بلند آہنگ گونج میں انگریز حاکموں کے خلاف غلام ملک کے لوگوں کے دلوں کی آواز اپنی طویل نظم ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام'' میں پیش کی۔ انہوں نے اگرچہ کوئی مربوط انقلابی فلسفہ پیش نہیں کیا جیسا اقبال کے ہاں ہے لیکن پھر بھی انہوں نے لوگوں کے دلوں کو جوش و جذبے سے بھر کر ایک سچے انقلابی و رومانی ہونے کا ثبوت دیا اور اسی جذباتی آواز میں ترقی پسند تحریک کی راہ ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

ترقی پسند تحریک

رومانی تحریک کے ساتھ ساتھ ایک اور تحریک بھی کام کر رہی تھی جو کہ زندگی کو اس کے اصل رنگوں میں پیش کر کے دکھا رہی تھی۔ یہ حقیقت نگاری کی تحریک تھی جو کہ زندگی اور اس کے متعلقات سے عبارت تھی۔ اس تحریک کا مقصد فرد کے اُس شعور کو بیدار کرنا تھا جس سے رومانی ادیب نظر چُرا رہے تھے۔ یہ تحریک رومانیت کی ضد تھی۔ انقلابِ روس نے کچلے ہوئے طبقے کی طرف لوگوں کا دھیان منعطف کیا۔ سماجی انصاف اور مساوات کی راہیں ہموار ہوئیں۔ منشی پریم چند ایک حقیقت نگار ادیب کے روپ میں ابھرے۔ انہوں نے بھوک، جہالت، افلاس اور توہم پرستی کو موضوع بنایا اور ایک عام انسان کے ذہنی تفکرات اور معاشرے میں اُس کے روابط کو زیر بحث لائے۔ ڈاکٹر انور سدید "اردو ادب کی تحریکیں" میں لکھتے ہیں کہ:

> "پریم چند کی عطا یہ ہے کہ انہوں نے حقیقت کی نقاب کشائی کی اور انسان کو صداقت کا کھردرا چہرہ دیکھنے پر آمادہ کیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اردو ادب میں چوٹی کے جن تین ناموں کا انتخاب کیا ہے، ان میں سر سید اور اقبال کے ساتھ تیسرا اہم نام پریم چند کا ہے۔"(۱۰۹)

در حقیقت رومانیت اور حقیقت نگاری کی تحاریک اُس وقت تک الگ الگ دکھائی دیتی ہیں لیکن جیسے ہی ترقی پسند تحریک شروع ہوئی یہ دونوں آپس میں مدغم ہو گئیں اور ڈاکٹر انور سدید کے بقول "ترقی پسند تحریک نے اقبال کی رومانیت سے تخلیقی قوت اور جوش کی رومانیت سے بغاوت کا جذبہ حاصل کیا۔ پریم چند کی حقیقت نگاری نے اسے زمین کی طرف متوجہ کیا"۔(۱۰۰)

ترقی پسند تحریک کی بنیاد اشتراکیت پر رکھی گئی تھی اور انگلستان سے یہ تحریک ہندوستان پہنچی۔ اس کے اعلان نامے کو ڈاکٹر ملک راج آنند، ڈاکٹر جیوتی گھوش، پرمود سین گپتا، ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور سجاد ظہیر نے تیار کیا تھا۔ سجاد ظہیر اور ملک راج آنند نے لندن میں رہائش پذیر ہندوستانی طالب علموں کی مدد سے ترقی پسند مصنفین کی انجمن بنانے کے خیال کو عملی روپ دیا۔ اعلان نامہ کی تیاری کے کچھ ماہ بعد ادیبوں کی بین الاقوامی کانفرنس پیرس میں ۱۹۳۵ء میں منعقد ہوئی۔ اس میں سجاد ظہیر اور ملک راج آنند نے شرکت کی۔ اس میں گورکی، رومان رولان، طامس مان، آندرے زید۔ ہنری باربوس، آندرے مالرو اور فورسٹر جیسے انقلابی نظریات رکھنے والے بڑے ادیبوں نے شرکت کی۔ سجاد ظہیر کے ہندوستان واپس آنے کے بعد احمد علی اور سجاد ظہیر نے انجمن ترقی پسند مصنفین قائم کرنے کی کوشش کی۔ ہم خیال ادیبوں میں ڈاکٹر اعجاز حسین، پروفیسر احتشام حسین، نرندر شرما، محمود الظفر، ڈاکٹر رشید جہاں، فیض احمد فیض، ڈاکٹر محمد اشرف، سبطِ حسن، فیروز الدین منصور اور ڈاکٹر عبدالعلیم شامل تھے۔ مولوی عبدالحق، پریم چند، جوش ملیح آبادی، رابندر ناتھ ٹیگور، میاں بشیر احمد، صوفی تبسم، ڈاکٹر یوسف حسین خان، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت اور اختر شیرانی نے تعاون کا یقین دلایا۔

ترقی پسند ادیبوں نے غیر ملکی سامراج سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد کو ترقی کا پہلا زینہ قرار دیا۔ اس دور میں ہر اس قوت سے اتحاد کی کوشش نظر آتی ہے جو برطانوی حکومت کی واپسی کے لیے زور لگا رہی تھی۔ کانگریس اور لیگ میں اتحاد قائم کرانے کی کوششیں تیز تر کر دی گئیں۔ کیمونسٹ پارٹی نے اپنا ہفت روزہ اخبار "قومی جنگ" نکالا جس کے مدیر سجاد ظہیر تھے۔ اس اخبار نے مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کی پرزور تائید کی لیکن بعد میں اپنا نقطہ نظر تبدیل کر لیا۔ کانگریس کے قوم اور قومیت کے نظریات ترقی پسندوں کے لیے کانگریس میں اشتراکی گروپ کو جواہر لال نہرو کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس بارے میں ڈاکٹر معین الدین عقیل اپنی کتاب "تحریک آزادی میں اردو کا حصہ" میں رقمطراز ہیں:

> "کانگریس میں اشتراکی گروپ فعال اور مؤثر تھا انہیں جواہر لال نہرو کی سرپرستی حاصل تھی جو نئی نسل میں کافی مقبول تھے... ڈاکٹر محمد اشرف، محمود الظفر، سجاد ظہیر، ڈاکٹر رام منوہر لوہیا وغیرہ ان کے مددگار تھے۔"(۱۱۱)

کانگریسی وزارتوں کے ذریعے کمیونسٹوں اور ترقی پسندوں کے لیے سیاسی نظریات اور ادبی سرگرمیوں کے فروغ کی کوششیں زیادہ بہتر طور پر سامنے آئیں۔ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں نے زیادہ بے باکی اور بے خوفی سے اپنے نظریات کا پرچار کیا۔ ادب کو سیاسی پراپیگنڈے کے اظہار کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ سردار جعفری مخدوم محیی الدین، فیض احمد فیض، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، جانثار اختر، مجاز، احمد ندیم قاسمی، غلام ربانی تاباں، مطلبی فرید آبادی، جوش ملیح آبادی، ن م راشد، اختر الایمان، احسان دانش، ساغر نظامی کے ہاں بغاوت، غلامی سے نفرت اور آزادی کے حصول کے لیے دوسروں کو آمادہ کرنے کی کوششیں دکھائی دیتی ہیں۔ اُس دور میں ہر شاعر و ادیب بالواسطہ اور بلاواسطہ غلامی سے متاثر اور آزادی کی تڑپ سے معمور تھا۔ ابتدا میں ترقی پسند تحریک کے قیام کا مقصد سراسر ادبی تھا جیسا کہ احمد علی نے اپنے ایک مضمون میں بیان کیا ہے کہ

> "محمود الظفر نے میرے اور رشیدہ جہاں کے مشورے سے ۱۹۳۳ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کا اعلان کیا اور چونکہ اس وقت سجاد ظہیر لندن میں تھے، ان کی رضامندی کا ذمہ لیا جو بعد میں انہوں نے خود بھی بذریعہ خط بھیج دی۔ چنانچہ ۳۳۔۱۹۳۲ میں اس کے باقی بانیوں کے سامنے جو اصل مقصد تھا وہ بالکل ادبی تھا اور اس میں سیاسی رجحانات اس سے زیادہ نہ تھے کہ ہم ان تمام مسائل زندگی پر آزادئ رائے اور تنقیدی حق چاہتے ہیں جو نسل انسانی کو بالعموم اور برصغیر کے لوگوں کو بالخصوص درپیش ہیں۔"(۱۱۲)

ترقی پسند ادب کسی ایک مخصوص خطۂ زمین کا ادب نہیں بلکہ پوری دنیا کے عوام کا ترجمان بننے کا دعویدار ہوا۔ ظلم، جبر، شخصی استحصال، غلامی اور معاشی استحصال کی مذمت بین الاقوامی سطح پر کی گئی۔ بے مقصد ادبیات کی جگہ بامقصد ادب کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ نتیجے میں ترقی پسندوں کو ملحد، جنس پرست، سرخے اور روسی آلہ کار بھی کہا گیا۔ ان پر پابندیاں لگائی گئیں اور ان کی کتابیں ضبط کر لی گئیں۔ احمد علی، سجاد ظہیر، رشید جہاں اور محمود الظفر کے افسانوں کا مجموعہ "انگارے" طبع ہوا اور چار ماہ بعد ضبط کر لیا گیا۔ پریم چند کا "سوزِ وطن" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ترقی پسند تحریک ابتدا میں ادبی تحریک کے طور پر ابھری لیکن اسے سیاسی بنا دیا گیا۔ ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں جو ہنگامہ ہوا وہ سراسر سیاسی نوعیت کا تھا۔ اس کانگریس کے بعد تخلیقی مصنفین تحریک کے سیاسی گروہ سے دور ہو گئے۔ سیاست کی انتہا پسندی کی وجہ سے اعتدال پسند مصنفین اس تحریک سے آہستہ آہستہ دور ہونے لگے۔

جنس نگاری کے بارے میں بھی ترقی پسندوں کا رویہ یکساں نہ تھا۔ ابتدا میں معاشرہ کے ناسوروں کو کریدنا کہہ کر اس کی حمایت کی گئی لیکن بعد میں اسے رجعت پسندانہ فعل کہہ کر جنس نگاری کے رجحان کو مریضانہ قرار دے دیا گیا۔ معاشرتی رویوں کے خلاف جنس نگاری کے ذریعے سے احتجاج کے علاوہ طنز نگاری بھی اختیار کی گئی۔

ڈاکٹر محمد صادق تحریک سے لوگوں کی علیحدگی کے بارے میں اس طرح اپنی کتاب "A history of urdu literature" میں رقمطراز ہیں کہ:

"The association continued successfully for a while and then gradually fell into decline. It had denied all along that it was communist, but made over-confident by success it became rash and declared that it was communist. The result was that many writers publicly dissociated themseleves from it. Others like manto and Miraji were disowned on moral ground, but what really killed the association was the partition. The patriotic sentiments once used to attack foreign rule were now used in praise of the new governments. Some people of course, did not go so far, but

(they found that sefety lay in silence, in keeping their thoughts to themselves."(113

ڈاکٹر انور سدید ترقی پسند تحریک کے تین ادوار متعین کرتے ہیں۔ دور اول: نانکنگ ریستوران لندن سے سجاد ظہیر کی گرفتاری تک ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۰ء تک

دور دوم: سجاد ظہیر کی رہائی سے آزادی تک۔ ۱۹۴۲ سے ۱۹۴۷ء تک

دورِ سوم: طلوع آزادی سے نئے منشور کی تیاری اور سیاسی پابندی تک ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۲ء

ترقی پسند تحریک کا زوال اس وقت شروع ہوا جب تحریک دو دھڑوں میں بٹ گئی۔ ایک نظریاتی اور سیاسی دھڑا جس کے نمائندہ سجاد ظہیر، علی سردار جعفری اور ڈاکٹر عبدالعلیم تھے۔ دوسرا دھڑا غیر نظریاتی اور ادبی تھا اس کی نمائندہ احمد علی اور اختر حسین رائے پوری تھے۔

سجاد ظہیر نے اسے حب الوطنی، انسان دوستی اور آزادی سے عبارت قرار دیا اور اسے ایک سیاسی تحریک ماننے سے انکار کر دیا۔ اور انتشار اور فکری افراتفری کے زمانے میں ترقی پسند تحریک کو دوبارہ منظم کرنا شروع کیا اور یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اس تحریک میں ہر قسم کے نظریات کے لوگ شامل ہو سکتے ہیں۔

حیدر آباد کانفرنس میں سید سجاد ظہیر نے احتجاج کیا کہ ترقی پسند ادب کے مخالفین ہر نئے ادب کو اور اگر وہ خراب ادب ہے تو اور زیادہ بہ اصرار ترقی پسند ادب کے ذمرے میں شامل کرتے ہیں اور پوری ترقی پسند تحریک کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس حوالے سے محمد حسن عسکری، ن۔ م۔ راشد۔ میرا جی، ممتاز مفتی اور سعادت حسن منٹو کی تحریروں کو ملامت کا نشانہ بنایا گیا اور کہا گیا کہ ترقی پسند ادب نیا ادب ضرور ہے لیکن تمام نیا ادب ترقی پسند ادب نہیں۔ ایسے ادب کو انحطاطی ادب کا نام دیا گیا اور وہ تمام ادب جسے غیر ترقی پسند تخلیق کرتے ہیں مزاجی ذہنیت، اذیت کوشی، تحت الشعوری اور جنسی دباؤ کی پیداوار قرار دیا گیا۔ (۱۱۴)

ممبئی میں صنعتوں کے فروغ، مشینوں کی حکومت اور دولت کی غیر مساوی تقسیم نے معاشرے کو دو حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ یہاں مزدور تحریک اور ٹریڈ یونین ازم پہلی مرتبہ قائم ہوئی۔ ملک کی پہلی پرولتاری تحریک اسی شہر سے آگے بڑھی۔ ممبئی اس تحریک کا اہم مرکز بن گیا۔ ترقی پسند تحریک نے ادب کے کئی گوشوں کو منور کیا۔ تنقید، افسانہ نگاری، شاعری، ناول نگاری، تھیٹر اور فلم میں نظریات کا پرچار کیا گیا۔ ادبِ لطیف لاہور، ساقی ممبئی، ہمایوں اور نظام ممبئی نے ترقی پسندوں کی تحریریں شائع کیں۔ کئی ادیبوں کی کتابیں طبع ہوئیں۔ کانفرنسیں منعقد ہوئیں اور حیدر آباد اور بھوپال کی شاخیں ریاست کے پابند ماحول کے اندر پروان چڑھیں۔

آزادی کے بعد ترقی پسند ادباء نے کہا کہ آزادی خاک وخون میں غلطاں ہے اس لیے جو اجالا پھیلا ہے وہ داغ داغ ہے۔ یوں حکومتِ وقت اور ادیبوں کے نظریات میں تصادم پیدا ہوا۔ حکومت نے سویرا، نقوش اور ادبِ لطیف رسائل پر پابندی لگا دی۔ یہ دور ہنگامہ آرائی، باہمی لڑائی اور حکومتی عمل پر رد عمل سے لبریز ہے۔ سیاست کی طرف توجہ ہے اور ادب کی طرف کم دھیان دیا گیا ہے۔

بحیثیت مجموعی اس تحریک نے منطقی استدلال اور حقیقت پسندانہ تجزیے کو فروغ دیا۔ معاشی حقائق کو مان کر استحصالی طاقتوں کی طرف اشارہ کیا گیا۔ بلند انسانیت پر اعتقاد اور کچلے ہوئے طبقوں کو بلند مقام تک لے جانے کی خواہش اس تحریک کے ادباء کے ہاں دکھائی دیتی ہے۔ تطہیر، احتساب اور سزا کی خواہش نے انتہا پسندی کے نظریات کو فروغ دیا۔

جوش ملیح آبادی کی ترقی پسندی ان کے مزاج کا حصہ رہی ہے۔ عقل کی فرماں روائی، روایتِ قدماء سے انحراف، بغاوت اور رد عمل کی قوت اسی ترقی پسندی کا شاخسانہ ہے۔ حیدر آباد کی ملازمت سے برطرفی کے بعد جوش کے ہاں احتجاج اور رد عمل کی قوت کار فرما دکھائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ حکومتِ وقت کو للکارنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ جوش اپنی مشہور نظموں "غلاموں کی بغاوت"، "ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام"، "نظام نو" اور "انسانیت کا کورس" میں انقلاب کو دعوت دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے کوئی مربوط تصور انقلاب قوم کے سامنے پیش نہیں کیا لیکن ان کا یہ تصور غلامی کا رد عمل تھا وہ فرد کو غلامی کی زنجیریں توڑنے اور حکومتِ وقت کے خلاف اٹھ کھڑا ہونے کو کہتے ہیں لیکن اس بغاوت کا رُخ متعین نہیں کرتے۔

اسی ترقی پسندی کی وجہ سے وہ انسانیت کے پرستار دکھائی دیتے ہیں۔ جوش آدمی کی بے کسی اور بے بسی دیکھ کر شکوۂ یزداں کے مرتکب بھی ہو جاتے ہیں۔ جوش کے نزدیک آدمیت عبادت سے بہتر ہے۔ ان کی نثر اور شاعری جدید میلانات سے معمور ہے اور عصری تقاضوں کی بڑی حد تک نمائندگی ان کے ہاں دکھائی دیتی ہے۔ جوش کی فطرت کا باغیانہ پن ان کی تحریروں میں بولتا ہے۔ بغاوت اور انقلاب ان دو لفظوں کی بازگشت ان کے ہاں نظر آتی ہے۔ وہ آزادی سے محبت کرتے ہیں اور آزادی کی راہ میں حائل ہر رکاوٹ کو عبور کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے نعرۂ انقلاب میں جذباتیت کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ سیاسی اور سماجی آزادی کی طلب انہیں بے چین رکھتی ہے۔ وہ سارے نظام کو انسان کی جذباتی اور سماجی ضروریات کے لحاظ سے تشکیل دینا ضروری خیال کرتے ہیں۔

ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کے پس منظر میں مقامی عوام کے ملکی، معاشی اور سماجی مسائل کی پیچیدگیوں کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی، معاشی اور معاشرتی صورت حال کی ابتری بھی شامل ہے۔ دنیا کے اکثر خطوں میں انسانوں کی آزادی بے دردی سے سلب کر دی گئی تھی۔ سامراجی قوتیں، استحصال اور استیصال کا سہارا لے کر خود کو مضبوط اور طاقتور بنا رہی تھیں۔ معاشی مساوات کی بنیادیں متزلزل تھیں۔ ترقی پسند تحریک کے شاعر نظریاتی اور لائحہ عمل کی شاعری کے قائل تھے۔ اس لیے موضوعات میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ماہنامہ فانوس کی اشاعتِ خاص میں فاضل مصنف نے جوش کو ان ترقی پسند شعراء میں شامل نہیں کیا ہے جنہوں نے اردو نظم میں کسی نئی جہت کا اضافہ یا اپنے انفرادی اظہار سے نئے لہجے کا ادراک کیا ہے۔(۱۱۵)

باب اول: حوالے و حواشی

۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو جلد سوم میں صفحہ نمبر ۸۴۷ پر فقیر محمد خان گویا کی پیدائش لکھنؤ کے مصناف ملیح آباد قرار دی ہے جبکہ جوش نے یادوں کی برات میں صفحہ نمبر ۳۲۱ پر فقیر محمد گویا کی ہندوستان میں ۱۲۳۴ میں آمد کا تذکرہ کیا ہے۔

۲۔ منشی مظفر حسین خان سلیمانی، نامۂ مظفری، حصۂ دوم، لکھنؤ مطبع مجتبائی، ۱۳۲۶ھ بمطابق ۱۹۱۷ء ص ۷۷

۳۔ سید نور الحسن خان، طور کلیم، آگرہ، مطبع مفیدِ عام، ۱۲۹۸ھ ص ۸۶

۴۔ منشی مظفر حسین خان سلیمانی، نامۂ مظفری، ص ۷۷

۵۔ حکیم نجم الغنی خاں، تاریخ اودھ، جلد چہارم، لکھنؤ، مطبع نول کشور، ۱۹۱۹ء، ص ۱۵۴

۶۔ خواجہ محمد زکریا، مدیر عمومی، تاریخ ادبیات، مسلمانان پاک و ہند، اردو ادب، جلد سوم، ۱۸۰۳ تا ۱۸۵۷ء لاہور، پنجاب یونیورسٹی ۲۰۱۰ء ص ۱۰۴

۷۔ خاطر غزنوی، جوش آفریدی اور دلِ آباء کی دھڑکنیں، مشمولہ عبارت، حیدر آباد، جون ۱۹۹۹ء ص ۷۵

۸۔ صہبا لکھنوی، افکار، بیادِ جوش، جولائی ۱۹۸۲ء ص ۲۹

۹۔ یحییٰ احمد، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی، شخصیت، افکار اور زبان و بیان، لاہور، نیاز مانہ پبلی کیشنز ۲۰۰۹ ص ۱۵

۱۰۔ اردو انسائیکلوپیڈیا، نیا ایڈیشن، لاہور، فیروز سنز لمیٹڈ، ۱۹۶۸ ص ۵۴۱

۱۱۔ محمود بریلوی، پروفیسر، مختصر تاریخ ادب اردو (باتصویر) لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، س۔ن، ص ۲۰۷

۱۲۔ خادم حسین، جوش ملیح آبادی کی نثر کا اسلوبیاتی مطالعہ، مقالہ ایم فل غیر مبطوعہ

۱۳۔ خواجہ محمد زکریا، مدیر عمومی، تاریخ ادبیات، مسلمانانِ پاکستان و ہند، اردو ادب (جلد پنجم) بیسویں صدی، لاہور، پنجاب یونیورسٹی ۲۰۱۲ ص ۱۴۲

۱۴۔ زوار حسین زیدی، سید، اردو شاعروں کا البم، لاہور، مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۹۴ء ص ۴۵

۱۵۔ جوش ملیح آبادی، نقش و نگار، ممبئی، کتب خانہ تاج آفس، ۱۹۴۴ء ص ۹۶

۱۶۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، اردو ادب، ۱۹۵۷ تا ۱۹۶۶ء لاہور، مکتبہ خیابانِ ادب، ستمبر ۱۹۶۷ء ص ۱۴۱

۱۷۔ احتشام حسین، پروفیسر، جوش ملیح آبادی، انسان اور شاعر، لکھنؤ اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۳ ص ۲۳

۱۸۔ عقیل احمد، ڈاکٹر، جوش کی شاعری کا تنقیدی تجزیہ، دہلی، ماڈرن پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء ص ۵۰

۱۹۔ مشفق خواجہ، جوش ناشناسی مشمولہ "جوش اور خامہ بگوش"، مرتب عبدالرحمن طارق، کراچی فضلی سنز، س۔ن ص ۷۷

۲۰۔ مائلی ملیح آبادی، جوش اور دیارِ دکن، لکھنؤ، اردو پبلشرز، بار اوّل، جون ۱۹۸۴ء ص ۲۹۴

۲۱۔ سحاب قزلباش، میرا کوئی ماضی نہیں، کراچی، فضلی سنز لمیٹڈ، ۱۹۹۵ء

۲۲۔ سجاد ظہیر، روشنائی، نئی دہلی، سیما پبلی کیشنز ۱۹۹۵ء ص ۶۲

۲۳۔ تبسم اخلاق، بابا کے شب و روز، مشمولہ ماہِ نو، جوش ملیح آبادی نمبر، لاہور ۲۰۱۶ء ص ۵۰

۲۴۔ تنویر قیصر شاہد، مر کر آئے گی یہ صدا قبر جوش سے" مشمولہ ماہِ نو، جوش ملیح آبادی نمبر ۲۰۱۶ ص ۵۴

۲۵۔ مجتبیٰ حسین، پروفیسر، آنکھیں ہتھیلیوں سے مل، مشمولہ ماہِ نو، ۲۰۱۶ ص ۲۳۸

۲۶۔ خورشید علی خان نے وفات کا وقت صبح تین بجے جبکہ ڈاکٹر ہلال نقوی نے جوش کی پوتی تبسم اخلاق کے حوالے سے وفات پونے چار بجے صبح بتائی ہے۔ (جوش ملیح آبادی شخصیت اور فن ص ۵۴)

۲۷۔ خورشید علی خاں، ہمارے جوش صاحب، ص ۵۸۶

۲۸۔ خلیق احمد مدیر، اردو ادب فراق نمبر، نئی دہلی، ہند، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۳ء شمارہ نمبر ۴۔ ص ۷۸۶

۲۹۔ خورشید علی خاں ہمارے جوش صاحب، ص ۵۸۸

۳۰۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، یادوں کا جشن، کراچی، پاک اور نٹیل پبلی کیشنز ۱۹۸۳ء ص ۲۲۹

۳۱۔ اعجاز حسین، ڈاکٹر، ملکِ ادب کے شہزادے، مشمولہ افکار نمبر بیاد خوش، جولائی ۱۹۸۲ء ص ۱۸۴

۳۲۔ ایس ایم شارق، بحوالہ ہلال نقوی، ڈاکٹر جوش ملیح آبادی شخصیت اور فن، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان ۲۰۰۷ ص ۵۲

۳۳۔ راغب مراد آبادی، اقبال حیدر (مرتب) مکالمات جوش و راغب، کینیڈا، جوش لٹریری سوسائٹی، گیل گری، جون ۱۹۸۸ء ص ۱۸

۳۴۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش کی شخصیت کے چند اساسی پہلو، مشمولہ ارتقاء ۲۴، جوش سیمینار نمبر دسمبر ۱۹۹۹ء ص ۵۰

۳۵۔ سید اشفاق حسین گیلانی، شاعر حضرات کی چھیڑ خوباں، ایڈیٹر کی ڈاک مشمولہ روزنامہ نوائے وقت، لاہور، بتاریخ ۲۶ جنوری ۲۰۱۵ء ص ۷

۳۶۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش کی شخصیت کے اساسی پہلو، ص ۴۹

۳۷۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، مسعود حسن رضوی ادیب اور جوش ملیح آبادی، دو متضاد نظریات کے حامل دو کردار، مشمولہ مسعود حسین رضوی ادیب حیات و خدمات، مقالہ ایم۔اے لاہور پنجاب یونیورسٹی، اور نٹیل کالج، ۱۹۷۲ء ص ۵۰

۳۸۔ کلیم نشتر، ادبی شرارتیں، لاہور، ابلاغ پبلشر، ۲۰۰۰ء ص ۱۵۔۱۴

۳۹۔ کے ایل نارنگ، ساقی، (مرتب) ادیبوں کے لطیفے، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، اپریل ۱۹۸۳ء ص ۸۱

۴۰۔ کے ایل نارنگ، ساقی، (مرتب) ادیبوں کے لطیفے، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، اپریل ۱۹۸۳ء ص ۸۱

۴۱۔ جوش ملیح آبادی، مقالاتِ جوش، ضرب شاہد بفرقِ شاہد باز، کراچی، جوش اکادمی ۱۹۸۲ء ص ۳۹۱

۴۲۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، یادوں کا جشن، ۲۰۳

۴۳۔ بحوالہ عقیل احمد، ڈاکٹر، جوش کی شاعری کا تنقیدی تجزیہ، نئی دہلی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۳ء ص ۲۷

۴۴۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش کی بیٹی سعیدہ خاتون سے گفتگو بتاریخ ۶ ستمبر ۱۹۸۲ء مشمولہ سہ ماہی "ہم قلم" کراچی، جوش نمبر، اپریل تا جون ۱۹۹۱ء ص ۲۶۲

۴۵۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، پاکستانی ادب کے معمار، جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن، ص ۵۷، ۵۶

۴۶۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر پاکستانی ادب کے معمار: جوش ملیح آبادی، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد ۲۰۰۷ء ص ۱۳۴

۴۷۔ جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، طابع اردو ڈائجسٹ پرنٹرز، لاہور، مئی ۱۹۷۵ء ص ۱۶۹

۴۸۔ ایضاً۔ ص ۱۶۹

۴۹۔ ارتقاء، جوش سیمینار نمبر کراچی، دسمبر ۱۹۹۹ء ص ۴۷۳

۵۰۔ اشتہار مشمولہ ماہنامہ کلیم اکتوبر ۱۹۳۸ء ص ۳۴۲

۵۱۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، پاکستانی ادب کے معمار: جوش ملیح آبادی، شخصیت اور فن، ص ۱۳۶

۵۲۔ جوش ملیح آبادی، آوازۂ حق، مشمولہ شعلہ و شبنم، ممبئی، کتب خانہ تاج آفس، محمد علی روڈ، ۱۹۳۶ء ص ۲۴۹، ۲۴۴

۵۳۔ جوش ملیح آبادی، شاعر کی راتیں، کلیم بک ڈپو، دہلی، ۱۹۳۰ء دہلی گلی کندلہ کشاں، بازار فتح پوری، ۱۹۳۰ء ص ۹۸

۵۴۔ بحوالہ اعجاز الحق قدوسی، ریش اور رندی کا رشتہ، مشمولہ افکار، جوش نمبر، پہلا ایڈیشن ۱۹۶۱ء ص ۲۰۴

۵۵۔ جوش ملیح آبادی، شاعر کی راتیں، دہلی کلیم بک ڈپو، ۱۹۳۰ء ص ۲۳

۵۶۔ جوش ملیح آبادی، شعلہ شبنم، ممبئی، کتب خانہ تاج آفس ۱۹۳۶ء ص ۲۵۸

۵۷۔ جوش ملیح آبادی، نقش و نگار، لاہور، مکتبہ اردو، ۱۹۳۶ء ص ۷۰

۵۸۔ جوش ملیح آبادی، شعلہ و شبنم، ممبئی کتب خانہ تاج آفس، محمد علی روڈ، ۱۹۳۶ء ص ۳۰۳

۵۹۔ وحید اختر، ڈاکٹر، جوش، اردو کا آخری کلاسیکی شاعر مشمولہ جوش شناسی، مرتبہ کاظم علی خاں لکھنؤ، نظامی پریس، ۱۹۸۶ء ص ۶۴

۶۰۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر پاکستانی ادب کے معمار، جوش ملیح آبادی، شخصیت اور فن ص ۱۴۱۔۱۴۰

۶۱۔ وارث علوی، ناخن کا قرض، مکتبہ جدید نئی دہلی، س ۲۰۰۳، ص ۴۹

۶۲۔ نیاز فتح پوری، جوش کی صحیح عظمت شاعرانہ، مشمولہ افکار بیاد جوش نمبر ۱۹۸۲ء، ص ۶۷

۶۳۔ کمال الدین احمد، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی، شاعر فردا کا نقیب، مشمولہ جوش ملیح آباد خصوصی مطالعہ، مرتبہ قمر رئیس، جوش انٹر نیشنل سیمینار کمیٹی دہلی ۱۹۹۳ء ص ۲۱۱

۶۴۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، پاکستانی ادب کے معمار، ص ۱۴۲

۶۵۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، پاکستانی ادب کے معمار، ص ۱۴۲

۶۶۔ جوش ملیح آبادی، حرف وحکایت، دہلی، کتب خانۂ رشیدیہ، ۱۹۳۸ء

۶۷۔ جوش ملیح آبادی حسین اور انقلاب مشمولہ جوش میری نظر میں، حیدر شیرازی، لاہور، اظہار سنز، اردو بازار، س، ن، ص ۱۱۳

۶۸۔ بحوالہ ہلال نقوی ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی، شخصیت اور فن، ۱۴۴

۶۹۔ جوش ملیح آبادی، آیات ونغمات، بحوالہ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی شخصیت اور فن، ص ۲۵

۷۰۔ جوش ملیح آبادی، عرش وفرش بحوالہ ہلال نقوی ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی شخصیت اور فن، ص ۴۳۶

۷۱۔ سجاد ظہیر، روشنائی، مکتبۂ دانیال، کراچی ۱۹۸۶، ص ۳۳۵

۷۲۔ جوش ملیح آبادی، رامش وانگ، بحوالہ ہمارے جوش صاحب، از خورشید علی خان، کراچی، ذیشان کتاب گھر، ۱۹۹۶، ص ۱۱۹

۷۳۔ جوش ملیح آبادی، سنبل وسلاسل، بحوالہ ڈاکٹر ہلال نقوی، شخصیت اور فن، ص ۱۴۶

۷۴۔ جوش ملیح آبادی، سیف وسبو، مکتبۂ اردو، لاہور ۱۹۴۷ ص ۱۳

۷۵۔ جوش ملیح آبادی، سرود خروش، مفید عام پریس، دہلی ۱۹۵۳ء ص ۸۶

۷۶۔ جوش ملیح آبادی، مطالعے وجائزے، مشمولہ ماہنامہ آجکل، دہلی، شمارہ مارچ ۱۹۵۳، ص ۲۱

۷۷۔ رشید حسن خان، سموم وصبا پر ایک نظر، مشمولہ ماہنامہ ساقی جوش نمبر، ۱۹۶۳ ص ۹۶

۷۸۔ روزنامہ امروز، ۱۸ فروری، ۱۹۵۷ بحوالہ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی، شخصیت اور فن، ص ۱۵۱

۷۹۔ جوش ملیح آبادی، موجد ومفکر، مشمولہ الہام وافکار، جوش ملیح آبادی، لاہور، مکتبۂ ادبِ جدید، ۱۹۶۶ء ص ۲۴۵

۸۰۔ جوش ملیح آبادی، قلرۂ وقلزم، دریاگنج، دہلی ۱۹۶۳ء ص ۳

۸۱۔ بحوالہ سید شبیر حسین، جوش ملیح آبادی کی شاعری میں عصری وسیاسی شعور تحقیقی مقالہ، ایم اے ۱۹۸۹ء غیر مطبوعہ، اورنٹیل کالج، جامعہ پنجاب، لاہور ۱۹۸۹ء ص ۸۹

۸۲۔ جوش ملیح آبادی، الہام وافکار، جوش اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۶ء ص ۷۰

۸۳۔ جوش ملیح آبادی، بخوم وجواہر، جوش اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۷، ص ۲۰۳

۸۴۔ جوش ملیح آبادی، بخوم وجواہر، جوش اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۷، ص ۱۰۴

۸۵۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی ایک مطالعہ، ارتقا مطبوعات، کراچی ۲۰۰۶ء ص ۸۸

۸۶۔ جوش ملیح آبادی، بخوم وجواہر، سرورق جوش اکیڈی، کراچی ۱۹۶۶ء

۸۶۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی، شخصیت اور فن، ص ۱۵۵

۸۷۔ جوش ملیح آبادی، محراب ومضراب، پیش لفظ، جنگ، پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء ص ۵

۸۸۔ جوش ملیح آبادی، محراب ومضراب، پیش لفظ، جنگ، پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء ص ۵

۸۹۔ جوش ملیح آبادی، محراب ومضراب، پیش لفظ، جنگ، پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء ص ۶

۹۰۔ احتشام حسین، پروفیسر، جوش ملیح آبادی، انسان اور شاعر، لکھنؤ، اترپردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۳ء ص ۱۲

۹۱۔ علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب علی گڑھ، انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۵۷ء ص ۲۱۱

۹۲۔ جوش ملیح آبادی، حرفِ آخر مشمولہ ہمارے جوش صاحب، از خورشید علی خان، کراچی، ذیشان کتاب گھر، جنوری ۱۹۹۶ء ص ۱۴۸

۹۳۔ جوش ملیح آبادی، محراب و مضراب، پیش لفظ از تبسم اخلاق، ص ۵

۹۴۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی، شخصیت اور فن، ص ۱۶۵

۹۵۔ مائل ملیح آبادی، جوش اور دیارِ دکن لکھنؤ، اردو پبلشرز نظیر آباد، جون ۱۹۸۴ ص ۱۱۹۔۱۱۸

۹۶۔ جوش ملیح آبادی محراب و مضراب (انتخاب کلیاتِ جوش) دہلی، کتابی دنیا، گلی نواب میرزا، محلہ قبرستان، ترکمان روڈ، ۲۰۰۴ء ص ۹۲

۹۷۔ عقیل احمد، ڈاکٹر جوش کی شاعری کا تنقیدی تجزیہ دہلی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۳، ص ۲۳

۹۸۔ وزیر آغا، نئے تناظر (مقالہ بیسویں صدی کی ادبی تحریکیں) لاہور ۱۹۸۱ء ص ۱۵۶

۹۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی انجمنِ ترقیٔ اردو، ۱۹۸۵، ص ۴۴۳

۱۱۰۔ محمد حسن، ڈاکٹر، اردو ادب میں رومانوی تحریک ملتان، کاروان ادب، ۱۹۸۶، ص ۱۱۶

۱۰۱۔ جوش ملیح آبادی، روح ادب، ممبئی کتب خانہ، تاج آفس، ۱۹۲۱ء ص ۱۵

۱۰۲۔ سلام سندیلوی، ادبی اشارے، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۱ء ص ۲۰۳

۱۰۳۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، جدید اردو شاعری، مشمولہ کراچی "اردو دنیا"، ۱۹۶۱ء ص ۲۰۲

۱۰۴۔ سراج منیر، آنکھوں میں جھلکتا ہے دھڑکتا ہوا دل، مشمولہ ادب لطیف، اپریل ۱۹۸۲ء ص ۱۸

۱۰۵۔ ظل حسین عابدی، ڈاکٹر جدید شاعری اور رومانوی تحریک "رسالہ نگار، سالنامہ، ۱۹۶۵ء ص ۳۲۲

۱۰۶۔ ناہید قاسمی، ڈاکٹر، جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، سال ۱۸۰۴ء تا حال، مقالہ پی ایچ ڈی، غیر مطبوعہ لاہور، پنجاب یونیورسٹی اورنٹیل کالج، ۱۹۹۶ء ص ۶۶

۱۰۷۔ محمد حسن، ڈاکٹر اردو ادب میں رومانوی تحریک، ص ۸۳

۱۰۸۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، جدید شاعری، لاہور اردو دنیا، ۱۹۶۱ء ص ۲۲۴

۱۰۹۔ (الف) انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، ابتدائی دور سے ۱۹۷۵ء تک کراچی انجمن ترقیٔ اردو پاکستان، ۱۹۸۵، ص ۴۸۳

۱۱۰۔ (ب) انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، ابتدائی دور سے ۱۹۷۵ء تک کراچی انجمنِ ترقیٔ اردو پاکستان، ۱۹۸۵، ص ۴۸۴

۱۱۱۔ معین الدین عقیل، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، کراچی انجمن ترقی پاکستان، ۱۹۷۶ء ص ۴۷۳

۱۱۲۔ احمد علی، تحریک ترقی پسند مصنفین اور تخلیقی مصنف بحوالہ سلیم اختر، ڈاکٹر اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، گیارہواں ایڈیشن، جنوری ۱۹۸۶ء ص ۳۲۳

۱۱۳۔ Muhammad sadiq, Dr A History of urdu literature, second addition, Karachi, Oxford Press, 1980, P534-535

۱۱۴۔ علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، علی گڑھ، انجمنِ ترقیٔ اردو، ۱۹۵۷ء ص ۱۶۳

۱۱۵۔ احمد علی، ترقی پسند تحریک، ماہنامہ فانوس خاص اشاعت، لکھنؤ ۱۹۸۲ء ص ۱۴۷

باب دوم

آپ بیتی نگاری

تذکرہ، یادداشت، روزنامچہ نگاری، مکتوب نگاری اور سفر نامہ نگاری میں مصنف اپنی زندگی کے کسی ایک گوشے پر روشنی ڈالتا ہے یا پھر کسی خاص ماحول یا معاشرے میں خود کو داخل کر کے اس خاص ماحول یا معاشرت کو ضبط تحریر میں لاتا ہے۔ جبکہ سوانح زندگی کے کسی ایک گوشے کی بجائے کسی فرد کی زندگی کے ہر دور کے نمائندہ واقعات کو پیش کرتی ہے۔ اس میں مصنف کا بچپن، جوانی، بڑھاپا تمام تر خوبیوں اور خامیوں سمیت عیاں ہوتا ہے۔ مصنف کی شخصی، نفسیاتی، سماجی، تاریخی اور اخلاقی زندگی کے مختلف گوشوں کو سوانح نگاری کے ذریعے اجاگر کیا جاتا ہے۔ اُس کی سوانح اگر کوئی اور شخص تحریر کر رہا ہے تو وہ اس کی عمر کا آخری حصہ یعنی اس کی موت کے بارے میں بھی لکھ سکتا ہے لیکن اگر سوانح خود نوشت ہے تو اس کی آخری زندگی کے واقعات کے بیان سے وہ محروم رہ جاتا ہے۔

سوانح عمری اگر کوئی اور شخص تحریر کر رہا ہے تو عام طور پر وہ اس کی زندگی کے حالات و واقعات کو بڑی چھان بین کے بعد بے لاگ سچائی کے ساتھ پیش کر سکتا ہے۔ سوانح نگار کے سامنے اگر تحقیق کی صداقت کا سوال ہو تو وہ لگی لپٹی رکھے بغیر اپنا مطمح نظر پیش کرے گا اور کھرے کھوٹے کا فیصلہ دے گا۔ اس کے برعکس خودنوشت سوانح نگار خود ہی منصف اور خود ہی گواہ ہوتا ہے اس لیے اس کی صداقت کے بارے میں شک وشبہہ کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ خودنوشت سوانح نگاری میں اصل کو ملمع کاری کے ذریعے چھپایا جاتا ہے۔ خود کو بے باک، نڈر اور بے خوف ثابت کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سید عبداللہ رقمطراز ہیں:

> ''خودنوشت سوانح عمریوں کی صنف دوسروں کی لکھی ہوئی سوانح عمریوں کے مقابلے میں خاصی نارسا اور ناقص چیز ہوتی ہے۔ اس کے راستے میں دو بڑی رکاوٹیں ہوتی ہیں۔ دوسروں کا خوف اور اپنے آپ سے محبت۔ ایک اچھا خاصا سوانح نگار اپنے فن کی لاج رکھنے کے لیے بہت سی ایسی باتیں بھی بیان کر دیتا ہے جو خودنوشت نویس کے لیے ممکن نہیں ہوتیں۔ سوانح نگار اپنے ہیرو کے کردار کا جج بن سکتا ہے۔ اس کی کمزوریوں کا شمار بھی کر سکتا ہے لیکن آپ بیتی میں اپنی محبت اور دوسروں کا خوف ہر وقت دامن گیر ہوتا ہے وہ نہ اپنے گناہوں کی صحیح فہرست پیش کر سکتا ہے اور نہ اپنا صحیح جج بن سکتا ہے۔''(۱)

یعنی یہ تو ہو سکتا ہے کہ کوئی اپنی آپ بیتی میں اپنی زندگی کے خاص خاص واقعات تحریر کر دے یا اپنے باطنی محرکات لکھ دے لیکن وہ سب کچھ تحریر نہیں کر سکتا جو اُس کے دل پر گزرتی ہے۔ وہ بہت سی باتیں چھپا لیتا ہے اور کچھ تحریر کر دیتا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر سید عبداللہ نے اسے نارسا اور ناقص قرار دیا ہے۔ بعض اوقات مصنف وہ کچھ بننے کی کوشش کرتا ہے جو کچھ وہ نہیں ہے یا بہت زیادہ مبالغے سے کام لیتا ہے۔ عام طور پر لوگ آپ بیتی میں اظہار کی بجائے اخفا سے کام لیتے ہیں۔ خود کو نہایت راست گو اور بلاکم وکاست سب کچھ بیان کرنے والا بتاتے ہیں۔ اسی حوالے سے وہ روزنامچے بھی آجاتے ہیں جن میں اصلی ناموں کی جگہ ناموں کے حروفِ اوّل لکھ دیئے جاتے ہیں مثلاً ''س''، ص، ع'' وغیرہ۔ زیادہ تر یادداشت پر بھروسا کیا جاتا ہے۔ آپ بیتی نہایت تاثراتی چیز ہوتی ہے۔ اگر یہ سوانح عمری ہے تو اس کو سائنٹیفک ہونا چاہیے۔ اچھا سوانح نگار اپنے مواد سے بال برابر بھی زیادہ نہیں تحریر کر سکتا۔ آپ بیتی میں مواد اپنی ذات کے اندر سے نکالنا پڑتا ہے۔ آپ بیتی میں صداقت خصوصی کی جستجو ضروری ہے۔ اپنے اعمال پر ایک جج کی نظر رکھنا مشکل ہے کیونکہ خود کو جانچنا ایک مشکل کام ہے۔

کفایت اردو لغت میں آپ بیتی کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

آپ بیتی: (اردو، اسم مونث) اپنی کہانی، اپنا ماجرا، اپنی سرگذشت، اپنا حال، خودنوشت حالاتِ زندگی (۲)

فیروز اللغات میں آپ بیتی کے معنی یہ تحریر کیے گئے ہیں۔

آپ بیتی: اپنی کہانی، اپنا حال، خود نوشت حالاتِ زندگی(۳)

انگریزی میں آپ بیتی کو Autobiography کا نام دیا گیا ہے۔

The Concise English Dictionary میں autobiography کی تعریف یہ کی گئی ہے۔

"Autobiography, writing the story of one's own life; story so written; hence n 'Autobiographric (AL) (ADJ, (F, Auto+Biography) (4

اردو سائنس بورڈ کی طبع کردہ فالن ڈکشنری میں آٹو بائیو گرافی کی تعریف یوں کی گئی ہے:

Autobiography,n, تزک، اپنا تذکرہ جو عین حیات میں آپ لکھے، ترجمۂ حال، آپ بیتی و خود گذشت، خود نوشت،(۵)

انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا میں خود نوشت سوانح کی کچھ یوں وضاحت کی گئی ہے:

Autobiography is a very close relative, or special form of biographical literature; it is the life of a man that happens to have been written by himself and is therefore (unfinished."(6

آپ بیتی یا خود نوشت سوانح مصنف کی زندگی کے تجربات و مشاہدات، محسوسات و نظریات کی سچی اور پکی داستان ہوتی ہے اس میں کسی قسم کی بد دیانتی گوارا نہیں کی جا سکتی۔ طفیل احمد اس بارے میں لکھتے ہیں۔

آپ بیتی کسی انسان کی زندگی کے تجربات، مشاہدات، محسوسات و نظریات کی مربوط داستان ہوتی ہے جو اس نے سچائی کے ساتھ بے کم و کاست قلم بند کر دی ہو۔ جس کو پڑھ کر اس کی زندگی کے نشیب و فراز معلوم ہوں۔ اس کے نہاں خانوں کے پردے اٹھ جائیں اور ہم اس کی خارجی زندگی کی روشنی میں پرکھ سکیں۔"(۷)

ساقی فاروقی آپ بیتی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"آپ بیتی کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ بہ وجوہ اس میں "آپ" ہی کی سلطانی ہوتی ہے اور "بیتی" بے چاری کبھی کبھی حسب منشاء اور حسب توفیق آ جاتی ہے۔ ہیہات کہ آپ بیتی لکھنے والا پیدا ہوتے ہی آپ بیتی شروع نہیں کر سکتا۔ اسے ایک زندگی گزارنی پڑتی ہے اور زندگی کرنے کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور قیمت ادا کرتے کرتے اتنا وقت گزر جاتا ہے کہ "خود نوشت باز" اس خوش فہمی یا غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی سطح پر "عوام" سے بلند ہو گیا ہے اور "خواص" میں شامل ہو گیا ہے۔ یہی نہیں اس عرصے میں اس کے بہت سے "گواہ" یا تو پیوند خاک ہو جاتے ہیں یا نذرِ آتش۔"(۸)

خود نوشت سوانح میں مصنف کی زندگی کی داخلی اور خارجی کیفیات کا بیان ہوتا ہے اس کی زندگی کے مختلف ادوار میں اس کی نفسیاتی، اخلاقی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی کیفیات کا بیان ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کے ارتقائی مدارج سب اس میں جلوہ فگن ہوتے ہیں۔ اس میں مصنف کا لہجہ کبھی مزاحیہ ہوتا ہے، کبھی حزنیہ کبھی طنزیہ، کبھی نشاطیہ۔ کبھی خطابیہ اور کبھی سنجیدہ انداز بیاں موقع محل کے حساب سے استعمال کرتا ہے۔

آپ بیتی ذاتی حالات کے علاوہ اپنے عہد اور ماحول کی مرقع نگاری بھی کرتی ہے اور آپ بیتی صرف ذات کے تجربات تک محدود نہیں رہتی بلکہ ذات کے پس منظر میں ایک خاندان کے صدیوں کے تجربات کا نچوڑ ہوتی ہے۔ غفور شاہ قاسم لکھتے ہیں۔

''آپ بیتی صرف ذات کے تجربات تک محدود نہیں رہتی بلکہ ذات کے پس منظر میں ایک خاندان کے کئی صدیوں کے تجربات کا نچوڑ بھی ہوتی ہے۔ زندگی گوناگوں تجربات کا مرکز ہے۔ ہر سانس ایک تجربہ ہے اور ہر لحہ ایک نیا جہاں تخلیق ہو رہا ہے۔ ایک اچھی بیتی آپ بیتی نگار کی ہر سانس کا محاسبہ ہے۔ اپنے کردار اور اپنی شخصیت کی ہو بہو عکاسی کے معاملے میں آپ بیتی لکھنے والے کو ظاہراً جتنی

آسانیاں میسر ہیں ان سے زیادہ مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ چنانچہ اظہار ذات کی ہر سعی کے ساتھ ساتھ اخفائے ذات کی لاشعوری کوشش بھی ہمرکاب رہتی ہے۔"(۹)

عام طور پر آپ بیتی کے لیے نثر استعمال کی جاتی ہے کیونکہ آپ بیتی جس تفصیل کی متقاضی ہوتی ہے اس کے لیے نثر بہترین ذریعہ ہے۔ اردو کی بہترین آپ بیتیاں نثر میں لکھی گئی ہیں۔ نظم میں آپ بیتیوں کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا مثلاً واجد علی شاہ، منیر شکوہ آبادی کی آپ بیتیاں نظم میں لکھی گئی ہیں لیکن نثر میں زیادہ بہتر طور پر اپنی بات پہنچائی جا سکتی ہے، ڈاکٹر سلمان علی اپنے مضمون "خودنوشت سوانح عمری چند بنیادی مباحث" میں لکھتے ہیں۔

جہاں تک آپ بیتی کے فن وتکنیک کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں خودنوشت کا مصنف اپنے حالات زندگی بیان کرنے کے لیے کسی مخصوص ہیئت کا پابند نہیں ہوتا جن کی بنیاد پر خودنوشت کا فن ایک انتخابی فن ٹھہرتا ہے لیکن اس کے مزاج کو نثری ہیئت ہی راس آتی ہے۔(۱۰)

ڈاکٹر وزیر آغا کی "آدھی صدی کے بعد" اور حمایت علی شاعر کی "آئینہ در آئینہ" میں منظوم شکل میں مصنفین کی عمر گذشتہ کی باز آفرینی کی گئی ہے۔ جہاں آپ بیتی شخصیت کے بارے میں بہت سا مواد مہیا کرتی ہے وہاں انسان کی زندگی میں ایسے واقعات بھی ہوتے ہیں جن کو خدا کے علاوہ کوئی بھی نہیں جانتا اور ایسے واقعات کو بیان نہ کرنا بہتر ہوگا۔ جمیل عدیل لکھتے ہیں:

آپ بیتی اظہائے ذات کا نام ہے لیکن ایک درجے میں آپ بیتی اخفا کا نام بھی ہے۔"(۱۱)

آپ بیتی نگار بعض اوقات اپنی آپ بیتی دوستوں اور عزیزوں کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر لکھتا ہے اور بعض اوقات اپنی انا کی تسکین کے لیے تحریر کرتا ہے اور اپنے جذبات کی تطہیر کے لیے بھی آپ بیتی کو ضروری سمجھتا ہے۔ڈاکٹر صبیحہ انور لکھتی ہیں۔

"یہ انا کی ہی تحریک ہے جس کے باعث کوئی انسان، اپنی ذات اور شخصیت کے اظہار کے لیے اپنی خودنوشت سوانح حیات لکھتا ہے۔"(۱۲)

ڈاکٹر صبیحہ انور نے معیاری آپ بیتی کے لیے تین شرائط کا ذکر کیا ہے، سچائی، شخصیت اور فن۔ اگر ایک آپ بیتی میں پائے جاتے ہیں تو وہ معیاری آپ بیتی کہلائے گی۔ ہم اردو خودنوشت کو مواد اور ہیئت کے لحاظ سے مختلف اقسام میں تحریر کر سکتے ہیں۔ڈاکٹر وہاج احمد علوی نے "اردو خودنوشت: فن و تجزیہ" میں خودنوشت کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ مواد کے لحاظ سے خودنوشت مذہبی، ادبی، سیاسی اور سماجی ہوتی ہے جبکہ ہیئت کے لحاظ سے مکمل، نامکمل، مختصر، مکتوباتی، افسانوی اور سوانحی ناول میں تقسیم کی جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں

"خودنوشت سوانح حیات ایک سیال ہے جو ہر شکل میں ڈھل سکتا ہے۔خودنوشت کے مصنف کو مواد کے لیے ہیئت کی تلاش نہیں کرنی پڑتی بلکہ یہ مواد لچک دار ہوتا ہے اور خود بہ خود اپنی فطری ہیئت میں ڈھل جاتا ہے۔"(۱۳)

ڈاکٹر محمد عمر رضا نے اپنی کتاب "اردو میں سوانحی ادب فن اور روایت" میں ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے خودنوشت سوانح کو پانچ درجوں میں تقسیم کیا ہے۔

1- مذہبی خودنوشت سوانح
2- تاریخی خودنوشت سوانح
3- سیاسی وسماجی خودنوشت سوانح
4- افسانوی خودنوشت سوانح
5- ادبی وفکری خودنوشت سوانح

ہر مصنف کا اپنا انداز بیاں اور انداز نگارش ہوتا ہے جو اسی سے مخصوص ہوتا ہے اور اسی کو ہم اسلوب کہتے ہیں۔ یہ انداز نگارش خود نوشت سوانح عمری میں اثر انداز ہوتا ہے۔ ڈاکٹر پرویز پروازی لکھتے ہیں۔

... ''جتنے منہ اتنی باتوں کے مصداق خود نوشت سوانح کے اسلوب کے بارے میں یہ محاورہ وضع کر لینے میں کوئی حرج نہیں کہ جتنے خود نوشت سوانح نگار اتنے اسلوب۔''(۱۴)

خود نوشت سوانح عمری ذاتی اور ذہنی سطح پر ایک دوسرے سے ممتاز ہوتی ہیں۔ لکھنے والا کون ہے اور اُس نے واقعات کو کتنی اہمیت دی ہے اور اس کی ذہنی اُپج اور کسی بھی واقعے پر اس کا ردعمل کیا ہے، خود نوشت سوانح عمریاں اس کی عکاس ہوتی ہیں۔ عبد المغنی لکھتے ہیں:

''دراصل اسلوب کا کردار مجرد الفاظ و تراکیب اور استعارات و تلمیحات سے نہیں متعین ہوتا۔ اس کے تعین میں فیصلہ کن چیز وہ لب و لہجہ، انداز و ادا ہے جو اس کے پیچھے کارفرما اور اس سے مترشح ہوتا ہے۔ ایک پورے مضمون کے ایک ٹکڑے اور ایک فقرے سے جو ذہنی رو اور فضا محسوس ہوتی ہے اسی سے اسلوب کا پتہ چلتا ہے۔ پھر ہر لفظ، ہر ترکیب، ہر فقرے کا انداز روح اسلوب کی اسی نشاندہی کے مطابق مشخص ہوتا ہے۔''(۱۵)

آپ بیتی بہت سی جگہوں پر جگ بیتی بن جاتی ہے اور تاریخ کے کئی حقائق خود نوشت سوانح نگاری کے ذریعے منظر عام پر آجاتے ہیں حالانکہ خود نوشت سوانح حیات تاریخ نہیں ہوتی۔ کچھ خود نوشت سوانح نگار کہانی سنا اور کچھ کہانی سن رہے ہوتے ہیں۔ یعنی انداز بیاں اور سوچنے کا انداز اس فرق کا باعث بنتا ہے۔ قدرت اللہ شہاب اپنی آپ بیتی میں کہانی سناتے اور وزیر آغا کہانی سنتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور کہنے اور سننے کا یہی فرق ان دونوں سوانح عمریوں کو متمیّز کرتا ہے۔

آپ بیتی میں مصنف مرکزی کردار ہوتا ہے اور سارے کردار و واقعات اسی کی ذات کے گرد گھومتے ہیں۔ ایسی صورت میں محاسبہ نفس اور اپنی ذات کی نفی کٹھن مرحلہ بن جاتے ہیں۔ ڈاکٹر سید شاہ علی اپنی کتاب اردو میں سوانح نگاری میں اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

''خود نوشت سوانح عمری ایک سخت دشوار اور قوتِ فیصلہ کو متزلزل کر دینے والی چیز ہے۔ اور وہ ایمانداری تجزیاتی نظر، خود آگاہی اور واقعیت پسندانہ دیانتداری سے عاری ہو سکتی ہے۔ مزید برآں سب سے عقل مند یا ایمان دار کے لیے بھی پردہ داری، ترمیم، اضافے یا مبالغے کے باوجود ہو سکتی ہے۔''(۱۶)

کچھ آپ بیتیوں میں روشِ عام سے ہٹ کر چلنے کا انداز بھی پایا جاتا ہے۔ کشور ناہید کی ''بری عورت کی کتھا'' خود کلامی کے انداز میں لکھی گئی ہے اور حمید نسیم کی آپ بیتی ''ناممکن کی جستجو'' میں مصنف نے اپنے لیے ضمیر متکلم یعنی ''میں'' کی بجائے صیغہ واحد غائب یعنی ''وہ'' استعمال کیا ہے۔ ممتاز مفتی نے اپنی خود نوشت ''علی پور کا ایلی'' میں ناول کی تیکنیک استعمال کی ہے۔

عام طور پر جب آپ بیتی تحریر کی جاتی ہے تو ترتیبِ واقعات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے تاکہ قاری کی طبیعت پر بوجھ نہ پڑے اور تسلسل و روانی کی رو میں بہتا ہوا وہ مصنف کے ساتھ سفر کرتا رہے۔ اس ضمن میں احسان دانش کی آپ بیتی ''جہانِ دانش'' و ''جہان دیگر'' اور میرزا ادیب کی ''مٹی کا دیا'' کی مثال دی جاسکتی ہے جہاں واقعاتی ترتیب تاریخی اعتبار سے نہیں ہے جس کی وجہ سے خود نوشت سرگذشت میں ترتیبِ واقعات کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ جوش نے اپنی آپ بیتی میں اس کا خیال رکھا ہے کہ واقعات زمانی ترتیب سے بیاں ہوں۔ ادا جعفری کی خود نوشت ''جو رہی سو بے خبری رہی'' اور جاوید اقبال کی خود نوشت ''اپنا گریباں چاک'' میں ترتیب واقعات کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔

کوئی مصنف جب آپ بیتی لکھنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اپنی زندگی کے اہم واقعات کو منتخب کرتا ہے جو اس کی نظر میں اہم ہوتے ہیں اور قاری سے بھی دلچسپی اور پسندیدگی کی سند پا سکتے ہیں۔ یہ واقعات کی شخصیت کی نمائندگی کھل کے بیان کر سکتے ہیں اس لیے انتخاب واقعہ اہم ہو جاتا ہے۔ اگر واقعات کا انتخاب نہ کیا جائے تو آپ بیتی غیر ضروری طوالت کا شکار ہو جاتی ہے اور اس کی ضخامت قاری کی طبیعت پر گراں بار ہوتی

ہے۔ اس حوالے سے عشرت رحمانی کی آپ بیتی ''عشرتِ فانی'' کی مثال دی جاسکتی ہے۔ نیز خواجہ محمد سعید کی آپ بیتی ''گورنمنٹ کالج اور میں'' انتخابِ واقعات کی خامی کے حوالے سے نمایاں ترین ہے۔ اس میں مصنف نے انتہائی غیر اہم اور غیر دلچسپ واقعات کو منتخب کیا ہے۔

حمید نسیم نے اپنی سر گذشت ''ناممکن کی جستجو'' میں علمی، لسانی اور فلسفیانہ بحثوں کو شامل کیا ہے جس کی وجہ سے خود نوشت میں بعض مقام عدم تسلسل کا شکار ہو گئے ہیں۔ خود نوشت میں ناصحانہ اور مبلغانہ باتوں کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔ ہاں حسب ضرورت علم و حکمت، سوجھ بوجھ اور بصیرت افروز موضوعات پر اپنا نقطہ نظر مختصر طور پر بیان کیا جاسکتا ہے۔ ''جہانِ دانش'' میں علم و دانش کا اک جہاں آباد ہے لیکن آپ بیتی کو بوجھل اور غیر دلچسپ نہیں ہونے دیا۔ زیڈ اے بخاری کی ''سرگذشت'' اور حمیدہ اختر کی ''ہم سفر'' اور ''نایاب ہیں ہم'' اس کی بہترین مثال ہیں جو اپنی روانی، تسلسل اور فصاحت کے حوالے سے مشہور ہیں باوجود کہ ان میں بصیرت افروز واقعات کا بیان ہے۔

آپ بیتی کا تعلق فرد کی ذات سے ہوتا ہے۔ جب کوئی انسان اپنے آپ کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہے تو اسے خود کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔ اُس میں چاہے جانے کا جذبہ ضرورت سے زیادہ پروان چڑھ جائے تو اُس کی یہ کیفیت نرگسیت کے زمرے میں آجاتی ہے۔ اور آپ بیتی لکھنے کا اہم محرک خود نمائی اور نرگسیت کا جذبہ بھی ہوتا ہے۔ بشیر سیفی اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

> ''عام طور پر آپ بیتیاں خودستائی کے جذبے کے تحت لکھی جاتی ہیں اور آپ بیتی نگار کا مقصد زیادہ تر اپنی ذات کو نمایاں کرنا ہوتا ہے۔''(۱۷)

ذات سے محبت کا اظہار خود پسندی کے زمرے میں نہیں آتا لیکن حد سے بڑھی ہوئی محبت کہ انسان اپنے سوا کچھ دیکھ نہ سکے۔ چاہے جانے کا احساس سوا ہو جائے تو ایسی حالت میں خود نمائی نرگسیت کی حدوں کو چھو لیتی ہے۔ زیڈ اے بخاری، میرزا ادیب اور اخلاق احمد دہلوی کے ہاں ذات سے محبت اور خود نمائی کا احساس نہیں ہے۔ احساس دانش نے خود تو اپنے آپ کو نمایاں نہ کیا لیکن مولانا تاجور نجیب آبادی کا ایک تجزیہ اپنی کتاب میں شامل کیا ہے جو کہ احسان دانش کی تعریف اور تحسین پر مشتمل ہے اور یہ خود نمائی کے زمرے میں آتا ہے اور ''جہان دانش'' میں بھی اپنی تعریف کا پہلو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کچھ آپ بیتیاں مزاح کے رنگ میں لکھی گئی ہیں جیسے مشتاق احمد یوسفی کی ''زرگزشت'' اور کرنل محمد خان کی ''بجنگ آمد'' اس کی مثال ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی ''نشانِ جگر سوختہ'' شگفتہ اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ زیڈ اے بخاری کی ''سرگذشت'' بھی شگفتہ اسلوب میں ہے۔

بعض آپ بیتیاں مصنف کی ذات کے گرد زیادہ گھومتی ہیں اور ان کے اندر کا حال زیادہ سناتی ہیں۔ میرزا ادیب کی ''مٹی کا دیا''، ڈاکٹر وزیر آغا کی ''شام کی منڈیر سے'' اور رحیم گل کی ''داستان چھوڑ آئے'' مصنف کی زندگی کو نمایاں کرتی ہیں۔

بعض آپ بیتیاں افسانوی رنگ میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں قدرت اللہ شہاب کی ''شہاب نامہ''، میرزا ادیب کی ''مٹی کا دیا'' اور جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی برات'' شامل ہیں۔

کچھ آپ بیتیوں میں شخصیت کے ساتھ ساتھ عہد کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔ اس حوالے سے احسان دانش کی ''جہان دانش''، کشور ناہید کی ''بری عورت کی کتھا''، ڈاکٹر عبادت بریلوی کی ''یادِ عہد رفتہ'' ادا جعفری کی ''جو رہی سو بے خبری رہی'' اور ''شہاب نامہ'' شامل ہے۔ کلیم الدین احمد کی آپ بیتی ''اپنی تلاش میں'' میں وہابی تحریک کا بے حد تفصیلی ذکر موجود ہے۔

خاکہ نگاری کے علاوہ تعارف، تذکرے اور روزنامچہ نگاری بھی آپ بیتیوں میں جگہ بنا رہے ہیں۔ شہرت بخاری کی ''کھوئے ہوؤں کی جستجو''، حمیدہ اختر کی ''نایاب ہیں ہم'' اور ''ہم سفر''، اختر حسین رائے پوری کی ''گردِ راہ''، احسان دانش کی ''جہان دانش''، قدرت اللہ شہاب کی ''شہاب نامہ''، عبدالمجید سالک کی ''سرگزشت''، رحیم گُل کی ''داستاں چھوڑ آئے''، آغا ناصر کی ''گمشدہ لوگ'' اور جوش ملیح آبادی کی یادوں کی

برات'' میں کئی خاکے مکمل اور کئی مبہم صورت میں موجود ہیں۔ کچھ آپ بیتیوں میں شخصی خاکے بہت کم ہیں یا سرے سے اس طرف توجہ نہیں دی گئی۔ کشور ناہید کی ''بری عورت کی کتھا'' اس کی مثال ہے۔ ''شام کی منڈیر سے'' میں خاکہ نگاری خال خال ہے۔

کچھ آپ بیتیوں میں مصنفین نے نفسیاتی رموز کو کامیابی سے استعمال کیا ہے اور نفسیاتی شعور کی ترجمانی ان کی آپ بیتی میں دکھائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی آپ بیتی ''نشانِ جگر سوختہ'' ان کے نفسیاتی شعور کی آئینہ دار ہے۔

مصنف اپنی زندگی کے حالات وواقعات سے تو متعارف کرواتا ہے لیکن اس کی طبیعت، ذہنیت، دبی ہوئی خواہشات اور چھپی ہوئی ذہنی اُلجھنوں کا بصیرت آمیز ذہنی تجربہ کرنے کا موقع بھی ملتا ہے یعنی ''آپ بیتی'' کے ذریعے سے کتھارسس بھی ہوتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے فلیش بیک کی تیکنیک بھی استعمال کی ہے۔ قراۃ العین حیدر کی ''کارِ جہاں دراز'' ہے میں بھی فلیش بیک کی تیکنیک استعمال کی گئی ہے۔ انتظار حسین نے ''جستجو کیا ہے؟'' اور ''یہ نصف صدی کا قصہ ہے'' میں فلیش بیک کی تیکنیک کو کامیابی سے برتا ہے۔ ''چراغوں کا دھواں'' میں بھی کہیں کہیں یہ تیکنیک استعمال ہوئی ہے۔ محمود نظامی نے ''آپ بیتی'' میں فلیش بیک کی تیکنیک استعمال کی ہے۔

شورش کاشمیری کی ''بوئے گل، نالہ ٔدل، دودِ چراغ محفل'' میں سیاسی زندگی کا بیان ہے۔ عبدالمجید سالک کی ''سرگذشت'' بھی اپنی ذات سے زیادہ اپنے عہد کی عکاس ہے۔ قدرت اللہ شہاب کی ''شہاب نامہ'' میں بھی سیاستِ دوراں کا ذکر ہے۔ بے نظیر بھٹو کی ''دخترِ مشرق'' اور کوثر نیازی کی ''اور لائن کٹ گئی'' میں ملکی سیاست اور اپنا عہد بیان کیا گیا ہے۔

کہیں کہیں آپ بیتی میں فلسفیانہ موشگافیاں بیان ہوں تو کوئی ہرج نہیں لیکن اگر آپ بیتی میں آپ سارا فلسفہ ہی ڈال دیں تو آپ بیتی اپنی دلچسپی اور اثر کھو دیتی ہے کیونکہ قاری زندگی کے تمام رنگ اور تخلیقی خوبصورتی آپ بیتی میں دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ فلسفیانہ باریک بینیاں اور نفسیاتی اُلجھنیں جاننے کے لیے آپ بیتی کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر تحسین فراقی اس بارے میں رقمطراز ہیں۔

''آپ بیتی فلسفہ تو نہیں لیکن وہ غنائی فلسفہ ضرور ہوتی ہے۔ اس Lyrical Philosophy میں غنا اور غزل بھی ہوتی ہے اور گداز اور گیراؤ بھی۔ گویا زندگی کی ساری دھوپ چھاؤں''(۱۸)

کسی جگہ سوانحی ناول نے آپ بیتی کی جگہ لے لی ہے۔ نذیر احمد کا ''ابن الوقت''، رسوا کا ''امراؤ جان ادا'' اور ''شریف زادہ'' قراۃ العین حیدر کا ''کار جہاں دراز ہے'' (دوجلدیں) اور ممتاز مفتی کا ''علی پور کا ایلی'' سوانحی ناول نگاری میں آپ بیتی کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔

مشاہیر کی آپ بیتیاں پڑھنے سے قاری ان کے تجربات سے بہت کچھ سیکھتا ہے اور دلچسپی و شگفتگی کے ساتھ ساتھ سامانِ عبرت بھی حاصل ہوتا ہے۔ ماضی کی غلطیاں اور کوتاہیاں حال کو بہتر بنانے اور مستقبل کی تعمیر کا سبق دیتی ہیں۔ انسان خود شناسی سے خدا شناسی کی طرف راغب ہوتا ہے۔ یہی عرفانِ ذات اسے احساس ندامت سے نکال کر تخلیق کے حسن کو دوچند کر دیتا ہے۔ مصنف کی زندگی کی جذباتی، ذہنی اور نفسیاتی تبدیلیاں اپنی ارتقائی منازل کے ساتھ قاری پر عیاں ہو جاتی ہیں۔ مصنف کی متشکک طبیعت اسے بعض اوقات دہریت کی طرف لے جاتی ہے۔ قاری کے سامنے اس کے انحراف کے سارے رویے آ جاتے ہیں۔ وہ مصنف کی سیمابی واضطراری حرکات کے پس پشت عوامل کو جان کر اس کی شخصیت کو بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے۔

خود نوشت سوانح لکھنا ایک فن ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے اپنی کتاب ''تکلمات'' میں اس فن کا سب سے بڑا اصول بیانِ واقعہ پر قدرت بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ ''اس مہارت کے بغیر کوئی بھی انسان اپنے سوانح زندگی کو بہتر انداز میں قلم بند نہیں کر سکتا ہے۔ مشق اور تربیت اس معاملے میں فوائد سے خالی نہیں ہو سکتی۔ جن لوگوں کو نثر لکھنے کی مشق ہو وہ زیادہ بہتر طور پر خود نوشت سوانح تحریر کر سکتے ہیں۔(۱۹)

جوش ملیح آبادی باوجود شاعر، ادیب اور صحافی تھے لیکن جب آپ بیتی تحریر کی تو کوئی بار مبیغّہ لکھا۔ مصنف جب کچھ تحریر کرنے لگتا ہے تو اپنا تجربہ، علم اور ذہانت بروئے کار لا کر دنیا کے روبرو ایک شاہکار پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بعض اوقات وہ حالات و خیالات کی توثیق دستیاب ذرائع سے کرتا ہے اور مختلف ماہرین فن کی کتب اور مضامین سے بھی اخذ و استفادہ کرتا ہے لیکن جب کوئی آپ بیتی نگار اپنی آپ بیتی میں عمیق مطالعے اور ہمہ جہتی مشاہدے کی بجائے سرقہ نویسی سے کام لیتا ہے تو اس کی آپ بیتی بھی وہ پذیرائی حاصل نہیں کر سکتی جو طبع زاد آپ بیتیوں کو حاصل ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان کی آپ بیتی "یادوں کی دنیا" اردو آپ بیتیوں میں ایک گراں بہا اضافہ ہے جبکہ آغا اشرف نے اپنی آپ بیتی "ایک دل ہزار داستان" میں ڈاکٹر یوسف حسین خان کی تصنیف سے بہت زیادہ اخذ و استفادہ کیا ہے اور سرقہ نویسی کی مثال قائم کی ہے جس سے ان کی آپ بیتی کو اردو ادب میں زیادہ اہمیت اور پذیرائی حاصل نہ ہو سکی۔

بعض اوقات خود نوشت نگار خود کو بہت بڑا حقیقت نگار اور صداقت کا پرستار ثابت کرنے کے لیے اپنی جنسی بے راہ رویوں اور دیگر نازیبا امور کو چٹخارے لے لے کر بیان کرتا ہے جس سے ادب میں اُس کی صداقت اور بے خوفی کو بطور مثال پیش کیا جا سکے۔ خود نوشت نگار کو ایسا تاثر پیش نہیں کرنا چاہیے کہ قارئین کو احساس ہو کہ خود نوشت نگار اسے برائی کی طرف راغب کر رہا ہے۔ جوش اور فراق گورکھپوری کے ہاں اپنی بے راہروی پر کوئی ندامت دکھائی نہیں دیتی۔ روسو اور گوئٹے کی تقلید میں خود کو بڑا حقیقت نگار ثابت کرنا بھی رومانوی شعراء و ادباء کے نزدیک پسندیدہ تھا۔ لیکن مشرقی اور مغربی معاشروں کے تقاضے مختلف ہیں جو چیز ان کے ہاں معیوب نہ ہے ہمارے ہاں قطعی ناقابل برداشت ہو سکتی ہے۔ اپنی باتوں پر پردہ ڈالنا اور مبالغے سے کام لینا فن خود نوشت نگاری کے خلاف ہے۔

اگر ہم یہ کہیں کہ اردو میں آپ بیتی کی صنف بھی اتنی قدیم ہے جتنا کہ خود آدمی ہے تو یہ غلط نہ ہو گا۔ انسان پر جو کچھ گزرتی ہے وہ جب کسی کو سناتا ہے تو گویا وہ اپنی آپ بیتی کہہ رہا ہوتا ہے۔ اپنی سرگزشت بیان کرنا انسان کی آپ بیتی کا نقطۂ آغاز ہے۔ انسان جب تک اپنی آپ بیتی نہیں لکھتا وہ اہم ہوتا ہے لیکن اس کو تحریر کر دینے کے بعد اس کی آپ بیتی اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔

آپ بیتی قبل مسیح بھی موجود تھی، کنفیوشس، افلاطون، بدھ کی بعض عبارتیں اور آگسٹن راہب کے اعترافات ابتدائی سوانح عمریوں کے نقوش ان میں پوشیدہ ہیں۔ 1570-71 میں کارلٹن نے اپنی خود نوشت (De Vita Propria) لکھی۔ مانتین نے اپنے قلبی اور باطنی رجحانات کو اپنے مضامین کے ذریعے 1571-89 کے درمیان بیان کیا۔ روسو نے اپنے اعترافات کو اپنا اعمال نامہ قرار دیا ہے۔ ناقدین نے ان اعترافات کو مبالغہ قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کو بھی روسو کی رومانی شوریدگی کے سبب ان پر پورا بھروسہ نہیں ہے۔

روسو کے اعترافات کی افتتاحی عبارت ڈاکٹر سید عبداللہ نے یوں پیش کی ہے:

> "میں نے سچائی اور پوری آزادی کے ساتھ اپنے عیب و ہنر کو بیان کیا ہے۔ میں نے اپنا کوئی جرم نہیں چھپایا۔ میں نے اپنی خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان نہیں کیا اور اگر کہیں کہیں میں نے زیبِ داستان کا ارتکاب کیا ہے تو محض اس وجہ سے کہ بعض بعض موقعوں پر میری یاد نے میرا ساتھ نہیں دیا لہٰذا مجھے وہ خلا پورے کرنے پڑے۔(۲۰)

روسو نے اپنے اعترافات میں خود کو ایک عام آدمی کے طور پر پیش کیا ہے جو بُرا بھی ہے اور اچھا بھی، وہ لکھتا ہے کہ میں جیسا بھی تھا ویسا ہی میں نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ کبھی بُرا اور قابل نفرت، کبھی نیک طینت۔ کشادہ دل اور رفیق۔ میرے بنی نوع میرے ان اعترافات کو سنیں۔ میری پستی پر شرمائیں، میرے دُکھ پر کانپ جائیں اور اگر ان میں سے کسی میں جرأت ہو تو وہ اسی خلوص اور جرأت کے ساتھ اپنے دل کو ٹٹولے اور اگر کہہ سکتا ہے تو صاف صاف کہہ دے کہ میں اسی آدمی (روسو) سے برتر ہوں۔"(۲۱)

بعد ازاں فرنکلن، گبسن، ہیوم، مل اور والٹ وٹمن آپ بیتی میں جزئیات نگاری، فلسفیانہ خود پسندی، اختصار اور عملی زندگی کی تصویر کشی کے حوالے سے مشہور ہوئے۔ مشہور صحافی فرینک ھیرس کی آپ بیتی (My Life and Adventure) اپنی جنسی تجربات اور سراپا نگاری کے حوالے سے مشہور ہوئی۔ اس نے اپنے عہد کے مشاہیر بسمارک، چرچل، کارل مارکس، موپساں، ملکہ وکٹوریہ اور ایڈورڈ ہشتم کے نہایت خوبصورت خاکے اپنی آپ بیتی میں پیش کیے ہیں۔

ملکہ وکٹوریہ کے آخری زمانے میں ہیری جے گرین وال کی آپ بیتی (I hate Tomorrow) شائع ہوئی۔ 1892ء میں ویب ملر کی آپ بیتی (I Found no peace) طبع ہوئی۔ سنسنی خیز واقعات سے یہ آپ بیتی بھری ہوئی ہے۔

اسی دور میں ملکہ کتھرائن کی آپ بیتی (The heart has its reason) شائع ہوئی۔ اس کے 55 عشاق کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اس آپ بیتی کو روسو کے اعترافات کے برابر کی چیز سمجھا جاتا ہے۔

اٹھارویں صدی میں یورپ میں آپ بیتی اور ناول کا امتزاج ملتا ہے، لیکن انیسویں صدی میں آپ بیتی کی شکل خاصی حد تک واضح ہو گئی۔ کارلائل، ڈارون، الفریڈ رسل، کارڈنیل نیومین، ہربرٹ سپنسر اور ٹرولوپ وغیرہ کی خود نوشت سوانح عمریاں خاصی مشہور ہوئیں۔ ایڈمنڈ گوس کی خود نوشت سوانح عمری اور سوانح عمری کا امتزاج (Father and son) ہے۔

روسو، جیولیس سیزر، سینیٹ آگسٹائن، گوئٹے، ونسٹن چرچل، لینن فرائڈ اور ہٹلر کے نام آپ بیتی کے حوالے سے اہم ہیں۔

قدیم دور میں ہندوستان میں مذہبی کتب میں سوانح نگاری کا التزام ملتا ہے۔ خود نوشت سوانح نگاری کا رواج نہیں تھا۔ اس کی باقاعدہ روایت مسلم دور حکومت سے شروع ہوتی ہے۔ تزکِ بابری یا بابر نامہ اپنے عہد کی لافانی تصنیف اور جزئیات نگاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ بابر نے اس کو ترکی زبان میں تصنیف کیا تھا۔ اکبر کے حکم سے اسے فارسی زبان میں منتقل کیا گیا۔ اب بہت سی زبانوں میں اس کے تراجم دستیاب ہیں۔ بابر کے بعد ''تزک جہانگیری'' اہم ہے اس میں خارجی واقعات کا بیان زیادہ ہے۔ ''تزکِ تیموری'' (جو کہ امیر تیمور سے منسوب کی جاتی ہے) اپنی صحتِ واقعہ کے حوالے سے مشکوک ہے کیونکہ اس میں مرض الموت اور موت کی تفصیلات کا بیان بھی ہے جو یقیناً آدمی خود تحریر نہیں کر سکتا۔ یہ بھی ترکی میں تھی، ابو طالب حسن نے فارسی میں ترجمہ کیا۔

میر تقی میر کی ''ذکرِ میر'' بھی فارسی میں ۱۷۸۳ء میں تحریر کی گئی۔ ناقدین نے اس تصنیف کو داخلی قرار دیا ہے حالانکہ اس میں خارجی واقعات کی بھی عکاسی ہے۔

۱۸۳۰ء میں انگلستان سے انگریزی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم لطف اللہ کی آپ بیتی (Autobiogaphy of lutfullah) کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ لندن پبلشرز اسمتھ ایلڈر اینڈ کمپنی سے شائع ہوئی۔ مذہب کے بارے میں تشکک کی کہانی ان کی آپ بیتی میں ملتی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کی (My life: A Fragment) گاندھی جی کی (Search of truth)، پنڈت جواہر لال نہرو کی (My Autobiography)، لکشمی پنڈت کی (So I became a minister) مسز کرشنا ہتی سلنگو کی (With no regrets) سر آغا خان کی (Memories) سر مرزا اسمٰعیل کی (My public life)، مولانا ابوالکلام آزاد کی (India wins freedom) ایم منشی کی (End of an era)، ڈاکٹر راجندر پرشاد کی (Autobiography)، چوہدری خلیق الزمان کی (Pathway to Pakistan)، میر فائق علی کی (Tragedy of Hyderabad)، ایوب خان کی (Friends not masters)، اندرا گاندھی کی (My truth) ذوالفقار علی بھٹو کی (If I am) آپ بیتیاں انگریزی میں ہیں۔ تہمینہ کھر کی آپ بیتی (My feudal lord) اور بے نظیر بھٹو کی (Daughter of the East)، بھی انگریزی میں تحریر کی گئی ہیں۔

اردو زبان میں آپ بیتی کب اور کہاں سے شروع ہوئی اس کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ نے نوعیت کے اعتبار سے آپ بیتی کی مختلف صورتیں بتائی ہیں۔ جن میں ۱۔ مکمل حالات زندگی ۲۔ زندگی کے کسی حصے کی روئیداد یا ایسی سوانح عمری جس کی مدد سے اپنے اہم فن یا اہم کارنامے کے ارتقاء کی داستان مرتب کی ہے۔ ۳۔ روزنامچے اور سفرنامے ۴۔ شخصی جھلکیاں یا شخصی خاکے ۵۔ کسی کی کہانی اس کی زبانی -6 شخصی انشائیے شامل ہیں۔

تحقیق بتاتی ہے کہ ریحانہ خانم اور مولانا علم الدین سالک کے نزدیک مولانا جعفر تھانیسری کی ''تواریخ عجیب'' عرف ''کالا پانی'' پہلی خود نوشت سوانح ہے جو کہ ۱۸۸۵ء کو طبع ہوئی۔ ڈاکٹر محمد صادق اور الطاف فاطمہ سر رضا علی کی خود نوشت ''اعمال نامہ کو اردو کی پہلی مستقل آپ بیتی قرار دیتے ہیں۔ عبد المجید قریشی نواب صدیق حسن خاں کی آپ بیتی ''البقا المنن بالقا المحسن'' ۱۸۸۵ء کو پہلی آپ بیتی کے درجے پر رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبد اللہ کے خیال میں ''کالا پانی'' جزوی آپ بیتی ہے۔ ''داستان غدر'' از ظہیر دہلوی، ''میرا افسانہ'' از چوہدری افضل حق، خواجہ حسن نظامی کی آپ بیتی اور محمد امین زبیری کی خود نوشت مکمل نہیں بلکہ جزوی آپ بیتیاں ہیں۔ ڈاکٹر محمد عمر رضا، محمد جعفر تھانیسری کی آپ بیتی، ''کالا پانی'' کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> ''یہ کتاب خود نوشت سوانحی تحریر تو ہے لیکن اسے باقاعدہ خود نوشت سوانح نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس میں جگہ جگہ خود نوشت سوانح کے اصولوں کی خلاف ورزی کی گئی ہے مثلاً اس میں انہوں نے اپنی پیدائش کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس کے باوجود اس میں خود نوشت سوانح کی بہت سی خوبیاں پائی جاتی ہیں اس لیے اسے اردو کی پہلی خود نوشت سوانح سے ضرور تعبیر کیا جا سکتا ہے۔''(۲۲)

''کالا پانی'' کے عنوان سے بھائی پرمانند نے بھی اپنی آپ بیتی تحریر کی ہے۔

جمیل احمد عدیل نے اپنے مقالے میں مختصر مضامین کو بھی خود نوشت سوانح عمریوں کی ذیل میں رکھا ہے کیونکہ ان میں بھی مصنفین نے آپ بیتی کی طرز کو برقرار رکھا ہے۔ یہ خود نوشتی خاکے مصنفین کی کتابوں کے دیباچوں اور اشعار میں موجود ہیں یا ان کے مضامین میں کہیں کہیں راہ پاتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبد اللہ کے خیال میں سید ہمایوں مرزا کی کتاب ''میری کہانی میری زبانی'' رضا علی کا ''اعمال نامہ'' دیوان سنگھ مفتون کی کتاب ''ناقابل فراموش'' عبد المجید سالک کی ''سرگذشت''، نقی محمد خان کی ''عمر رفتہ'' اور مولانا محمد حسین مدنی کی ''نقش حیات'' آپ بیتی کی صنف کے اوصاف کو کافی حد تک پورا کرتی ہیں۔

ہمایوں مرزا ''میری کہانی میری زبانی'' میں ایک متحرک شخصیت کی طرح مختلف ادوار سے گزرتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے خارجی تفصیلات زیادہ فراہم کی ہیں۔ بعض واقعات میں تفصیل بیانی کے شوق میں غیر ضروری باتیں بھی شامل ہو گئی ہیں۔

نواب صدیق حسن خان بھوپالی کی خود نوشت ''البقا المنن بالقاء المحسن'' ۱۸۸۵ء اولین آپ بیتیوں میں شمار ہوتی ہے۔ آپ وھابی تحریک سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی لیے انگریز نے ان کی کتاب ''ترجمانِ وہابیہ'' کی اشاعت کے بعد ان کا خطاب سلب کر لیا۔ انداز و اسلوب دلکشی سے محروم ہے۔ مختصر ہونے کی وجہ سے تشنگی کا احساس باقی رہتا ہے۔

عبد الغفور نساخ کی خود نوشت ''سوانح عمری'' میں واقعات کا تسلسل و ترتیب قائم نہیں ہے۔ موضوع اور مواد کے لحاظ سے اسے اردو خود نوشتوں میں بے حد ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ نساخ نے اپنے عہد کی معاشرت، ادبی معرکے اور تہواروں کی بڑی جاندار تصویریں پیش کی

ہیں۔ نساخ نے اپنی زندگی کے چوّن برسوں کا حال بیان کیا ہے۔ اپنے عہد کی سیاسی، سماجی، علمی اور ثقافتی زندگی کو داستانی اسلوب میں پیش کیا ہے۔ نثر سادہ اور صاف ہے۔

خواجہ حسن نظامی کی ''آپ بیتی'' میں جدید فنِ خودنوشت نگاری کے اصولوں کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ ۱۹۱۹ء میں یہ آپ بیتی طبع ہوئی اس خودنوشت میں خواجہ صاحب نے بڑی بے باکی سے اپنی زندگی کے اچھے اور بُرے واقعات کو سپردِ قلم کیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب ''تذکرہ'' کے عنوان سے فضل الدین احمد مرزا نے مولانا کے رشحاتِ قلم کو یکجا کر کے مرتب کی اور ۱۹۱۹ء میں شائع کی۔ مولانا نے اس کتاب میں کسی فرد، شخصیت، مزاج اور عادات و اطوار پر جو کئی نسلوں کے تجربات کا نچوڑ ہے، اس کا اثر بھی بیان کیا ہے۔ اس میں ابوالکلام کی زندگی سے زیادہ علمائے حق کی زندگیوں پر روشنی پڑتی ہے۔ اس میں تبلیغی رنگ نمایاں ہے۔ استعاراتی لب و لہجہ ہے۔ ایک بات ختم نہیں ہوتی کہ دوسری شروع کر دی جاتی ہے۔

ظہیر دہلوی نے اپنی آپ بیتی ''داستانِ عذر'' ۱۹۱۱ء کے عنوان سے تحریر کی۔ یہ آپ بیتی مسلمانوں کی زوال آمادہ تہذیب و تمدن کا فکر انگیز اشاریہ مرتب کرتی ہے۔

حکیم احمد شجاع کی آپ بیتی ''خون بہا'' ۴۰۔۱۹۴۳ء دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اس میں حکیم صاحب نے انسان کو بحیثیت انسان پہلے اور اس کے مرتبے اور درجے کو دوسرے نمبر جگہ دی ہے۔

سرسید رضا علی کی آپ بیتی ''اعمال نامہ'' ۱۹۴۳ء اردو زبان میں لکھی گئی پہلی مستقل آپ بیتی قرار دی جاتی ہے۔ اس میں خودنوشت نگاری کے تمام فنی تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ لیکن اس میں خارجی جزئیات کا بے محابہ استعمال ہے۔ سیاست کے حوالے زیادہ اور شخصی حوالے کم ہیں۔ علمی اور ادبی حوالے ہیں۔

ظفر حسن ایبک کی ''آپ بیتی'' میں جنگ بلقان کا تذکرہ ہے۔ اگرچہ یہ مکمل خودنوشت کے تقاضے پورے نہیں کرتی لیکن پھر بھی اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

سردار دیوان سنگھ مفتون کی خودنوشت سوانح سے پہلے مولانا حسین احمد مدنی کی ''نقش حیات'' ۱۹۵۲ء میں طبع ہوئی۔ اس کے دو حصے ایک ہی جلد میں موجود ہیں۔ اس میں مصنف نے اپنے بارے میں کم اور ہندوستان کے سیاسی حالات کے بارے میں زیادہ لکھا ہے۔ اس میں مولانا کی نسبت۔ شیخ احمد علی صاحب، شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب، سید احمد بریلوی شہید، مولانا فضل حق اور مولانا عبیداللہ صاحب کے بارے میں سوانحی مواد موجود ہے۔

سردار دیوان سنگھ مفتون کی آپ بیتی ''ناقابل فراموش'' باقاعدہ آپ بیتی نہیں ہے بلکہ مصنف کے انبالہ و فیروزپور کی جیلوں میں گزارے ہوئے ایک سالہ اسیری کے اہم واقعات کے نوٹس جو کہ بعد رہائی یادداشت کے زور پر لکھے گئے ہیں۔ ''ناقابل فراموش'' کے نام سے مصنف کے یہ مضامین اخبار ''ریاست'' میں ہفتہ وار شائع ہوئے۔ ۱۹۵۷ء میں یہ مضامین کتابی صورت میں طبع ہوئے۔

نواب ہوش یار جنگ کی خودنوشت سوانح 1955ء میں ''مشاہدات'' کے نام سے طبع ہوئی۔ مصنف نے اپنی حیدر آباد کی سیاسی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ اس سیاسی زندگی میں درباری ریشہ دوانیوں کے عام آدمی پر اثرات کو بیان کیا گیا ہے۔

۱۹۵۸ء میں رشید احمد صدیقی کی خودنوشت سوانح ''آشفتہ بیانی میری'' طبع ہوئی۔ رشید احمد صدیقی نے اس آپ بیتی میں اپنی شخصی زندگی کے ساتھ ساتھ علی گڑھ کی معاشرتی زندگی کو بھی موضوع بنایا ہے۔ اسلوب کے اعتبار سے نہایت اعلیٰ آپ بیتی ہے۔

۱۹۶۱ء میں ممتاز مفتی کی کتاب "علی پور کا ایلی" طبع ہوئی۔ لوگوں نے اسے سوانحی ناول قرار دیا ہے اور بالواسطہ طور پر اسے آپ بیتی کے زمرے میں رکھا ہے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین کی خود نوشت سوانح "میری دنیا" 1965ء میں طبع ہوئی۔ اس میں ایک استاد اور اس کے شاگردوں کی دنیا آباد ہے۔ زبان کے اعتبار سے عمدہ ہے۔ مصنف کی شخصیت پس پردہ جانے کی وجہ سے آپ بیتی اوسط درجے کی ہو گئی ہے۔

۱۹۶۷ء میں ڈاکٹر یوسف حسین خان کی آپ بیتی "یادوں کی دنیا" طبع ہوئی۔ ڈاکٹر محمد عمر رضا اسے "بے حد منصوبہ بند اور منظم خود نوشت گردانتے ہیں"۔ اس کا آغاز مغلیہ سیاست سے ہوتا ہے۔ مغلوں کے دور انحطاط اور طوائف الملوکی کی بہترین تصویر کشی ہے۔ اپنے ذاتی حالات میں پیدائش، تعلیم و تربیت اور خاندانی حالات کو بیان کیا ہے نیز اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صدر جمہوریہ ہند کی علمی استعداد، عالی ظرفی اور حب الوطنی کو بڑے مؤثر انداز میں قلمبند کیا ہے۔ اس خود نوشت میں تاریخ، عمرانیات، نفسیات اور ادب کا خوبصورت امتزاج ہے۔

یادوں کی برات کا تجزیاتی مطالعہ

جوش ملیح آبادی کی خود نوشت سوانح عمری یادوں کی برات کے نام سے منظر عام پر آئی۔ پہلا ایڈیشن 1970ء میں جوش اکیڈمی، کراچی کے زیر اہتمام طبع ہوا۔ کتابت کے فرائض اظہر عباس جعفری نے انجام دیئے تھے۔ آفسٹ پریس کراچی نے اسے طبع کیا تھا۔ 11 مارچ 1971ء کو جوش نے اپنے دستخط کے ساتھ اسے اپنے دوست کو عنایت کیا تھا اور پرانی کتابوں کی ایک دکان سے یہ نسخہ عقیل عباس جعفری کو دستیاب ہوا۔ انہوں نے اپنے مضمون "یادوں کی برات کا پہلا ایڈیشن" میں اس کا احوال درج کیا ہے۔(۲۳)

ڈاکٹر ہلال نقوی نے اپنی کتاب "جوش ملیح آبادی کی نادر و غیر مطبوعہ تحریریں" میں اس کے بارے میں وضاحت اس طرح کی ہے۔

> ..."جب یہ نسخہ (کم تعداد میں) شائع ہو کر اوّل اوّل جوش صاحب کے مطالعہ میں آیا تو منور عباس صاحب نے اس بات کی نشاندہی کی کہ اس میں مجاز لکھنوی کا تذکرہ رہ گیا ہے۔ جوش صاحب کو اس پر حیرانی بھی ہوئی اور صدمہ بھی۔ اب سوال یہ تھا کہ اس کا ازالہ کیونکر ہو۔ اس مرحلے پر صفحات میں اضافہ قدرے مشکل تھا۔ چنانچہ منور عباس صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ میرا تذکرہ جو دو صفحات پر ہے اسے نکال دیا جائے۔ مجاز کا تذکرہ کتابت کروایا جائے جس کی ان دو صفحات کی جگہ پیسٹنگ ہو جائے گی۔ جوش صاحب اس پر آمادہ نہیں تھے۔ مگر منور عباس صاحب کے بے لوث اصرار نے انہیں مجبور کر دیا۔ مجاز سے متعلق تذکرہ جب کتابت کیا تو وہ چار صفحات پر آیا۔ چنانچہ منور عباس سے پہلے شمس زبیری اور سید سبط حسین کا جو ذکر تھا وہ بھی ہٹا لیا گیا اور یوں مجاز کا ذکر شامل کر لیا گیا۔(۲۴)

لیکن جوش شناسی چھٹے شمارے میں منور عباس صاحب کا ایک مضمون "محبت کا قرض" کے عنوان سے ہے اس میں انہوں نے وضاحت کچھ اور طرح کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

> ..."۱۹۷۰ء میں جوش صاحب نے "یادوں کی برات" طبع کرائی۔ اس کتاب کا ایک باب ہے "میرے چند قابل ذکر احباب"، یوں تو جوش صاحب کے احباب کی فہرست خاصی طویل ہے لیکن اس کتاب میں صرف چند احباب کا ذکر ہے اس باب میں آخری دو صفحات میں جوش صاحب نے میرا ذکر کیا تھا اور مقفع اور مسجع عبارت میں پورے دو صفحات (۵۷۷تا۵۷۸) پر میرا تذکرہ تھا اور ایسی تعریفوں کے پل باندھے تھے جن کا میں کسی طرح اہل نہیں ہوں۔ جوش صاحب نے ایک کاپی مجھے بھی عنایت فرمائی تھی جو میرے پاس محفوظ ہے۔ جب جوش صاحب ہفتہ وار نشست میں میرے دفتر تشریف لائے تو میں نے ان سے عرض کیا کہ اس کتاب میں آپ سے ایک فروگذاشت ہو گئی ہے۔ اس میں ابو طالب نقوی مرحوم (سابق کمشنر کراچی) کا تذکرہ نہیں ہے۔ ان کے آپ پر احسانات ہیں اور انہی کے بہ اصرار دعوت پر آپ پاکستان آئے۔ جوش صاحب نے کہا واقعی یہ بھول ہو گئی مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو کتاب چھپ

کر آ گئی ہے۔ میں نے کہا کہ ابھی آپ نے صرف چند نسخے اپنے قریبی احباب کو دیئے ہیں۔ کتاب بازار میں نہیں آئی ہے۔ یوں کیجئے میرے متعلق جو ورق ہے اسے نکال کر اس کی جگہ اے۔ ٹی نقوی مرحوم کا ذکر شامل کر دیجئے۔ اس سے کتاب اور اس کی ترتیب بھی باقی رہے گی اور آپ کے محسن کا ذکر بھی ہو جائے گا۔"(۱)(۲۵)

منور عباس کا یہی مضمون مجلّہ "حیات جاوداں"، بیادِ جوش میں بھی "محبت کا قرض" کے عنوان سے موجود ہے۔ مرتب نعیم میر ٹھی ہیں۔(۱۱)(۲۵)

منور صاحب کی یادداشت نے ان کا ساتھ نہیں دیا کیونکہ ان کے بیان کے مطابق ابو طالب نقوی کا خاکہ "یادوں کی برات" کی زینت بنا تھا۔ ڈاکٹر ہلال نقوی نے منور صاحب سے کئی مرتبہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ جوش کس کا تذکرہ "یادوں کی برات" میں شمس زبیری، سبطِ حسن اور منور عباس کی جگہ کرنا چاہتے تھے لیکن یادوں کی برات کے تمام نسخے مجاز کے خاکے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہلال نقوی کے بیان کی تائید کرتے ہیں جبکہ ابو طالب نقوی کا خاکہ "یادوں کی برات" اور یادوں کی برات قلمی نسخہ اور اس کے گمشدہ اوراق" میں بھی موجود نہیں ہے۔

ابو طالب نقوی اور مجاز کے تذکرے پر مشتمل صفحات کی کتابت خوشنویس سید تہذیب حسین سے کروائی گئی جو کہ چھ صفحات پر مشتمل تھی چار صفحات اسرار الحق مجاز کے بارے میں اور دو صفحات ابو طالب نقوی کے بارے میں تھے لیکن اسرار الحق مجاز کا تذکرہ "یادوں کی برات" میں موجود ہے اور سبطِ حسن کی منشاء کی بموجب مجاز کو جگہ مل گئی۔

مطبوعہ نسخے کا ایک باب معاصر و احباب غائب تھا چونکہ طباعت کی ذمہ داری سید سبطِ حسن پر تھی اس لیے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ طباعت کے اخراجات بڑھ جانے کی وجہ سے انہوں نے اس کو شامل اشاعت نہیں کیا۔

یادوں کی برات کا لاہور ایڈیشن مئی ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔ اضافہ شدہ حصہ ۵۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

زیرِ نظر یادوں کی برات (اضافہ شدہ ایڈیشن)، مکتبہ شعر و ادب، چوہدری اکیڈمی، لاہور سے مئی ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔ کتاب کو پانچ ابواب / حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ آغاز چند ابتدائی باتوں سے کیا گیا ہے جن کو جان لینے کے بعد مصنف کی زندگی کو سمجھنا بہت آسان ہو جائے گا۔ جوش نے بتایا کہ میں نے اپنے حالات زندگی تحریر کرنے کے سلسلے میں چھ برس تک محنت کی ہے۔ اس سلسلے میں تین مسودے قلم زد کرنے کے بعد (جن میں سے تیسرے کی تین ہزار روپے میں کتابت بھی کروائی تھی) چوتھے مسودے کو بھی اس خوف کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے کہ کہیں راستے ہی میں زندگی کی شام نہ ہو جائے۔ اس لیے اس مسودے سے مطمئن نہ ہونے کے باوجود اسے طبع کروا رہا ہوں۔

جوش نے اپنی زندگی کے چار بنیادی میلانات بتائے ہیں۔ شعر گوئی، عشق بازی، علم طلبی اور انسان دوستی پہلا حصہ "بنام قوت و حیات" سے شروع ہوا ہے۔ اس حصے میں جوش نے اپنے "حادثۂ ولادت" کو بیان کیا ہے۔ اس کے بعد اپنی پیدائش کے بعد رسم بسم اللہ، موسم اور تہوار، لکھنؤ کا پہلا سفر، فرنگی سے نفرت، ولولۂ تعلیم، میرا نکاح، پہلا مشاعرہ، علی گڑھ میں، لکھنؤ میں دوبارہ آمد، سینٹ پیٹرز کالج آگرہ، برہنہ پا یتیموں کی مانند، روحِ ادب، میرے عنفوان شباب تک کا ہندوستان، قومی تحریک سے وابستگی، ایک خواب، سریرِ ملازمت سے حصیرِ ملازمت کی جانب، حیدر آباد سے اخراج، دربدری، "رسالہ کلیم" کا دہلی سے اجراء، سیاست افرنگ کے دو رخ، کچھ دن فلمی دنیا میں مژدہ خارِ دشت پھر... پاکستانی شہریت، میری موجودہ زندگی، اور میر ادین کے ذیلی عنوانات کے تحت اپنے چھہتّر سالہ زندگی پر ایک نظر دوڑائی ہے۔

دوسرے حصے "میرا خاندان" میں میرے پردادا، میرے دادا، میرے باپ، میری ماں، میرے چچا، میری بیوی، میری بیٹی، میرا بیٹا کے عنوان سے آٹھ کرداروں کو احاطۂ تحریر میں لائے ہیں۔

"میرے چند قابل ذکر احباب" میں تینتیس (۳۳) احباب کا ذکر ہے۔

''میرے دور کی چند عجیب ہستیاں'' اس عنوان سے اُنیس (۱۹) لوگوں کا تذکرہ ہے۔

''میرے معاشقے'' کے تحت نو (۹) معشوقاؤں کا بیان ہے۔

اضافہ شدہ حصے میں جوش نے ہندو پاکستان کے لوگوں کے رویوں کا موازنہ کیا ہے کہ پاکستان میں اپنوں کے حوصلے بڑھانے کو ہاتھیوں پر بٹھا کر جلوس نکالتے ہیں جبکہ ہندوستان میں اور خصوصاً یو۔ پی میں اپنے ادیبوں اور شاعروں کو گدھوں پر بٹھا کر، ان کا منہ کالا کر کے اور انہیں گلی گلی پھرا کر انہیں لُولُو بنا کر ان کے پیچھے تالیاں بجاتے ہیں۔ جب سے ہندوستان چھوڑا ہے لوگ میرے خلاف کچھ نہ کچھ بولتے رہتے ہیں۔ جب اپنے صوبے کے لوگ اس قدر ظالم ہیں تو ''نوائے وقت'' اخبار کو کیا کہوں، جب شام ہوتی ہے تو دوستوں کی چہرے نظر کے سامنے پھرنے لگتے ہیں اور پھر میں ایک ایک کو پکارتا ہوں۔ اسی عالم میں ایوب خان کی حکومت کا جنازہ نکل گیا۔ اسی کے ساتھ ہی الطاف گوہر کا اقتدار بھی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد یحییٰ خان آ گئے جو شامد خورے ان کی طرف دوڑ پڑے پھر مارشل لاء لگا اور تمام کرنیلوں، جرنیلوں نے مونچھیں کھڑی کر لیں، غرور کے تاج پیشانیوں پر کج کر لیے۔ یحییٰ خان نے میرا ضبط شدہ پاسپورٹ واپس کر دیا اور میرے بیٹے کی چھنی ہوئی سیمنٹ کی ایجنسی کو بحال کر دیا اور مجھ سے دوبارہ تقرر کا وعدہ کر لیا۔

لیکن عام لوگوں کے لئے یہ دور سخت مشکل ثابت ہوا۔ بنگال ہاتھ سے نکل گیا ایوب خان بادۂ عنبر چکاں اور انفاسِ رخاں میں ڈوب چکے تھے۔ ہر گھر میں سقوطِ مشرقی پاکستان کی وجہ سے صف ماتم بچھ چکی تھی۔ جوش لکھتے ہیں کہ سقوطِ ڈ مشرقی پاکستان سے آٹھ دس برس بیشتر جب میں ڈھاکے گیا تھا تو وہاں کے ذرے ذرے سے آواز آ رہی تھی کہ ہماری زنجیر غلامی توڑ دو اب ہم پاکستان کے ساتھ نہیں رہیں گے اور بالآخر وہی ہوا۔ ابھی بنگال کا زخم بھرنے بھی نہ پایا تھا کہ الیکشن کا ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ پیپلز پارٹی اور جماعت اسلامی خم ٹھونک کر میدان میں اُتریں۔ ایک طرف تھے حور، انگور اور غلمان اور دوسری طرف روٹی، کپڑا اور مکان۔ پاکستان کے عوام نے پیپلز پارٹی کو منتخب کیا۔ (یادوں کی برات ص ۷۳۳۔۷۳۴)

اپنی ایک مداح کنیز فاطمہ کے کہنے پر میں مولانا کوثر نیازی سے ملا۔ انہوں نے وزارت اطلاعات میں میرا تقرر کر دیا۔ بعد میں وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے مجھے وزارت اطلاعات سے ہٹا کر وزارت تعلیمات میں لگوا دیا لیکن چھ ماہ تک میں بیکار بیٹھا رہا۔ چھ ماہ بعد میں نے تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق بھٹو صاحب کو خط لکھا کہ آپ کی حکومت مجھ کو دیر اثر زہر (Slow Poison) کے ذریعے آہستہ آہستہ ہلاک کر رہی ہے۔ یہ ایسا جرم ہے جس کو تاریخ کبھی معاف نہ کرے گی۔ بھٹو صاحب نے میرے لہجے کی تلخی سے قطع نظر وزیر تعلیم کو حکم دیا میرے فوری تقرر اور چھ ماہ کی تنخواہ کی ادائیگی کا۔

اگرچہ میرے معاش کا بندوبست ہو گیا ہے لیکن میری آمدنی میرے اخراجات سے کم ہے۔ بیٹے اور بیٹی کی امداد کے بعد گرانی اور بادۂ ناب کی گرانی نے کمر توڑ دی ہے۔ آخر میں تنہائی سے نجات دلانے آنے والے مہمانوں کا تذکرہ ہے۔ ان کی تعداد اکتیس (۳۱) ہے۔

''میری زندگی کا سب سے دردناک سانحہ'' اس عنوان کے تحت اپنے والد کی وفات اور اپنی بیوی کے دماغی اختلال کا تذکرہ کیا ہے۔

آخر میں ''فتنۂ آخر الزماں'' کا تذکرہ ہے۔ یہ جوش کی انیسویں (۱۹) محبوبہ ہے اور آخری عمر کا عشق بھی اس حوالے سے جوش نے ایک نظم بہ عنوان ''تقاضائے سرد مہری'' لکھی ہے اور فتنۂ آخر الزماں کی پندرہ رباعیات بھی تحریر کی ہیں۔ جوش نے کتاب کے خاتمہ پر بیس اکتوبر ۱۹۷۴ء کی تاریخ کے ساتھ اپنے دستخط ثبت کیے ہیں۔

ایک فیض احمد فیض کی شخصیت ہے جس پر لاہور ایڈیشن میں بھی مضمون موجود ہے اور گمشدہ اوراق میں بھی مضمون لکھا گیا ہے۔ دونوں جگہ مضمون الگ ہے۔

ڈاکٹر ہلال نقوی جوش پر کام کرنے کے حوالے سے ایک مشہور محقق ہے۔ آپ کو شاگردِ جوش ہونے کا شرف حاصل ہے۔
تقریباً ۶۰۰ گمشدہ صفحات میں سے ۲۳۴ صفحات رفیق احمد نقش سے ڈاکٹر ہلال نقوی کو دستیاب ہوئے۔

یادوں کی برات کا قلمی نسخہ ڈاکٹر ہلال نقوی کو جوش کی نواسی صبوحی خاتون سے ملا جو کہ بارہ کاپیوں پر مشتمل تھا۔ جوش نے یہ سارا مسودہ ایک سطر چھوڑ کر تحریر کیا تھا۔ یہ مسودہ "یادوں کی برات" قلمی نسخہ اور اس کے گمشدہ اوراق" کے نام سے اپریل ۲۰۱۳ میں جوش لٹریری سوسائٹی کیلگری، کینیڈا سے شائع ہوا اور اس کا دوسرا ایڈیشن ستمبر ۲۰۱۳ء میں بک کارنر جہلم سے شائع ہوا۔

اس قلمی مسودے کے بھی بہت سے صفحات موجود نہیں ہیں۔ اس پر جوش نے اصلاح متن اور پروف ریڈنگ بھی کی ہے۔ کچھ صفحات قلم زد ہیں (جن افراد کا تذکرہ موجود ہے ان کے بارے میں خاکہ نگاری میں مفصل جائزہ موجود ہے)

چونکہ اس مسودے میں بھی کاٹ چھانٹ کی گئی ہے۔ جوش نے اسے بہتر سے بہتر بنانے کی تگ و دو میں بار بار لسانیاتی اغلاط کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے ڈاکٹر ہلال نقوی کے خیال میں یہ مسودہ چوتھا نہیں بلکہ پانچواں مسودہ ہے۔ جوش ملیح آبادی کی خودنوشت سوانح "یادوں کی برات" کے طبع ہوتے ہی ایک غلغلہ مچ گیا۔ دشمن مخالفت میں مضامین پر مضامین قلمبند کرنے لگے۔ دوست داد و تحسین کے ڈونگرے برسانے لگے اگر اس کی مخالفت میں اپنے وقت کے مشہور ادیب کمربستہ ہوئے تو اس کی موافقت میں بھی مشاہیر کی طرف سے بہت کچھ لکھا گیا۔ یہ دونوں گروہ انتہا پسند کہے جاسکتے ہیں لیکن ایک تیسرا حلقہ بھی ہے جو اسے ایک ایسے شخص کی خودنوشت گردانتا ہے جو اچھائی اور برائی دونوں سے متصف ہے جو جوش کو فرشتہ یا شیطان نہیں بلکہ ایک انسان گردانتا ہے جس میں اچھائی اور برائی دونوں ایک تناسب کے ساتھ موجود ہیں۔ جو انسانیت کے دُکھ پر تڑپ جاتا ہے اور جب بازار میں مزدور کا گوشت بکتا ہے تو جس کا دل قابو میں نہیں رہتا ہے۔ جس کے سینے کی آگ اسے تعصبات کی عینک ہٹا کر لوگوں کو دیکھنے کا درس دیتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اعتقاد و ارادت کی اونچی مسند پر بٹھانا نہیں چاہتا بلکہ اپنی کوتاہیاں، فروگذاشتیں، بداعمالیاں، اچھائیاں اور محبتیں آج کے قاری کو منصف بنا کر اُس کے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے۔ وہ خود کو انسان کہلوا کر خوش ہونا چاہتا ہے۔

روسو نے جب اپنی خودنوشت میں اپنی زندگی کی ہر خوبی اور خامی کھل کر بیان کی تو اس کی قوم نے اس کی راست گفتاری کی داد دی لیکن جب جوش اپنے قوم کے سامنے اپنے گزرے ہوئے روز و شب اپنی خودنوشت کی صورت میں پیش کرتا ہے تو ادیبوں، نقادوں اور تجزیہ نگاروں کی طرف سے صف آرائی شروع ہو جاتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آیا "یادوں کی برات" خودنوشت سوانح نگاری یا آپ بیتی نگاری کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے یا نہیں۔

جوش سے پہلے اردو آپ بیتی نگاری کی روایت زیادہ مضبوط بنیادوں پر استوار نہ ہو سکی تھی۔ جوش کا ماضی، خاندانی، پس منظر، تہذیبی روایات، ماحولی اثرات، جوش کی شخصیت کی خوبیاں، خامیاں، کوتاہیاں، تضادات اور خود پسندانہ رویہ اس کتاب کے ذریعے زیادہ مستند انداز میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ جوش کے آباؤ اجداد آفریدی پٹھان تھے جو کہ نڈر، خودسر اور متکبر تھے۔ ملیح آباد کی تعلقے داری، شاہانہ کروفر، کنول ہار ملیح آباد کی تہذیبی روایت، وہاں کے کردار، ان کے چہروں کے نقوش، رہن سہن، گفتگو کے آداب، لہجہ، مشاغل، عمارتوں کا احوال، موسموں کی رنگارنگی، وراثتی اثرات و خصائص کا بیان ہمیں اس کتاب میں دکھائی دیتا ہے۔ جوش کا بچپن، نوجوانی اور جوانی ملیح آباد کی حویلی میں گزارے ہوئے شب و روز، پرانے نوابی اور تعلقہ دارانہ ماحول کی شاہانہ وضع داری، امیرانہ اسراف پسندی، عیش کوشی، خود فراموشی اور مے نوشی جوش کی مکمل زندگی کا نقشہ کھینچ دیتی ہے۔ جوش جاگیردارانہ ماحول سے تعلق رکھنے پر فخر کا اظہار کرتے ہیں۔ جوش نے اپنی خودنوشت میں تہواروں، کھیلوں، مٹھائیوں، رسموں اور کھانوں کے بارے میں مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ کیونکہ اس کتاب میں درج ان اشیاء سے لکھنؤ، حیدرآباد (یو۔

پی) کی مخصوص تہذیب و ثقافت کی عکاسی ہوتی ہے اور نئی نسل جو ان چیزوں سے ناآشنا ہے اُس کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ عبدالماجد دریا آبادی لکھتے ہیں۔

> "اس کتاب میں اردو کے ایسے بہت سے الفاظ، محاورے اور کہاوتیں آگئی ہیں جن کو آج کی نسل بڑی تیزی سے بھولتی جا رہی ہے۔ تہواروں، کھیلوں، مٹھائیوں، کھانوں، سواریوں، زیوروں اور کپڑے وغیرہ کے ناموں کے اعتبار سے یہ کتاب معلومات آفرین بھی ہے"(۲۶)

خود نوشت سوانح کی صنف چونکہ تاریخ، سوانح اور ناول سے خاصی قریب کی مماثلت رکھتی ہے۔ اس لیے اس صنف میں لکھنے والا سوانح نگاری کی واقعیت سے قدرے آزاد ہوتا ہے کیونکہ وہ خود کو ایک تاریخ نگار کے طور پر پیش نہیں کرتا اس لیے تاریخ نگاری کے تقاضے پورے کرنا بھی اس کے لیے ضروری نہیں اور ناول کا نام نہ دینے کی وجہ سے کردار نگاری اور پلاٹ سازی بھی اس کے لیے لازمی نہیں ہوتی۔ خود نوشت نگار ان اصناف کے مثبت پہلوؤں کو اپنی خود نوشت میں استعمال کر کے اپنی ذات، اپنے معاشرے، اپنی تاریخ کو اپنے معاصر کرداروں سمیت اپنی خود نوشت کا درجہ ایک نگار خانے کی سطح تک بلند کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی رقمطراز ہیں:

> "جوش ملیح آبادی نے کسی مخصوص نوعیت کی صنفی ذمہ داری قبول نہ کرنے کے باوجود ان تمام سرچشموں سے فیض حاصل کرنے اور استفادہ کرنے کا ثبوت فراہم کیا ہے جن سرچشموں نے خود ان کی شخصیت اور ان کے زمانے کی تعمیر میں مؤثر کردار ادا کیا ہے۔"(۲۷)

وارث علوی نے اپنے ایک مضمون میں یادوں کی برات کو شب گزیدہ بستی اور "آخر شب کے ہمسفر" جیسے ناولوں کی صف میں رکھا تو نو ادبی حلقوں میں اس نقطہ نظر پر حیرت کا اظہار کیا گیا لیکن صنفی حدبندیوں سے بلند ہو کر اگر تہذیبی سیاق و سباق کے ساتھ "یادوں کی برات" کا موازنہ ان دونوں ناولوں سے کیا۔ ایک مٹتی ہوئی تہذیب کے جاہ و جلال، جاگیرداری یاز مینداری نظام، اشتراکی فلسفے کی آمد اور لبرل طرز فکر کی بخوبی عکاسی ملتی ہے۔ اس جاگیردارانہ نظام کے بطن سے جنم لینے والی تہذیب و تمدن زندگی کے مختلف شعبوں میں شائستگی، نفاست، احساس جمال اور فنونِ لطیفہ کی اساس قرار پاتی ہے۔ جوش ملیح آبادی نے اس مٹتی ہوئی تہذیب کی بازیافت اپنی سوانح نگاری میں کر کے اس تہذیب کو جیتی جاگتی شکل میں پیش کر دیا ہے۔ جوش نے مغربی یلغار اور مشرقی اقدار کی کشمکش کو اپنی سوانح میں پیش کر کے زمانہ کی بدلتی ہوئی فکر کو ایک تناظر فراہم کیا ہے۔ جوش کے ہاں ہولی، دیوالی، شب برات، رمضان، عیدین، محرم جیسے تہذیبی مظاہر کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے۔ مذہبی عناصر کو تناظر میں رکھ کر منائے جانے والے تہوار اپنی تہذیبی، ارضی اور ثقافتی اہمیت کے پیش نظر واقعات کے انتخاب یا عدم انتخاب میں مدد فراہم کرتے ہیں۔ جوش ملیح آبادی نے پیغمبر اسلامؐ، شیر خداؓ اور حضرت امام حسینؓ کی تہذیبی شخصیت پر قلم فرسائی کی۔ سرزمین عرب کی تہذیبی روایت کو ہندی قالب میں ڈھالنا جوش کا ہی کام ہے۔ تقسیم ہند کے واقعات کے بیان، اپنی پاکستان کو ہجرت اور اپنی نقل مکانی کو تفصیل سے تحریر کیا ہے۔ جوش نے پرانی تہذیبی قدروں کی نمائندگی (خواہ کسی معروف شخص کے ذریعے ہو یا غیر معروف ذریعے سے) ثقافتی سطح پر پیش کی ہے۔ جوش ملیح آبادی نے ایک پورے عہد اور جاہ و جلال کو یادوں کی برات کی صورت تہذیبی علامت میں محفوظ کر دیا ہے۔

انسان کی شخصیت کی تعمیر میں وراثت (Heredity) اور ماحول (Environment) اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جوش نے وراثت میں نسلی افتخار، انانیت، غصہ و رحم دلی جیسی صفات پائیں جبکہ ماحول سے عیش پرستی، رندی و سرمستی، سیاست اور انسان دوستی جیسی خصوصیات حاصل ہوئیں۔ ان مختلف و متضاد عناصر سے مل کر جو شخصیت بنی وہ مجموعۂ اضداد شخصیت جوش کے سوا کوئی اور نہیں۔ احتشام حسین جوش کی اس متضاد شخصیت پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔

"جوش کا سینہ کتنے متضاد اور متصادم عناصر کی جولان گاہ ہے۔ کیا ان کی شخصیت میں ان کا اظہار نہیں ہو گا؟ پھر کیا جوش کی شخصیت ایک پارہ پارہ بیمار شخصیت ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ ان کا کردار ایک ایسے ذہین، ذکی اور ذود حس انسان کا کردار ہے جو عمل میں کم اور خیال میں زیادہ۔ اپنے ماحول اور گرد و پیش کے واقعات سے متاثر ہوتا ہے۔(۲۸)

یادوں کی برات میں جوش نے اپنے معاشقوں کے بارے میں بتایا ہے۔ پہلے دو معاشقے دو امردوں سے ہوئے۔ ایک کا نام س، ح اور دوسرے کا ع، ج ہے۔ نفسیات "یادوں کی برات" کے حوالے سے جوش کے نفسیاتی تجزیے کے ذریعے اس کی ذہنی و فکری اُپج کو اس کے شعور و لاشعور کی کرم فرمائی قرار دیتی ہے اور جوش کی امرد پرستی کو اس دور کے تہذیبی و معاشرتی عوامل سے جاملاتی ہے۔ ہم جنس پرستی ایک نفسیاتی عارضہ کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ یہ عمل قدیم ترین اقوام میں بھی پایا جاتا تھا۔ قدیم مصر سے یہ قدیم چین اور جاپان تک پھیلا ہوا عارضہ ہے۔ مردوں کے قحبہ خانے تک یہاں ملتے ہیں۔ اہل یونان نے اس کو قومی و ملی ادارہ بنالیا۔ ہم جنس پرستی نے ان کے معاشرے، مذہب، فلسفہ، قانون اور شعر و ادب کو متاثر کیا۔ ہومر، ارسطو، سقراط اور افلاطون کے ہاں لڑکوں سے عشق کا تصور ملتا ہے۔

کچھ لوگ اس عمل کو اعصابی خلل قرار دیتے ہیں اور کچھ اسے کرداری الجھن گردانتے ہیں۔ ماہرین ماحول اور تربیت پر زور دیتے ہیں۔ جب اُلجھن دور ہو جائے تو یہ بھی خود بخود دور ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر اپنے ایک مضمون "عورت جنس کے آئینے میں" اس کے بارے میں اس طرح رقمطراز ہیں:

"غالباً فرائڈ نے اعصابی خلل کے ماخذات میں جنس کی اہمیت پر زور دیا تھا اور شائد ہم جنسیت کی سماجی ناپسندیدگی کے باعث اکثر معالجین ہم جنس پرستی کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ جدید تجرباتی تحقیقات نے یہ واضح کر دیا ہے کہ دیگر کرداری الجھنوں کے حل ہو جانے پر ہم جنسیت خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔"(۲۹)

خالد سہیل جوش کی جنسی بے راہ روی کا ایک سبب ان کے خاندانی اور معاشرتی پس منظر کو بتاتے ہیں۔

اور ان کے رومانوی اور جنسی تعلقات کو سمجھنے کے لیے ان کے بچپن، خاندان اور شخصیت کے ارتقاء کو جاننے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ (۳۰)جوش کی حویلی کی اندرونی و بیرونی فضا میں طرح طرح کی عورتوں (جن میں خاندان کی خواتین، رشتہ دار، ملنے والی خواتین اور ملازمائیں شامل ہیں) کے درمیان جوش کا بچپن گزرا اور نوجوانی کے شب و روز گزر رہے تھے۔ ایسے عالم میں ان کی کرداری خصوصیت میں عورتوں کا سا رنگ ڈھنگ پیدا ہونا فطری امر ہے۔ جوش لکھتے ہیں:

"پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں رندِ ازلی بسم اللہ کے گنبد میں پالا گیا تھا اور میرے باپ نے مجھ کو اسی بے پایاں احتیاط کے ساتھ پروان چڑھایا تھا کہ آج کل ایسی احتیاط سے لڑکیوں کی بھی پرورش نہیں کی جاتی ہے اور اسی بنا پر مجھ میں کنواری لڑکیوں کی سی جھجک پیدا ہو گئی تھی اور کسی مردانہ جرأت کا تو ذکر ہی کیا مجھ میں اس قدر شرمیلا پن پیدا ہو گیا تھا کہ جب اپنے باپ کی بھری محفل یا کسی مشاعرے میں جاتا تو دل دھڑکنے اور پنڈلیاں کانپنے لگتی تھیں اور "گوری دھرے چلو۔ گگریا چھلک نہ جائے" کا عالم طاری ہو جایا کرتا تھا۔ "جی ہاں" میرے باپ نے کوئی کسر نہ اٹھار کھی تھی مجھ کو "وہ" بنا دینے میں جس کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی اصطلاح میں جوان صالح اور اہل نظر کی زبان میں "مخنّث" کہا جاتا تھا" (یادوں کی برات ص۶۲۹)

"میرے دل میں جوانی آتے ہی دین سے بغاوت کا میلان پیدا ہو گیا تھا اور میرے راسخ العقیدہ باپ تک جب یہ خبر پہنچی کہ میں بعض مسلمات کا مذاق اڑاتا ہوں تو انہوں نے میرے منہ پر تھپڑ مار کر فرمایا مجھے اس کا خوف پیدا ہو گیا ہے کہ تُو آگے چل کر گمراہ ہو جائے گا۔ (اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کہ میرے باپ کا خیال درست نکلا اور میں 'گمراہ' ہو گیا۔ اسے فضل کرتے نہیں لگتی بار)"

(یادوں کی برات ص۱۷)

ڈاکٹر سلیم اختر۔ ''جوش کا نفسیاتی مطالعہ اور دوسرے مضامین'' میں جوش کی بغاوت کو مختلف حوالوں سے تخلیقی سطح پر برتری کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ والد سے بغاوت انا کے اثبات اور اس کی تسکین کے لیے لازمی تھی۔ انگریز دشمنی ارتفاع پا کر تخلیقی سطح پر انقلابی شاعری کے روپ میں سامنے آئی اور سیاسی نظموں کی بنیاد بنی ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

> ''لیکن جہاں تک جوش کے مبینہ الحاد کا تعلق ہے تو ان کا الحاد اسلام، دین کی روح، آنحضرت ﷺ سے بغاوت کا اعلان نہ تھا بلکہ بعض امور میں تخلیقی بغاوت کا اظہار تھا۔ اس لحاظ سے جوش کو نطشے کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے جس نے اپنے عہد میں مروج مسیحی اخلاقیات کو مسترد کرنے کی سعی کی تھی۔ اس کے الحاد میں چھپی دینداری کو اقبال جیسا حساس فلاسفر ہی سمجھ سکا۔ البتہ جوش کو سمجھنے کے لیے کوئی اقبال نہ تھا (لطیفہ یہ ہے کہ خود علامہ اقبال پر بھی کفر و الحاد کا فتویٰ لگ چکا تھا)'' (۳۱)

یادوں کی برات میں جوش کا الحاد اس مذہبی رجعت پسندی اور قدامت پرستی کے خلاف اعلانِ بغاوت تھا جو مطلب پرست علماء و ملاؤں کی دین ہے۔ جو سامنے کی چیز بھی دیکھنے نہیں دیتی بلکہ آباء کے گڑے گڑائے طریقوں پر چلنے کی ترغیب دیتی ہے جبکہ جوش تفکر اور عقل کو بروئے کار لانے پر زور دیتے رہے ہیں وہ مذہب کے روشن پہلوؤں کو دکھانے پر زور دیتے ہیں اور یہاں تک نازِ جسارت رکھتے ہیں کہ خدا کو بھی اپنے دکھائی دینے کی صدا لگاتے ہیں جو اپنے ابا میاں کی شکایت اللہ میاں سے کرتے ہیں۔

''یادوں کی برات'' جوش کو ایک ایسا فرد ثابت کرتی ہے جو کہ خود اپنی محبت میں مبتلا ہے جسے اپنے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ خود پسندی یا نرگسیت بھی ایک نفسیاتی بیماری ہے۔ نرگس کا پھول یونانی اور ایرانی شاعری میں چشمِ حیراں کی علامت بن کر نمودار ہوا۔ جنسیات کی اصطلاح میں جو شخص اپنے ہی حسن و جمال پر عاشق ہو اسے نرگسیت کا مریض سمجھا جاتا ہے۔ وہ اپنی خوبصورتی پر خود ہی فدا ہوتا ہے اور خود کو سب کچھ سمجھتا ہے۔ ساری کائنات کا مرکز و محور اسے اپنی ہی ذات نظر آتی ہے۔ جوش نرگسیت کے زیرِ اثر اپنی ذات کے سوا کسی سے محبت نہ کر سکے۔ معاشرتی علائق میں وہ اپنی انا ہی کو ہر قسم کے تعلقات کا معیار بنا چکے تھے اور جو شخص ان کی انانیت کو سہارا دے وہ ان کا منظورِ نظر بن جاتا تھا اور جو ان کی خود بینی کی تشفی نہ کرے اُسے پسند نہیں کرتے تھے۔ پنڈت نہرو ایک تو ان کی انا کو تشفی کرتے تھے اور دوسرے ان کی وجہ سے جوش کو مالی فائدے پہنچتے تھے اسی لیے انہوں نے پنڈت نہرو کی مدح و ستائش میں ایک قصیدہ نثر میں تحریر کیا۔ اس کی ابتداء ہے:

> ''اے لافانی جواہر لال! روحِ انسانیت کا سجدہ قبول کر''

جواہر لال پاکستان کے قیام کے وقت بہت ضرر رساں ثابت ہوا اس لیے اسے روحِ انسانیت کے محسن کا نام دینا جوش کی نرگسیت کا ہی کمال ہے۔ جوان ہونے پر اس نرگسیت میں جنس زدگی (Erotomania) شامل ہوئی تو انہیں لگا کہ وہ بہت بڑے عورت شکن (Lady killer) ہیں۔ کوئی بھی عورت میری خوبصورتی سے متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتی۔ ''یادوں کی برات'' میں جوش جہاں جاتے ہیں عورتیں ان پر فدا ہو جاتی ہیں۔

اور جگہ جگہ جوش یہ اعلان کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ

> ''ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں کہ ہر چند میرے بال سفید ہو چکے ہیں لیکن بحمد للّٰہ کہ میرا نامہَ اعمال ابھی تک سیاہ ہے''

علی عباس جلالپوری جوش کے اس اعلان پر یوں تبصرہ کرتے ہیں کہ

جوش صاحب نے اپنی جنس زدگی کو اپنے لیے مایہَ افتخار بنایا ہے کتی شدید ہو گی وہ محرومی اور کتنا تلخ ہو گا وہ احساس کہتری جس کو تلافی کے لیے انہیں ڈنکے کی چوٹ پر ایسے مضحکہ خیز دعوے کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ (۳۲)

ڈال ڈال منڈلانا اور کلی کلی کا رس چوسنا بھونرے کی صفت ہے۔ جوش نے بھونرے کی صفت اپناتے ہوئے اپنی زندگی کو رنگین سے رنگین تر بنانے کی سعی میں کسی مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی ضابطے کی پابندی قبول نہیں کی ہے۔

جوش ملیح آبادی کی نفسیات کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ وہ خود کو کسی ڈان یو آن سے کم نہیں سمجھتے تھے نت نئی عورتوں سے محبت کرنا اور اپنی عیاشی کے لیے ہر جتن کرنا ان کا مطمح نظر ہوتا تھا۔ جوش نے اپنی محبت کی ثابت قدمی دکھانے کے لیے بہت سے جتن کیے۔ چوکیدار سے بچ کر چھت سے کود کر محبوبہ کے گھر تک پہنچے۔ ایک محبوبہ کو سمندر کی پہنائیوں سے کھینچ کر واپس لائے۔ ایک امرد کے لیے چھری سینہ میں مارنے کی سعی کی۔ جوش ذوالفقار علی احسن کے اس خیال کی عملی تفسیر بن کر سامنے نظر آتے ہیں کہ:

جنسی تلذذ کا ایک زاویہ ڈان یو آن بھی ہے۔ وہ فریقِ ثانی کی تسکین کرنے اور نہ خود بھرپور جنسی تشفی سے بہرہ مند ہونے کی اہلیت رکھتا ہے۔ ایسے لوگ عمر بھر نت نئی عورتوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔" (۳۳)

ڈاکٹر سلیم اختر اپنے مضمون "جوش کا نفسیاتی مطالعہ" میں جوش کو "کاسانوا" کے استعارہ سے پکارا ہے اور جوش کے معاشقوں کو ایک حقیقت تسلیم کرتے ہوئے اسے جاگیر دارانہ تمدن کی دین قرار دیا ہے کہ اس ماحول میں کھل کھیلنے کی گنجائش بہت زیادہ تھی۔ جوش صاحبِ حیثیت تھے۔ خوش گفتار اور خوش اطوار تھے اور شاعر و ادیب کی حیثیت سے مشہور تھے اس لیے عورتوں کا ان پر ریجھ جانا فطری ہے۔

یادوں کی بارات میں جوش کی دکھلائی ہوئی اپنی شخصیت کے علاوہ بھی ان کی ذات کے کئی رخ دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی ذات ماضی پرستی (Nostalgia) کا شکار محسوس ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے مضمون (جوش کا نفسیاتی مطالعہ) میں فرائڈ کے نظریات کے تحت جوش کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے ان کی شخصیت میں ایڈی پس کمپلیکس کی نشاندہی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "تُند مزاج باپ اور نرم خو ماں کے بیٹے نے اپنے باپ کے ضمن میں جس ردعمل کا اظہار کیا وہ ایڈی پس الجھاؤ کی واضح مثال ہے یعنی باپ کے مرنے کی تمنا کرنا اور یہ تمنا بھی لاشعوری طور پر خوابوں میں اظہار نہیں پاتی بلکہ بولنے کی صورت میں "اللہ کرے مر جائیں میاں" اور اس سے بھی بڑھ کر اس وقت جب باپ نے چاقو کی نوک سے اٹھا کر خربوزہ کھانے سے منع کیا تھا تو مجھے اس قدر غصہ آ گیا تھا کہ میں نے باپ کی طرف چاقو اس طرح نشانہ باندھ کر پھینک مارا تھا کہ اگر وہ ان کے سینے میں چُبھ جاتا ہے تو لہولہان ہو جائے" یہ کم سنی کے واقعات ہیں اور ظاہر ہے ایسے واقعات کم سنی ہی کے ہوتے ہیں لیکن نفسیاتی لحاظ سے ان کی اہمیت مسلم ہے۔ واضح رہے کہ کتاب کے آغاز میں جوش نے اپنی یادداشت کی خرابی اور حافظے کی کمزوری کا مفصل ذکر کیا ہے... لیکن اس کے باوجود باپ کے حوالے سے جنم لینے والی تلخیاں اپنی تمام جزئیات سمیت یاد ہیں۔ اس لیے کہ یہ اچھے خاصے (Traumatic) تجربات تھے اور اسی لیے انہیں فراموش کر دینا آسان نہ تھا۔ جوش نے بعد میں شراب نوشی اور اس کے ساتھ جنسی مہمات سر کرنے میں جو عمر بسر کی اور پھر ان کا مزے لے لے کر تذکرہ کیا تو یہ سب باپ کے جبر کے خلاف ردعمل کا واضح اظہار تھا۔ (۳۴)

اقبال حیدر نے اپنے مضمون "رودبار انحراف" میں خورشید علی خاں سے ایک ملاقات کا ذکر کیا ہے جس میں انہوں نے خورشید علی خاں سے پوچھا کہ لوگ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ جوش صاحب نے "یادوں کی برات" میں اپنے معاشقوں کے بارے میں گپ ماری ہے۔ خورشید صاحب نے ہنس کر جواب دیا کہ یہ صرف ان کے ۴۲۔۱۹۴۰ء سے پہلے کے معاشقے ہیں جبکہ احتشام حسین نے بھی اپنی کتاب "جوش انسان اور شاعر" ۳۹۔۱۹۳۸ء کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب انہوں نے جوش پر ایک تفصیلی سوانحی کتاب لکھنے کا ارادہ کیا اور جوش صاحب سے اظہار کیا تو جوش نے کہا کہ اگر میری سوانح لکھنا ہے تو جیسے شیلے پر ایریل Andre Mourois نے لکھی، ویسی لکھو۔ احتشام صاحب نے کہا کہ تو کیا آپ اپنی زندگی کے تمام واقعات اور حالات مجھ پر واضح کر دیں گے۔ جوش نے کہا بھئی برطانیہ اور فرانس میں اور ہندوستان میں بہت فرق ہے مگر میں تمہیں سب بتا دوں گا۔ تم میرے مرنے کے بعد اسے شائع کر دینا۔ اس دور میں بھی جوش نے اپنے اٹھارہ معاشقوں کا ذکر کیا تھا۔

جوش کی آپ بیتی مختلف نفسیاتی اُلجھنوں اور گروہوں کو کھولتی ہے۔ نہ صرف جوش کی ذاتی زندگی بلکہ اس زمانے کا فکری میلان، تہذیبی رکھ رکھاؤ، میلانات، رجحانات اور اعتقادات اس آپ بیتی کے ذریعے ہمارے سامنے روشن ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر محمد عمر رضا اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

... اردو میں اب تک جتنی بھی آپ بیتیاں منظر عام پر آچکی ہیں ان میں جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی (یادوں کی برات) ہی ایسی ہے جو مختلف نفسیاتی گروہوں اور اُلجھنوں کی سب سے زیادہ آئینہ دار ہے۔"(۳۵)

ناقدین جوش ملیح آبادی کی اس آپ بیتی کے بارے میں متضاد رائے رکھتے ہیں۔ ایک طبقہ اگر اس کو سراہتا ہے تو دوسرا طبقہ اس پر الزامات کی بوچھاڑ بھی کرتا رہتا ہے اور آپ بیتی کی مذمت میں بیانات جاری کرتا رہتا ہے۔ یہ آپ بیتی متنازعہ آپ بیتیوں میں شمار کی جاتی ہے۔ جوش کے معاشقوں اور خاندانی جاہ و جلال کے بارے میں ہمیشہ شبہات کا اظہار کیا جاتا رہا ہے اور لوگ اسے جوش کی ذہنی اختراع اور دروغ گوئی کا کمال قرار دیتے رہے ہیں۔ غفور شاہ قاسم لکھتے ہیں:

"اب آتے ہیں ایک متنازع اور رسوائے ادب خود نوشت کی جانب، ہماری مراد جوش ملیح آبادی کی خود نوشت "یادوں کی برات" سے ہے جسے آپ بیتی سے زیادہ "پاپ بیتی" کہنا چاہیے۔ انہوں نے اپنے معاشقوں کو اتنی مبالغہ آرائی اور لذت اندوزی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جو ذوق لطیف پر گراں گزرتا ہے۔ ان کی اس آپ بیتی پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک نقاد نے انہیں "اردو ادب کا سلمان رشدی" قرار دیا تھا۔ یہ آپ بیتی ایک نہایت خود پسند اور نرگسیت زدہ شخص کی تحریر ہے۔"(۳۶)

جوش نے "یادوں کی برات" کی ابتداء میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ

"میں کبھی قوی حافظے کا مالک نہیں رہا اور اب یہ عالم ہو گیا ہے کہ رات کو کیا چیز کھائی تھی صبح کو یہ بھی یاد نہیں رہتا... اور تو اور آپ کو مشکل سے یقین آئے گا کہ ایک روز ایک خط لکھنے کے بعد جب دستخط کی نوبت آئی، تو اپنا تخلص بھول گیا، چند سیکنڈ تک مجھ پر عجیب کرب کی کیفیت طاری رہی، دل دھڑ دھڑ کرنے لگا اور اگر دو چار سیکنڈ کے اندر اندر اپنا تخلص نہ یاد آجاتا، تو یقین فرمائیے کہ میرا دم نکل جاتا۔

میں نے یہ بات اس واسطے لکھ دی کہ اگر میری زندگی کے کسی واقعے میں کمی بیشی یا تقدیم و تاخیر نظر آئے، تو آپ اِسے میرا ارادی فعل نہ سمجھیں، اور میری حالت پر ترس کھا کر، اُسے معاف کر دیں۔" یادوں کی برات ص ۱۰۔۱۱

جوش نے اپنا آباؤ اجداد کے جس جاہ و جلال کا تذکرہ کیا ہے وہ والیان ریاست اور سربراہان مملکت کے شایان شان تو ہو سکتا ہے لیکن زمیندار گھرانوں کے ہاں اس کروفر اور رکھ رکھاؤ کی کمی ہے اور پھر جس زمانے کا جوش ذکر کر رہے ہیں اس دور میں سادگی اور اپنائیت اہم تھی۔ ناقدین کو ملازمین کی انواع اور تعداد پر شک ہوا ہے جو کہ جوش کی حویلی میں موجود تھیں جوش لکھتے ہیں:

"لونڈیاں، باندیاں، مامائیں، اصیلیں، مغلانیاں، انائیں، ددائیں، کھلائیاں، استانیاں، پنکھوں کی ڈوریاں کھینچنے اور راتوں کو کہانی سنانے والیاں، چاروں طرف چلتی پھرتی اور ہنسی بولتی نظر آتی تھیں...

خدمت گاروں، رکاب داروں، فراشوں، سپاہیوں، مولویوں، ماسٹروں، مصاحبوں، داستان گویوں، منشیوں، ضلع داروں اور کارندوں کا ہر طرف ایک ہنگامہ سا برپا رہتا تھا۔"(یادوں کی برات ص ۳۰)

مصنف کی غلط بیانی سے اس کی زندگی سپاٹ ہو جاتی ہے اور اس میں جھول پیدا ہو جاتا ہے۔ جوش نے ابتدا ہی میں اپنے حافظے کی کمزوری کا بہانہ بنا کر اپنی غلط بیانی کو جواز مہیا کر دیا ہے لیکن جب کوئی مصنف اپنے کو برتر ثابت کرنے کے لیے دروغ گوئی یا کذب بیانی اختیار کر لیتا ہے تو ایک طرح سے اپنی تحریر کو عیب دار بنا لیتا ہے۔ ایک اچھی اور سچی آپ بیتی لکھنے میں جو چیز سب سے زیادہ حائل ہے وہ فنکار کی انا ہوتی ہے۔

جوش بھی اپنی انا کی وجہ سے کسی سے کمتر درجے کا ثابت نہیں ہونا چاہتے تھے۔ اسی لیے ان کی انانیت انہیں سر تسلیم خم کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ الطاف فاطمہ اپنے مضمون ''آپ بیتیاں'' میں لکھتی ہیں:

آپ بیتی ایک صدائے عام بھی ہو سکتی ہے اور زندہ شہادت بھی لیکن اُس وقت جب اس کو دیانت اور سچائی سے تحریر کیا گیا ہو اور اس پر تصنع اور بناوٹ کا ملمع نہ کیا گیا ہو۔(۳۷)

آپ بیتی اپنی دریافت کا علم ہے۔ گزرے ہوئے وقت کو واپس بلانا اور اپنے ماضی کے دریچوں میں جھانک کر انمول گُہر کی تلاش کرنا ہے۔ آپ بیتی نگار اپنے تلخ و شیریں واقعات و لمحات سے قاری کو آشنا کرواتا ہے اور ان گوشوں کو منور کرتا ہے جو قاری کی نظروں سے اوجھل رہے ہوں۔ جوش ملیح آبادی نے بھی نہ صرف اپنی بلکہ اپنے دوستوں کی زندگی بھی قاری کے سامنے کھول کر رکھ دی ہے۔ حالانکہ کسی کے بارے میں لکھتے ہوئے انسان محتاط ہو کر قلم اٹھاتا ہے لیکن جوش نے اپنے دوستوں اور رفقاء کی خلوت کو جلوت بنا کر پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں۔

''آپ بیتی زندگی کے گزارے ہوئے لمحوں کی ریت کو سمیٹنے کا عمل ہے اور اس میں چاشنی اس لیے زیادہ ہے کہ اس پر لکھنے والے کی مہر تصدیق ثبت ہوتی ہے''

''خود نوشت سوانح میں مصنف اپنے ماضی کی یاترا کرتا ہے اور یوں اپنے قدیم نقوش پا پر سفر کر کے خود اپنے آپ کو دریافت کرتا ہے۔''(۳۸)

خود نوشت سوانح اگرچہ اپنی ذات کا سفر ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ خود نوشت نگار اپنے عہد کا محدب عدسہ بھی ہوتا ہے۔ جس میں اس دور کی مخصوص معاشرت، تاریخ، تہذیب و تمدن، مذہبی اقدار، روایات، تمدن و ثقافت اور رسوم و رواجات سب کچھ بخوبی دکھائی دیتا ہے۔ قاری کو سب کچھ اپنی نظر سے دیکھ کر سمجھنا پڑتا ہے کیونکہ آپ بیتی نگار تو اپنی ذات کے تناظر میں ہر چیز کو دکھاتا ہے۔ ثمینہ ارشد آپ بیتی میں جوش کی سچائی کا دعویٰ صرف جنسی معاملات، عشق و عاشقی اور معاشقوں کی حد تک تسلیم کرتی ہیں وہ لکھتی ہیں:

''اردو میں خود نوشت سوانح حیات میں سچائی کا دعویٰ نہیں بلکہ واقعی اظہار سب سے پہلے جوش ملیح آبادی نے اپنی آپ بیتی ''یادوں کی برات'' میں کیا ہے مگر یہاں بھی ایک کمی محسوس ہوتی ہے کہ انہوں نے سچ کے ضمن میں صرف جنسی معاملات، عشق و عاشقی اور معاشقوں کا ذکر کیا ہے اور زندگی کی دیگر جہات میں اپنے آپ کو دروغ گوئی سے نہ بچاسکے۔(۳۹)

جوش کے سر سے اس کے خاندان کی جاگیرداری اور خاندانی غرور کا سودا آخر وقت تک نہ گیا۔ ان کا خاندان ملیح آبادی کا ایک جاگیردار گھرانہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ شاہ اودھ یا نظام دکن کے خاندان کے فرد نہ تھے۔ وہ کہیں پر دادا کی ملکیت تو کہیں دادا کی غیر معمولی جنسیت کی ذیل میں مبالغہ آرائی کرتے ہیں۔

''یادوں کی برات'' ایک متنازعہ آپ بیتی ہونے کے باوجود آج بھی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی ''آپ بیتی'' ہے۔ اس کے کرداروں نے اس کی دلچسپی کو اور بڑھا دیا ہے۔ مولانا سُہا بھوپالی، قاضی خورشید احمد، جواہر لال نہرو، سروجنی نائڈو، حکیم صاحب عالم، رئیس احمد خاں، وحید الدین سلیم، بیگم جوش، اور مولوی عبد السلام کے خاکے بھی خاصے کی چیز ہیں۔ جوش کے کردار بولتے اور چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جوش نے ذات وصفات کو یکجا کر دیا ہے۔ مختصر لفظوں میں بھی مفصل ذکر کیا ہے۔ جوش کی کردار نگاری کا کمال اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب وہ واقعات کے ذریعے سے کسی شخصیت کی تصویر کشی کرتے ہیں یا اپنے خاص جذباتی انداز میں تجزیہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ جوش نے اپنے والد، اپنے دادا، اپنی بیگم کے کردار نہایت چابکدستی اور فنی مہارت سے پیش کیے ہیں۔ ان کرداروں کے بارے میں پڑھ کر ہم ان کو اپنے سامنے چلتا پھرتا اور باتیں کرتا دیکھتے ہیں۔ مشرقی رکھ رکھاؤ، وضع داری، ظاہر داری، اندر کی سیاہی کو مصنوعی خوبصورتی سے ملمع سازی کر کے شخصیت کو

نکھارنا، صاف گوئی، سچائی اور خلوص جیسے انسانی جذبات و احساسات کو کامل مہارت سے پیش کرنا، یہ سب جوش نے کمال سلیقے سے کیا ہے۔ جس شخصیت کی جو صفت اس میں موجود پائی، چاہے وہ کتنی ہی بدنما اور کریہہ المنظر کیوں نہ لگے، جوش نے مختصر ترین لفظوں میں اُس کو بیان کیا۔ جوش نے جو ہے، جہاں ہے اور جیسا ہے کا فارمولا اپناتے ہوئے بلا کم و کاست سب بیان کیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ باتیں جو کوئی اپنی شخصیت اور اپنی ذات کے بارے میں دوسروں کے سامنے بتاتے ہوئے شرماتا ہے جوش نے اُن باتوں کو بھی عیاں کر دیا ہے۔ ثمینہ ارشد لکھتی ہیں۔

"آپ بیتی کے حوالے سے مشرق و مغرب کے معیارات مختلف رہے ہیں۔ مشرق میں معاشرتی، سیاسی، سماجی تقاضوں اور مخصوص نفسیاتی عوامل کی وجہ سے بیشتر آپ بیتیاں اور سوانح عمریاں ایسی لکھی گئی ہیں جن میں لکھنے والا کذاب اور کتاب مدلل مداحی یا کتاب المناقب بن کر رہ جاتی ہے اور انسان کو ایک انسان کے طور پر پیش کرنے کی بجائے فرشتہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔"(۴۰)

جوش نے اپنے ظاہر و باطن کو بلا کم و کاست، لگی لپٹی رکھے بغیر بیان کر دیا ہے۔ انہوں نے اپنی کمزوریوں پر پردہ نہیں ڈالا بلکہ جرأتِ اظہار سے کام لیتے ہوئے کھل کر بیان کر دیا ہے۔ حمیرا ماجد لکھتی ہیں:

"آپ بیتی کا فن متقاضی ہے کہ لکھنے والا اپنا آپ بیان کرتے وقت سب کے سامنے خوبیوں اور خامیوں سمیت آئے۔ آپ بیتی اس کی شخصیت کا آئینہ ہے اس کو اس میں اس طرح نظر آنا چاہیے جیسا کہ وہ ہے اور اس کے لیے بری جرأت، ہمت اور حوصلہ چاہیے۔(۴۱)

جوش کے کہنے کے مطابق ان کی راتیں سارنگیوں کی روں روں، مجیروں کی کھن کھن، طبلوں کی ٹکوروں اور گھنیری زلفوں کی مہکتی چھاؤں میں پینگ لیا کرتی تھیں لیکن ان کے دن کتابوں کے مطالعے، شعر کی تخلیق اور علماء و شعراء کی صحبتوں میں بسر ہوا کرتے تھے۔ جوانی آتے ہی دین سے بغاوت کا میلان پیدا ہو گیا اور جوش گمراہ ہو گئے۔ انہیں احساس ہے کہ وہ اپنی راہ گم کر بیٹھے۔ ستاروں کے مشاہدے نے تفکر کے احساس کی ابتدا کی۔ صوفیاء و مشائخ کے در کھٹکھٹائے۔ پیری نے احساس دلایا کہ وہ تو جاہل ہیں نرے جاہل۔

جوش نے انسان دوستی کو کرۂ ارض کی جان قرار دیا اور انسان دشمنی کو عظیم دشمنی، انسان کی محبت، اصل ایمان، انسان کا چہرہ گیتا اور قرآن قرار دیا ہے اور کوئی سلطان نہیں سوائے انسان کے جوش پکارتے ہیں:

اے مجھے "کافر باللہ" کہنے والو، تم کو معلوم نہیں کہ یہ "کافر" مومن بالانسان ہے۔" (یادوں کی برات ص۱۸)

اور اسی حُبِ انسانی کی وجہ سے جوش کن کن مراحل سے گزرتے ہیں کیونکہ وہ تمام انسان برادری کو اپنا کنبہ تصور کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"جب کسی مفلس کے گھر کے چولہے میں آگ روشن نہیں ہوتی میرے سینے سے دھواں اُٹھنے لگتا ہے۔ جب کسی یتیم کی پسلیاں نکلی نظر آتی ہیں میرے بدن میں خود اپنی ہڈیاں چبھنے لگتی ہیں۔ جب کسی گوشے سے رونے کی آواز آتی ہے۔ میری کم بخت آنکھیں آنسو برسانے لگتی ہیں، اور جب کسی گھر سے جنازہ نکلتا ہے تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ جنازہ خود میرے ہی گھر سے نکل رہا ہے۔"

(یادوں کی برات ص۲۱)

" یادوں کی برات " لکھنوی تہذیب و تمدن، روایات، اقدار، زبان و بیان کو بہت عمدگی کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ ان کے ہاں عشق کا تصور ارضی اور جسمانی ہے ماورائی اور روحانی تصور جوش کے ہاں دکھائی نہیں دیتا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے مضمون "خود نوشت اور اردو خود نوشت" میں لکھتے ہیں:

"اردو خود نوشتوں میں جھوٹ موٹ کے واقعات کی شمولیت میں دو طرح کا مواد نظر آتا ہے۔ ایک معاشقوں کی صورت میں اور دوسرا کشف و کرامات کی صورت میں۔ بعض نے اپنی آپ بیتیوں میں معاشقوں کو اتنی کثرت سے داخل کر دیا ہے اور ایسی تفصیل سے بیان کیا

ہے جیسے انہیں دنیا میں معاشقے لڑانے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا اور دوسرا جو معاشقوں کے دوش بدوش نظر آتا ہے وہ روحانی تجربات اور کشف و کرامات کا بیان ہے۔"(۴۲)

جوش کی آپ بیتی میں دونوں طرح کے مواد ملتے ہیں۔ جوش کے انیس معاشقے اور خوابوں میں بزرگ ہستیوں سے ملاقات اور بشارت۔ دو مرتبہ رسول پاک ﷺ کی زیارت ہوئی۔ حضرت علی مرتضیٰؓ کو خواب میں دیکھا۔ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی زیارت ہوئی اور ان بزرگ ہستیوں کے فیض کی وجہ سے جوش کے دس سال حیدر آباد کی ریاست میں عیش میں گزرے اور اجمیر میں بھی جوش کو دعوت دے کر بلایا گیا۔ ایک خواب میں حضور ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا:

"یہ نظام دکن ہے تم کو دس برس اس کے زیر سایہ رہنا ہے"

(یادوں کی برات ص ۲۱۷)

اس کے بعد ان کے کپڑوں سے خوشبو کی لپٹیں نکل رہی تھیں، ان کی بیگم صاحبہ حیران تھیں کہ یہ کیا ماجرا ہے گھر کے دوسرے لوگ بھی اس خوشبو کو سونگھ رہے تھے۔

ناقدین سوال کرتے ہیں کہ کیا ایک رند خراباتی اور جنسی آلودگیوں میں مبتلا شخص کو ان پاک اور برگزیدہ ہستیوں سے شرف ملاقات حاصل ہو سکتا ہے۔ خواب میں ہی سہی۔ مولانا ماہر القادری اپنے مضمون "یادوں کی برات۔ ہماری نظر میں" لکھتے ہیں:

"میں تو اس تصور سے کانپ جاتا ہوں جوش صاحب نے اس کا دعویٰ کیا ہے کہ دو بار خواب میں انہیں رسول ﷺ کی زیارت ہوئی تھی۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"میرا دین... جوش کے ذہن و فکر کی کجی، عقل کی ناپختگی و خامی اور شعور کی نارسیدگی اور دماغ کے الجھاؤ کی شہادت دے رہا ہے۔"(۴۳)

تحقیق سے آج یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جوش نے حیدر آباد جانے کے سلسلے میں بھی فسانہ طرازی سے کام لیا تھا۔ جوش نے نظام حیدر آباد کو خط لکھا کہ وہ فارسی شاعر فردوسی کی طرز پر نظام کے خاندان کی تاریخ لکھنا چاہتے ہیں۔ اس خط کے ساتھ جوش نے ایک مختصر منظوم باب بھی ارسال کیا تھا۔ یہ منظوم باب اور دیگر کاغذات آج بھی حیدر آباد میں موجود ہیں۔ مائل ملیح آبادی کے حوالے سے قمر رئیس نے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ جوش باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ حیدر آباد روانہ ہوئے تھے۔

ایک اور مقام پر جوش روحوں کو بلانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

جوش کے دعویٰ کے مطابق راجہ کشن پرشاد کول، فانی بدایونی اور آزاد انصاری جوش کی اس صلاحیت کے معترف تھے۔ جوش لکھتے ہیں:

"فانی صاحب نے ایک رات میر تقی میر کی روح کو بلا کر پوچھا اقبال کیسے شاعر ہیں؟ روح نے جواب دیا میں ان کو آدھا شاعر مانتا ہوں۔ اس لیے کہ وہ دوسروں کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں اور ان کی ذاتی پونجی بالکل اوچھی ہے۔ (یادوں کی برات ص ۴۹۰)

ایک اور جگہ غالب کی روح بلائی اور اُس سے استفسارات کیے گئے۔ روحوں پر انتقاد کی ذمہ داری ڈال کر جوش نہایت خوبصورتی سے بری الذمّہ ہو گئے۔ جوش لکھتے ہیں۔

ایک بار فانی، آزاد انصاری، علی اختر اور مودودی وغیرہ کے سامنے میں نے غالب کی روح کو بلا کر کہا اپنا اسم گرامی لکھ دیجئے، روح نے چٹ پر غالبِ مغلوبیت لکھ دیا، میں نے کہا مغلوبیت کیسی؟ پلان چٹ نے جواباً یہ لکھا۔ اہل دنیا کی ناقدر شناسی کے باعث، اب تک اپنے کو مغلوب سمجھ رہا تھا۔ میں نے کہا کہ میں پرسوں آپ کے مزار پر گیا تھا۔ انہوں نے لکھا۔ میرا قیام مزار میں نہیں ہے۔ میں نے آزاد

انصاری کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ میرے داہنے طرف کون بیٹھے ہیں، انہوں نے لکھا میرا پوتا ہے۔ میں نے کہا آپ مغل ہیں اور یہ انصاری، آپ کے پوتے کیسے ہو سکتے ہیں؟ انہوں نے لکھا یہ میرے شاگرد حالی کے شاگرد اور اس رشتے سے میرے معنوی پوتے ہیں"۔
(یادوں کی برات ص ۴۹۰)

ایک مرتبہ جوش نے مہاراجہ کشن پرشاد کے والد کی روح کو بھی بلایا۔ جوش نے محبوب شاہ مجذوب کی شخصیت کو متعارف کروایا ہے جو کہ پیش گوئی کرتے ہیں۔ الویرو (Alvero) انسان کے دل کی باتیں بتاتے ہیں اور کیے گئے سوالوں کا درست جواب دیتے ہیں۔ جوش اس آپ بیتی میں مختلف قسم کی پیش گوئیاں کرتے بھی دکھائی دیتے ہیں۔

مثلاً سقوط بنگال سے دس برس قبل کسی غیبی آواز نے جوش صاحب سے کہہ دیا تھا کہ بنگال پاکستان سے جدا ہو جائے گا۔

حیدر آباد جانے سے قبل رسول ﷺ نے جوش کو دس برس کے لیے حیدر آباد کے نظام کے سپرد کیا تھا۔

ڈاکٹر واگرے کے کہنے پر جوش نے گنگا دھر تلک کی روح کو بلایا جس نے ہندوستان کی آزادی بیس اکیس برس بعد ہونے کی اطلاع دی۔ یہ واقعہ ۱۹۲۷ء کا ہے۔

جوش کے دادا نے ان کے والد سے کہہ دیا تھا کہ تمہارا بیٹا بادشاہوں (حیدر آباد کے واقعے کی پیش بندی ہے) سے ٹکر لے گا۔
ڈاکٹر خالد علوی اپنے مضمون "یادوں کی برات" میں لکھتے ہیں۔

"جوش صاحب مختلف اوقات میں مختلف امیج بنانا چاہتے ہیں کبھی سرفروش عاشق، کبھی سوشلسٹ انقلابی، کچھ خاندانی زمیندار اور ہر امیج "یادوں کی برات" میں اس طرح گڈمڈ ہو گئی ہے کہ کوئی بھی شکل لہولہان ہونے سے محفوظ نہیں رہی۔ اس بات پر کون یقین کرے گا کہ جوش صاحب کو سقوطِ بنگال سے قبل دس برس قبل ہی کسی غیبی قوت نے کان میں کہہ دیا تھا کہ بنگال پاکستان کے ساتھ نہیں رہے گا۔ (ص ۵۳۷) لیکن وہ اس طرح کے دعوے روشن ضمیر ثابت کرنے کے لیے کرتے ہیں لیکن پاکستانیوں نے اس طرح غور ہی نہیں کیا۔" (۴۴)

"یادوں کی برات" میں جوش ملیح آبادی لوگوں کو چونکانے میں اور دھماکے کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ غزل کی مخالفت میں غلو، اپنے عقائد سے لوگوں کو ایذا رسانی پہنچانا، عام گفتگو میں بڑے بڑے لوگوں کے تلفظ کی غلطیاں نکالنا، اس دور میں جب کہ لوگ صنف نازک سے عشق کا اظہار کرنے میں بے باک نہیں تھے جوش کا نہایت بے باکی اور جرأت کے ساتھ امردوں سے عشق کو تسلیم کرنا، باپ دادا کی جنسیت کا چرچا کرنا اور تو اور بڑے بڑوں سے ٹکر لے لینا یہ سب دھماکے نہیں تو اور کیا ہیں۔

"یادوں کی برات" میں جوش ملیح آبادی نے واقعاتی ترتیب کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ باوجود یہ کہ اس میں سنین کا اہتمام نہیں ہے۔ لیکن جوش نے اپنے بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کے حالات کو ایک ترتیب کے تحت قلمبند کیا ہے۔ عام طور پر لوگ اپنی پیدائش کا ذکر کرتے ہیں تو اس طرح سے بتاتے ہیں۔ گویا وہ اپنی آنکھ سے پیدائش کا منظر دیکھ کر واقعات بیان کر رہے ہیں لیکن جوش نے اپنے دادی کے حوالے سے روایت کر کے اپنی پیدائش کا وقت مقرر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

میرا حادثۂ ولادت

میں، اس بوند بھر زندگی کو بھوگنے، اور اس بظاہر رنگین و بباطن خون آلود زندانِ کون و فساد میں اُبھنے کے واسطے کب لایا گیا، اس امر کو، صحت کے ساتھ بیان نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ میرے خاندان میں بچوں کی تاریخ ولادت کے درج کرنے کا رواج ہی نہیں تھا۔
البتہ میری دادی جان نے، جو خاندان کی مورخ تھیں، مجھ سے میری ولادت کا جو سن بتایا تھا، وہ سن عیسوی کے حساب سے ۱۸۹۶ء تھا یا ۱۸۹۸ء، یہ بھی یاد نہیں رہا۔

بہر حال اپنی عمر کو دو برس بڑھا دینے میں نقصان ہی کیا ہے، اس لیے، آپ یہ سمجھ لیں کہ میں ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوا تھا۔ (دو برس اور بوڑھا ہو گیا، ہو جانے دیجئے، جوتی کی نوک سے)" (یادوں کی برات ص ۲۷)

جوش نے اس آپ بیتی میں واقعاتی ترتیب کے حسن کو قائم رکھنے کے لیے تین مسودوں کو مسترد کرنے کے بعد چوتھا مسودہ بڑی قطع و برید کے بعد طبع کرایا۔ اس سے پہلے رسالہ "کلیم" میں بھی "آپ بیتی" کے عنوان سے تھوڑا سا حصہ طبع کروا چکے تھے۔ "نقوش" کے آپ بیتی نمبر میں بھی "آپ بیتی" کا کچھ حصہ طبع ہو چکا تھا۔ جوش نے جہاں مرقع کشی کی اختصار و ایجاد کے کمالات دکھائے ہیں لیکن آباؤاجداد کے تعارف اور بچپن کے واقعات کے احوال سے جوش نے غیر ضروری تفصیلات بھی فراہم کی ہیں، بعض ایسے واقعات ہیں جن کو بیان نہ کرنا بہتر تھا۔ مثلاً ہوسٹل کی چھت سے استاد کے کمرے میں پیشاب کرنا، لکھنؤ میں لوگوں کے گھروں کے باہر رات کے اندھیرے میں ان کو فحش مغلظات بکنا، اس آپ بیتی میں مصائب کا حصہ بھی خاصا طویل ہے۔ بلکہ جہاں کہیں بھی اپنی مصیبتوں اور تکلیفوں کا ذکر آیا ہے یا تو وہ غیض و غضب میں آپے سے باہر ہو گئے ہیں یا روایتی مجلسی انداز میں "مومنین" کو رلانے کی کوشش کے مشابہہ نظر آتے ہیں۔ اس باب میں یقیناً جوش توازن سے کام نہیں لے سکے ہیں جس کی وجہ سے آپ بیتی میں در آنے والا سقم کھٹکتا ہے۔

جوش شاعر تھے۔ اس آپ بیتی میں انہوں نے زبردستی خود کو شاعر منوانے کی شعوری کوشش شروع سے آخیر تک اپنائے رکھی ہے۔ یوں تو شعراء کے ہاں شاعرانہ تعلی کی گنجائش ہوتی ہے اور زمانے کی ناقدری کے رویے پر اظہار تاسف بھی پایا جاتا ہے لیکن لوگوں کی کم فہمی پر آنسو بہانا اور شکایت کرنا جوش کے ہاں کچھ زیادہ ہے۔ اعتدال کا دامن جوش کے ہاتھ سے چھوٹتا دکھائی دیتا ہے۔ جوش کے ہاں انفرادیت ہے، لیکن اگر کوئی شاعر خود یہ کہے کہ کیا غضب کا خیال ہے؟ کیسے انوکھے الفاظ ہیں؟ کیا مؤثر پیرایہ ہے؟ جوش نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے بہت سے استعارے، نظمیں اور رباعیاں درج کر دی ہیں۔ غیر ضروری اشعار نے آپ بیتی کی روانی و تسلسل کو متاثر کیا ہے۔ ایک عام سی نظم کو دنیائے ادب کی انوکھی، نرالی، بے نظیر اور نادر نظم کے طور پر تحریر کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

> "اب میں اپنی انوکھی نظم پیش کر رہا ہوں جس کی دنیائے شاعری میں کوئی نظیر ہی نہیں ملتی اور میں دعوے کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ جب سے اس کرۂ ارض پر شاعری کا آغاز ہوا ہے اس وقت سے لے کر آج تک اس نوعیت کا ایک مصرع بھی دنیا کی کسی زبان کی شاعری میں بھی نہیں کہا گیا ہے۔ (یادوں کی برات ۷۷۶)

جوش کے اس دعوے سے ان کی شخصیت کی ایک خاص جہت سامنے آئی ہے۔ دنیا بھر کے شعری ادب کو کھنگالنے کی بجائے اگر مذکورہ نظم کو ایک مرتبہ پڑھ لیا جائے تو جوش کے دعوے کی قلعی کھل جائے گی۔ نظم کا عنوان ہے۔ "تقاضائے سرد مہری"

مجھے آزاد کر کے پر کشائی کیوں نہیں کرتیں
جو دل کو توڑ دے وہ کج ادائی کیوں نہیں کرتیں
بچھا دوں بوریا جا کر، پھر اپنے شہر حکمت میں
کبھی مجھ سے، تم ایسی بے وفائی کیوں نہیں کرتیں
شکن جو ڈال دے میرے غرور فن کے ماتھے تھے
کبھی اتنی اہانت سے رکھائی کیوں نہیں کرتیں

(یادوں کی برات ۷۷۶)

جوش کی خود ستائی اور خود پسندی کے اس دعوے کے باوجود نظم قارئین کے دلوں کو نہ چھو سکی۔ جوش نے اپنی دنیا سے تعلق رکھنے والی بہت سی شخصیات کے مرقع ہمارے سامنے پیش کیے ہیں۔ ان کی دنیا کا ہر آدمی کسی نہ کسی غیر معمولی خصوصیت کا حامل ہے۔ جوش نے اس کی وہ تصویر دکھانے کی کوشش کی ہے لیکن کسی طرح بھی اپنی ذات سے اس کو بلند ہونے نہیں دیا۔ کسی فرد کی تھوڑی سی تعریف کر کے اس کو اس طرح سامنے لائے ہیں (گویا قاری کی نظروں میں اس کی شخصیت کا غلط رخ سامنے آئے) کہ وہ احترام آمیز مسند سے یکدم دھڑام سے زمیں پر جا گرے۔ ٹیگور کے بارے میں جوش نے یہی رویہ اختیار کیا۔ اقبال کی تعریف کی پھر انہیں مسلمانوں تک محدود ثابت کر دیا۔ فانی کو بڑا غزل گو قرار دیا لیکن پھر اسے لکھا کہ "سارا وقت اپنی محبوبہ کے گھر گزارتے ہیں اور باقی سارا وقت اس کی داستان سناتے ہیں۔ اثر لکھنوی اور مانی جائیسی کی شخصیت بھی دبا دی ہے۔ جوش نے کوشش کی ہے کہ کوئی کتنا ہی بڑا منصب دار کیوں نہ ہو اس کا قد جوش کے قد سے نہ نکلے۔ لیکن اپنے ممدوح کی لڑائی میں زمین آسمان کے قلابے ملانے سے بھی دریغ نہ کیا۔ سروجنی نائڈو، پنڈت نہرو، روشن علی بھیم جی، کنور مہندر سنگھ بیدی اور والئی اودھ جان عالم واجد علی شاہ کی جی بھر کر تعریف کی ہے۔ کچھ حضرات کی مالی منفعت کی وجہ سے تعریف کی ہے۔ بہت کم معاصر کی تعریف کی ہے۔

تشبیہات اور استعاروں نے "یادوں کی برات" کی نثر کو دلکشی عطا کی ہے۔ ہم معنی یا قریب المفہوم لفظوں کی تکرار اور تشبیہوں اور استعاروں کی کثرت مرقع نگاری کے انداز کو مؤثر بنا دیتی ہے اور جس چیز یا واقعے کو بیان کیا جائے اس کی اثر آفرینی میں اضافہ کر دیتی ہے۔ جزئیات مرتب ہو جاتی ہیں کہیں معلوم نہیں ہوتا کہ لفظ ٹھونسے گئے ہیں۔ جوش کی نثر میں کسی واقعے کو اس کی اہمیت کے لحاظ سے سپرد قلم کرنے کی کاوش کارفرما دکھائی دیتی ہے۔ ملیح آباد کی ایک برسات کا حال ملاحظہ فرمائیے۔

"اوہو جھومتی جھمکتی، جھولتی، جھرجھراتی، چھم چھماتی، جھم جھم برستی، جوبن والی، جونٹی برسات، گھپ اندھیروں اور گھنگور گھٹاؤں کی چھاؤں میں گھرتی، گھومتی، گھمرتی، گنگناتی، گجتی، گاتی، گرجتی، گونجتی، گھڑگھڑاتی، گھونگھر والی برکھا (یادوں کی برات ص ٦٦)

ایک اور جگہ سردی کا بیان اس طرح کرتے ہیں۔

"قصیّر النہار، طویل الیل، تنگ آستیں، دراز گیسو، موتی کی آب، موتیے کی اوس۔ رگوں میں چٹکیاں لیتی سردی، چہروں پر انگڑائیاں لیتی سرخی۔ مہکتے لحافوں کی نیند، چٹکتے انگاروں کا ناچ۔ شمس در آستین، قمر جبیں، ٹھڈّی تارا، ماتھے چاند۔ ماہ رو، سوسن خو، گھبرو، لچکیلا، چھریرا، چٹکتا، مدھ بھرا، بانکا، ترچھا، نکیلا، لپیٹا، رسیلا، چھبیلا، سجیلا، سانولا، سلونا اور سہانا جاڑا۔"

(یادوں کی برات ص ٦٤)

جوش کے ہاں لفظوں کے انتخاب میں صوتی مناسبت کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ جس سے ایک خاص آہنگ تشکیل پایا ہے۔ جوش کے ہاں تصویر کشی کے انداز سے واقعے میں مرقع کشی کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ معمولی سا واقعہ رنگین بیانی کی وجہ سے غیر معمولی ہو جاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے رنگین جملے سادہ سے واقعہ کو جادوئی رنگ دے دیتے ہیں۔ بیان کی شگفتگی اور عمدہ تشبیہوں کی مرصع کاری سے قاری بے ساختہ سر دھننے لگتا ہے۔ مثلاً اس جملے کو ملاحظہ کیجیے۔

"پتلی پتلی اور لانبی لانبی سرخ انگلیوں سے اُس نے ساغر اٹھایا، ایسا معوم ہوا گویا بلوریں جھاڑ کے قلموں کے حلقے میں قمقمہ روشن ہو گیا۔"

"پتلی پتلی اور لانبی لانبی" بظاہر یہ سوچا جائے گا کہ یہ تو انگلیوں کی معمولی سی خوبی ہے اور یہی کیفیت "سرخ" کی ہے۔ یہ بھی سامنے کی بات ہے دونوں کلمات ہیں۔ لیکن جملے کے دوسرے حصے میں جو تشبیہ ہے اس ی نسبت سے دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ جھاڑ کی قلموں کی مناسبت سے انگلیوں کو پتلی پتلی اور لانبی لانبی کہنا بہت معنی خیزی رکھتا ہے۔ اسی طرح قمقمے کی نسبت سے اور جام شراب ارغوانی کی نسبت سے سرخ لفظ کا

استعمال بر محل ہے۔ ایک تشبیہہ کی وجہ سے معمولی چیز غیر معمولی بن گئی۔ شام کے وقت محبوب کے آنے کے منظر کی عکاسی کتنی عمدگی سے کی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

> جب دن ڈوب گیا، سائے بھاری ملگجے سے ہو گئے، ٹھنڈی ہوا دبے پاؤں چلنے لگی، وقت کے منہ پر سانولا پن دوڑ گیا اور لیمپوں کی روشنی ہمکنے لگی، تو خدا خدا کر کے نازک قدموں کی آہٹ سے زینہ بجنے لگا۔

خود نوشت سوانح عمری کے اسلوب کی بات کریں تو اس کے لیے کوئی متعین اسلوب نہیں ہے بلکہ ہر لکھنے والا اپنی سہولت اور فکر کے مطابق اپنے لکھنے کا طریقہ وضع کرتا ہے۔ جس کے ذریعے وہ اپنی ذات اور اپنے کام کو قاری سے متعارف کرواتا ہے اور پڑھنے والے کو اُس سماجی، سیاسی، مذہبی، علمی اور ادبی فضا میں لے جاتا ہے جس میں وہ پروان چڑھا تھا۔

مطالب کے لحاظ سے اردو کے نثری اسلوب کی چار اقسام ہیں۔ توضیحی(Expository)، بیانیہ(Narative)، انانیتی(Egoistic)، اور تاثراتی(Impressionistic)، توضیحی نثر کسی مجرد خیال کو پیش کرنے کا وسیلہ ہوتی ہے۔ آپ عام طور سے اس سے سنجیدہ بحثوں اور مفکرانہ تحریروں میں کام لیتے ہیں جہاں کسی چیز کی وضاحت و توضیح ہوتی ہے۔ بیانیہ نثر میں کسی واقعے مقام یا شے یا شخص کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے۔ اس کی دو اقسام ہیں اگر یہ بیان کسی واقعے کے بارے میں ہو تو Narration کہلاتا ہے، اگر کسی شے، شخص یا مقام کے متعلق ہو تو وصیفہ یعنی Description کہلاتا ہے۔ یہ دونوں بیان حقیقی بھی ہو سکتے ہیں اور فرضی بھی۔ حقیقی ہوں تو ان کے تحت تاریخ، سفر نامے اور سوانح کا بیان ہوتا ہے۔ فرضی ہوں تو ان کے تحت فکشن کے مباحث داستان، ناول اور افسانہ پر بحث کی جاتی ہے۔ انہی کے حوالے سے ان کے عناصر ترکیبی یعنی کردار نگاری، واقعہ نگاری اور منظر نگاری بیان کی جاتی ہے۔ انانیتی نثر میں مصنف جو کچھ بیان کرتا ہے اپنی ذات کے حوالے سے بیان کرتا ہے۔ اس میں نجی، خطوط، خود نوشت سوانح عمری، روزنامچے اور یادداشتیں شامل ہیں۔ تاثراتی نثر میں مصنف اپنے گرد و پیش کے بارے میں اپنے ذاتی تاثرات تحریر کرتا ہے۔

جوش کی خود نوشت سوانح عمری ''یادوں کی برات'' اگرچہ انانیتی نثر کے ذیل میں آتی ہے لیکن اس میں توضیحی نثر کے حوالے سے بھی بیان ملتے ہیں اور تاثراتی نثر کے حوالے سے بھی ان کے قلم نے جادو جگایا ہے۔ توضیحی نثر کے حوالے سے بہت سے مقامات پر جوش نے کسی خیال کی وضاحت کی ہے۔ اپنے خاندان کے افراد کی کردار نگاری کی ہے یا مختلف تہواروں، مشاعروں اور محفلوں کا حال بیان کیا ہے۔ یہ سب بیانیہ نثر کی ذیل میں بھی آ سکتے ہیں۔ اپنی زندگی کا احوال افسانوی رنگ میں تاثراتی انداز سے بیان کرتے ہوئے جوش نے کس خوبصورتی سے بچپن سے بڑھاپے تک سفر طے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> ''میں نے اپنے بڑھاپے کو بچہ بنا کر اپنے ماں باپ کی آغوش میں بٹھایا اپنے گھر کی انگنائی میں کلیلیں کیں، پرانی برساتوں کو جگایا، اپنے مدرسوں اور بورڈنگ ہاؤسوں میں گیا، اپنے لنگوٹیا یاروں کو پکارا، اپنے موت کی نیند سوئے ہوئے مور خان شباب کے شانے ہلائے، اپنے دور افتادہ دوستوں کو اشاروں سے قریب بلایا، اپنے جوانی کے شبستانوں میں پہنچا... اور ماضی سے اپنے کو ڈسوا چکا تو قلم کو خون میں ڈبو ڈبو کر، سب کچھ قلمبند کر لیا۔ اور آپ کو سنانے بیٹھ گیا'' (یادوں کی برات ص ۱۲۔۱۱)

الغرض جوش ملیح آبادی کی نثر میں ان کی شگفتہ مزاجی، عقلیت، تعیش پسندی کے ساتھ ساتھ زبان و بیان پر ان کی ماہرانہ دسترس نے ''یادوں کی برات'' کو زندہ و تابندہ کر دیا۔ اسالیب بیان کی رنگارنگی کے ساتھ ساتھ شعریت، مزاح نویسی اور افسانوی طرز بیاں نے ''یادوں کی برات'' کی مطالعہ پذیری میں اضافہ کیا۔ ڈاکٹر مظفر عباس نقوی اپنے مضمون ''یادوں کی برات... ایک اسلوبیاتی مطالعہ'' میں رقمطراز ہیں۔

''مصنف کی بیباکی، برہنہ گفتاری، نشاط کوشی، یا عقلیت پسندی کی بنا پر اس کتاب کی ادبی قدر و قیمت کے تعین میں کسی قسم کی عصبیت سے کام لینا، ادبی تنقید کا طریقہ کار نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہمیں کتاب میں پائے جانے والے ایسے فقرات پر معترض ہونے کا پورا حق حاصل ہے۔ جہاں مصنف کی برہنہ گفتاری فحشیات کی حدود میں داخل ہو گئی ہے اور وہ اس لیے کہ ادب بہر طور ادب ہے اور اس کو سستی بازاری گفتگو سے دامن کشا رہنا ضروری ہے، لیکن اس معاملے میں جوش صاحب کی ایک مجبوری بھی تھی۔ کیسے ممکن تھا کہ نواب محمد اسحاق خان (جوش کے چچا) ابرار حسن خاں ملیح آبادی (بہنوئی) قاضی خورشید احمد اور کنجو خان جیسے زبردست دشنام طرازوں کا کردار بیان ہو رہا ہو اور مصنف کی عبارت ناگفتنی سے بچی رہے''۔

(جوش شناسی، یادوں کی برات نمبر ص ۲۰۱)

جوش ملیح آبادی نظم و نثر دونوں میں اظہار کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔ موقع محل کے حساب سے الفاظ و تراکیب کا چناؤ، عربی و فارسی اشعار و تراکیب کی پیوند کاری، قافیہ پیمائی، مترادفات اور تشبیہات و استعارات کا برمحل استعمال انہیں دیگر معاصرین سے ممتاز بناتا ہے۔ جوش نے مختلف النوع الفاظ کو ہنر مندی سے استعمال کیا ہے۔ انہوں نے نئے نئے الفاظ بھی اختراع کیے ہیں اور نئی نئی تراکیب بھی وضع کی ہیں۔ ان کا ذخیرہ الفاظ بہت وسیع ہے۔ جوش نے ''یادوں کی برات'' کی تصنیف پر بہت محنت کی ہے۔ سینکڑوں صبحوں اور شاموں کی ریاضت اس کی نوک پلک سنوارنے میں صرف ہوئی ہے۔ جوش نے ایک ایک جملے اور عبارت کو نہایت ژرف نگاہی سے رقم کیا ہے۔ اسی لیے اس ساری کتاب کو ایک مسلسل نظم قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے اپنی تمام تر پابندیوں اور اوزان کے مطابق مصرع بہ مصرع لکھی گئی ہے۔ جتنی یہ کتاب پابند ہے اتنے ہی اس میں درج افکار و بیانات آزاد ہیں۔ الفاظ کے تکلف نے اس سے بے ساختہ پن چھین لیا ہے۔

جوش کی آپ بیتی ''یادوں کی برات'' میں ختم ہوتی ہوئی جاگیر دارانہ تہذیب کی عکاسی ہے۔ موسموں، تہواروں اور رنگوں کا بیان ہے، پٹھانوں کی روایات کی عکاسی ہے۔ واقعات و سانحات کے حوالے سے اگر تاریخی حالات بھی درج ہو گئے ہیں تو مصنف کا منشاء تاریخ رقم کرنا نہیں بلکہ اپنی زندگی کے چیدہ چیدہ حالات و واقعات سے لوگوں کو روشناس کرانا ہے۔ انشاء پردازی کا حسن، تشبیہہ، استعاروں کی بے مثال مہارت کے ساتھ ساتھ شگفتہ نگاری نے آپ بیتی کو اردو کی بے مثل آپ بیتیوں میں شامل کرا دیا ہے۔ رشید حسن خاں نئے لکھنے والوں کو اس کے مطالعے کی ترغیب دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہمارے بہت سے نئے لکھنے والوں کو تو خاص طور سے اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے، بہت سے لفظوں کے برمحل استعمال کا انداز اور سلیقہ ان کو روشنی دکھائے گا۔ میری نظر میں اب یہاں کوئی ایسا شخص موجود نہیں جو مختلف النوع الفاظ کو اس مہارت اور سلیقے کے ساتھ استعمال کرنے پر قادر ہو جس کے سامنے الفاظ اس طرح ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہوں اور تشبیہیں گویا حکم کی منتظر ہوں اور التفات کے طلب گار۔

جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی معاشرتی عوامل کے ثقافتی تہذیبی اور ادبی عوامل کا ایک وافر ذخیرہ چھپائے ہوئے ہے۔ افکار و نظریات کا تنوع اور شعور کی بالیدگی کا احساس اس میں پوشیدہ ہے۔ دوسری جنگ عظیم چھڑی تو ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو چکے تھے۔ اسی زمانے میں جوش انسان دوست جوش بن کر نمودار ہوا۔ جوش استبداد کے خلاف ہیں وہ فرنگی دشمنی میں نظمیں لکھتے ہیں۔ وہ انسان دشمن جنگ کے خلاف ہیں۔ وہ بے گناہ کے ساتھ ہیں اور رنگ و نسل و قوم و ملت سے بالاتر انسان کو سمجھتے ہیں۔ استعماریت کے خلاف نظموں نے جوش کو جوش بنا دیا۔ ''یادوں کی برات'' میں بھی انسان اور انسانی معاشرے کے حوالے سے مصائب و آلام کی تصویر کشی اور ظلم و استحصال پر مبنی نظامِ معیشت اور نظامِ حکومت پر سنگ باری کرتے ہوئے وہ قنوطیت کی اندھیری گلیوں میں زیادہ دیر نہیں رہے۔ اور رجائیت کی شاہراہوں پر انسان دوستی، آزادی، امن، حریت پسندی اور سیکولرازم کی روشنی پھیلائے دکھائی دیتے ہیں۔

جوش ملیح آبادی نے ''یادوں کی برات'' میں کہیں بھی مایوسی اور ناامیدی کو گلے نہیں لگایا۔ انہوں نے انسان کے مستقبل کو روشن سے روشن تر دیکھنے کی سعی کی ہے۔ جوش کے ہاں امید، آس اور اچھے دنوں کے آنے کا احساس قوی تر ہے۔ اس طرح جوش اقبال سے قریب تر ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''ہر چند مستقبل انسانی بے حد روشن ہے اور مجھ کو یقین کامل ہے کہ یہ دوزخ زمین ایک دن جنت بن جائے گی، یہ درندہ آدمی کے مرتبے پر فائز ہو کر دم لے گا، نہ عدالتیں رہیں گی، نہ فوجیں، نہ پولیس نہ اسلحہ سازی کے کارخانے، پیری مستقل جوانی بن جائے گی اور موت کا گلا گھونٹ دیا جائے گا، زندگی کی پیشانی پر حیات ابدی کا تاج رکھ دیا جائے گا، شمس و قمر ہمارے پاؤں چومیں گے، ہم مشتری میں اگر ناشتہ کریں گے تو زہرا میں رات کا کھانا کھائیں گے'' (یادوں کی برات ص ۲۰)

جوش نے ''یادوں کی برات'' میں گاندھی کے اس اقدام پر کہ شہر سے باہر طوائفوں کو نکال دو، مے خانوں کو مسمار کر دو اور اجاڑ کر رکھ دو شبستانوں کو یہ کہا کہ گاندھی انسانی مسرت و شادمانی کے سب سے بڑے دشمن ہیں اور پیش گوئی کی کہ اگر ان برائیوں کو یکدم ختم کر دیا گیا تو کل کسی اور روپ میں یہ برائیاں زیادہ شدت سے جنم لیں گی۔ دانشمندی ہے کہ بازار حسن میں ماہر و سن رسیدہ ڈاکٹروں سے ہفتہ وار معائنہ کرایا جائے۔ اعلیٰ و سستی شراب کشید کرنے کی بھٹیاں سرکاری سطح پر لگیں اور ایسے افراد کو اجازت نامے دیئے جائیں جو صحت جسمانی اور سلامتیٔ عقل کی بنا پر بادہ خواری کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اور ان طوائفوں کے اڈوں کو ایک جگہ محدود کر دیا جائے۔ اگر ان سوچے سمجھے مشوروں پر عمل نہیں کیا گیا تو پھر نتائج نہایت ہولناک ہوں گے، جوش لکھتے ہیں۔

> ''کان کھول کر سن لیجئے کہ ایک طرف تو انسانی فطرت بغاوت پر کمر باندھ لے گی، گھر گھر بھٹیاں قائم ہو جائیں گی، اور اناڑیوں کے ہاتھ کی کھینچی ہوئی کچی شراب یعنی اسپرٹ پی پی کر لوگ جرائم پر اُتر آئیں گے اور دھڑا دھڑ مرنے لگیں گے۔
>
> اور دوسری طرف، جب طوائفوں کے اڈے بند کر دیئے جائیں گے تو ان کے پاؤں کی زنجیر کھل جائے گی اور وہ اڈے شہر کا رخ کر کے گلی گلی میں پھیل جائیں گے، شہر کا ہر مکان بازار حسن میں تبدیل ہو کر رہ جائے گا اور شہر کی ہر شریف زادی، خانگی کا روپ بھر کر طوائف سے بھی دو قدم آگے نکل جائے گی، اور عصمت فروشی کا پانی اس قدر ٹوٹ ٹوٹ کر برسے گا، کہ کالجوں کے احاطوں اور گھروں کی انگنائیوں میں گھٹنوں گھٹنوں پانی کھڑا ہو جائے گا۔'' (یادوں کی برات ص ۹۵)

اپنے نشاطیہ لب و لہجے کی وجہ سے جوش ولیؔ دکنی سے اور سوداؔ سے جا ملے ہیں جوش کے ہاں سرخوشی کی کیفیت غالب ہے۔ آپ بیتی میں بھی جوش نے مایوسی، یاس اور حزن کی کیفیت کو خود سے دور رکھا ہے۔ جوش جب کبھی حسرت و یاس کی زد میں آنے لگتے ہیں تو چار گالیاں آلام کو اور حالات کو دے کر دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں اور ''برپاپوش قلندر'' کہہ مصائب کو خاطر میں نہیں لاتے۔ جائیداد بھائی نے اڑالی باقی جو بچی ہندوستان میں رہ گئی، حیدر آباد کی ملازمت ختم ہو گئی۔ ''کلیم'' کی ادارت سے ''آج کل'' کی ادارت کے مراحل طے ہوئے۔ فلمی دنیا کا سفر بھی اختیار کیا، پاکستان میں ہجرت کی، ترقیٔ اردو بورڈ کی ملازمت، وہاں سے اخراج، پھر اسلام آباد میں وزارت تعلیمات میں تقرر تک جوش کی زندگی کئی مد و جزر سے آشنا ہوئی، لیکن جوش کے پائے عزیمت میں لغزش پیدا نہ ہوئی۔

گذشتہ کچھ صدیوں میں انسان کے کارناموں کے حوالے سے جوش کی بصیرت اور وسعت فکر و نظر کی داد نہ دینا بے انصافی ہو گی۔ کرۂ ارض آج ایک گلوبل ویلج میں تبدیل ہو چکا ہے۔ عظمتِ آدم پر جوش کا یقین کامل ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی مختلف سمتوں میں پیش رفت ہوئی ہے۔

حالات و واقعات کا تجزیاتی مطالعہ جوش کے ہاں ان کی تنقیدی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اسی تنقیدی بصیرت کی وجہ سے وہ اپنے دوستوں، احباب اور قریبی رشتہ داروں کی شخصیت کا فکری پہلو سے جائزہ لے کر کم سے کم الفاظ میں ان کے بارے میں بتلا سکے ہیں۔ ''یادوں کی

برات'' کا وہ حصہ جس میں جوش نے اپنے احباب کے خاکے کھینچے ہیں بہت خوبصورت اور فنکارانہ ہے۔ عام طور پر جوش پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فن ''آپ بیتی'' کے قواعد و ضوابط کو مد نظر رکھ کر آپ بیتی تحریر نہیں کی ہے اور نہ ہی خاکہ نگاری میں تفصیلی نقشہ پیش کیا ہے۔ جواب یہ ہے کہ جوش نے جب آپ بیتی تحریر کی اس وقت چند آپ بیتیاں اردو کے حوالے سے منظر عام پر آئی تھیں اُن میں سے بھی بہت سی ''معیار آپ بیتی'' کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر تھیں۔ جوش نے جب آپ بیتی تحریر کی تو آپ بیتی کے بیشتر ضوابط کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ یادوں کی برات کا اسلوب ایک زندہ اسلوب ہے۔ اگرچہ یہ خامیوں سے مبرا نہیں لیکن کلیتاً ہم اس کو ناقص آپ بیتیوں کے زمرے میں بھی شامل نہیں کر سکتے بلکہ جہاں چند ناقدین اس کی تنقیص میں سرگرم ہیں وہاں غالب اکثریت اس آپ بیتی کو اردو کی بڑی آپ بیتیوں میں شمار کرتی ہے۔ ہم باری باری ناقدین کی وقیع رائے پیش کرتے ہیں۔

> ''یادوں کی برات کے مطالعے سے مفہوم معلوم ہوتا ہے کہ جوش صاحب ایک بہت چھوٹے آدمی ہیں لیکن بہت بڑے Fake ہیں وہ ساری زندگی افسانوی کُبڑے بونے کی طرح دیو کا لباس پہننے کی اضطراری کوششیں کرتے رہے۔(۴۶)

زبان کے سلسلے میں جوش بہت حساس ہیں اور اگر وہ سمجھتے ہیں کہ علمی و ادبی گفتگو میں بات کرنے والا ان کی سمجھ سے بالاتر گفتگو کر رہا ہے تو جوش کا جذبۂ احساس برتری فوراً عود کر آتا ہے پھر وہ اس کی لسانی اغلاط کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور اکثر اس میں کامیاب رہتے ہیں۔ وہ گفتگو کا سلسلہ روک کر فوراً توجہ دلاتے ہیں کہ اصل بات یوں نہیں یوں ہے ہمارے ہاں لفظ اس طرح بولا جاتا ہے۔ اس بات کی مثال اس واقعے سے دی جا سکتی ہے کہ نہرو نے ایک مرتبہ جوش کے سامنے کہا کہ میں آپ کا مشکور ہوں فوراً جوش نے غلطی نکالی کہ اصل لفظ ''شکر گذار'' ہوتا ہے۔ نہرو نے مسکرا کر تسلیم کر لیا۔ ڈاکٹر عالیہ امام نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک محفل میں شائد کسی نے کہا کہ کھانا لگ چکا ہے۔ جوش صاحب نہایت برہم ہو کر بولے کھانا لگا یا نہیں چُنا جاتا ہے۔ جوش نے ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک مرتبہ میں نے اپنے والد کے روبرو پان لگانا کہہ دیا تھا تو میرے والد نے میرے منہ پر طمانچہ مارا کہ پان لگانا نہیں بلکہ پان بنانا کہا جاتا ہے۔ جوش کی طبیعت کی یہ شدت پسندی ان کے والد کی سختی کا شاخسانہ ہو سکتی ہے۔ جوش کوشش کرتے تھے کہ وہ جن باتوں کو اپنے لیے لازم ٹھہراتے ہیں دوسرے بھی ان کی پابندی کو لازم کر لیں اور ان کا رویہ بھی اس بات کا غماز تھا کہ وہ اردو کو اپنے گھر کی لونڈی تصور کرتے تھے۔ جوش کے ہاں املاء کی اغلاط کا بھی الزام ''یادوں کی برات'' میں نظر آتا ہے۔ انہوں نے اگرچہ کتاب کا مسودہ چار بار پڑھا لیکن پھر بھی کتاب اغلاط سے مبرّا نہیں ہے۔ اور جوش کی املاء کے مثالی تصور کے مطابق ہے۔

نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

> ''جوش کی علمی صلاحیت کے بارے میں میری رائے بہت ناقص ہے وہ ایک گُر جانتے ہیں، گفتگو میں زبان کی غلطیاں پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں، خواہ بڑا آدمی ہو یا چھوٹا (انہوں نے خود بھی اس کا تحریری اقرار کیا ہے) مثلاً کسی شخص نے اگر کہہ دیا کہ میں دو جولائی کو آؤں گا تو وہ کہیں گے ''صاحب ہمیں تو آپ زہر کی پڑیا لا دیجئے۔ اس دنیا میں رہنا فضول ہے۔ جہاں لوگ دوسری جولائی کو دو جولائی بولتے ہیں'' لیکن خود ان کی تحریر و تقریر قواعد کی غلطیوں سے خالی نہیں ہوتی۔(۴۷)

گھاس کو وہ گھانس بولتے ہیں ان کے ہاں ڈگڈگی لفظ ڈگ ڈگی اور انگریزی لفظ انگرے زی لکھا اور بولا جاتا ہے۔ پچھانا کو ''پچھانا'' لکھتے ہیں اور ہائے مخلوط اور ہائے مختفی میں بھی فرق نہیں کرتے۔ ''زور کا قہقہہ مارا'' قہقہہ میں زور اور آہستہ کا فرق کر کے انہوں نے قہقہہ کا مفہوم ہی بدل دیا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ''میں نے اپنے حالات زندگی قلمبند کرنے میں کامل چھ برس تک زیادہ تر مسلسل گاہ گاہ غیر مسلسل عرق ریزی کی ہے۔'' عرق ریزی کی جگہ دیدہ ریزی یا دماغ سوزی زیادہ فصیح لفظ ہے۔

جوش "ذرا" کو "زرا" لکھتے ہیں۔

"رجحان" کو وہ ہمیشہ "رُجحان" لکھتے ہیں۔

ایک اور جگہ یادوں کی برات میں رقمطراز ہیں "تار بھیج کر مجھے نینی تال سے بلا بھیجا" تار دیا جاتا ہے۔ تار بھیج کر بلا بھیجنا بھی فصیح نہیں ہے۔ تیار کو وہ ہمیشہ "طیار" لکھتے ہیں۔

> یادوں کی برات پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس میں جوش نے اپنے بہت سے کرم فرماؤں اور دوستوں کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا ہے۔ مجاز، سردار جعفری، فیض، ندیم، ساحر، عصمت، کرشن چندر، عبداللہ ملک، ابراہیم جلیس، مجروح، سجاد ظہیر، احتشام حسین، آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری اور سبطِ حسن کا تذکرہ موجود نہیں ہے۔

جوش سے جب یہ سوال کیا گیا تو جوش نے جواب دیا کہ تذکرہ تو موجود تھا لیکن پھر پتہ نہیں کہاں غائب ہو گیا۔ جب جوش کی نواسی صبوحی خاتون سے جوش کا قلمی مسودہ برآمد ہوا اور رفیق احمد نقش سے بہت سے صفحات بازیاب ہوئے تو معلوم پڑا کہ جوش نے سچ لکھا تھا۔ جوش نے اکثر دوستوں کو اپنی اس آپ بیتی میں جگہ دی ہے لیکن صفحات کے غائب ہونے سے جوش کی نیت پر شک کیا گیا۔

"س: لیکن یادوں کی برات میں آپ کے بہت سے دوستوں کا ذکر نہیں ملتا۔

ج: افسوس! کیا سوال کیا ہے آپ نے۔ جناب روشن علی بھیم جی سے یہ طے پایا تھا کہ ایک ایڈیٹوریل بورڈ تشکیل دیا جائے گا۔ جو مسودے کو چھان پھٹک کر شائع کرے گا۔ جو باتیں میرے ذہن سے اتر گئیں یا کسی وجہ سے رہ گئیں وہ سب شامل کر لی جائیں گی، لیکن مسودے پر نظر ثانی کرنا تو در کنار، مسودے میں سے بہت سے صفحات غائب ہو گئے۔ میرے کئی عزیز دوستوں کا تذکرہ شائع نہ ہو سکا۔ مرزا جعفر حسین، عسکری صاحب، کرشن چندر، علی سردار جعفری، حمایت علی شاعر اور نہ جانے کتنے۔(۴۸)

سید حامد لکھتے ہیں

> "جن لوگوں کی نظر جوش کی زندگی پر رہی اور جو بالخصوص ان کی زندگی کے اس دور سے واقف ہیں جو انہوں نے دلی میں گزارا ان لوگوں کو "یادوں کی برات" میں جوش کے کئی مقتدر احباب کی کمی کھٹکتی ہے۔ یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے جوش پر احسانات کیے اور بے شمار کیے"(۴۹)

جوش کے ایک اور بیان پر ناقدین معترض ہیں کہ جوش نے اس کتاب میں اپنی علمی حیثیت و مرتبے پر فخر کا اظہار کیا ہے۔ قاری کو مرعوب کرنے کے لیے انہیں جتنے نام یاد تھے سب لکھ دیئے ہیں۔ جوش نے لکھا کہ شانتی نکیتن سے واپسی پر جوش نے جائیداد کی دیکھ بھال کے علاوہ اپنا وقت ادب، تاریخ، فلسفہ اور شاعری پر صرف کیا۔ ادبیات میں انہوں نے شیکسپیئر، گوئٹے، دانتے، ملٹن، ٹالسٹائی، ورڈز ورتھ، شیلے، کیٹس، بائرن، برنارڈ شا سے، فلسفہ میں سقراط، افلاطون، ارسطو، کانٹ، ہیگل، مارکس، برگساں، نطشے، شوپنہار اور ہیوم سے سائنس میں آئن سٹائن کے نظریہ اضافت، ڈارون کا نظریۂ ارتقاء اور جیمس جین، کی پراسرار کائنات سے، مذہبیات میں قرآن مجید، انجیل

توریت، زبور، اوشاد، وید، اپنشد اور گیتا سے تاریخ میں تاریخِ اسلام، مہابھارت اور رامائن سے استفادہ کیا۔ ہندی شعراء میں کالی داس، سورداس، بھبھوتی، تلسی داس، ملک میں جائسی محمد اور رحیم خانِ خاناں سے فارسی میں سعدی حافظ، خیام، نظیری، عرفی، قاآنی، سرمد، افغانی، صائب اور بیدل سے اثر قبول کیا۔

ناقدین کی اکثریت اصرار کرتی ہے کہ جلدی میں جوش کو جتنے نام یاد آئے سب لکھ دیئے۔ انہوں نے فہرست مضامین نہیں دی کہ کہاں کہاں کس کس سے استفادہ کیا۔ رعب ڈالنے کو یہ بڑے نام استعمال کیے ہیں۔ کیونکہ آج کل نام گنوانے کی وباءعام ہو گئی ہے۔ جب تک اپنی تحریر میں بڑے نام نہ لکھ دیئے جائیں آگے نہیں بڑھا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی لکھتے ہیں۔

"فن علوم کا جوش صاحب نے یادوں کی برات میں تذکرہ کیا ہے۔ ان سے گہری واقفیت تو بڑی بات ہے ان کی اطلاع ان علوم کے بارے میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ جوش صاحب چاہتے تو یہ ہیں کہ وہ اپنے افکار کا تانا بانا مادی فلسفہ پر بُنیں، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کے لیے بڑی ریاضت، مطالعے، مشاہدے اور تجربوں کی ضرورت تھی۔ ظاہر ہے جوش صاحب ان جدید علوم پر دسترس اور عبور نہیں رکھتے"(۵۰)

بچپن ہی سے جوش مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب سے رغبت اور شیفتگی کی فضا میں پروان چڑھے تھے اسی لیے جوش میں ایک طرح کی تعقل پسندی پیدا ہو گئی تھی اور دور جوانی میں داخل ہوئے وقت جوش کے سامنے شاہ ولی اللہ اور سر سید احمد خان کے عقلی رویے تھے اور اسی لیے وہ اپنے دور جوانی میں غیر مقلد (Non Canformist) تھے۔

مختلف مفکرین، ادباء، اور شعراء کا مطالعہ کرنے سے جوش نے مختلف لوگوں کے مختلف النوع اثرات قبول کیے۔ روسو کے اثرات ان کے ہاں آپ بیتی میں نظر آتے ہیں۔ کانٹ، ہیگل اور مارکس کا فلسفہ ان کی شاعری میں دکھائی دیتا ہے۔ ورڈز ورتھ، ٹینی سن، حالی، شبلی اور سر سید کے اثرات کے ساتھ ساتھ ٹیگور کے اثرات ان کی رومانی اور نیچرل شاعری میں دکھائی دیتے ہے۔ غالب کے خیالات نے بھی جوش کو متاثر کیا۔ فارسی میں بیدل، نظیری اور فردوسی سے جوش متاثر ہوئے۔ فردوسیٔ ہند بننے کی تمنا میں انہوں نے حیدر آباد کی تاریخ بھی منظوم کرنا چاہی تھی۔ حیدر آباد میں علامہ عمادی، نظم طباطبائی اور میر زاہادی محمد رسوا کی صحبت نے جوش کو چمکا دیا۔ فارسی کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب اور فلسفہ کا درس، ہادی رسوا سے لینا شروع کیا۔

سینئر کیمبرج کی تعلیم کے زمانے میں جوش انگریزی رومانی شعراء سے متاثر ہوئے۔ انگریزی کے توسط سے ادب اور فلسفہ پر نظر پڑی اور لبرل فکر کی شروعات ہوئی۔ جوش اس دور میں بھی اپنی مذہبی فکر اور انگریزی تعلیم کے باعث اپنی عمر کے دیگر نوجوانوں سے مختلف تھے۔ اس دور میں آزاد فضاؤں میں سانس لینے کی خواہش اور سامراج سے ٹکر لینے کی سوچ جنم لے رہی تھی۔ اس دور میں جوش ٹیگور سے متاثر ہوئے اور نیچر کی زبان سمجھنے لگے۔ جوش نے فطرت پرستی سے حسن تناسب، رنگوں کی دھنک اور نمود و افزائش کے رازوں کو جاننا چاہا۔ فارسی شعراء کے توسط سے وحدت الوجودی فکر سے آشنا ہوئے۔ جوش نے ابنِ عربی کے وحدت الوجودی فلسفے سے حقیقت انسانیہ کا سبق سیکھا۔ انہوں نے خدا کے لامحدود تصور کو اس کی تجلیٰ کے ذریعے سمجھنے کی سعی کی۔ مظاہر تجلیٰ کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں جب مظہر کے واسطے سے تجلی سے تعلق قائم کیا جاتا ہے تو پھر تجلیٰ فرماذات یعنی اللہ تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ خدا تعینات سے ہٹ کر ہو۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی لکھتے ہیں:

'جوش کے خیال میں عالم مثال کی منطق عالم حقیقی کی منطق سے بالکل جدا ہونی چاہیے۔ جوش کو مشرقی فلسفہ اور مشرقی تصوف پر مقدور بھر استعداد حاصل تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اللہ کی تجلی کا علم مجاز اور کنایت کے طریق پر نہیں ہو تا جو کہ عام علوم کا طریقہ ہے بلکہ نزول علم کا یہ طریقہ تجوزِ طبعی، یعنی مخفی حقیقت کے منشاء... کو کسی متاشبہ اندازِ ترسیل کا ذریعہ اختیار کرتا ہے۔"(۵۱)

جوش عصر جدید کی سائنسی، تکنیکی ور صنعتی ترقی کا اعتراف کرتے ہیں، ان کے ہاں رومانی یا وجودی مفکروں کی طرح انسان کی ذہنی اور تیکنیکی ترقیوں کے خلاف بیزاری کا اظہار نہیں ہے۔ ان کے نظریہ تحقیق اور نظام علم میں مابعد الطبیعاتی سوالوں کی اور حوالوں کی اہمیت نہیں ہے۔ ان کی فکر انسان اور اس کی زندگی کی مشکلات کے گرد گھومتی ہے۔ ان کی شاعری اور نثر میں فلسفہ اور تاریخ ان کی تخلیقی فکر کے چراغ روشن کرتی ہے۔ جوش کی طویل نظم "حرفِ آخر" اور بعض دوسری نظموں میں وہ انسانی وجود اور سماجی ارتقاء کی تعبیر مادی اور عقلی زاویۂ نگاہ سے

ہی کرتے ہیں۔ جوش کا خیال ہے کہ انسان اپنے ذہنی تحرک اور تخلیقی عمل سے ہی اپنی تاریخ کی تعمیر کرتا ہے۔ سائنسی علم کے فروغ سے آگہی کے وجدانی سرچشمے خشک ہو جاتے ہیں۔ نقلی علوم دم توڑنے لگتے ہیں۔ تشکیک جنم لیتی ہے۔ انسان مرکز کائنات اور خلیفہ الارض بنتا ہے تو صرف اپنے تجربے، تخلیقی صلاحیت اور ذاتی غور و فکر کے نتیجے میں۔ قمر رئیس اپنے مضمون ''جوش کی میزان اقدار میں علمی اور عقلی رویے'' میں لکھتے ہیں:

''جوش کا نظریہ علم حرکی، عملی اور ہمہ گیر ہے۔ انسانی تمدن کے ارتقاء میں وہ اسی سائنسی علم کو کارفرما دیکھتے ہیں جو انسانی محنت اور اس کے تجربات کا عطیہ ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ جہالت، ضعیف الاعتقادی اور قدیم و جامد علوم کو آدمیت کے فروغ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تصور کرتے ہیں۔''(۵۲)

ڈاکٹر ہلال نقوی جوش پر کام کے سلسلے میں ماہر اور مستند ناقد کے طور پر اُبھرے ہیں انہوں نے کہا کہ:

''مجھے ایک زمانے میں جوش صاحب کے بہت قریب رہنے اور انہیں دیکھنے کا موقع ملا۔ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا'' جوش صاحب کی تحریریں کس طرح بکھرتی گئیں۔ میں نے خود دیکھا کہ سبط حسن کی کتاب ''موسیٰ سے مارکس تک'' پڑھ رہے ہیں اور جگہ جگہ نشان لگا رہے ہیں۔ اسی طرح موازنۂ انیس و دبیر کو دیکھا کہ وہ اس پر کچھ لکھ رہے ہیں... آخری دنوں میں وہ نور اللغات کی تصحیح کر رہے تھے۔''
(۵۳)

جوش کے طنز کی کاٹ، للکار، خطیبانہ انداز اور استدلالی لہجہ انہیں دوسروں سے الگ کرتا ہے۔ انیس کے بعد جوش اظہار کی اس قدرت سے مالا مال تھے۔ اس عہد کا قومی اور بین الاقوامی ماحول اور اس تناظر میں ملک کی سیاسی و سماجی صورت حال میں اظہار کی یہ قدرت جوش کے لیے بہت کامیاب ثابت ہوئی۔ ناصر کاظمی نے جوش کی اسی قوت اظہار کے لیے کہا ہے کہ ''جوش صاحب تھری ناٹ تھری سے پدّی کا شکار کرتے ہیں۔'' جوش کی گھن گرج، لفظیات پر ماہرانہ دسترس، تشبیہہ، استعارے اور تراکیب پر قدرت نے جوش کے لسانی اقتدار کی وسعت میں اضافہ کیا تھا اور یہیں سے جوش کے ہاں طنز و تعریض کا ایک عنصر راہ پا گیا تھا جس نے جوش کی نثر میں ایک کاٹ پیدا کر دی۔ لفظوں پر بے پناہ دسترس کی بنا پر جوش نے اپنی آپ بیتی یادوں کی برات میں مترادف الفاظ اور مترنم الفاظ سے ایسا سماں باندھا ہے کہ قاری کی ڈکشن اس منظر کشی میں گم ہو جاتی ہے۔ مجاز نے کہا تھا کہ ''جوش ڈکشنری کے شاعر ہیں'' جوش کی ڈکشن انہیں شاعرانہ نثر میں کمال پیدا کرنے کے نئے نئے طریقے سکھاتی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو جلد سوم میں خزائن فصاحت (دیوان امانت) کے نسخے پر جوش کے لسانی اعتراضات کا ذکر کیا ہے۔ ص۶۹۔۸۶۸۔ جوش نے جستہ جستہ اپنی رائے درج کی ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی ایک تقریر میں جوش کو ان کی متنوع جہات کی وجہ سے مفکر شاعر کے نام سے پکارا ہے وہ کہتے ہیں:

''جوش کے یہاں سوچ کی اتنی متنوع جہات اتنی اس کی ورائٹی، اس کی لفظیات، اسلوب میں تنوع ہے اور کون سا نکتہ ہے جس پر یہاں اظہار خیال نہیں کیا گیا۔(۵۴)

جوش کی فکری ابعاد پر بات کرتے ہوئے اقبال حیدر نے کہا کہ جب ہم کسی بھی تخلیقی فنکار کی فکری ابعاد پر بات کرتے ہیں تو اسے اپنی مرضی سے کسی سیدھے راستے پر نہیں چلا سکتے اس لیے کہ تخلیقی فن کار کسی سیدھے راستے پر نہیں چلتا۔ فکر کوئی پولیٹیک ڈائمنشن (Political dimension) نہیں کہ ہم اسے جوش کے یہاں تلاش کریں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''زندگی یا انسان سے متعلق کوئی بھی علم ہو، وہ ہمہ وقت بدلتا رہے گا اور یہی Dynamism حرکیت اسے زندگی اور حیاتیات سے متصل اور relevent رکھے گی کیونکہ فلسفے کا بنیادی کام ہی مختلف اکائیوں کو یکجا کر کے کلیت عطا کرنا ہے۔ اب وہ اکائیاں مختلف العلوم یا ایک

ہی علم کی مختلف شاخیں، جب ہم اس لحاظ سے جوش کے مختلف خیالات اور افکار پر غور کریں تو ہمیں دشواری نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس اگر جوش ان تمام امور کو زیر بحث لانے کے بعد ہر ایک کے نقائص کو آشکار کرتے ہوئے ان تمام علوم کو اپنے آبائی مذہب یا تصور کے حق میں رد کر دیتے تو شاید لوگوں کو ایک "فکری وحدت" نظر آجاتی مگر بحیثیت ایک فکر کے ان کی معروضی و علمی قدر گھٹ جاتی"(۵۵)

یوں اگر ہم غور کریں تو ہمیں جوش کی فکر میں مرکز، انسانی فلاح اور بہبود نظر آتا ہے۔ وہ ہر خاص طرز کو انسانی فلاح کے ایک طریقے سے پہچانتے ہیں اور اس میں کسی قسم کا تضاد محسوس نہیں کرتے۔ وہ علم کی کسی بھی شاخ کی طرف بڑھیں کوئی بھی راستہ اختیار کریں، ان کے تمام رجحانات، میلانات اور بیانات انہیں ایک مرکز کی طرف لے جاتے ہیں وہ ہے انسان اور فلاح انسان اس کے لیے تو وہ خالق پر بھی سوال اٹھاتے ہیں۔ وہ حضرت محمدؐ، حضرت علیؓ، حضرت امام حسینؓ کی ذات گرامی قدر کی تعریف و توصیف کریں یا گوتم، کارل مارکس، نطشے، برگساں، ارسطو، افلاطون کو سراہیں، مادہ پرستی کو خراج عقیدت دیں۔ عینیت، لذتیّت، وحدت الوجودیت، کمیونزم، اشتراکیت، روحانیت یا سیکولرازم کی طرف جائیں سب میں ان کے مطمحِ نظر انسان کی فلاح ہے۔

جوش نے انکار میں اقرار کی راہیں تلاش کرنے کی سعی کی اور یہی انکار اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان یہ کہتا ہے کہ "لا موجود الا اللہ" جوش اس وقت ہمیں روایات، اقدار اور اخلاقیات کے ایسے باغی کے روپ میں نظر آتے ہیں جو اُس خدا کو نہیں مانتا جو نظام کائنات چلا رہا ہے لیکن بغور مشاہدہ کریں تو معلوم ہو گا کہ وہ ایسے خدا کو نہیں مانتے جو بے بس ہے اور انسان کی بے بسی کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ اپنے ایک مضمون میں جوش کہتے ہیں:

"یہ بات درجہ حمق تک لغو ہے کہ ہم ایک ایسے شخصی خدا کے باب میں مباحثہ کریں جو تشخص کے ساتھ بے پایانی کی بھی نمائندگی کرتا ہو"

جوش مختلف بزرگوں کے ساتھ فکری مباحث میں مسلم فلاسفہ کی فکر کی تہہ تک پہنچنے کی سعی کرتے تھے۔ صوفی بزرگ ذہین شاہ تاجی سے تحریر و تقریر میں استفسارات کا سلسلہ جاری رہنا مودودی برادران سے بھی گفتگو رہتی۔ مولانا عبد الماجد دریا آبادی، مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی تقابل ادیان کے بارے میں گفتگو کرتے تھے۔ ایک زمانے میں مولانا عبد الماجد دریا آبادی اور مولانا صالح الدین عمر ندوی جوش کی حمایت پر کمربستہ رہے لیکن تقسیم کے بعد مولانا دریا آبادی جوش کے خلاف ہو گئے۔ جوش سا ملحد و منکر خدا بغیر کسی محبت و تعلق کے کیا ایسے شعر لکھ سکتا تھا؟

مرے وجود کی بنیاد ہے عبادت پر
بہار کوثر و باغ ارم کی بات نہیں

یا

ملا جو موقع تو روک دوں گا جلال روزِ حساب تیرا
پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا

یا

اللہ کو قہار بنانے والو
اللہ تو رحمت کے سوا کچھ بھی نہیں
جوش قرنوں کے اندھیروں سے اماں پانے کو

قرب یک لحۂ صاحب نظر اں کافی ہے۔

اکبر حمیدی اپنے ایک مضمون "جوش صاحب" میں جوش کے عقیدے کے حوالے سے رقمطراز ہیں کہ انہوں نے پوچھا کہ کیا آپ خدا کو نہیں مانتے تو جوش صاحب نے جواب میں کہا:

"میں خدا کو مانتا ہوں مگر تمہارے اس خدا کو نہیں مانتا جو جوش سے بھی چھوٹا ہے۔ جو قیامت کے روز فرشتوں سے کہے گا مارو جوش کو پچاس جوتے یہ مجھے نہیں مانتا۔

جوش صاحب نے پھر یہ شعر پڑھا جو poetic truth کی بہترین مثال ہے جس میں ایک نیا زاویۂ نگاہ دکھائی دیتا ہے۔

خدا یہ حشر میں پوچھے گا پاک بازوں سے
گناہ کیوں نہ کیے کیا خدا رحیم نہ تھا۔"(٦٧)

جوش خدا کی بے پایاں رحمت کے قائل ہیں جو اپنے بندوں کے گناہوں کو اپنی بے حد و حساب رحمت سے معاف فرما دیتا ہے۔ اکبر حمیدی نے اسی مضمون میں بتایا ہے کہ جوش ایک رجسٹر میں فیروز اللغات کی غلطیاں جمع کر رہے تھے۔ خورشید علی خان نے اپنی کتاب "ہمارے جوش صاحب" میں جوش اور بابا ذہین شاہ تاجی کے مابین ہونے والی علمی، ادبی، فلسفیانہ اور مذہبی مباحث بیان کی ہیں۔

تجھے اس سے زیادہ کوئی سمجھا ہی نہیں سکتا
خدا وہ ہے جو حدِ عقل میں آ ہی نہیں سکتا

جوش ملیح آبادی نے اپنی کتاب "یادوں کی برات" میں انتہائی جرأت سے اپنی گزشتہ زندگی کا احوال بیان کیا ہے اور اسی بنا پر کتاب کی عمومی حلقوں میں زیادہ پذیرائی بھی نہیں ہوئی۔ اس پر ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا ہے کہ جوش نے اس کتاب میں قلم کی گرفت مضبوط نہیں رکھی۔ فاروق خالد نے اپنے مضمون مکالمے میں جوش کی زبانی اس کا جواب تحریر کیا ہے کہ

"میاں یہ میری شرمیلی اور عصمت مآب مردوں کی قوم ہے۔ ہر بے ادب آدمی پیٹ بھر کے بیوقوف ہے۔ میں نے اس کتاب میں حتی الوسع کوئی بات نہیں چھپائی۔ میں ریاکاری کا قائل نہیں ہوں۔

بآسانی بچا سکتا ہوں خود کو طنزِ یاراں سے
مگر میں کیا کروں مجھ سے ریا کاری نہیں ہوتی(٥٨)

ریاکاری، جھوٹ، فریب اور دھوکہ دہی سے جوش کی طبیعت دور بھاگتی تھی۔ جوش کے احباب نے ان سے فریب کاری کی لیکن جوش نے کشادہ دلی سے برداشت کی۔ عیش ٹونکی نے جوش کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ جوش نے ان کو بھی کچھ نہیں کہا۔ ایسے دور میں جبکہ لوگ چہرہ بہ چہرہ بھیس بدلے ہوئے ہیں۔ جوش نے لوگوں کے صاف اور سادہ چہرے سب کو دکھائے ہیں۔ انہوں نے فساد خلق خدا کے خوف سے اپنی آواز نہیں دبائی بلکہ جو کچھ ان کے من میں تھا بیان کر دیا ہے۔ جوش جانتے تھے کہ وہ بہت سے چہروں سے نقاب کھینچ رہے ہیں لیکن انہوں نے بغیر کسی ڈر اور فریب کے سب کو آئینے کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ اپنے دادا، والد، بھائی، اقربا، سب کی خوبیاں اور خامیاں کھول کر بیان کر دی ہیں۔ جوش نے کیسی ہی شرم کی بات ہو، ضبط کرنے کی بجائے اپنے قارئین کے سامنے اپنا کچا چٹھا بیان کر دیا ہے۔ روسو کا انداز پاکستانی معاشرے کے حوالے سے جوش کا جرم بن گیا اور ناقدین ان کی اس روش کے خلاف قلم اٹھائے زہر اگلنے لگے۔ ڈاکٹر یوسف حسین کی کتاب "روح اقبال" کے ہر صفحے پر جوش کی رائے، دیوان حافظ اور شبلی کی کتاب "موازنۂ انیس و دبیر" پر جوش نے مختلف مقامات پر اپنی رائے کا اظہار کر کے قارئین کو مختلف سطحوں پر اپنی علمیت سے روشناس کرایا ہے۔ علاوہ ازیں بیکن کی کتاب کا ترجمہ بھی کیا جس کے کچھ حصے "کلیم" میں شائع ہوئے۔

حسین سرودھی (Hussain Saruardhi) نے یادوں کی برات پر اظہار رائے کچھ یوں کیا ہے:

"Shahnaz Sahiba dekhiye "Yedoon ki brart" is not daubt a master piece but one should go through it carefully putting aside his/her set principles of idelogoies. To be very frank the book in question is considered as a controversial one. Readers have difference views but there is no reason to distaste at all. some questioned about its authenticity. Other view that the author should have omitted certain accounts of events. This book lacks of "Maslihat" according to others. Apart from these, there are plus points as follows' (1) Eloquent style of narration (2) Its improves vocabulary (3) Its account of historical events from 1900 to 1947 or so no by a person who abhorred foreign rule believed in equality mankind. (59)

جوش ملیح آبادی کی آپ بیتی کی تنقیص کے ساتھ ساتھ تعریف بھی کی گئی ہے۔ باقر مہدی ''تنقیدی کشمکش'' میں رقمطراز ہیں۔

''آج تک مشرق میں مذہب کی دقیانوسیت کا اتنا گہرا اثر ہے کہ کوئی آزادانہ بحث تک کرنے کو روادار نہیں ہے۔ خاص کر جنسی آزادی کا مسئلہ، ایسے تنگ اور دقیانوسی ماحول میں جوش سارند اپنا نامۂ اعمال لکھتا ہے تو سب کا خفا ہونا یقینی تھا اور یہی ہوا''(۶۰)

جوش ساری زندگی جذبات کے ماتحت رہے۔ اسی جذباتیت کے ہاتھوں انہوں نے بہت نقصان اٹھائے۔ جس وقت جو جذبہ ان پر حاوی ہوتا تھا وہی ان کے لیے صحیح اور راست ہوتا تھا۔ جب اس جذبے کے تحت وہ کوئی رائے قائم کر لیتے تھے تو سختی سے اُس پر ڈٹ جایا کرتے تھے اور منطقی دلائل پیش کرتے ہیں اور جذباتی نتائج کو منطقی نتائج سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے مجموعہ کلام کے نام بھی ان کے متضاد جذبات کے آئینہ دار ہیں مثلاً شعلہ و شبنم، سرود و خروش، سیف و سبو، سنبل و سلاسل، فکر و نشاط حرف و حکایت، جنون و حکمت، عرش و فرش، رامش و رنگ، سنبل و سلاسل، سموم وصبا، الہام و افکار اور نجوم و جواہر وغیرہ جوش کے جذباتی تموج کو عیاں کرتے ہیں جو دو متضاد دھاروں میں رواں ہے۔

جوش کی شخصیت کا ایک اور پہلو رہبری و پیغمبری حاصل کرنے کی تمنا بھی ہے۔ مائل ملیح آبادی کی تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ جوش کی فردوسیٔ ہند بننے کی تمنا کی تکمیل نہ ہو سکی۔ فردوسیٔ ہند بننے کی تمنّا ختم نہیں ہوئی بلکہ دوسری تمناؤں کا روپ دھار لیا۔ اسی لیے ان کے ہاں رہبری و پیغمبری کی تمنا بار بار ملتی ہے۔ بچوں کو درس دینا، دوسروں کی زبان کی غلطیاں پکڑنا جوش کی اسی خواہش کا اظہار ہے۔ زبان کی اسی غلطیاں پکڑنے کی عادت کی وجہ سے شاہد احمد دہلوی اور جوش کے درمیان دشمنی کی ابتدا ہوئی۔ ڈپٹی نذیر احمد کی کتاب ''منتخب الحکایات'' جوش کے پاس نظر ثانی کے لیے آئی تو انہوں نے اس کتاب میں اور شاہد احمد دہلوی کے لکھے ہوئے مقدمے میں بھی بعض لسانی اغلاط کی نشاندہی کی۔ یہی دوسروں کی رہبری کی تمنا نے جوش کے مخالف زیادہ اور دوست کم پیدا کیے۔ سجاد ظہیر اور مولانا آزاد دونوں کی زبان پکڑنے کی جسارت جوش کے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا۔ اسی سے وہ خود کو برتر اور دوسروں کو کمتر ثابت کرتے تھے۔

رشید حسن خان یادوں کی برات کے بارے میں اپنی رائے کا اس طرح اظہار کرتے ہیں کہ:

دلچسپی کے لحاظ سے اردو کی بہت کم کتابیں اس کے برابر رکھی جا سکتی ہیں اور یہ دلچسپی انشاء پردازی کی پیدا کی ہوئی ہے... جب میں نے پہلی بار اس کتاب کو پڑھا تھا تو بہت سے مقامات پر یہ محسوس ہوا تھا کہ جیسے پہلے پہل یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ ہماری زبان میں الفاظ کا اس قدر ذخیرہ ہے اس میں ایسے ایسے لفظ ہیں''(۶۱)

ڈاکٹر آغا سہیل اسے روسو اور دوستوفسکی کے اعترافات کے پائے کی اردو میں پہلی خودنوشت سوانح عمری قرار دیا ہے۔ خالد حمید اپنے مضمون ''جوش کی سوانح اور پورے انسان کی کہانی'' میں لکھتے ہیں کہ:

''میری نگاہ میں جوش کی ''یادوں کی برات'' اردو ادب کی وہ سوانح عمری ہے جو اپنی حق گوئی اور بے باکی، جرأتِ رندانہ اور ادبی محاسن کی وجہ سے روسو، برٹنڈرسل اور ہنری ملر جیسے مایہ ناز ادیبوں کی خودنوشت سوانح عمریوں کی صف میں فخر سے پیش کی جا سکتی ہے۔''(۶۲)

جوش ملیح آبادی کی "یادوں کی برات" باوجودیکہ ایک متنازعہ آپ بیتی رہی لیکن اپنے دور کی ایک بڑی آپ بیتی بھی شمار کی جاتی ہے۔ آج بھی اپنے اسلوب، انشاء پردازی، شاعرانہ نثر، جرأت اظہار کی وجہ سے منفرد ہے۔ جوش کے بعد اس طرز کی آپ بیتی تحریر نہ ہو سکی ہے۔ کہیں کہیں واقعات کی طوالت کھٹکتی ہے لیکن تحریر کا حسن اس خرابی پر پردہ ڈال دیتا ہے اور قاری مصنف کی روانی کے سنگ بہتا ہوا دور نکل جاتا ہے۔ سید حامد یادوں کی برات کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> "یادوں کی برات" لن ترانی، طمطراق، لفاظی، سوقیت اور عدم صحت کے باوجود ایک دلچسپ کتاب ہے اور لطائف وظرائف اور حرف و حکایت کا ایک بیش بہا گنجینہ اور ایک دور کی تصویر بغاوت قارئین کے دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ خواہ وہ سیاسی استبداد کے خلاف ہو خواہ اخلاقی اقدار کے "(۶۳)

جعفر عسکری اپنے مضمون "جوش بحیثیت خودنوشت سوانح نگار" میں یادوں کی برات کی کامیابی کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

"یادوں کی برات کی کامیابی کا راز اس حقیقت میں مضمر ہے کہ جوش کی شخصیت ہر مقام پر اور مختلف النوع کرداروں میں زندہ اور متحرک نظر آتی ہے۔ اردو زبان کا کوئی دوسرا خودنوشت سوانح نگار مثال میں نہیں پیش کیا جا سکتا جو اپنی خودنوشت سوانح عمری میں جوش کی سی تہہ دار معنویت، متنوع اور متضاد شخصیت کا مالک ہو۔ جملوں کی تراش خراش، اسلوب نگارش کی انفرادیت، زبان کے تصرف پر غیر معمولی مہارت، نیز ان کے انداز بیاں میں پوشیدہ نشتریت نے اس سوانحی تصنیف کو استواری اور پائیداری عطا کی ہے۔(۶۴)

"یادوں کی برات" کی اشاعت کو یہ سینتالیسواں (47) سال ہے۔ اس عرصے میں نہ صرف عالمی سطح پر ادب میں تبدیلیاں ہونے سے عالمی منظر نامہ تبدیل ہوا ہے بلکہ ملکی سطح پر بھی نظریات، قوانین اور ضوابط میں انقلاب رونما ہوا ہے۔ جو باتیں ۱۹۷۰ء میں ڈھکا چھپا کر کہنے سننے پر قدغن تھی اب ۲۰۱۵ء میں ان کو برسرعام افشاء کر دیا جاتا ہے۔ میڈیا کی ترقی نے عریاں نویسی اور برہنہ گفتاری کو حقیقت نگاری کے دامن سے جا ملایا ہے۔ اب بھی غریب جینے کی سزا کاٹ رہا ہے اور کسی سے اپنا جرم بھی نہیں پوچھ سکتا۔ سرمایہ دار آج بھی اونچے سے اونچا ہوتا جا رہا ہے۔ ہندوستان میں مسلمان ہونا آج بھی جرم ہے۔ جوش جس چیز سے ڈر کر پاکستان ہجرت کر گئے تھے وہ تو آج بھی اسی طرح لوگوں کے حقوق کو غصب کر کے ہندو اور ہندی کے تنازعے میں ملوکیت کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی ایک کوشش ہے۔ جوش کی "یادوں کی برات" ایک فرشتے کی نہیں بلکہ ایک انسان کی روداد ہے جو غلطیاں بھی کرتا ہے، جس کی گُھٹی میں پیار کرنا بھی ہے، جو دوسروں کے درد پر تڑپ اٹھتا ہے، جو ریاکاری سے اپنے عیب نہیں چھپاتا بلکہ صاف گوئی سے اپنے نظریات، افکار اور اعمال سب کے سامنے "یادوں کی برات" کی صورت پیش کر دیتا ہے۔ جوش نے خود کو کسی لانڈری سے دھلوا کر استری نہیں کروائی اس لیے وہ بہت سے لوگوں کے معیار پر پورے نہیں اترے لیکن ہمیں جوش کی اس کتاب کا غیر جانبدارانہ جائزہ لینے کی ضرورت ہے تبھی ہم فیصلہ کر سکتے ہیں کہ "یادوں کی برات" خودنوشت سوانح نگاری کے حوالے سے کیسی کتاب ہے۔ کیا یہ ٹرینڈ سیٹر یعنی رجحان سازی کے تقاضے پورے کرتی ہے تو اس کا جواب ہے۔

"یادوں کی برات" اپنی دلچسپی کے لحاظ سے ایک بہت مقبول کتاب ہے۔ اردو خودنوشتوں کا انداز اس کی اشاعت کے بعد تبدیل ہو گیا اور کچھ ادیبوں نے شعوری طور پر اس کے انداز کو اپنانے کی کوشش کی، ان میں قدرت اللہ شہاب، کشور ناہید، سعیدہ بانو اور نفیس بانو شمع کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ اگر ہم ان میں سوانحی ناول بھی شامل کر دیں تو احمد بشیر کا "دل بھٹکے گا"، ممتاز مفتی کا "علی پور کا ایلی" اور "گیان سنگھ شاطر" کا گیان سنگھ شاطر شامل ہے۔

ہندوستان میں معاشقوں کے اعتبار سے کملا داس (جو تبدیلیٔ مذہب کے بعد ثریا کے نام سے موسوم ہوئیں) کو رکھا جا سکتا ہے اس کی آپ بیتی "مائی اسٹوری" کے نام سے شائع ہوئی۔ تہمینہ کھر کی آپ بیتی" (My Feudal lord) میرا سائیں" بھی اپنی بے باکانہ زبان کے لحاظ سے مشہور ہوئی۔

لیکن اگر راست گویائی اور باطن کا احوال سنانے والی آپ بیتیوں کے لحاظ سے میرزا ادیب کی "مٹی کا دیا"، احسان دانش کی "جہان دانش و جہان دیگر" وزیر آغا کی "شام کی منڈیر سے" رحیم گل کی "داستان چھوڑ آئے" اور اشفاق احمد کی "بابا صاحبا" بہترین آپ بیتیاں ہیں۔ حمیدہ اختر کی "ہم سفر" اور "نایاب ہیں ہم" مصنفہ کے ظاہر و باطن کا حال دکھاتی ہیں۔

باب دوم: حواشی و حوالہ جات

۱۔ سید عبد اللہ، ڈاکٹر، اردو میں آپ بیتی۔ مشمولہ اردو نثر کا فنی ارتقاء از ڈاکٹر فرمان فتح پوری، کراچی، اردو اکیڈمی، سندھ ۱۹۸۹ ص ۲۱۸

۲۔ کفایت اللہ، کفایت اردو لغت، لاہور، کراچی، کفایت پبلشرز، اشاعت دوم، مئی ۲۰۰۹ ص ۴

۳۔ فیروز الدین، مولوی، فیروز اللغات، اردو جامع، لاہور، کراچی ۱۹۷۰ ص ۶

۴۔ The concise English Dictionary, oxford English press, 1993, 7th addition, New York, Page 58

۵۔ Dr, S-W, Fallon,

)i) Fallons, English Urdu dictionary, Lahore Urdu science board, 1982

)ii) PAI Sahib Gullab Singh + Sons

۶۔ Encyclopedia Britanica (vol: 1 and 11) Chicago, 1973-74, P-1009

۷۔ طفیل احمد، آپ بیتی، مضمون مشمولہ نقوش۔ آپ بیتی نمبر، جلد اول، لاہور، ۱۹۶۴ء ص ۳۰۲

۸۔ ساقی فاروقی، آپ بیتی / پاپ بیتی، کراچی، اکادمی بازیافت، جنوری ۲۰۰۸ء ص ۱۵

۹۔ غفور شاہ قاسم، پاکستانی ادب، شناخت کی نصف صدی تحقیق و تنقید، راولپنڈی ریز پبلی کیشنز اگست ۲۰۰۰ء ص ۲۸۲

۱۰۔ سلمان علی، ڈاکٹر، خود نوشت سوانح عمری چند بنیادی مباحث، مشمولہ جنرل آف ریسرچ والیم ۱۲، ملتان، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۰۷ء ص ۳۱۳

۱۱۔ جمیل احمد عدیل، تقسیم کے بعد اردو ادب میں خود نوشت سوانح عمری (تحقیقی مقالہ)، لاہور ایم۔اے پنجاب یونیورسٹی اور نٹل کالج، ۱۹۸۸ء ص ۲۰

۱۲۔ صبیحہ انور۔ اردو میں خود نوشت سوانح حیات، لکھنؤ، نامی پریس، اگست ۱۹۸۲ء ص ۲۳

۱۳۔ وہاج الدین علوی، اردو خود نوشت: فن و تجزیہ، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بار اول، ۱۹۸۹ء ص ۳۲

۱۴۔ پرویز پروازی، پروفیسر، پس نوشت و پس پس نوشت، لاہور، نیازمانہ پبلی کیشنز، س ندارد، ص ۲۰

۱۵۔ عبد المغنی، ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش، علی گڑھ ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۱ء ص ۱۲۳

۱۶۔ شاہ علی، ڈاکٹر، اردو میں سوانح نگاری، کراچی، گلڈ پبلشنگ ہاؤس، بار اول، جولائی ۱۹۶۱ء ص ۶۴

۱۷۔ بشیر سیفی، تنقیدی مطالعے، لاہور، نذیر سنز پبلشرز ۱۹۹۶ء ص ۱۰۰

۱۸۔ تحسین فراقی، ڈاکٹر، عبد الماجد دریا آبادی احوال و آثار، لاہور، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۱۹۹۳ء ص ۴۱۶

۱۹۔ اسلم انصاری، ڈاکٹر، تکلمات، لاہور، فکشن ہاؤس ۲۰۰۰ء ص ۸۲

۲۰۔ عبد اللہ، سید، ڈاکٹر، اردو میں آپ بیتی، (مضمون) مشمولہ اردو نثر کا فنی ارتقاء مرتبہ، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۸۹ء ص ۲۱۸

۲۱۔ عبد اللہ، سید، ڈاکٹر، فنِ آپ بیتی (مضمون) مشمولہ اُردو ادب بیسویں صدی میں مرتبہ پروفیسر حق نواز، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۸ء ص ۱۸۳۔۱۸۲

۲۲۔ محمد عمر رضا، ڈاکٹر، اردو میں سوانحی ادب: فن اور روایت، لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲، ص ۱۳۵

۲۳۔ عقیل عباس جعفری، یادوں کی برات کا پہلا ایڈیشن (مضمون) مشمولہ جوش شناسی، ساتواں شمارہ، یادوں کی برات نمبر، کراچی، الفاظ فاؤنڈیشن، جون ۲۰۱۳ء ص ۳۶۱

۲۴۔ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی کی نادر و غیر مطبوعہ تحریریں، کراچی، حیات اکیڈمی، ۱۹۹۲ء ص ۱۰۵

۲۵۔ منور عباس، محبت کا قرض، مضمون مشمولہ جوش شناسی، چھٹا شمارہ، کراچی، الفاظ فاؤنڈیشن، دسمبر ۲۰۰۹ء ص ۱۰۳

ii۔ منور عباس، محبت کا قرض (مضمون) مشمولہ مجلہ ''حیات جاوداں'' بیاد جوش مرتب نعیم میرٹھی، کراچی، کل پاکستان حلقۂ ادب، اپریل ۱۹۸۳ص ۶۵

۲۶۔ عبد الماجد دریا آبادی، مولانا، صدق جدید، لکھنؤ، ۴ مئی ۱۹۷۳ء

۲۷۔ ابو الکلام قاسمی، ڈاکٹر، یادوں کی برات، ایک تہذیبی بازیافت، مشمولہ جوش شناسی، ساتواں شمارہ، کراچی، الفاظ فاؤنڈیشن، جون ۲۱۰۳ ص ۲۴۸

۲۸۔ احتشام حسین، جوش کی شخصیت کے چند پہلو مشمولہ جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ، از قمر رئیس (مرتب) دہلی، سیمینار کمیٹی ۱۹۹۳ء ص ۳۰۸

۲۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، عورت جنس کے آئینے میں، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۴ء ص ۱۰۹

۳۰۔ خالد سہیل، جوش کی سوانح اور پورے انسان کی کہانی، مشمولہ جوش شناسی، کراچی، الفاظ فاؤنڈیشن، ساتواں شمارہ، جون ۲۰۱۳ ص ۳۷۱

۳۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، جوش کا نفسیاتی مطالعہ اور دوسرے مضامین، لاہور، فیروز سنز، س۔ن اشاعت ندارد، ص ۱۵۶

۳۲۔ علی عباس جلالپوری، سید، جوش ملیح آبادی ''یادوں کی برات کے آئینے میں'' مشمولہ فنون، ماہنامہ اپریل مئی ۱۹۷۲ء شمارہ ۵۔۶، ص ۶

۳۳۔ ذوالفقار علی احسن، اردو سفر نامے میں جنس نگاری۔۱۹۴۷ کے بعد، لاہور، مغربی پاکستان، اُردو اکیڈمی، اکتوبر ۲۰۰۸ء ص ۳۰

۳۴۔ سلیم اختر، جوش کا نفسیاتی مطالعہ او دوسرے مضامین، لاہور، فیروز سنز لمیٹڈ، س۔ن، ص ۲۰، ۲۱

۳۵۔ محمد عمر رضا، ڈاکٹر، اردو میں سوانحی ادب، فن اور روایت، لاہور، فکشن ہاؤس ۲۰۱۲ء ص ۱۵۵

۳۶۔ غفور شاہ قاسم، پاکستانی ادب، شناخت کی نصف صدی، راولپنڈی، ریز پبلی کیشنز، اگست ۲۰۰۰ء ص ۲۸۵

۳۷۔ الطاف فاطمہ، آپ بیتیاں (مضمون) مشمولہ تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند، لاہور، پنجاب یونیورسٹی پریس، جلد ا، طبع اول فروری ۱۹۷۲ ص ۶۱۷

۳۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، نئے جائزے (۱۹۷۸۔۱۹۸۸) لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، بار اوّل نومبر ۱۹۸۹، ص ۷۴ اور ۳۳۹

۳۹۔ ثمینہ رشید، اردو آپ بیتی کے نظری مباحث، مقالہ ایم اے، لاہور، اورنٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی ۲۰۰۸ء ص ۱۱۹۔۱۱۸

۴۰۔ ثمینہ ارشد، بُری عورت کی کتھا (تجزیاتی مطالعہ) مقالہ ایم فل غیر مطبوعہ، لاہور اورنٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۰۶ء ص ۷۷

۴۱۔ حمیرا ماجد، پاکستان میں اہم آپ بیتیوں کی تاریخ کا تنقیدی جائزہ، مقالہ ایم فل (غیر مطبوعہ) لاہور، جی سی یو ۲۰۰۱ء ص ۶

۴۲۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، خودنوشت اور اردو خودنوشت مضمون، مشمولہ فنون، لاہور، جنوری۔ مئی ۱۹۹۷ء ص ۳۰

۴۳۔ ماہر القادری، صدقِ جدید، لکھنؤ، یکم جون ۱۹۷۳ ص ۹

۴۴۔ خالد علوی، ڈاکٹر، یادوں کی برات، مضمون مشمولہ جوش شناسی، یادوں کی برات، کراچی الفاظ فاؤنڈیشن، جون ۲۰۱۳ ص ۱۳۷

۴۵۔ عبدالماجد دریا آبادی، مولانا، یادوں کی برات از جوش ملیح آبادی، مشمولہ صدق جدید، لکھنؤ نمبر ۳۵۔۳۶ جلد ۲۲۔۲۱۔۲۸، جنوری ۱۹۷۲ء ص ۶۱

۴۶۔ علی عباس جلالپوری، جوش ملیح آبادی، "یادوں کی برات کے آئینے میں"، مشمولہ فنون، لاہور، اپریل مئی ۱۹۷۲ء شمارہ ۵۔۶، ص ۱۶

۴۷۔ نثار احمد فاروقی، مضمون جوش مشمولہ ساقی، کراچی ۱۹۶۳ء، ص ۳۵

۴۸۔ عالیہ امام، ڈاکٹر، باتیں ہماری یاد رہیں گی، مشمولہ ادبیات (سہ ماہی) شمارہ ۸۷، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، اپریل تا جون ۲۰۱۰، ص ۳۴۴

۴۹۔ سید حامد، "جوش کی شخصیت یادوں کی برات کے آئینے میں" مشمولہ جوش ملیح آبادی تنقیدی جائزہ، مرتبہ خلیق انجم، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۹۲ء ص ۸۳

۵۰۔ حسرت کاسگنجوی، ڈاکٹر "یادوں کی برات اور ذہنی انتشار" مشمولہ پرکھ، کراچی، سندھ ایجوکیشنل اکیڈمی، مئی ۱۹۸۱ء ص ۱۲۸

۵۱۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر جوش ملیح آبادی ایک مطالعہ، مشمولہ ادبیات، شمارہ ۸۷، اپریل تا جون ۲۰۱۰ء ص ۷۱

۵۲۔ قمر رئیس، جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ، دہلی جوش انٹرنیشنل سیمینار کمیٹی ۱۹۹۳ء ص ۱۰۶

۵۳۔ بحوالہ حسن عابدی، چوتھا اجلاس: جوش کی فکری جہات مشمولہ ارتقاء ۲۴، لاہور۔ ارتقاء مطبوعات دسمبر ۱۹۹۹ء ص ۲۱۱

۵۴۔ ایضاً

۵۵۔ اقبال حیدر، جوش کی فکری ابعاد، مشمولہ ارتقاء ۲۴، ص ۱۴۳

۵۶۔ جوش ملیح آبادی، (مضمون) اسفل السافلین، مشمولہ مقالاتِ جوش مرتبہ سحر انصاری، ص ۱۳۳

۵۷۔ اکبر حمیدی، جوش صاحب مشمولہ ادبیات سہ ماہی، ص ۹۵

۵۸۔ فاروق خالد، مکالمہ، مشمولہ ادبیات سہ ماہی، ص ۳۵۹

۵۹۔ i- Hussain Saruardhi, Face book account, 13-10-2015
ii- Diganta Palli, Santiniketan, Birbhum, West Benga, Pin, 731235, India Ph: +919474410628

۶۰۔ بحوالہ جمیل احمد عدیل، مقالہ ایم اے اردو، ص ۲۷۳

۶۱۔ رشید حسن خاں، جوش بحیثیت انشاء پرداز، مشمولہ جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ، مرتب قمر رئیس، جوش انٹرنیشنل سیمینار کمیٹی، دہلی، ۱۹۹۳ء ص ۲۹۱

۶۲۔ خالد سہیل، جوش کی سوانح اور پورے انسان کی کہانی، مشمولہ جوش شناسی، یادوں کی برات نمبر ۲۰۱۳ ص ۳۷۳

۶۳۔ نقوش، آپ بیتی نمبر، حصہ اول، ۱۹۶۴ء ص ۸۹

۶۴۔ جعفر عسکری، جوش ملیح آبادی بحیثیت خود نوشت سوانح نگار مشمولہ جوش شناسی، ص ۲۳۴

باب سوم

مقالہ نگاری

کسی خاص موضوع پر اپنے جذبات واحساسات کا تحریری اظہار مضمون کہلاتا ہے اور اس میں ہر معاملے اور مسئلے کے بارے میں اظہار خیال کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ مضمون نگار اپنی پسند کے موضوع کا انتخاب کرتا ہے اور اس کا تعارف کرواتے ہوئے مختلف دلائل سے اپنی بات کر پُروزن بناتا ہے اور اپنے خیال کے مطابق نتیجہ پیش کرتا ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی مضمون کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

"کسی متعین موضوع پر اپنے خیالات اور جذبات واحساسات کا تحریری اظہار مضمون کہلاتا ہے۔ مضمون کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں۔ دنیا کے ہر معاملے، مسئلے یا موضوع پر مضمون لکھا جاسکتا ہے۔ مضمون کی بالعموم ایک خاص ترتیب ہوتی ہے۔ سب سے پہلے زیر بحث مسئلے کا تعارف کرایا جاتا ہے۔ پھر اس کی حمایت یا مخالفت میں دلائل دیے جاتے ہیں اور آخر میں نتیجہ پیش کیا جاتا ہے۔ بعض مضامین تاثراتی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ان میں ایسی ترتیب اور دلائل کی ضرورت نہیں ہوتی البتہ ہر مضمون کے لیے نظم وضبط، توازن اور تناسب ضروری ہوتا ہے۔"(۱)

مضمون کو بطور صنفِ ادب دیکھا جائے تو اس میں موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے بڑی وسعت ہے۔ ہر عہد کے مصنف نے اس صنف سے فائدہ اٹھایا ہے۔ یہ ایک ایسی صنفِ ادب ہے کہ جس میں شروع ہی سے تخلیقی آزادی کا احساس کارفرما ہے لیکن فنی نقطہ نظر سے جدید دور کی اس صنف میں مغربی ادب کے مطالعے کا احساس دکھائی دیتا ہے۔

اردو میں (Essay) سے مراد وہ مضامین ہیں جن کا اردو ادب میں باقاعدہ آغاز سرسید احمد خان نے کیا اور جنہیں بعض لوگ مقالہ کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں، مولانا حامد حسن قادری لکھتے ہیں:

"سرسید کی بعض تصانیت مثلاً خطباتِ احمدیہ اور اکثر مضامین تہذیب الاخلاق ایسے موضوع پر خوش اسلوبی سے لکھے گئے ہیں کہ ان سے پہلے اردو کیا عربی اور فارسی میں بھی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ سرسید کی کتابوں سے زیادہ ان کے مضامین مفید ہیں جن سے اردو میں حسنِ مقالہ نگاری پیدا ہو گیا ہے۔"(۲)

ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں مضمون اور مقالہ کی اصطلاح ایک ہی معنی میں استعمال کی گئی ہے۔ مضمون کی توسیعی شکل مقالہ ہے اور اسی وجہ سے مضمون اور مقالہ میں کوئی خاص فرق روا نہیں رکھا جاتا۔ اردو میں مضمون کی جو تعریف کی جاتی ہے وہ مقالہ کے لیے بھی روا رکھی جاتی ہے اور رائج بھی ہے۔ اردو میں مقالہ نگاری کی ترقی ایک مستقل فن اور صنفِ ادب کی حیثیت سے سرسید اور ان کے رفقاء کے دور میں شروع ہوئی۔ اظہر زیدی لکھتے ہیں:

"اردو میں مقالہ نگاری کی ترقی ایک مستقل فن اور صنفِ ادب کی حیثیت سے سرسید اور ان کے ادبی رفقاء کی رہنِ منت ہے۔ سرسید سے پہلے اس صنفِ ادب کا رواج یوں ہی سا تھا اور اس کا باعث اخبارات اور رسائل کا فقدان تھا"(۳)

"مضمون (ع) اسم مذکر (۱) لغوی معنی میں لیا ہوا۔ درمیان میں ڈالی ہوئی چیز (۲) معنی، مطلب، بیان، عبارت، تقریر (۳) آرٹیکل، جوابِ مضمون، انشاء ایڈیٹوریل (۴) بات، سُخن، ضمن، قول،

کہا تب رام سے ماں نے یہ مضمون
بھرت سے مجھ کو تم، پیارے ہو افزوں(۴)

انسائیکلوپیڈیا امریکانو میں مضمون کی یہ تعریف درج ہے:

"Essay a relatively brief literary compasition on the restricted topic - it is one of the principal divisions of literature along with poetry, drama and fiction,"(5(

اردو ادبیات میں مضمون نگاری کی صنف بھی انگریزی ادبیات کے زیر اثر انیسویں صدی میں یعنی ۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہوئی۔ اس دور کے لکھنے والوں نے خود کو محض ایک صنف تک محدود نہ رکھا بلکہ کئی اصناف میں خود کو منوایا اور اپنی بہترین صلاحیتوں کا اظہار کیا۔ مولوی حسن عبداللہ ''اردو ادب پر غدر کا احسان'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۱۴ء تک ان حضرات (سرسید، حالی، شبلی، آزاد، شرر، نذیر احمد وغیرہ) کا کوئی مضمون ایسا نہ تھا، جن پر کتابوں کا ڈھیر نہ لگا دیا ہو۔ ان کی تصانیف نظم و نثر کی جملہ اصناف و موضوعات پر حاوی تھیں، عقلیات، تواریخ، سیرت و سوانح، تعلیمات، سیاست، ادبیات، تراجم، اخبار ورسائل، ناول، فلسفہ وریاضیات، پندونصائح، تنقید و تبصرہ وغیرہ غرض کہ کوئی مضمون نہ بچا... ان کے سفر ناموں، تقریروں، مضامین اور خطوط کے مجموعے بذاتِ خود ادبیات کا اہم جزو بن گئے''(۶)

انگریزی ادب کے اثرات پڑنے سے ابتداء میں فنی طور پر تمام تخلیقات اپنی واضح شکل اختیار نہ کر سکیں اور اس طرح ایک صنف میں دیگر اصناف کی جھلک دکھائی دینے لگی۔ ناول میں داستان، ڈرامہ، افسانہ، تمثیل، سوانح، انشائیہ اور خاکہ وغیرہ کی شکل نظر آئی۔ اسی طرح مضمون میں بھی مقالہ، لیکچر، خطبہ، پیپر ٹاک، آرٹیکل اور انشاء وغیرہ کے عناصر کئی روپ بدل کر آئے۔ Essay کی اصطلاح آج کے دور میں ایک معین صنفِ ادب کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ لفظ ''Essay'' فرانسیسی لفظ ''Essai'' کی انگریزی شکل ہے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے بھی اس اصطلاح کے ماخذ کے بارے میں بحث کرتے ہوئے کہا کہ اس کا ماخذ ایک فرانسیسی لفظ ''Assay'' ہے جس کے معنی سعی اور کوشش کے ہیں اور یہ لفظ قدیم فرانسیسی لفظ ''Essai'' کی ایک جدید صورت ہے۔(۷)

ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک اس اصطلاح کا تعلق ہے تو اس کی تاریخ بذاتِ خود دلچسپی کی حامل ہے کہ محمد ارشاد کے بقول کہ ''ہم میں سے بہتوں کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ فرانسیسی زبان کا لفظ ''Essai'' درحقیقت فرانسیسی زبان کا لفظ نہیں بلکہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ عربی میں سعی کے معنی کوشش کرنا کے ہیں اور یہی معنی ''Essai'' کے بھی بیان کیے جاتے ہیں''(۸)

سید ظہیر الدین مدنی نے اپنی تصنیف ''اردو ایسیز ''Urdu essays'' میں لکھا ہے۔

لفظ Essay فرانسیسی لفظ Essai کی انگریزی شکل ہے۔ ایسائی عربی لفظ السعی کی فرانسیسی شکل معلوم ہوتا ہے۔ دونوں الفاظ کوشش کے مفہوم کو ظاہر کرتے ہیں۔ مانا جاتا ہے کہ لفظ Essai یونانی زبان سے فرانسیسی زبان میں آیا ہے مگر گمان غالب ہے کہ عربی لفظ ''السعی'' ہی اس کی اصل ہے۔ صدیوں تک اندلس اور جنوبی فرانس پر عربوں کا سکّہ چلتا رہا ہے۔ اسی وجہ سے فرانسیسی زبان میں لاطینی سے بھی زیادہ عربی الفاظ ہیں۔ ممکن ہے ''Essai'' ان میں سے ایک ہو''(۹)

The concise oxford dictionary of current english نے اس کا لاطینی ماخذ ''Exagium'' بتایا ہے جس کے معنی تولنے کے ہیں۔ ''Exagare'' کے معنی کوشش کرنے اور جانچنے کے ہیں۔ انگریزی میں یہ لفظ املاء کی تبدیلی کے ساتھ فرانسیسی سے لیا گیا ہے۔ چاسر نے ایسے کا لفظ تجزیے اور جائزے کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ ''Gover'' نے یہی لفظ کوشش کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ Essay لفظ فعل کے طور پر برتا گیا ہے جس کے معنی کوشش کرنے اور تجربہ کرنے کے ہیں۔ شیکسپیئر کے ہاں لفظ ایسے (Assay) فعل کی صورت میں

آیا ہے۔ اس سوال کے جواب میں کہ ایسے کے معنی کوشش کرنے کے ہیں تو پھر اس کو مضمون نگاری کے لیے کیوں استعمال کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر لکھتی ہیں:

چونکہ ایسے (Essay) میں کسی خاص موضوع کو منتخب کر کے ایک خاص نقطہ نظر سے اس پر روشنی ڈالی جاتی ہے اسی لیے اسے ایسے (Essay) کہا جاتا ہے۔(۱۰)

John Lock نے اپنی مشہور فلسفیانہ تصنیف کے لیے "An Essay concerning human understanding" کی اصطلاح استعمال کی۔ اٹھارویں صدی کے بیشتر لکھنے والوں نے جان لاک کی تقلید میں اپنے نثری کارناموں کے لیے Essay کی اصطلاح کو استعمال کیا۔ ڈرائی ڈن (Dryden) کے ادبی جمالیات (Treatise) کی بجائے یہی نام استعمال کیا۔ پاپ (PoP) نے اپنی معاشرت کی تنقید کو مجموعے کو (An essay on man) کہا اس اصطلاح کو اس کثرت سے استعمال کیا گیا کہ بہت سے نثر پارے اس ذیل میں آ گئے جو در حقیقت اس اصطلاح پر پورے نہ اُترتے تھے۔ اس ضمن میں بروکس (Brukes) کے Reflection on the revolution in france) یا مالتھس Malthas کا (On population) قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر جانسن جو کہ ایک صاحبِ طرز مضمون نگار ہیں مضمون کی تعریف میں اس طرح رقمطراز ہیں:

A loose sally of mind, an irrugular, undigested piece, not a regular and orderly composition(۱۱)

رضی عابدی کہتے ہیں مضمون ایک آزاد سیل خیال ہے جو کسی تہذیب اور قاعدے کا پابند نہیں ہے اور نہ پختگی اور تکمیل کے تقاضے پورے کرتا ہے۔(۱۲)

گولڈ سمتھ اپنے ایک مقالے میں مضمون کی تعریف یوں کرتا ہے کہ:

The essay is a literary form, reasonables the lyrics is so far as it is moulded by some central mood whimsical serious or ratical (13).

مضمون نگار کہتا ہے کہ مضمون ایک صنفِ ادب کی حیثیت سے غزل سے مشابہہ ہے ان حصوں میں اس کا بنیادی نقطہ نظر کوئی مرکزی کیفیت ہوتی ہے اور یہ کیفیت جذباتی بھی ہو سکتی ہے۔ سنجیدہ بھی اور طنزیہ بھی۔

آکسفورڈ ڈکشنری میں Essay کے معنی ایک ادبی اصطلاح کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں۔

A composition of moderate length on any particular subject, or branch of a subject originally implying want of finish an irregular, indigested piece. But now said of a composition more or less

eloborate in style through limited in range.(14(

آرتھر سی بنسن لکھتے ہیں:

The essay is the reverie, the frame of mind, in which a man say in the words of the old song, say I to myself, say. The essance of the essay is sololoquy

یعنی مضمون کی روح خود کلامی میں ہے۔(۱۵)

ڈاکٹر سلام سندیلوی اپنی کتاب ”ادب کا تنقیدی مطالعہ میں انشائیہ، مضمون، مقالہ اور تنقید کو الگ الگ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ لوگ انشائیہ، مضمون، مقالہ اور تنقید میں فرق نہیں کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر اور اصولی اعتبار سے یہ سخت غلطی ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک کے مقاصد الگ الگ ہیں اور ہر ایک کی حدود جُدا جُدا ہیں... انشائیہ مضمون نگاری کا وہ جزو ہے جس میں مصنف اپنے ذاتی اور انفرادی تجربات پیش کرتا ہے۔ اس پیشکش میں اس کی شخصیت کافی نمایاں رہتی ہے۔ اس طرح انشائیہ میں ایک خاص قسم کا داخلی رنگ پایا جاتا ہے مگر مضمون میں خارجی رنگ غالب رہتا ہے۔(۱۶)

انشائیہ، مضمون اور مقالے کو کتنا طویل ہونا چاہیے، اس کے بارے میں مصنفین مختلف رائے رکھتے ہیں۔ مضمون کو بہت طویل نہیں ہونا چاہیے۔ اختصار اس کی خاصیت ہونا چاہیے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ انشائیہ دو چار صفحات پر مشتمل ہو۔ انشائیہ دو چار صفحات پر مشتمل بھی ہو سکتا ہے اور دس بارہ صفحات پر مشتمل بھی۔ طوالت کا انحصار موضوع پر ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انشائیہ نگار کے علمی و ادبی پس منظر، مشاہدہ اور زندگی کے تجربات پر بھی۔ اگر انشائیہ نگار کا مشاہدہ کم اور زندگی کے تجربات محدود ہوں تو انشائیہ بھی سطحی نوعیت کا اور اکہرا ہو گا کیونکہ انشائیہ نگار کے پاس کہنے کو کم باتیں ہوں گی لیکن اگر اس کے پاس گوناگوں تجربات کا ذخیرہ ہو اس کا علمی و ادبی مشاہدہ وسیع ہو تو الفاظ کا ایک لامتناہی سمندر اس کے سامنے پایاب ہو گا اور وہ کفایتِ لفظی سے کام لے کر اپنی بات کو مختصر طور پر پیش کرے گا۔ انشائیہ کی دلچسپی اس کا مختصر ہونا ہے۔ مضمون کو کتنا طویل ہونا چاہیے اس بارے میں مختلف رائے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ''Essay'' کے طول کے متعلق لکھا ہے کہ یہ اوسط کمپوزیشن کا ہوتا ہے۔ واکر اس کا مختصر ہونا ضروری نہیں سمجھتا۔ اس کا کہنا ہے کہ ادب میں بعض اچھے مضامین طویل بھی ہیں لیکن جی اے ہڈسن کہتا ہے کہ طوالت اور ضخامت اکثر Essay کا حسن مجروح کر دیتی ہے۔ اس نے Essay concerning human understanding کی مثال کو عبرت انگیز قرار دیا ہے۔ ای وی ڈانز E.V. Dawns لکھتا ہے کہ Essay کا موڈ اور اس کا موضوع اس کی طوالت کا تعین کرتا ہے۔ اس نے طویل مضمون (Of adversity) کا حوالہ دیا ہے جو کہ چار سو الفاظ پر مشتمل ہے۔ اُس نے (De Quincey) کے مضمون (Murder as fine art) کا بھی ذکر کیا ہے جو بیس ہزار الفاظ میں لکھا گیا ہے اور بتایا ہے کہ ہم مضمون کے طول کو بندھے ٹکے اصول و ضوابط کے تحت مقرر نہیں کر سکتے بلکہ مضمون نگار کا مواد اور اس خاص موضوع پر مضمون نگار کے روشنی ڈالنے کا انداز اس طول کو گھٹاتا اور بڑھاتا ہے۔ Peter West land کا کہنا ہے کہ مضمون اپنے اختصار اور جامعیت کی وجہ سے دوسری اصنافِ نثر سے متمیز ہے کہ مضمون نگار کو اپنے جملہ پہلوؤں کا احاطہ نہیں کرنا ہوتا بلکہ کسی ایک پہلو پر بطور خاص روشنی ڈالنا مقصود ہے۔ زیادہ طوالت خوش ترتیبی اور سڈول پن کے لیے مضر ہے۔ ناول کے متعلق Stevenson (اسٹیونسن) کا کہنا ہے کہ ناول کو اس کی زیادہ ضخامت ہلاک کر دیتی ہے لہٰذا یہی چیز مضمون کے بارے میں بھی صحیح ثابت ہوتی ہے۔ مورے (Morrey) بھی مضمون کے اختصار پر زور دیتا ہے۔ جبکہ (Saint Beuve) سنٹ بیو، اس اختصار سے جامعیت مراد لیتا ہے، ڈاکٹر نظیر صدیقی اس بارے میں لکھتے ہیں:

''انشائیے کی طوالت اور اس کا اختصار کسی مقررہ اصول کا پابند نہیں۔ لیکن اس معاملے میں خود انشائیہ نگار کو یہ اندازہ کرنا چاہیے کہ اس کی تخلیقی توانائی طوالت کی متحمل ہو سکتی ہے یا نہیں''۔(۱۷)

مقالہ میں چونکہ مقالہ نگار اپنی بات کو دلائل سے ثابت کرتا ہے اور معروضی انداز کی بجائے تفصیلی بحث سے اپنی بات قاری تک اس طریقے سے پہنچانا چاہتا ہے کہ کسی طور بھی اس کی بات کو جھٹلانا ممکن نہ ہو اس لیے وہ ہر پہلو کا بھرپور طریقے سے جائزہ لیتا ہے اور آخر میں محاکمہ پیش کرتا ہے یعنی وہ تمہیدی پہلو سے آگے بڑھتا ہوا اختتام تک پہنچتا ہے۔ ایک مقالہ بیس صفحات سے لے کر کئی سو صفحات پر محیط ہو سکتا ہے۔ خاص طور پر علمی، ادبی، تحقیقی مقالات اپنی ضخامت میں سینکڑوں صفحات پر مشتمل ہوتے ہیں۔

عام طور پر سر سید احمد خان ہی کو مقالہ نگاری اور مضمون نگاری کا بانی کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اور پروفیسر رفیع الدین ہاشمی، سر سید احمد خان کو اردو مضمون نگاری کا بانی تصور کرتے ہیں۔ جبکہ ڈاکٹر سیدہ جعفر ماسٹر رام چندر کو اردو کا پہلا مضمون نگار تصور کرتی ہیں۔ رام چندر نے مضمون کی اصطلاح نہایت وسیع معنی میں استعمال کی ہے۔ اُنہوں نے نہ صرف ادبی موضوعات کے لیے اسے استعمال کیا ہے بلکہ ان کے یہاں تاریخی، جغرافیائی، کیمیائی اور دیگر مضامین جو مساحت، نجوم، ہیئت، تصوف، علم الاجسام، اخلاق، سماجی اصلاح اور حکمت وغیرہ سے متعلق ہیں ان کے لیے بھی یہی اصطلاح استعمال کی ہے لیکن ہم ماسٹر رام چندر کے مضامین کو باقاعدہ ادبی مضامین نہیں کہہ

سکتے۔ وہ سرسید کے پیش رو تو ضرور ہیں لیکن اردو نثر اور خاص طور پر مضمون نگاری کی ترقی میں سرسید ان سے آگے ہیں۔ سرسید احمد خان نے باقاعدہ مضمون نگاری کی تحریک شروع کی، خود مضمون لکھے اور دوسرے سے مضامین لکھوائے۔ ان کے دور میں یہ صنف اردو ادب کی اہم اور مستقل صنف بن گئی۔ سرسید سے قبل فورٹ ولیم کالج کی نثر اور دلی کالج کی نثر کے نمونے ہمارے سامنے ہیں لیکن سرسید نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ اس کام کا آغاز کیا اور اردو نثر میں سادہ نویسی کو رواج دیا۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر مضامین لکھوا کر اور خود لکھ کر اس سلسلے کو فروغ دیا۔ غالب کی انفرادیت پسندی نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا۔ انہوں نے بھی اردو نثر کی ترقی میں بالواسطہ حصہ لیا۔ ہر دور میں مضمون کے موضوعات تبدیل ہوتے رہے۔ آج موضوعات کے حوالے سے مضامینِ اردو کا دامن وسیع ہے۔ ڈاکٹر طیبہ خاتون لکھتی ہیں:

مضمون نگاری میں رفتہ رفتہ ارتقاء ہوا اور موضوعات کی وسعت کی بنا پر مختلف ادوار میں مختلف صورتیں اختیار کی گئیں۔(۱۸)

اردو مضمون نگاری کا آغاز دہلی کالج کے رسالے ''قران السعدین'' سے ہوا۔ اس رسالے کا اجراء ۱۸۴۵ء میں ہوا۔ دہلی کالج کے طلباء کو ایک موضوع دے دیا جاتا تھا۔ یہ ہفتہ وار رسالہ علمی نوعیت کا تھا۔ گارساں دتاسی قران السعدین'' کے حوالے سے لکھتا ہے:

ایک باتصویر اخبار ہے جس میں سائنس، ادب اور سیاست سے بحث ہوتی ہے۔ اس کا مقصد اپنے ہم وطنوں میں مغربی خیالات کی اشاعت ہے۔ ہفتہ میں ایک بار ہی شائع ہوتا ہے''۔(۱۹)

مضمون نویسی میں مضمون کی وسعت ادیب کی ذہنی اپج کی مرہون منت ہوتی ہے۔ مضمون نگاری کی ایک قسم مختصر نویسی یا Short essay ہے جس کی ابتداء ماسٹر رام چندر کے مضامین اور ''قران السعدین'' سے ہوئی۔ "Short essay" یا مختصر مضمون پانچ یا دس صفحات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان میں غیر متعلقہ مواد سے اجتناب کیا جاتا ہے اور تمام تو توجہ موضوع پر دی جاتی ہے۔ علمی بصیرت اور حقائق سے نفسِ موضوع کو اصول و ضوابط کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا جاتا ہے۔ مضمون نگار مشق کے زور پر مہارت حاصل کرتا ہے۔ اُس بارے مس ضیاالحق اپنے ایک مضمون ''مضمون نویسی'' میں اس طرح رقمطراز ہیں:

''جب تک کسی شے کے متعلقہ قواعد و فرائض سے پوری طرح واقفیت نہ ہو اور نفسِ مدعا پر غور وخوض کرنے اور ترتیب کی قابلیت بلحاظ اصول و قواعد حاصل نہ ہو، طبع آزمائی کرنا آنکھ بند کر کے راستہ چلنا ہے، مضمون نویسی بغیر مختصر نویسی کے بے سود اور بے سلیقگی اور بے ترتیب بھدّا پن ہے''۔(۲۰)

مضمون نویسی کے حوالے سے سرسید احمد خان کا نام نمایاں نظر آتا ہے جنہوں نے رسالہ تہذیب الاخلاق میں دینی، سیاسی، ادبی، سائنسی، معاشرتی غرض ہر قسم کے مضامین لکھ کر اور اپنے رفقائے کار سے مضامین لکھوا کر وقت کی اہم ضرورت کو پورا کیا۔ ڈاکٹر بشیر سیفی نے اپنی کتاب ''اردو میں انشائیہ نگاری'' میں سرسید کے مضامین کے تجزیاتی مطالعے سے ثابت کیا ہے کہ ''سرسید احمد خان بنیادی طور پر مقالہ نگار تھے اور ان کی مقالہ نگاری قوم اور معاشرہ کی اصلاح کے لیے وقف تھی۔ اصل میں ان کی حیثیت ایک مصلح کی ہے، ان کے لیے ادب یا مقالہ نگاری اس مقصد کے حصول کا ایک کارآمد ذریعہ تھا اور انہوں نے اسی حیثیت سے اسے استعمال کیا۔ انہوں نے اپنے مضامین میں جذبے کے بجائے عقل اور منطق سے کام لیا ہے جس کے باعث ان کے مضامین بھی مختصر مقالے بن کر رہ گئے ہیں۔(۲۱) سرسید احمد خان کے تفسیری مضامین اسی ذمرے میں آتے ہیں جبکہ فلسفیانہ مضامین میں انسانی نفسیات کی آگہی بھی ملتی ہے۔ سرسید احمد خان اپنی ذہنی اپروچ کی وجہ سے شک سے یقین کی منزل تک پہنچے اور مواد، اسلوب، علم و آگہی، مطالعہ، مشاہدہ، تخلیقی رویے، تخلیقی سوچ، وجدان و ذوق اور موضوع پر گرفت کی وجہ سے کامیاب مقالہ نگار بن کر سامنے آئے۔ اسی وجہ سے انہوں نے نہ صرف اردو ادب کی آبیاری کی بلکہ نئی پود کو شعور و آگہی اور محنت و لگن کی دھن سے کام لینے پر اکسایا۔ سرسید نے تحقیقی مضامین کے ذریعے سائنسی تشنگی کو پورا کیا۔ انہوں نے قرآن کے حوالے سے دنیا کے بننے بگڑنے،

انسان کی پیدائش، سورج کی گردش اور جدید علمِ طبیعات پر روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے علمی تناؤ کو کم کیا ہے۔ علمی و معاشرتی مضمون نگاری کے ذریعے انہوں نے تنقید نگاری کو اپنا شعار بنایا۔ سیاسی و فکری مضمون نگاری اردو مضامین کے ذریعے سے شروع ہوئی۔ سرسید احمد خان نے باغیانہ مضامین بھی پہلی بار لکھے اور انگریز حکومت کے خلاف قلم اٹھایا۔ تاریخ نے ثابت کر دیا کہ انگریز حکومت کے خلاف قلم اٹھانے والے باغی کہلائے۔

سرسید کے مضامین نے اردو نثر کو سیدھا سادا اسلوب دینے کے ساتھ ساتھ قوم میں اجتماعی شعور کو موضوع بحث بنانے کی بنیاد رکھی۔ اس دور میں حالی، شبلی، آزاد، مولوی ذکاء اللہ، وقار الملک اور دیگر احباب نے بھی مضامین لکھے۔ ان مضامین نے مسلمانوں کو جوش و جذبات کے تلاطم سے نکال کر عقل و دانش کی وہ راہ دکھائی کہ مسلمان اپنی عظمتِ رفتہ کی کھوج میں جُت گئے۔ مضامینِ حالی، کلیاتِ حالی جلد اوّل و دوم کو شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے مرتب کیا۔ انہوں نے حالی کے مضامین کی اقسام، مذہبی، اصلاحی، تاریخی، سوانحی، سرسید پر لکھے گئے مضامین، علی گڑھ کالج پر لکھے گئے مضامین اور متفرق مضامین کی حیثیت سے منتخب کیے ہیں۔ اصلاحی مضامین عوام الناس کی کمزوریوں کو اخلاقی رویوں اور روایات و اقدار کی پاسداری نہ کرنے پر لکھے گئے جبکہ علمی مضامین دین اسلام سے متعلق مضامین ہیں۔ تاریخی، سوانحی و متفرق مضامین، اصلاحی، علمی وادبی نوعیت کے ہیں اور سرسید پر لکھے گئے مضامین دراصل سرسید کی خدمات کا اعتراف ہیں۔ ان میں حالی کی سادگی، خلوص و صداقت جھلکتی ہے۔ حالی کے ہاں جوش و جذبے اور تخیل پر اصلاحِ قوم کا جذبہ غالب آ گیا۔ حالی کے نیچرل اسلوب کا آغاز سرسید کے تتبع میں ہوتا ہے اور پیامبر قوم بن کر انہوں نے قوم کی زبوں حالی کا ذکر بار بار کیا ہے۔ البتہ اس دردمندی اور سوزمندی پر ان کا لہجہ کہیں کہیں خشک اور اکتاہٹ سے بھرپور بھی ہو جاتا ہے۔

مولانا آزاد نے مضمون نگاری میں روحانی و جمالیاتی حسن کو اس طرح سمو دیا کہ مضمون نگاری میں باقاعدہ انشا پردازی کا آغاز ہو گیا ہے۔ علم بیاں اور علم بدیع کی رنگینی کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تخیل کی کارفرمائی بھی جہاں کڑی شرط ہو اور زبان کی جدت کے ساتھ ساتھ مصنف اپنا مافی الضمیر بھی بھرپور انداز میں بیان کر سکے۔ انشاء پرداز مضمون نگار کہلاتا ہے۔ انگریزی خیالات کا تڑکا آزاد کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔

رومانوی مضمون نگاری کا آغاز شبلی کی نثر سے ہوتا ہے۔ رومانوی مضمون نگاری میں تخیل کی کارفرمائی ہوتی ہے اور جوش و جذبات سے بھرپور نثری رومانویت مضمون کا خاصہ ہوتی ہے۔ فقروں میں غنایت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سحر انگیز نثر ہمارے سامنے آتی ہے۔ مولانا شبلی کی نثر دل پذیر بھی ہے اور خوش گوار بھی۔ شبلی کے مقالات میں نفاست اور لطافت بھی نظر آتی ہے۔ مولانا کی تخلیقی قوت نے ان کے مقالات کے نثرپاروں میں شعریت کو اس طرح جذب کیا ہے کہ علمی بصیرت اور باطنی بصارت یکجا ہو گئی ہیں۔ البتہ شبلی کے ہاں یہ نقص بدرجہ اتم پایا جاتا ہے کہ ان کی نثر غیر متوازن اور منتشر بھی ہو جاتی ہے۔

اظہر زیدی اپنی مرتب کردہ کتاب ''متاعِ ادب'' میں لکھتے ہیں۔

سرسید تحریک کی خشک اور معقولیت سے بھرپور نثر کے ردعمل کے طور پر رومانوی تحریک اُبھری جس میں حسن و عشق اور جذبات واحساسات کا بھرپور اظہار اسلوب بیان میں کیا جاتا ہے۔ اس تحریک کے سرخیل مولانا عبدالحلیم شرر تھے۔ ان کے مضامین رسالہ ''دلگداز'' میں شائع ہوتے رہے ان کا اندازِ تحریر رومانی ہے ان کے شاعرانہ وعاشقانہ مضامین میں رومانویت نقطہ عروج پر نظر آتی ہے۔ فقروں میں بھرپور جذباتیت جھلکتی ہے۔ نثرپاروں میں جذبات کے تلاطم کے ساتھ ساتھ جوشیلا پن بھی نظر آتا ہے۔ شرر کی نظر بھی بہکتی ہے اور تخیل بھی اکثر بے لگام ہو جاتا ہے۔ ان کے مضمون ''غریب کا چراغ'' کا ایک اقتباس دیکھیے:

"ہائے دیکھو! کس طرح ٹمٹما کے جل رہا ہے اس کی روشنی یا تو پرانے جھونپڑوں کی پھونس کی چھت اور چٹائیوں اور ٹہنیوں پر پڑتی ہے بعینہ جس طرح ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں میں مسلمانوں کا اقبال چمک رہا ہے"(۲۲)

مولانا شرر نے جس قدر مضامین لکھے، کسی دوسرے اردو مقالہ نگار نے نہیں لکھے۔ ان کے مضامین تقریباً (۲۰) بیس جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔

"صحیح مقالہ نگاری کا آغاز مولانا شبلی نے کیا۔ ان سے پیشتر جس قدر مقالے لکھے گئے ہیں ان کی حیثیت صرف مضامین کی تھی۔ مضامین کو مقالات کی سطح پر لانے والے مولانا شبلی ہیں۔ مضمون اور مقالے میں صرف اتنا فرق ہوتا ہے کہ لکھنے والے کو مقالے کے اندر اپنی ذاتی رائے اور ذاتی فیصلہ دینا ضروری ہوتا ہے جبکہ مضمون میں اس قسم کی پابندی نہیں ہوتی۔ مولانا شبلی کی علمی معلومات بہت وسیع تھی اس لیے انہوں نے تاریخی، مذہبی موضوعات کو سموتے ہوئے خود اپنی ذاتی رائے کا اظہار کیا۔"

تنقیدی مقالہ نگاری اپنے ابتدائی دور میں مولانا حالی اور شبلی کی مرہون منت ہے۔ حالی نے سب سے پہلے "مقدمہ شعر و شاعری" اور شبلی نے "موازنہ انیس و دبیر" لکھ کر تنقید کو فن کا درجہ عطا کیا۔ ان کے بعد مولوی عبدالحق، مولانا سید سلیمان ندوی خاص طور پر ممتاز ہیں اس سلسلے میں شرر، چکبست اور مہدی افادی مشہور ہیں۔ رسالہ مخزن نے جو سر عبدالقادر کی ادارت میں نکلتا تھا بلند پایہ مقالہ نگاری کی ترویج میں حصہ لیا۔

سر سید اور ان کے ادبی رفقاء محسن الملک، وقار الملک، سید محمود، مولانا الطاف حسین حالی، مولوی چراغ علی، مولوی ذکاء اللہ، مولوی اقبال علی، مہدی حسن وغیرہ نے ہر قسم کے بلند پایہ مضامین لکھے اور کثرت سے مختلف موضوعات پر خامہ فرسائی کی۔

رومانوی تحریک کو پروان چڑھانے والے سجاد حیدر یلدرم ہیں، مخزن اور شیخ عبدالقادر نے رومانویت کو فروغ دیا۔

سنتھیا اوزیک "Cynthia Ozick" رومانوی مضمون نگاری کے حوالے سے لکھتی ہیں:

An essay is thing of the imagination, if there is information in an essay; it is by the by, and if there is an oppinion in it, you need not trust it for the long run, A genuine essay has no educational, poemical sociopolitical use; it is the movement of a free of mind at play. Though it is written in prose, it is closer in kind to poetry than to any other form like a poem a genuine essay is made out of language and character and good temperament and pluck and chance.(23)

اردو میں شرر کے بعد یلدرم، شیخ عبدالقادر، عبدالعزیز فلک پیما، ابوالکلام آزاد، جوش ملیح آبادی، سجاد انصاری، حسن نظامی، میاں بشیر احمد، خلیقی دہلوی، حجاب امتیاز علی، امتیاز علی تاج، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، عبدالماجد دریا آبادی وغیرہ رومانوی نثر نگار کے روپ میں سامنے آئے۔

ابوالکلام آزاد کے "الہلال" کے ذریعے سیاسی تغیرات و انقلاب رونما ہوئے۔ ڈاکٹر محمد حسن ابولکلام کی نثر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ابوالکلام آزاد کی نثر رومانوی انانیت، تخیل کی فراوانی اور شدت جذبات کا اعلیٰ ترین مظہر ہے اور ان کی بلند و بالا شخصیت شبلی کی طرح آسمانوں سے نیچے نہیں اترتی۔ ابوالکلام آزاد نے جس عظمت و جبروت اعتماد کے ساتھ "میں" کا لفظ استعمال کیا ہے ابوالکلام کی انفرادیت اس دور کی عظیم ترین تخلیقات میں شامل کی جاسکتی ہے۔"(۲۴)

لفظوں کا حسن عبارت کو جمالیاتی پیرہن پہناتا ہے تو مضمون بھی جمالیاتی مضمون نگاری کی ذیل میں آتا ہے۔ ادب لطیف پر ثقیل لفظوں کی حکمرانی نہیں ہوتی بلکہ سُبک، نرم اور لطیف اندازِ تحریر قاری کو مسرت و حظ اٹھانے کے ساتھ ساتھ مسرت و تازگی عطا کرتے ہیں، کبھی کبھی لفظی حسن پوشیدہ مقصد کو ذہنی ترفع عطا کرتا ہے۔

رومانوی تنقیدی مضامین ایسے ہوتے ہیں جن میں اندازِ تحریر تاثراتی ہوتا ہے اور یہ جذباتی نثر سے بھی مزین ہوتا ہے ایسے مضامین لکھنے والوں پر جانبداری کا الزام لگایا جاتا ہے۔ ان میں کہیں خطیبانہ انداز ہوتا ہے کہیں جملوں کی کاٹ نظر آتی ہے اور کہیں تخیلاتی الفاظ اور پر شکوہ آہنگ ہوتا ہے۔ دلی لگاؤ سے وابستہ خیالات و احساسات کسی بھی نقاد کی دلچسپی و احساسات کو ظاہر کرتا ہے۔ نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، عبدالرحمن بجنوری کے ہاں تاثراتی تنقید کا گہرا عکس نظر آتا ہے۔

نیاز فتح پوری کے ہاں جمالیاتی تنقید میں جمالیاتی اقدار کی تلاش اہم ہے۔ مضامین میں فطرتِ سلیم نمایاں ہے۔ اسلوب میں ادبیت کی شمولیت نے نیاز پر رومانویت کی چھاپ لگادی۔ مثلاً ''اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ'' میں ان کا لہجہ کہیں کہیں لفظیات سے بھرپور نظر آتا ہے۔

مجنوں گورکھپوری نے نیاز کے زیر اثر تاثراتی مضامین لکھنے شروع کیے۔ اگرچہ بعد میں ان کے ہاں ترقی پسند تحریک کا اثر دکھائی دیتا ہے لیکن ''ادب اور زندگی'' اور ''تنقیدی حاشیے'' میں تاثراتی رنگ جھلکتا ہے اور ان کے مضامین کا رنگ رومانوی نظر آتا ہے۔

فراق گورکھپوری تنقید کا ایک معتبر نام ہے۔ جمالیاتی تنقیدی مضامین میں مضمون نگار ادب پاروں میں حسن و قبح کی کھوج لگاتا ہے۔ فراق نے نیاز کا اثر قبول کیا۔ انہوں نے قدیم شاعری کو نئی نسل سے متعارف کروایا۔ ان کے جملوں کی بازگشت میں گھن گرج نمایاں ہے۔ فراق نے اپنے معاصر مجنوں گورکھپوری سے حقِ دوستی ادا کیا۔ اردو غزل پر فراق کی تنقیدی بصیرت ان کی روشن خیالی کی عکاس ہے۔ وہ فن برائے ادب کے ترجمان ہیں۔ الجھی ہوئی تقابلی تنقید کے نمونے فراق کے مضامین کی پہچان ہیں۔

عبدالماجد دریا آبادی، عبدالرحمن بجنوری، مولانا صلاح الدین، اور فیض احمد فیض بھی رومانوی تنقید کے علمبردار ہیں۔ عبدالماجد دریا آبادی نے فلسفہ، تاریخ، سوانح، ادب اور دیگر موضوعات پر قلم اٹھایا۔ مشرقی اندازِ تحریر کے ساتھ ساتھ اپنے مضامین میں جامعیت، اختصار اور تنوع کا خاص دھیان رکھتے ہیں۔ ان کے مضامین میں تازگی اور دلکشی ہے۔ ان کا مضمون '' غالب کا ایک فرنگی شاگرد آزاد فرانسیسی'' ایک تحقیقی مضمون ہے۔

سرسید کا رسالہ دسمبر ۱۸۷۰ء میں منظر عام پر آیا جبکہ اودھ پنچ ۱۸۷۷ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ معاشرتی زوال اور اخلاقی انحطاط پر ایک تازیانہ تھا۔ اس رسالے کے توسط سے پہلی بار اردو مضمون نگاری میں طنزیہ اور مزاحیہ مضمون نگاری کا آغاز ہوا۔ کیٹلی اور طنزیہ تحریروں کے ذریعے معاشرے کی ناہمواریوں اور تنزل پذیر ماحول کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس رسالے کے مدیر منشی سجاد حسین نے انیسویں صدی کے آخر میں طنز و ظرافت کے ذریعے اردو مضمون نگاری'' کو وسعتِ موضوع عطا کیا۔ فقروں کی کاٹ، زبان کی مہارت اور واقعات کی منظر کشی، طنز و ظرافت سے بھرپور مضامین کا خاصہ ہوا کرتی ہے۔ تخیل اعلیٰ کی وساطت سے اصلاحِ معاشرہ کا کام کیا جاتا ہے لیکن رکاکت اور پھکڑ پن کسی بھی مضمون کی ادبی حیثیت کو کم کر سکتے ہیں۔ اودھ پنچ کی ظرافت بھی اکثر سطحی اور عامیانہ ہوا کرتی تھی۔ اودھ پنچ کا مواد ظریفانہ ہونے کے باوجود اخلاقی، سماجی اور سیاسی رویوں کے خلاف ایک تجزیاتی و استدلالی تحریک بھی تھا۔ رسالہ نقوش طنز و مزاح نمبر میں ڈاکٹر خورشید اسلام اودھ پنچ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اودھ پنچ کی ظرافت میں گہرائی اور طنز میں گیرائی کی کمی ہے لیکن ہمیں زمانہ کی پابندیوں اور مجبوریوں کو ذہن سے یکسر محو نہیں کرنا چاہیے۔ اودھ پنچ کی ظرافت ثقل ہے مگر نمک سے خالی ہے۔(۲۵)

طنز و ظرافت کی یہ لہر فرحت اللہ بیگ، پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی تک پہنچی ''مرزا الم نشرح'' کے نام سے مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین مزاح کی چاشنی کے ساتھ ساتھ تخلیقی و تنقیدی بصیرت سے بھی بھرے ہیں۔

پطرس اپنی طرز کے خود موجد تھے۔ ان کے ظریفانہ مضامین میں عالمانہ تدبیر حاوی تھی۔ انسانی کمزوریوں کا احاطہ کرنے والے یہ مضامین انسان دوستی کا درس دیتے ہیں۔

الفاظ کی جادو گری، خیال کی شوخی اور بیان کی دلکشی نے رشید احمد صدیقی کے مزاح کو زندہ جاوید کر دیا۔

ملا رموزی کا نام بھی ادبی ظرافت میں اہم مقام کا حامل ہے۔

قاضی عبدالغفار، سلطان حیدر جوش، حاجی لق لق، چراغ حسن حسرت، شوکت تھانوی، شفیق احمد، عبدالمجید سالک و دیگر نے اردو مزاح نگاری میں اضافے کیے۔

تاریخی مضمون نگاری کا آغاز سرسید سے ہوا۔ تاریخی مضمون میں اعداد و شمار کی صداقت کے ساتھ ساتھ تحقیقی اسلوب بھی شامل ہوتا ہے۔ سرسید نے "آثار الصنادید" لکھی، شبلی نے اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر، الفاروق، المامون اور الغزالی موازنہ انیس و دبیر، شعر العجم اور سیرت النبی تحریر کیں۔ محمد حسین آزاد نے دربار اکبری اور سخندانِ فارس لکھی۔ ان مضامین میں ترتیب واقعات درست ہونا ضروری ہے۔ بڑی محتاط چھان پھٹک کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی لیے دستاویزی تحقیق کہلاتے ہیں۔ شعور کے ساتھ حقائق کی صداقت اور دیانت تاریخی مضامین کا اہم اصول ہے۔ مرزا محمد سعید نے تاریخی و سوانحی مضامین لکھے۔ "لیڈی کرزن" اور "تاجِ آگرہ" ان کے نمائندہ مضامین ہیں۔

حسن برنی بطور مورخ جانے جاتے ہیں۔ مقالات کے دو مجموعے مقالاتِ برنی حصہ اول و دوم ہیں جو سلاطین برصغیر و مشاہیر اسلام پر مشتمل ہے۔ استقلال، منطق اور تحقیق کے ساتھ صداقت اور تنوع ان کے مضامین کا خاصہ ہیں۔

شمس اللہ قادری کے تاریخی مضمون کی خوبی ان کی طوالت، اسلوب، تحقیق، اعداد و شمار کی کھوج اور سائنس کی کھوج ہے۔

مضمون نگاری کی ایک اہم قسم تحقیقی مضمون نگاری ہے۔ صداقت کی تلاش، اصل حقائق کی جستجو تحقیق ہے۔ ملا وجہی کی "سب رس" پر مولوی عبدالحق کی تحقیق نے اسے گمنامی سے نکال دیا۔ حافظ محمد شیرانی نے "پنجاب میں اردو" لکھی اور تحقیق کے نئے در وا کیے اور پرانی تحقیق کی تصحیح بھی کی۔

مولوی عبدالحق کے مقدمات میں تحقیق کا اعلیٰ معیار نظر آتا ہے جو انہوں نے سب رس، نکات الشعراء، گلشن عشق، دیوانِ اثر اور باغ و بہار وغیرہ پر لکھے۔

مولوی محمد شفیع کے تحقیقی مقالات میں ان کا نقطہ نظر واضح، مدلل اور صداقت و ریاضت کے ساتھ ساتھ ان کی انتھک محنت کا نچوڑ ہے۔ انہوں نے برصغیر پاک وہند کے علاوہ دنیائے ادب کے تحقیقی سرمائے کے تاریخی مواد کی جانچ پڑتال کر کے اسے ضائع ہونے سے بچایا۔

مولانا عرشی کی تحقیق نے نئی جہات واضح کیں۔ غلام رسول مہر قاضی عبدالودود، رشید حسن خان اور گیان چند اردو تحقیق کا بڑا نام ہیں۔

1935ء میں ترقی پسند مصنفین نے لندن میں ترقی پسند تحریک کی ابتداء کی جس نے روٹی، کپڑا، مکان، انسانی مجبوریوں، ضرورتوں اور انسانی محکومیوں اور مجبوریوں کو اپنا موضوع بنایا۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر معاشرے کے انتشار و اضطراب سے متاثر ہونے والے غرباء اور نادار مزدوروں کی فاقہ کشی، مظلومیت، اور بے کسی کے موضوعات پر لکھا گیا۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، سجاد ظہیر، مجنوں گورکھپوری، آل احمد سرور، سید احتشام حسین، ڈاکٹر عبدالعلیم، اختر انصاری، عزیز احمد، ممتاز حسین، سردار جعفری نے تنقیدی مضامین لکھے۔

اردو انشائیہ کے حوالے سے سرسید احمد خان، عبدالحلیم شرر، محمد حسین آزاد، سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، فرحت اللہ بیگ، خواجہ حسن نظامی، ڈاکٹر وزیر آغا، کرشن چندر، نظیر صدیقی، مشکور حسین یاد اور اکبر حمیدی کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

جوش ملیح آبادی کی مضمون نگاری / مقالہ نگاری

مضمون نگاری کے حوالے سے جوش ملیح آبادی کے مضامین درج ذیل کتب میں موجود ہیں۔

۱۔ روحِ ادب ۱۹۲۰ء (مجموعہ نظم و نثر)

۲۔ مقالاتِ زریں ۱۹۲۱ء

۳۔ اوراق سحر ۱۹۲۱ء

۴۔ اشارات ۱۹۴۲ء

۵۔ مقالاتِ جوش ۱۹۸۲ء

۶۔ اوراقِ جوش ۲۰۱۰ء

جوش ملیح آبادی کی پہلی تصنیف ''روح ادب'' کے نام سے میتھیوڈیسٹ لکھنؤ سے جولائی ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی جبکہ جوش نے اپنی سوانح ''یادوں کی برات'' میں اس کے سن تصنیف کو ۱۹۲۱ء یا ۲۲ قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''میری سب سے پہلی سترہ تصویروں والی، مصور تصنیف 'روح ادب' غالباً میتھوڈیسٹ پریس لکھنؤ سے رفیع احمد خاں کے مقدمے اور حضرتِ اکبر کی رائے کے ساتھ ۱۹۲۱ء یا ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی۔''(۲۶)

جوش ملیح آبادی ''یادوں کی برات'' میں سہواً ۱۹۲۰ء کی جگہ ۱۹۲۱ء یا ۲۲ء تحریر کر گئے تھے کیونکہ روح ادب کے صفحۂ اول پر کتاب کے نام کے نیچے یہ تحریر موجود تھی کہ نتیجۂ فکر مصورِ جذبات جناب شبیر حسن صاحب جوش رئیس ملیح آباد لکھنؤ، جولائی ۱۹۲۰ء کتاب کے آخری صفحے پر جوش صاحب کے دستخط بھی موجود تھے جس میں ''شبیر حسن خاں بہ قلم خود'' لکھا ہوا تھا۔(اس وقت شاید جوش لکھنا شروع نہیں کیا تھا) ساتھ ہی یہ بھی لکھا گیا تھا کہ جس کتاب پر مصنف کے دستخط موجود نہ ہوں وہ کتاب مالِ مسروقہ ہے۔ اس کتاب میں محمڈن کالج علی گڑھ اور کیلنگ لکھنؤ کے سابق آفیشنگ پروفیسر رفیع احمد خاں کے مقدمے کے علاوہ اکبر الہ آبادی اور شرر لکھنوی کی رائے بھی موجود تھی۔

اس کتاب میں سترہ تصویریں بھی موجود تھیں جو اس زمانے میں موجود سگریٹ کی ڈبیا پر موجود تصویروں کی طرز پر تھیں۔ اس بارے میں حبیب اللہ رشدی رقمطراز ہیں:

اس زمانے میں قینچی سگریٹ بڑا مشہور تھا اس سگریٹ کو بنانے والی کمپنی نے ایک جدت یہ کی تھی کہ سگریٹ کی ہر ڈبیہ میں کسی یورپی حسینہ کی تصویر ہوا کرتی تھی۔ اس طرز پر ''روحِ ادب'' میں مشرقی حسن کے ساتھ تصویریں تھیں''۔(۲۷)

اس کتاب کی لاگت تھی چار روپے فی جلد جبکہ فروخت کی گئی تین روپے فی جلد کے حساب سے۔ جوش نے اسی بنا پر خود کو نئ قسم کی بیوپاری قرار دیا ہے۔(۲۸) کہ نفع نقصان جس کے پیش نظر نہ تھا بلکہ ادبی خدمت کا جذبہ تھا اور خود کو منوا لینے کی ایک پرجوش قوت تھی جو

انہیں نقصان کے خدشے سے بھی پیچھے نہ ہٹا سکی تھی۔ یہاں سے ان کی شخصیت کے ابتدائی خدوخال بھی اُجاگر ہونے لگے تھے کہ انہوں نے کبھی بھی مالی منفعت کو ترجیح نہ دی۔

یہ ایک ایسا مجموعہ تھا جس میں جوش نے نظم ونثر میں اپنے جذبات و محسوسات کو بیان کیا تھا۔ ۹۷ صفحات پر ان کی نظمیں، غزلیں اور قطعات تھے جبکہ ۵۶ صفحات نثر کے لیے مخصوص تھے۔ اس دور میں جوش کی نثر ٹیگور سے متاثر دکھائی دیتی ہے اور نثر میں بھی جوش کا شعری مزاج غالب دکھائی دیتا ہے۔ جوش کے اس دور کے خیالات میں تخیل پرستی اور عارفانہ رجحان حاوی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جوش نے ''روح ادب کو اپنے دورِ تصوف وتقشف کی یادگار قرار دیا ہے۔(۲۹)

اکبر الٰہ آبادی نے جوش کے بارے میں لکھا۔

''آپ کی نثر بھی خوب ہے، کیوں نہ ہو، آپ اہل دل بھی ہیں، اہلِ زبان بھی، میری خوش نصیبی ہوگی کہ میرے بعد آپ ایسے یاد کرنے والے باقی رہیں۔''(۳۰)

مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

روحِ ادب۔ منشی شبیر حسن خاں صاحب جوش کے نثر و نظم کے مجموعے کا نام ہے۔ حضرت جوش ایک مستعد پر جوش اور جدت پسند شاعر اور نثار ہیں۔ نثر میں جابجا جدت سے کام لیا ہے اور فرضی تصویروں میں اصلیت کا رنگ دکھایا ہے۔ ''ان کی نثر میں تصنع اور تکلف کا دخل زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ حصولِ کمال کے لیے اس سے بچنا ضروری ہے''۔(۳۱)

پروفیسر آلِ احمد سرور اپنے مضمون ''جوش کی نثر نگاری'' میں رقمطراز ہیں۔ جوش کی شاعری کی قدر و قیمت ضروری ہے مگر ان کی نثر ایک قسم کی ہسٹریا ہے''۔(۳۲)

مولوی عبدالحق اور پروفیسر آلِ احمد کی رائے سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی رائے اس بات کی شہادت ہے کہ ان اصحاب نے جوش کی نثر نگاری کا بھرپور جائزہ نہیں لیا ہے۔ روحِ ادب میں نثر سے متعلق اوراق کی تعداد بہت کم ہے۔ مولوی عبدالحق نے تو پھر رواداری نبھاتے ہوئے سخت الفاظ استعمال نہیں کیے ہیں لیکن پروفیسر آلِ احمد سرور نے جو رائے استعمال کی ہے وہ سراسر اضطراری نوعیت کی ہے۔ دراصل جوش نے فانی بدایونی کے کلام پر سخت تبصرہ کیا تھا اور انہیں بیسوۂ عالم، سوز خواں اور ہر وقت بسورنے والا شاعر قرار دیا تھا جس کا بدلہ آل احمد سرور کی رائے کی صورت میں سامنے آیا۔

راقم کے زیرِ نظر ''روحِ اَدب'' کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ یہ مکتبہ اردو لاہور سے شائع کیا گیا ہے۔ پبلشر چوہدری نذیر احمد پرنٹر ہیں۔ یہ ایڈیشن ۱۹۴۲ء میں طبع ہوا۔ اسی صورت میں اسے نگارستان ایجنسی اردو بازار، دلّی سے بھی شائع کیا گیا ہے۔

ابتداء میں اکبر الٰہ آبادی کی رائے اور شرر لکھنوی کا تبصرہ دیا گیا ہے۔ دیباچہ ''باز، گلبانگ پریشاں می زنم'' کے عنوان سے جوش ملیح آبادی کا تحریر کردہ ہے۔ انتساب ''نذر'' کے عنوان سے ہے۔ شاعر و نثر نگار نے اپنی اس کاوش کو صبحِ صادق کے نام معنون کیا ہے۔ اگلے صفحے پر غالب کا ایک شعر ہے۔

بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

اس کے بعد نظم کا جلّی عنوان ہے جس کے نیچے فارسی کا ایک شعر موجود ہے۔

بیاؤ رید گر اینجا بود سخندانی
غریبِ شہر سخن ہائے گفتنی دارد

"نظمیں" کے عنوان سے موجود حصے میں ۲۱ نظمیں موجود ہیں جو صفحہ نمبر ۱۹ تا صفحہ ۶۳ واقع ہیں۔ "محسوسات" کے عنوان سے موجود دوسرے حصے میں ۵ نظمیں موجود ہیں۔ جو صفحہ نمبر ۶۷ تا صفحہ نمبر ۷۳ پر مشتمل ہے۔ تیسرے حصے میں "غزلیات" ہیں جو صفحہ نمبر ۷۸ تا صفحہ نمبر ۱۰۴ پر مشتمل ہیں۔ چوتھا حصہ "آئینے" کے عنوان سے ہے جو صفحہ نمبر ۱۰۵ تا ۱۱۴ تک ہے۔ اس میں ۳۵ رباعیات ہیں۔ پانچواں حصہ "ستارے" کے عنوان سے جو صفحہ نمبر ۱۱۵ تا ۱۲۶ ہے۔

چھٹا حصہ "تازہ پھول" کے نام سے ہے جو کہ صفحہ نمبر ۱۲۷ تا ۱۶۰ پر مشتمل ہے اور یہی حصہ ہمارا مقصود ہے۔ ہمیں نثری حوالے سے جوش کے ابتدائی مضامین کا تجزیاتی مطالعہ کرنا ہے۔ اس حصے میں کل چھیالیس ۴۶ مضامین ہیں ان میں سے کچھ انتہائی مختصر یعنی چند سطری ہیں اور کچھ کی طوالت قابل قبول ہے۔

"روحِ ادب" کا صفحہ نمبر ۱۸، ۶۶، ۷۴، ۷۶، ۱۰۶، ۱۱۴، ۱۱۶، ۱۲۸ اور ۱۶۱ خالی ہے۔ شاید ان صفحات پر وہ تصویریں تھیں جن کا تذکرہ جوش نے یادوں کی برات میں کیا ہے کیونکہ طبع ثانی طبع اوّل کی بعینہ نقل ہے اس لیے تصویروں والی جگہ خالی ہے۔ ہو سکتا ہے طباعت کی کسی مجبوری کی بنا پر یہ تصویریں طبع کرنا جوش کے لیے ممکن نہ ہو سکا ہو۔

حصہ نثر "تازہ پھول" کے جلّی عنوان سے ہے۔ عنوان کے اوپر ایک شعر ہے۔

کس درجہ دلگداز ہے آمد بہار کی
لبریز سوز سے ہے ہوا کوہسار کی

عنوان کے نیچے جوش کی تحریر ہے کہ

"یہ وہ مضامین واشعار ہیں جو آغاز موسم بہار یعنی مارچ میں لکھے گئے ہیں اور ایسے پھول ہیں جن کی پنکھڑیوں سے شبنم ابھی اڑی نہیں ہے"۔

روح ادب ص ۱۲۷

پہلا نثر پارہ "بہار" کے عنوان سے ہے۔ جوش ٹیگور سے متاثر تھے اور انہوں نے "روح ادب" کے دیباچے میں اس کا برملا اظہار بھی کیا ہے۔ دوسرے رومانی مصنفین کی طرح جوش کے مضامین بھی مناظر فطرت اور حسن وعشق کے بیان سے لبریز ہیں۔ جوش کے شاعرانہ مزاج کا اثر ان کی نثری تحریروں میں دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر بشیر سیفی اس بارے میں لکھتے ہیں۔

"جوش نے اپنے شاعرانہ مزاج کے زیر اثر جو تشبیہات استعمال کی ہیں انہوں نے ان کے نثر پاروں کی قدر و قیمت میں بہت اضافہ کر دیا ہے۔ خصوصاً روح ادب کا نثری حصہ شاعرانہ نثر کا بہترین نمونہ ہے"۔ (۳۳)

بہار کے موسم میں ایک شاعر باغ میں بیٹھا ہوا شعر کہہ رہا ہے۔ شاعر پرندوں کے چہچہوں میں اپنی روح کو بالیدہ محسوس کو رہا ہے۔ ہوا خوشبو کے بوجھ سے آہستہ آہستہ چل رہی ہے، پھول کھل رہے ہیں، کلیاں چٹک کر ساز بجا رہے ہیں۔ اس معطر فضا میں شاعر (جوش) اپنی گہرے گہرے سانس لے رہا ہے اور اس کا دل کہہ رہا ہے کہ مجھے آبِ حیواں کی طرف نہ بلاؤ وہاں تو صرف عمر دراز ہوتی ہے جبکہ یہاں روح بالیدہ ہوتی ہے اور دل صاف ہوتا ہے۔

شاعر موسم بہار کو ایک "ٹھنڈی سانس" یا "ایک شیریں بوسہ" سے تعبیر کرتا ہے۔ شاعر کی تشبیہہ نے موضوع کی معنویت میں اضافہ کیا ہے۔

دوسرا نثر پارہ "گل و بلبل" کے عنوان سے ہے۔ جوش کا خیال ہے کہ گل و بلبل دو نہیں بلکہ ایک چیز ہے۔ عاشق و معشوق کو دو نہیں بلکہ ایک کہو۔ ملکۂ بہار کی آمد رنگینیوں، خوشبوؤں اور نغموں کی نوید لاتی ہے۔ باغ میں چٹکنے والی کلیاں پھول بن جاتی ہیں تو ملکۂ بہار باغ کی روش پر ٹہلتے ہوئے جس پھول کو توڑ کر بوسہ دیتی ہے وہ بلبل بن کر گیت گانے لگتا ہے۔ یہاں بھی جوش مناظر فطرت کی محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اس کا رومانی انداز نظر غالب ہے۔ موسم بہار کے مناظر کے سامنے اس کا صرف سر ہی نہیں بلکہ دل بھی خم ہے۔

تیسرا نثر پارہ "میں خوش رہنا چاہتا ہوں" ہے اس میں شاعر نے دولت کو نجس قرار دیا ہے۔ آرام اس کی نظر میں ادبار کا پیش خیمہ ہے۔ زمانہ غدار ہے۔ شاعر کو اس خوشی کی تلاش ہے جو دل کے ٹوٹ جانے سے پیدا ہوتی ہے اور بہتے ہوئے آنسوؤں کی تہہ میں مسکراتی ہے۔ اصل خوشی وہ خوشی ہے جو دُکھ کے بعد جنم لیتی ہے۔ دولت اور عیش و آرام کا وہ خواہاں نہیں ہے۔ ایک رومانی کا سا تخیل جوش کو مثالی دنیا میں لے جاتا ہے۔

چوتھا مضمون "میرا سینہ تاریک ہے، مجھے تھوڑی سی روشنی دے دو" ہے۔ جوش نے صبح اور شام کی تمثیل کے ذریعے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ من اگر روشن ہو تو اس کی روشنی انسان کو باہر سے بھی روشن کر دیتی ہے اور اسے مانگنے کی روشنی کی حاجت نہیں رہتی۔ اگر انسان کا اندر ہی تاریک ہو تو باہر کے اجالے اس کو کسی طرح بھی روشن نہیں کر سکتے۔ کسی کے دُکھ میں بہائے ہوئے دو آنسو سینہ جگمگا دیتے ہیں۔ اظہارِ بیان کی صداقت اور احساسِ جمال نے جوش کی طبعی رومانیت پسندی کو صیقل کیا ہے۔

پانچویں نثر پارے کا عنوان ایک فارسی شعر پر ہے کہ: ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی!

کیں رہ کہ تو میروی ترکستان است

ضروری نہیں کہ ہر خوشگوار سفر کا انجام بخیر ہو۔ بڑی منزل تک پہنچنے کے لیے خوفناک گھاٹیوں اور طوفانی سمندروں کے اندر سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ جتنا عظیم کام ہو اس کے لیے مشکلات و مصائب بھی اتنے ہی جھیلنے پڑیں گے۔ مسافروں کو سفر پر نکلنے سے پہلے راستے کی کٹھنائیوں کو دھیان میں رکھنا چاہیے۔ یہاں جوش رومانیت کے دائرے سے نکل کر حقائق کی دنیا کی طرف قدم رکھتے دکھائی دے رہے ہیں کہ اے مسلمان! مجھے ڈر ہے کہ تم کعبے نہ پہنچ پاؤ گے کیونکہ تم نے جو راستہ اپنایا ہے وہ ترکستان کو جاتا ہے، کعبے کو نہیں۔ جوش نوجوانوں سے مخاطب ہیں کہ ہمیں درست سمت اختیار کرنی چاہیے تا کہ جلد منزل تک پہنچ جائیں۔ غلط قدم موت کی بھیانک وادیوں میں پھینک دیتا ہے۔ ایک انقلابی کا انداز ان کے نثر پارے سے جھانک رہا ہے۔

چھٹے مضمون میں بھی ایک شعر کو بطور عنوان لیا گیا ہے۔

ساز شادی سن کے ہوتی ہے پریشانی مجھے
اس سے آتی ہے صدائے مرثیہ خوانی مجھے

جوش نے اس مضمون میں خوشی کے پردے کے پیچھے جھانکنے والے غم کا ذکر کیا ہے کہ جو خوشی کے ساتھ توام ہے۔ جہاں شہنائیاں بجتی ہیں وہیں ماتم بھی ہوتے ہیں۔ دولہا اور دلہن کی تمثیل کے پیرائے میں جوش نے تذکرہ کیا ہے کہ خوشی یعنی شادی اپنے ساتھ غم بھی لے کر آتی ہے۔ جوش عام طور پر رجائی لہجے کے مالک ہیں لیکن اس نثر پارے میں وہ تھوڑے سے قنوطی دکھائی دے رہے ہیں۔

ساتویں مضمون "عجیب شیرینی" میں جوش نے ایک واقعہ کو بنیاد بنایا ہے کہ رنگین عارضوں والی حسینہ آئس کریم بیچا کرتی تھی۔ اس کی آئس کریم کی بجائے اس کی باتوں کی شکر سے لوگ شاد کام ہوا کرتے تھے۔ "عجیب شیرینی" تھی جو لوگوں کو آئس کریم میں محسوس ہوتی تھی۔ محبت ناممکن کو بھی ممکن کر دکھاتی ہے۔ حسن و عشق کے اظہار نے جوش کے رومانی مزاج کو اس نثر پارے میں عیاں کیا ہے۔

آٹھواں مضمون ''ایوان شاہی میں چند سوالات'' ہے۔ جوش نہایت جذباتی ہیں اور ان کی تحریروں میں جذبات کی یہی فراوانی ہے۔ جاندار اسلوب نے ان کے جذبات کو مؤثر بنا دیا ہے۔ فطرت سے محبت نے جوش کے رومانی انداز کو واضح کیا ہے۔ وہ مہربان بادشاہ سے سوال کرتے ہیں کہ جب قدرتی پانی، نرم وملائم سبزہ، سنہرا آسمان، اور جنگل شہر کی ترتیب سے بہتر ہے تو وہ کیوں فطرت کا حسن چھوڑ کر محل کی پابندیوں میں خود کو محبوس کرے۔

نویں نثر پارے کا عنوان ایک شعر ہے جو مصنف کے والد کا ہے۔

برا ہو دل کا یہ کم بخت آہ کر بیٹھا
قریب تھا کہ وہ کچھ مجھ سے گفتگو کرتے

حسن وعشق کا بیان رومانی شعراء وادباء کا خاصا رہا ہے۔ تخیلاتی تازگی اور انفرادیت وانانیت نے جوش کے اس مضمون کو ادب لطیف میں شامل کر دیا ہے۔ حسن وعشق کی تپش عاشق کا کلیجہ جلاتی ہے۔ رعبِ عشق جان لے لینے کے درپے ہو جاتا ہے۔ عاشق اظہار کی جرأت نہیں پاتا اور اس کی آہ سب کچھ جلا دیتی ہے۔ عاشق ومعشوق کی ملاقات کا تخیلاتی منظر اس چابکدستی اور خوبصورتی سے تخلیق ہوا ہے کہ جس نے جوش کی نثر میں رچاؤ پیدا کر دیا ہے۔

''اس نے مجھ سے معافی چاہی اور میں نے اُسے ظالم سمجھا'' ایک نثر پارے کا عنوان ہے۔ معشوق کی طرف سے ملنے والا جور وستم بھی عاشق کے لیے باعث تسکین واطمینان ہوا کرتا ہے۔ وہ سہواً عاشق کو تکلیف پہنچا کر اگر معافی مانگے تو عاشق کی راحت کلفت میں بدل جاتی ہے۔ خالصتاً عاشقانہ مضمون ہے۔

''اُمید موہوم'' اور ''گفتگوئے خواب'' بھی عاشقانہ مضامین میں جوش پہلے مضمون میں محبوب کو ملنے اور اک نظر دیکھنے کی اُمید میں دروازے پر نظر جمائے بیٹھے ہیں لیکن انہیں خود پتہ ہے کہ یہ امید موہوم ہے۔ اس میں شاعر نے مایوسیوں کو زبردست اور تاریک بگولے سے اور امید کو چھوٹے سے زرہ سے تشبیہہ دی ہے۔

دوسرے مضمون میں شاعر خواب میں اپنے محبوب سے مخاطب ہے جو چاند کی طرح اس کی نیند کے آسمان پر چمکتا ہے۔ خوبصورت استعارات وتشبیہات نے اس نثر پارے کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔ شاعر اپنے تخیل کی پرستش میں گرفتار ہے اور یہ اس دور کی رومانی فضا کی تاثیر ہے۔

''شائد وہ آجائے'' جوش ایک ایسے شخص کی طرح محوِ انتظار ہیں جو موسموں کی شدت سے بے نیاز ہے، سردی، گرمی اور بارش اس کے انتظار کو کم نہیں کر سکتے۔ امید ہے کہ عاشق کے دل کو مایوس نہیں ہونے دیتی۔ رومانی لحاظ سے ایک کامیاب مضمون ہے۔

''کیا تو مجھے کچھ دینا چاہتا ہے'' درویش اپنی گڈری میں مست ہے اس کے سامنے شاہی جاہ وجلال اور خزانے کچھ نہیں ہیں۔ وہ آسمان کا خزانہ رکھتا ہے جو چاند، ستاروں اور سورج کی دولت سے معمور ہے۔ قدرتی حسن سے مالا مال ہے۔ جوش نے ''ایوانِ شاہی میں چند سوالات'' میں بھی ایسے ہی سوال اٹھاتے ہیں۔ مناظر قدرت سے محبت اور اپنی کم مائیگی پر فخر اور غیرت وانانیت نے جوش کی نثر کو انشائے لطیف کے قریب کر دیا ہے۔

''وہ آنسو بے بہا ہیں جو دوسروں کی مصیبت پر نکلیں'' جوش نے اس نثر پارے میں غریب بڈھے کی حالت پر ہمدردی کے آنسو بہائے تو وہ ستاروں کی طرح روشن ہو گئے۔ جوش نے اس موضوع سے مناسبت رکھنے والے نثر پارے ''میں خوش رہنا چاہتا ہوں'' اور ''میرا سینہ تاریک ہے مجھے تھوڑی سی روشنی دے دو'' میں اسی قسم کے خیالات کو ظاہر کیا ہے۔ دیگر رومانی ادباء وشعراء کی طرح جوش نے جذباتیت پر زور دیا ہے

''گرانی کا سبب'' ایک ایسا نثر پارہ ہے جس میں جوش نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ اس دنیا میں ہر شخص گرانی کا رونا روتا ہے جو بھی جس کے پاس سب کچھ ہے اور وہ بھی جو بہت تھوڑی سی پونجی رکھتا ہے۔ شاعر بے شک اپنے خیالوں کی دنیا میں کھویا رہتا ہے۔ لیکن بالواسطہ یا بلاواسطہ اُسے اس گرانی سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ اسلام نے ہمیں مساوات، رواداری اور حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے۔ معاملات میں اعتدال، ایمانداری اور دینی اصول وضوابط کی پابندی کو ملحوظ خاطر رکھنے کی ضرورت ہے، لیکن ہم نے اللہ کے بتائے ہوئے راستے کو چھوڑ کر یہود و ہنود کے راستے اپنا لیے ہیں۔ جوش کے خیال میں لوگوں نے خدا کو ہلکا کر دیا ہے اور اشیاء کو گراں کر دیا ہے۔ نکتہ آفرینی اور اختصار نے اس نثر پارے کو انشائیہ سے بہت قریب کر دیا ہے۔

''دنیا میں جنگ کا باعث میں ہوں'' ایک ایسا نثر پارہ ہے جس میں پہلی جنگ عظیم کی توجیہہ یہ کی گئی ہے کہ میں نے اپنے باغ کی وسعت کے لیے تمام ہمسایوں کے مکانات اپنے قبضے میں لے لیے اس لیے لوگوں کے دلوں میں بھی تحریص پیدا ہوئی کہ وہ دوسروں کی املاک اپنے قبضے میں لے لیں۔ شاہ جرمن کے دماغ سے جب یہ لہر ٹکرائی تو دنیا میں جنگ شروع ہو گئی۔ جوش دنیا میں جو کچھ بھی بُرا دیکھتے ہیں اس کو خود سے منسوب کر کے اپنے آپ کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ یہی جذباتیت اور خود اذیتی انہیں دوسروں کے درد پر تڑپا دیتی ہے۔

''عقلیں سلب، آنکھیں بند'' ایک ایسا نثر پارہ ہے جس میں جوش نے یہ نکتہ نکالا ہے کہ ڈگری و سرٹیفکیٹ کے بغیر کسی چیز کی سچائی کا دعویٰ کرنے والے کو جھوٹا سمجھا جائے گا۔ پہلے حسن کو سفارش تصور کیا جاتا تھا اب باوجود حسن و جمال ڈگری کے بغیر کوئی قابلِ اعتناء نہ گردانا جائے گا۔ وقت کے ساتھ جوش کی یہ بات صحیح ثابت ہوئی۔

''بدترین اذیت'' میں جوش نے بیان کیا ہے کہ اس سے بڑھ کر اذیت کیا ہو گی کہ محبوب کی آمد کا انتظار ہو، قدموں کی آہٹ پر فرطِ اشتیاق سے عاشق نظر اٹھائے اور رقیبِ روسیاہ کا چہرہ نظر آئے۔

''کیا ہی اچھا ہوتا'' جوش نے اس نثر پارے میں یہ نکتہ نکالا ہے کہ اپنے من میں ڈوب کر سراغِ زندگی پالے یعنی مشاہدۂ کائنات کرے اور جزو میں کل دیکھ لے خاک کے اک ذرّے میں پوری کائنات ہے۔ ملکوں کی سیر سے سیاحت میں نام ہوتا ہے۔ جبکہ مشاہدہ کائنات سیاحت اور عارفیت دونوں بخشتا ہے۔ جوش نے اس نثر پارے میں اختصار میں تفصیل پیش کر دی ہے۔

''اس تصویر کے دونوں رخ اچھے ہیں'' جوش نے اس نثر پارے میں ایک عاشق کے جذبات کی خوب ترجمانی کی ہے۔ اس کے محبوب کا لطف اور ترشی دونوں اس کی زندگی کے لیے ضروری ہے۔

''راز'' عاشق نے اپنے محبوب کو ایک راز کی طرح دل میں چھپایا ہوا ہے۔

''آب در کوزہ و من گردِ جہاں میگروم'' عاشق دیوانہ وار کسی کو ڈھونڈ رہا ہے۔ کس کو؟ اس کو پتہ نہیں ہے اس کی طلب اسے در در بھٹکا رہی ہے وہ اپنے اضطراب میں ادھر اُدھر گھوم رہا ہے۔ جیسے ہرن کو خوشبو محسوس ہوتی ہے مگر سراغ نہیں ملتا کہ کہاں سے یہ خوشبو آرہی ہے۔

رومانوی شعراء، و ادباء کے ہاں حسن و عشق کا والہانہ اظہار ہوتا ہے۔ ''عجیب شراب'' میں محبوب کی آنکھ ولب کی تعریف کی گئی ہے۔ ''پانچ قسمیں'' جوش نے دنیا کو رونے کا مقام، تاریکی کا مرکز، صحت و سکون کا محل نہیں، سخت بے حیا اور بے غیرت اور بے حد تلخ و ترش قرار دیا ہے۔

''چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے سبق'' ایک ایسا مضمون ہے جو جوش کی فکری و فنی معراج پر دلیل ہے۔ جوش کہتے ہیں کہ پتھر پر نام کھودنا مشکل ہے تو صفحۂ ہستی پر نام چھوڑنا کس قدر مشکل ہے۔ لوہے کو حسب منشا شکل میں ڈھالنا اور اس قدر مشکل ہے تو نفس پر بغیر محنت و

جانفشانی قابو پانا کس قدر مشکل ہو گا۔ دنیا میں گرنے کے ہزاروں راستے ہیں لیکن اوپر چڑھنا یعنی بلند مقام حاصل کرنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے محنت۔ اونچائی سے مکانات بلند و پست قبریں معلوم ہوتے ہیں لیکن روحانی طور پر بلند ہو جانے سے چلتے پھرتے مردوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ مختلف النسل جانور ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں لیکن مختلف النسل انسان ہرن کچھوے سے بھی گئے گزرے ہیں مل جل کر رہ نہیں سکتے۔

''بیش بہا موتی'' کے عنوان سے جوش نے مختلف اقوال بیان کیے ہیں۔ خوشی کے بعد غم ضرور آتا ہے۔ حسن سنگدل ہوتا ہے۔ دوستی میں مستقل رہ اور دشمنی میں غیر مستقل رہ، پرانے دور کے کافر بھی آج کے مومنوں سے بہتر تھے اور موت سے زیادہ شیریں کوئی چیز نہیں۔ جوش موت کو تمام تکالیف کا علاج سمجھنے والوں میں سے نہ تھے بلکہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے والوں میں سے تھے لیکن اپنے ابتدائی دور میں موت انہیں پُر کشش اور شیریں دکھائی دے رہی ہے۔

''طلوع سحر'' ایک ایسا مضمون ہے جس میں جوش نے منظر نگاری کے ذریعے قاری کو اس تجربے میں اپنے ساتھ شامل کیا ہے جو انہیں ہر روز صبح صادق کے وقت حاصل ہوتا ہے۔ ان کے ہاں جلال و جمال کی دلکش کیفیات ملتی ہیں۔ ٹیگور سے اثر پذیری اس مجموعے میں جگہ جگہ جھانکتی نظر آتی ہے۔ صبح کا حسن، افق کی لو، عروسِ فطرت، شبنم کے قطرات، صبح کا طلوع ہونا، فردوسی مطرب یعنی حوروں کا موتیوں کے ہار پہنے زمین پر اترنا، جمالیاتی احساس کی یہی شدت جوش کو ادبِ لطیف کے نثر نگاروں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔ ان کی رومانیت پسندی نے جمالیاتی احساس کے ساتھ مل کر سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ جوش کے اسلوب کی یہی رنگینی ان کے طبعی رجحان کی عکاس ہے۔

''حیات و ممات'' ایک ایسا نثر پارہ ہے جو منظر نگاری اور خاص طور پر تخلیقی و تخیلی منظر نگاری کا عکاس ہے۔ زندگی اور موت دو الگ الگ عالم ہیں مگر بعض اوقات وقت ہمیں ان لوگوں کی زندگی کا ادراک کروا دیتا ہے جو اس دنیا سے جا چکے ہیں اور اب قدرت کے کرشمے سے مختلف انداز سے ہمارے سامنے جلوہ گر ہو رہے ہیں۔ الفاظ اس منظر کو گرفت میں لانے سے قاصر ہیں۔ جوش جس رومینٹیزم میں گرفتار ہیں وہاں موت دلربا محسوس ہو رہی ہے۔

''صبح پیری'' ایک ایسا نثر پارہ ہے جو استعاراتی ہے۔ جوش نے تاریک رات سے آفتاب کے روشن ہونے کو ''برکتیں بیدار'' ہونا قرار دیا ہے۔ بڑھاپے میں تاریکی ناامیدی کی عکاس ہوتی ہے جبکہ آفتاب کی بلندی کرّے کی سیاہی مٹا دیتی ہے۔

''میرے مالک مجھے حیرت ہے کہ تو سرد مہر کیوں نہیں'' جوش مختلف مناظر قدرت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں ہم سورج، چاند، ستاروں، پہاڑوں، آبشاروں، برساتوں اور سبزہ زاروں سے محبت کرتے ہیں، ان کی طرف دوڑتے ہیں لیکن یہ اپنی جگہ ساکت رہتے ہیں۔ حسین لوگ آنکھوں میں مہر و مروت نہیں رکھتے۔ خدا تو سب سے حسین و جمیل ہے پھر وہ کیوں سرد مہر نہیں ہے وہ تو طالب و مطلوب میں فرق نہیں رکھتا۔ اس نثر پارے میں جوش عمومی رویوں اور خدا کے تخصیصی رویے کی بات کر رہے ہیں کہ وہ بندوں پر بے حد مہربان ہے۔

''حسن کیا ہے؟'' اس نثر پارے میں جوش نے حسن کے مختلف مفاہیم بیان کیے ہیں۔

''حسن کا دوسرا رخ'' جوش اس نثر پارے میں اپنی بات کو (جو اس نے حسن کیا ہے؟ میں کہی تھی) رد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب میں دنیا کی رنگینیوں اور رعنائیوں سے لطف اندوز ہو رہا ہوتا ہوں تو اس وقت ایک حسین چہرے پر نگاہ پڑتے ہی میرا سارا اطمینان اضطراب میں بدل جاتا ہے۔ کیا حسن کا دوسرا نام ''نرمی و تفریح'' ہے۔ جوش ایک پکے عاشق کی طرح اپنے محبوب کو دیکھتے ہی اس حسنِ جہاں سوز کے نظارے میں گم ہو جاتے ہیں اور اس نثر پارے میں جمالیاتی اظہار کے علاوہ انشا پردازی کی خصوصیات کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے۔

"عشق" جوش نے عشق کے مفہوم کی مختلف توجیہات پیش کی ہیں۔ ازل سے ہی حسن کے سوال کا جواب عشق نے دیا ہے جو نظام ہستی بدل ڈالتا ہے۔ محبت کی طوفانی سمندر کی سب سے اونچی موج، روحانی اثرات کی بہترین تشریح عشق ہے۔ عشق کی اس سے بہتر تشریح اور نہیں ہو سکتی۔ عشق آسمانوں پر چڑھا دینے والا زینہ بھی ہے اور قبروں میں اتار دینے والا رعشہ بھی ہے۔

"صداقت" ایک ایسی دوشیزہ کی مانند ہے جو بلوریں تخت پر جلوہ افروز ہے اور ہر طرح کے تصنع و تکلف سے آزاد ہے۔ دلیری، خلوص، صفائی اور نور باطن سے چہرہ روشن ہے۔ رحمت کے فرشتے صداقت پر واری جاتے ہیں، مسکرائے تو پھول کھلتے ہیں۔

"قناعت" ایک ایسی خوبصورت شاہزادی ہے جو غیور، متدیّن، خوددار، سرمایۂ فخر و امتیاز اور طمع سے پاک ہے۔ اپنی مٹی کے برتنوں میں اس قدر مستغرق ہے کہ سونے کے ظروف کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتی۔

"امید" مردہ رگوں میں زندگی دوڑا دیتی ہے۔ بحرِ ہستی لعل اُگلنے لگا۔ "طلسم تخیل" ایک روح کو تازہ کر دینے والا مضمون ہے۔ ساری کائنات میں ایک ہی روح دوڑ رہی ہے۔ مظاہر قدرت اور انسان الگ الگ نہیں ہیں بلکہ کائنات انسان میں گم ہے اور انسان کائنات میں۔ جوش لکھتے ہیں۔

"یہ عجیب بات ہے کہ کشتی دریا میں غرق ہے اور دریا کشتی میں ڈوبا ہوا ہے۔ (۳۴)

"نوجوان بیوہ اور طویل رات" جوش ملیح آبادی نے اس نثر پارے میں نوجوان بیوہ کی تنہائی اور پل پل مرنے کی کیفیت اس خوبی سے بیان کی ہے کہ استعارات و تشبیہات کی مدد سے چند سطروں میں بیوہ کی طویل راتوں کا منظر آنکھوں کے سامنے کھینچ دیا ہے۔ جوش اپنی نثر کی رنگینی سے قاری پر وجد کی کیفیت کر دیتے ہیں۔ نئے نئے استعارات اور تشبیہات نے ان کی نثر میں اسلوب کی جدت اور ندرت پیدا کر دی ہے۔ مظاہر کی تجسیم کاری نے منظر نگاری کو کمال کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ ابتداء میں غالب کا شعر ہے جس سے ابلاغ میں اور زیادہ روانی پیدا ہو گئی ہے

جوش غالب کا شعر یہاں لکھتے ہیں:

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شب غم بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا

نصف شب کے آتے ہی بیوہ کا ٹوٹا ہوا دل دھڑکنے لگا... آنسو آنکھوں میں آئے اور برسنے لگے۔

جو آنسو نکلا بیوہ نے اپنی سالگرہ کے ریشمی دوڑے میں پرو لیا۔ یہاں تک کہ صبح ہوتے ہوتے "آنسوؤں" کا ایک چمکتا ہوا ہار تیار ہو گیا۔ رونے والی نے تھراتے ہوئے ہاتھوں سے یہ تحفہ تاروں بھری رات کی خدمت میں پیش کیا۔

رات سناٹے میں آ گئی... تاروں کے آنسو بہنے لگے... صبح نے ٹھنڈی سانس کھینچی... اور سویرا ہو گیا..." (۳۵)

جوش نے اپنے ابتدائی دور کے مضامین میں ہی ادب لطیف کے نثر نگاروں میں جگہ حاصل کر لی تھی۔ ان کی رومانیت پسندی نے ان کے جمالیاتی احساس کے ساتھ مل کے وہ شہ پارے تخلیق کروائے جو اپنے اختصار، تخلیقی گرفت، جامعیت، جاذبیت، جرأت رندانہ اور فنی چابکدستی کی وجہ سے قاری کے دل میں گھر کر گئے۔ انہوں نے شعوری طور پر تو ادب لطیف کی نثر کو نہیں اپنایا اور رومانیت کی تحریک سے وابستگی بھی دانستہ اختیار نہیں کی لیکن فطرت سے محبت کو وہ ٹیگور کی قربت سے اثر پذیری قرار دیتے ہیں۔ صبح کا حسن، عروسِ فطرت، اُفق کی لو، شبنم کے قطرات، شبِ مہتاب کا حسن، لوحِ محفوظ کا مطالعہ یہ سب جوش کی فطرت سے محبت کی وجہ سے ان کے دل کو بھاتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالودود خان لکھتے ہیں کہ:

"جوش کا جمالیاتی احساس پاکیزہ ہے۔ ان کی تحریروں میں تخیل کی رومانیت، جمالیاتی احساس کے علاوہ اظہار بیان میں انشا پردازی کی وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ادبِ لطیف کے لازمی عنصر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جوش بھی ٹیگور سے متاثر ہوئے۔ خصوصاً ان مضامین سے جو "روح ادب" میں شامل ہیں۔ ٹیگور کی تقلید ظاہر ہوتی ہے۔ "روحِ ادب" کا حصہ نثر، "مقالاتِ زریں"، "اوراقِ سحر" اور "اشارات" کے چند مضامین اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر سرمایۂ ادب لطیف میں جگہ حاصل کر لیتے ہیں۔"(۳۶)

۲۔ مقالاتِ زریں

۱۹۲۱ء میں یہ مجموعۂ اقوال لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اس پاکٹ سائز مجموعے کے صفحات کی تعداد ۶۴ ہے اس میں جوش کے اپنے ۲۶۴ اقوال درج ہیں۔ جوش نے تعارف میں لکھا ہے۔

... یہ نوعیتِ تحریر نثر میں ایک طرح کی پُر مغز شاعری ہے۔ وہ آزاد خیالات، جنہوں نے بحر و قوافی کے زندان میں آنا پسند نہ کیا۔ نثر کے وسیع اور کھُلے میدان میں جلوے دکھانے لگے۔ نہیں معلوم اردو خواں طبقہ اسے کس حد تک رغبت کی نگاہ سے دیکھے گا بہر حال اردو میں یہ ایک نئی صورت ضرور ہے۔ اگر یہ طریقہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا تو جرأت ہو گی کہ ایسے سلسلے قائم رکھے جائیں ابھی تو یہ چند اوراق ملک میں نمونے کی حیثیت سے پیش کیے جاتے ہیں۔"(۳۷)

یہ انتہائی نایاب مجموعہ ڈاکٹر ہلال نقوی کو سید علی کرار نقوی کے ذاتی کتب خانے سے دستیاب ہوا۔ ہندوستان اور پاکستان کے کتب خانوں میں اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہے۔ البتہ ذاتی کتب خانوں میں اس کے نسخے موجود ہو سکتے ہیں۔ کچھ اقوال درج ذیل ہیں جو جوش کے مزاج اور فکری نہج پر روشنی ڈالتے ہیں۔

۱۔ مفلسوں سے دوستی رکھنا اعلیٰ ترین عبادت ہے۔

۲۔ خدا نہ کرے خوشی درجہ کمال تک پہنچ جائے۔

۳۔ شاعر اپنی صدی کی بہترین تصنیف ہے۔

۴۔ خوشی کے پھول کو زیادہ پیار نہ کر ورنہ دب کر اس کی پنکھڑیوں سے غم کا عرق ٹپک پڑے گا۔

۵۔ مہ رُخوں کی سخت مزاجی اور حسینوں کی سخت دلی نے یہ بات مجھ پر واضح کر دی کہ حسن کے نقش و نگار ہمیشہ پتھر پر کھودے جاتے ہیں۔

۶۔ خوبصورت چہرے، خوش تقریری اور موسیقی کے مدرسے ہیں۔

۷۔ جب بُرے آدمی آپس میں صلح کرنے لگیں تو اچھے آدمیوں کو گھبرا کر ایک دل ہو جانا چاہیے۔

۸۔ ایک چیز میں مستقل رہ اور ایک میں بالکل غیر مستقل... دوستی میں مستقل رہ اور دشمنی میں بالکل غیر مستقل۔

۹۔ کوئی جانور ایسا قابلِ مضحکہ اور شایان تمسخر نہیں جس طرح ایک معزور مجتہد۔

۱۰۔ جب میں پرانے زمانے کا موجودہ زمانے سے موازنہ کرتا ہوں تو مجھے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس دور کے شدید کافر بھی اس وقت کے بہترین مومنوں سے بہتر تھے۔

۱۱۔ کاش یہ بات آسانی سے سمجھ آسکتی کہ موت سے زیادہ شیریں کوئی چیز نہیں!!

۱۲۔ صرف شہید ملک الموت کو شکست دے سکتا ہے۔

۳۔"اوراق سحر" ۱۹۲۱

یہ کتاب بھی نایاب ہے اس کے بارے میں ڈاکٹر ہلال نقوی یوں رقمطراز ہیں:

''مقالاتِ زریں'' کے آخری صفحات پر اوراق سحر کے تعارف میں یہ سطریں لکھی ہوئی ہیں:

... یہ جوش کے وہ نادر چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں جو آپ نے صبح کے وقت تاروں کی چھاؤں میں لکھے ہیں۔ حضرت جوش دراصل "Poet of Dawn" یعنی شاعر صبح ہیں اور صبح کے متعلق کچھ اس طرح لکھتے ہیں کہ آنکھوں کے نیچے طلوع کی تصویر پھرنے لگتی ہے۔ ان اوراق میں تڑکے بیدار ہونے کی بہت زبردست تعلیم دی گئی ہے اور اس کے محاسن کو کچھ ایسے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے کہ کاہل سے کاہل آدمی صبح اُٹھنے کا عادی ہو جائے اور یہ بات دعویٰ کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس وقت تک ہندوستان میں اس نثر اور اس پیرائے کی ایجاد کا سہرا صرف حضرتِ جوش کے سر ہے... المشتہر رئیس احمد خاں رئیس ملیح آباد لکھنؤ(۳۸)

جوش ملیح آبادی نے "یادوں کی برات" میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔ انہوں نے جہاں اپنی بیوی اشرف جہاں کی خوش انتظامی کی تعریف کی وہیں اس کتاب یعنی "اوراق سحر" کے بارے میں بھی لکھا ہے۔

"انہوں نے میرے سر پر مسلط ہو کر میری مندرجہ ذیل کتابیں مجھ سے مرتب کروائیں اور چھپوائیں، اگر وہ زبردستی نہ کرتیں تو یہ کتابیں کبھی معرض وجود میں آ ہی نہیں سکتی تھیں۔"(۳۹)

جوش ملیح آبادی کی کتابوں کی فہرست میں اوراق سحر اور مقالاتِ زریں دونوں کے نام ہیں۔ یہ کتاب یعنی اوراق سحر بھی لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ ۱۹۲۱ء اس کا سنِ اشاعت ہے۔

۴۔ "اشارات" ۱۹۴۲ء

جوش ملیح آبادی کے کلیم میں چھپنے والے مضامین کو "اشارات" کے نام سے کتابی صورت میں مجتمع کیا گیا ہے۔ یہ وہ اداریے اور مضامین ہیں جو ماہنامہ کلیم کے چار سالہ دور میں شائع ہوتے رہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۲ء میں نگارستان ایجنسی اردو بازار دہلی سے شائع ہوئی۔ کتاب پر سن کا اندراج نہ ہے۔ قیمت مجلّد دو روپے ہے۔ صفحات کی کل تعداد ۲۰۸ ہے۔ کتاب میں کل ۳۲ مضامین ہیں۔ دیباچہ نہیں ہے۔

"تمدن کی ظالمانہ مسخرگی" میں جوش کہتے ہیں کہ موجودہ دور میں انسان کی زندگی اتنی مصنوعی ہو گئی ہے کہ لگتا ہے کہ افراد قانونِ فطرت کے مطابق نہیں بلکہ مشینوں کی مصنوعی گرمی سے پیدا کیے گئے ہیں۔ ہمارا اٹھنا، بیٹھنا، چلنا، پھرنا، سونا، جاگنا سب کچھ بناوٹی ہو گیا ہے۔ بادشاہ انگلستان محبت کی بنا پر ایک عورت سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ رسم و رواج، قانون و دفعات اور تہذیب و تمدن نے اجازت نہ دی۔ بادشاہ چاہے تو تمام عمر اس عورت سے تعلق رکھ سکتا ہے۔ لیکن شادی نہیں کر سکتا۔ نتیجہ یہ کہ بادشاہ کو تخت سے دستبردار ہونا پڑا۔ تمدن کی اس سے ظالمانہ مسخرگی اور کیا ہو گی۔ جوش نے اس تہذیب کا مذاق اڑایا ہے جو ناجائز تعلقات کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور جائز فعل کی راہ میں روڑے اٹکاتی ہے۔

"عقل کی باتیں" جب کسی قوم کے دن بُرے آتے ہیں تو وہ عقل کی باتوں پر عمل کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ ہندو تو پھر عقل کی بھولے سے ایک دو باتیں سُن لیتا ہے لیکن مسلمان عاقلانہ کلمات برداشت نہیں کر سکتے۔ مشتعل ہو کر کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ مذہبی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی احکام و اصول میں ترمیم و تنسیخ گناہ سمجھی جاتی ہے۔ پڑھے لکھے افراد بھی ہر معاملہ بزرگوں پر ڈال دیتے ہیں۔ جوش نہایت جذباتی ہیں اور یہ بات ان کی تحریروں سے بھی عیاں ہوتی ہے۔

جوش موضوع کی پروا کیے بغیر اکثر اوقات جذباتی ہو کر لکھتے ہیں۔ جوش کے جاندار اسلوب اور جذباتیت نے مل کر جوش کی نثر کو پُر اثر بنا دیا ہے۔ جوش اس فن میں ماہر ہیں لیکن کہیں کہیں اس جذباتیت نے ان کی تحریر میں خامی پیدا کر دی ہے کیونکہ جوش کی جذباتیت خطابت کی شکل اختیار کر گئی ہے اور ان کا لہجہ اس قدر تلخ ہو گیا ہے کہ سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے نکل گیا۔ اشارات میں ایک جگہ رقمطراز ہیں:

''مسلمانو! خدا لگتی کہنا، کیا تم اپنے کو خدا اور اپنے رسول دونوں سے زیادہ غیرت مند نہیں سمجھتے؟ ایک دم سے بھڑک نہ اُٹھو۔ بے سمجھے بوجھے مشتعل نہ ہو۔ دوسرے کی باتیں صبر کے ساتھ سننے کی عادت ڈالو، یقین مانو، ہر وہ بات جو تمہارے مزاج کے خلاف ہو، لازمی نہیں کہ ہمیشہ غلط ہی ہو'' (۴۰)

اشارات کے تقریباً تمام مضامین میں جوش کی یہی جذباتیت نظر آتی ہے۔ نظم میں جذباتیت بُری محسوس نہیں ہوتی مگر نثر میں جذباتیت ہتھوڑا بن کر سر پر لگتی ہے۔ جوش نے جہاں جہاں زیادہ جذباتی انداز اپنایا ہے تحریر میں بھدّا پن پیدا ہو گیا ہے۔ جہاں جذباتیت اپنی حدود میں رہی ہے وہاں ایک خوبصورت تاثر کو جنم دیا ہے۔ جوش کہیں کہیں نرم لہجے میں خطاب کرتے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اشارات میں ''عقل کی باتیں'' میں لکھتے ہیں۔

''جب کسی قوم کے دن بُرے آتے ہیں تو عقل کی باتوں پر عمل کرنا چھوڑ دیتی ہے اور جب قدرت کو یہ منظور ہوتا ہے کہ کوئی جماعت بد سے بدتر ہو جائے تو پھر افراد کی ذہنیت یہ ہو جاتی ہے کہ عقل کی باتوں پر عمل کرنا تو در کنار وہ عقل کی باتوں سے دور بھاگتے ہیں، اور جو شامتِ اعمال سے انہیں عقل کی باتیں سنانے کی جرأت کرتا ہے اس کے دشمن ہو جاتے ہیں اور جو طبیب اُن کے واسطے دوا تیار کرتا ہے، وہ حکومت سے درخواست کرتے ہیں کہ اس کی سند ضبط کر لی جائے''۔ (۴۱)

جوش مسلمانوں کو عقل کی بات سمجھاتے ہیں کہ تقلید و اوہام سے باز آ جاؤ اور زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اپنے مرض کو پہچانو اور سدّباب کرو۔ وہ لکھتے ہیں

''ایک بار پھر سُنو اور غور سے سُنو کہ تمہارے دماغوں پر تقلید و اوہام کی برف جمی ہوئی ہے۔ تمہاری ذہنی فضا میں بوسیدہ روایات کا غلیظ دھواں گھُٹا ہوا ہے اور تمہارے نفوس کے گرد قدامت پرستی کی کائی سے ڈھکی ہوئی سر بفلک دیواریں کھڑی ہوئی ہیں۔ اب بھی سویرا ہے، خدا کے واسطے چونکو، اُبھرو اور پھریری لے کر کھڑے ہو جاؤ، تقلید و اوہام کی برف کو آزاد اندیشی کے تیشے سے کاٹ ڈالو۔ روایات کے دھویں کو صحیح تفکر کی تند ہواؤں میں اڑادو اور قدامت پرستی کی دیواروں کو روشن خیالی کی توپوں سے مسمار کر ڈالو۔'' (۴۲)

اگلا مضمون ''کھرے کھوٹے کی پہچان'' ہے۔ جوش کہتے ہیں کہ دیگر اقوام کے شعراء، شرافت، خلوص، لطافت، بلند ہمتی، عالی ظرفی، پاکیزگی، محبت اور خوش خلقی کے پیکر ہوتے ہیں جبکہ ہندوستان کا شاعر بہت ہی پست ذہنیت رکھتا ہے۔ وہ چڑچڑا، بد خلق، لاف زن، کینہ پرور، بدگمان، غیر مخلص، پست ہمت، سرد مہر اور احسان فراموش ہوتا ہے۔ جوش نے کچھ نکات بیان کیے ہیں جن کو مد نظر رکھ کر سچے اور جھوٹے شاعر میں فرق معلوم کیا جا سکتا ہے اور کھرے کھوٹے میں تمیز کی جا سکتی ہے۔

ایک اور مضمون ''ایک مکالمہ'' ہے جس میں جوش نے ہندو اور مسلمان دونوں کے نقطہ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے حکومت وقت یعنی انگریز کے خلاف دونوں کے متحد ہونے کو وقت کی آواز قرار دیا ہے۔ دونوں کو درگزر کی پالیسی کو اپناتے ہوئے آپس میں جھگڑے سے گریز کرتے ہوئے ایک سخت دشمن کے خلاف نبرد آزما ہونا پڑے گا۔ جوش نے اس گفتگو میں جو صغیر اور کبیر کے درمیان مکالمے کی صورت میں موجود ہے تقسیم سے قبل کی صورت حال بیان کی ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مصالحت ہی اس وقت بہترین چارۂ کار ہے۔ یہ ایک سنجیدہ موضوع ہے جس میں جوش نے نہ صرف ہندوؤں کی کمزوریاں اور خامیاں بیان کی ہیں بلکہ مسلمانوں کے عیوب اور کمزوریاں بھی بیان کی ہیں۔

''ہمہ دانی'' ایک اور موضوع ہے جس پر جوش کا مضمون حقیقت نگاری اور طنز کے پیرائے میں ہمیں یہ ادراک کروا رہا ہے کہ اگرچہ یہ صدی ''ہمہ دانی'' کی صدی ہے لیکن افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے علمی رجحانات جس قدر وسیع ہیں اُسی وسعت کے ساتھ کھوکھلے اور

سطحی بھی ہیں۔ سیاسی حالات کی ابتری اور ذہنی ماحول کی تنگی کے باعث ہم نے اب تک یہ فیصلہ نہیں کیا کہ علم کو علم کی خاطر حاصل کرنا بہتر ہے کہ گرمئ محفل اور نمودِ معاش کے واسطے۔ ہر فن مولا بننے سے بہتر ہے کہ آدمی کسی ایک فن میں ماہر ہو۔

"وہ مظالم جو روز ہوتے ہیں" میں جوش کہتا ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہے جب ہم بے گناہ معصوم جانوروں کو اپنے شکار کے شوق کی خاطر گولی سے نہ اُڑاتے ہوں۔ اپنے معدے کی خاطر جانور حلال نہ کرتے ہوں۔ سینکڑوں کیڑے مکوڑوں کو کچل کر نہ مارتے ہوں۔ درندوں کو ہلاک نہ کرتے ہوں۔ گاڑیاں لوگوں کو نہ کچلتی ہوں۔ بڑے جانور چھوٹوں کو کھانہ جاتے ہوں۔ امیر غریبوں کو نہ مارتے ہوں اور قوی کمزوروں کو قتل نہ کر ڈالتے ہوں۔ جوش سوال کرتے ہیں کہ کیا اس دنیا کے دو خدا ہیں۔ ایک طاقتوروں کا اور دوسرا کمزوروں کا۔ جوش متشکک ہیں اور استفہامیہ انداز میں اربابِ بصیرت کو غور کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ ان کی جذباتیت کمزوروں کی حالت پر اُنہیں کڑھنے پر مجبور کر رہی ہے۔

ہاں مجھے کوئی قوت بوڑھا، زرد رو اور خشک مزاج نہیں بنا سکتی!

"زمانے کی عیاری" جوش نے محبت کا غم بڑی مشکل سے برداشت کیا تھا کہ زمانے کی عیاری نے اُسے پھر سے محبت آشنا کر دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

"خدا کے لیے انصاف سے کہو، میں نے زمانے سے کیا درخواست کی تھی کہ مجھے دوبارہ مزہ چکھایا جائے۔ میں عورت، خطرناک جنت، انگاروں کی بہشت، پھولوں کا جہنم یعنی عورت سے قطعی مایوس ہوں، یہ دلوں کو توڑ دیتی ہے مگر جوڑ نہیں سکتی۔(۴۴)

جوش نے رومانی جذبات سے لبریز بیان میں اپنی محبوبہ کے حسن و جمال کے جو قصیدے گائے ہیں وہ یہاں محبوبہ کی جلد کی نزاکت کے بیان میں میر کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ جوش کی تشبیہات و استعارات نے اس حسن میں اور اضافہ کیا ہے۔ چہرہ یونانی، گردن ہنس کی سی، جلد پنکھڑی سے بھی زیادہ ہموار، چکنی اور نرم، گردن کا خم، لچک تلوار کی سی، طاؤس کا سا بانکپن، بات کرے تو مندر میں چاندی کی گھنٹی سی بجے، تبسم، دل کی قحط زدہ زمین پر روم جھوم برسنے والی گھٹا کا سا سلوک کرے۔ آنکھیں مخمور، ساحر اور مست، کائنات در آغوش، دراز پلکوں میں شراب کی موجیں ہیں وہ آہوئے صحرا ہے۔ غرض جوش کے محبوب میں کیا نہیں ہے۔ وہ خالق عالم کا تصور بہشت ہے جس نے جسم کی صورت اختیار کر لی ہے۔

"اردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت" ایک ایسا مضمون ہے جس میں جوش کا نقطہ نظر اصلاحی اور انقلابی ہے۔ وہ ادب اور شعر میں اصلاح کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شعر و ادب کے ذریعے نظریات، اعتقادات، رسومات، مذہبیات، سیاسیات، غرض ہر شعبے میں انقلاب لایا جا سکتا ہے۔

وہ چاہتے ہیں کہ ادیب کا قلم صحیح انداز میں استعمال ہو۔ وہ مختلف مثالیں دیتے ہوئے ادب کی کم مائیگی کا ذکر بھی کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ماضی کی طرح رونے، بسورنے والا ادب انقلاب کا سرچشمہ نہیں ہو سکتا بلکہ پر جوش اور گرم آگ کی سی خصوصیت رکھنے والا ادب ذہنوں میں انقلاب کا باعث بن سکتا ہے۔ وہ ادب کو حقیقت شناس اور زندگی کے رازوں کا امین دیکھنا چاہتے ہیں۔

"غزل گوئی" ایک ایسا مضمون ہے جس میں جوش غزل کے شدید مخالف کے روپ میں سامنے آئے۔ وہ غزل کو غیر فطری اور غیر حقیقی قرار دیتے ہیں جس کے لیے مشاقی و موزونئ طبع کی ضرورت ہوتی ہے، اثر و جذبات کی نہیں جنہیں محض چند الفاظ کی خاطر جذبات نہیں بلکہ مشاقی و موزونی طبع نے پیدا کیا ہے۔ اس صورت حال میں الہامی و حقیقی شعر کس طرح کہا جا سکتا ہے، زبردستی کے قوافی باندھے جاتے ہیں۔ ایک

شعر کا دوسرے شعر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جوش کے نزدیک غزل صرف لفظوں کی بازی گری ہے۔ شاعر اسے چوں چوں کا مربہ بنا دیتے ہیں۔

جوش غزل کی مخالفت میں انتہا پسندی کا شکار ہوئے، وہ مزاجاً نظم کے شاعر تھے۔ انہوں نے پہلے غزل کہی مگر بعد میں غزل کو اپنے مزاج کے مطابق نہ کر پا کر نظم گوئی کی طرف متوجہ ہوئے۔ جوش پر متعصبانہ اندازِ نظر کا الزام اس وجہ سے عائد ہوتا ہے کہ وہ اردو غزل کی کلاسیکل شاعری سے واقف ہونے کے باوجود اس انتہا پسندی کا شکار نظر آتے ہیں۔ وہ عشق کو غزل کے اسی فیصد اشعار کا موضوع قرار دیتے ہیں۔ اور اس کے مضامین کو پامال سمجھتے ہیں۔ بے شک عشق اردو غزل کا سب سے پسندیدہ موضوع ہے مگر غزل میں عشق مجازی اور حقیقی دو پہلوؤں سے ملتا ہے۔ غزل میں شاعر رمز کے پردے میں عشق کے حوالے سے کائنات کے چھپے ہوئے رازوں سے پردہ اٹھاتا ہے۔ غزل کے حوالے سے بہت سے شعراء کے ہاں عشق کی معنویت اور کیفیت جُدا جُدا ہے۔ اس کے موضوعات بھی بدلتے رہتے ہیں اور غزل میں عصرِ حاضر کے مسائل بھی بیان کیے جاسکتے ہیں۔ غزل کے بارے میں جوش کا بیان مبنی بر حقیقت نہیں ہے۔

ایک مضمون "بدحواسیاں" کے عنوان سے ہے۔ جوش کہتے ہیں کہ ہماری قوم نا قابل برداشت حد تک سنجیدہ ہو چکی ہے۔ ہندوستان کی زندہ دلی اور رنگینیوں کو کس کی نظر کھا گئی ہے۔ چاہے لوگ مجھی پر ہنسیں لیکن ہنسیں ضرور۔ اس کے بعد جوش نے اپنی کچھ بدحواسیاں بیان کی ہیں۔

"خدا کے تین قہر" میں جوش ملیح آبادی نے جو لوگ ان تین باتوں سے متمیز ہیں تو سمجھیں کہ خدا کے قہر کا شکار ہیں اوّل یہ کہ ہندوستانی ہیں۔ دوم یہ کہ مسلمان ہیں اور سوم یہ کہ یوپی یعنی اتر پردیش کے باشندے ہیں۔ ہندوستان وہ ملک ہے جہاں پہلے آریا پھر مسلمان اور پھر انگریز حکمرانی کرتے رہے۔ اب وہاں نہ مشترک زبان ہے نہ لباس ہے اور نہ مشترک معاشرت ہے۔ جہاں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی تو ہیں لیکن ہندوستانی نہیں۔ جہاں چوپایوں کے بدلے انسانی خون بہا دیا جائے وہاں آزادی کا خواب کیونکر دیکھا جائے۔ مسلمانوں نے مسلسل تموّل اور مسلسل افلاس دونوں کو دیکھا ہے۔ حسد، شک، بدگمانی، غیبت، کاہلی، تنگ نظری، دروغ گوئی، اسراف، لاف زنی، ناعاقبت اندیشی، اوہام پرستی اور غداری مسلمانوں کی مخصوص عادات ہیں۔ یوپی کے باشندے ذہانت وفطانت، خوش سلیقگی و تمدن، شائستگی اور علم وادب میں آگے ہیں۔ لیکن حدِ اعتدال سے گزر کر مصیبت میں گرفتار ہیں۔ ان تینوں قہر کا شکار جوش اپنی قوم کو آگے آنے کے لیے للکار رہے ہیں۔ یہاں جوش مصلح قوم بن کر سامنے آئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہم اپنی قوم کو آگے بڑھانے کے لیے مثبت کردار ادا کریں۔

"قومیت کا تخیل" میں جوش ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں سے مخاطب ہیں۔ مسلمان اپنی تاریخی عظمت پر فخر کرنے والے تنگ نظر جاہل اور فاقہ مست ہیں جبکہ ہندو اپنے مذہبی فلسفے پر اترانے والے، تنگدل، وہم پرست اور زبوں ہمت ہیں۔ تمہاری آئے دن کی خانہ جنگیوں نے مجھے دیوانہ بنا دیا ہے اور میں غصے کی شدت سے دانت پیس رہا ہوں۔ ہر قوم کی بنیاد وطن اور انسانیت ہے لیکن تمہاری قومیت کی بنیاد کیا ہے۔ یہاں جوش خالصتاً قومیت کا مغربی تصور پیش کر کے ہندو اور مسلمانوں کو اپنے اختلافات ختم کر کے ایک ہو جانے پر آمادہ کر رہے ہیں یہاں جوش کا اندازِ نظر سراسر جذباتی، خطابیانہ اور تخیلی ہے وہ لکھتے ہیں۔

'دین، دین"، "دھرم، دھرم" کلیجہ پیپ ہوا جاتا ہے۔ ان جھوٹی اور کھوکھلی آوازوں سے، کانوں میں زخم پڑے جاتے ہیں۔ ان مولویوں اور پنڈتوں کی نامراد صداؤں سے،

اے بھائیو! اے عقل وحکمت کے دشمن بھائیو! اے زمین پر فساد برپا کرنے والے بھائیو! تمہاری کس کس بات پر روؤں؟

اے دھوتی اور پائجامے کے گروؤ، اے لوٹے اور بدھنے کی انجمنوں، اور اے داڑھی اور چُٹیا کے اِدارو! تمہاری کس کس حماقت پر غور کروں۔ میں تمہارے جنونِ خانہ جنگی اور ذوق محکومی و کفش برداری کو مبارک باد دیتا ہوں کہ اب تو خیر سے تمہارے پانی اور تمہاری چائے نے بھی دین اور دھرم کے ہات پر بیعت کر لی ہے۔"(۴۵)

ماہنامہ کلیم، دہلی، میں جوش نے مختلف تحریروں میں بار بار اس اس عزم کو دہرایا ہے کہ وہ کسی دبستان فکر یا تحریک سے وابستہ نہیں ہیں اس لیے ان کی تحریروں میں کوئی حد بندی نہیں ہے بلکہ جوش و خروش اور روانی ہے۔ وہ قدیم روایت، مذہب اور سماج، توہمات، انگریزیت اور رسم و رواج سے متنفر ہیں۔ یہاں اگرچہ جوش ایک سیکولر ہندوستان کی حمایت کرتے دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کے پیش نظر صرف انسانیت ہے اور وہ وطن پرستی کے گیت گانے والے شاعر و ادیب ہیں۔ عبدالماجد دریا آبادی جوش کے مضمون پر کچھ اس طرح اظہار رائے کرتے ہیں کہ:

"مدیر کلیم کی نثر میں "تازہ کلام" کا اندازہ اقتباس ذیل سے ہو گا۔ ہندو مسلمان دونوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:۔

"میں تمہاری صفوں میں سے آندھی کی طرح گزروں گا۔ تمہارے بے مغز سروں پر کڑی کمانوں کی طرح کڑکوں گا، اور طوفانی بادلوں کی طرح گرجوں گا... تم پر میرا غیظ و غضب بپھرے ہوئے دیوتاؤں کا غیظ و غضب ہے... اے مورکھ ہندوؤ، اور اے نادان مسلمانو!" خدا تمہیں انسان بننے کی توفیق دے..."۔

یہ جوش و خروش، غیظ و غضب اگر محض تخلص کی مناسبت سے ہے اور یہ گرج اور چمک اور یہ ہوش ربا تجلیات آتشیں، اور سب سے بڑھ کر بقول ایک صاحب کے یہ لن ترانیاں اگر اسم کلیم کی شاعرانہ رعایت سے ہیں تو اس حسن ادا کی داد نہ دینا ظلم ہیں لیکن اگر ان کے سوا کوئی اور صنعت ملحوظ رکھی گئی ہے تو اتنا دماغ کوئی کہاں سے لائے(۴۶)

ڈاکٹر فضل امام لکھتے ہیں کہ عبدالماجد دریا آبادی کے سامنے جوش کا مکمل نثری سرمایہ نہیں تھا اس لیے وہ اپنی رائے ظاہر کرنے میں تذبذب کا شکار ہوئے ہیں۔ جوش کی پکار ایک ایسے آدمی کی پکار ہے جو انسانیت کا درد دل میں لیے ہوئے ہیں اور انہیں ہندو مسلم فساد اور خون خرابا بُرا لگتا ہے۔ مذہب کے نام پر خوں ریزی کی اجازت تو کوئی مذہب نہیں دیتا لیکن ہم مذہب کے نام پر من مانی کارروائیاں کرتے ہیں۔(۴۷)

"غلامی کے نظارے" جوش نے چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہندوستانی قوم کی ذہنی کیفیت کے بارے میں اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے۔ ہم بڑی بڑی باتوں کو تو دیکھ لیتے ہیں لیکن چھوٹی چھوٹی باتیں ہمیں نظر نہیں آتیں۔ ہم انگریز حاکموں کی نقالی میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ہم تہذیب و تمدن میں نشست و برخواست میں اور گفتگو کے انداز میں نقالی کرتے ہیں۔

"ہندوستانی پردہ" میں جوش اپنے بھرپور جذباتی انداز میں مسلمانوں سے مخاطب ہیں۔ جوش کی جذباتیت نے یہاں خطابت کا رنگ اختیار کیا ہے اور ان کا لہجہ اس قدر تلخ ہو گیا ہے کہ سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے نکلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کہیں کہیں طنز اور تمسخر بہت بڑھ گیا ہے۔ جوش کا پورا مضمون جب تک پڑھ لیا نہ جائے قاری اُلجھن میں رہتا ہے کہ آخر جوش مسلمانوں کو اتنی لعن طعن کیوں کر رہے ہیں لیکن بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوانے کی پکار ہے جو گھر کو جلتا دیکھ کر بے ربط انداز میں لوگوں کو ڈراتا ہے۔ یہاں جوش حالی اور شبلی کی طرح مصلح قوم بنتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں!

جوش کی تحریروں کی جذباتی خطابت نے تحریروں میں میں کُھردرا پن پیدا کیا ہے مگر جہاں جوش نے نرم اور پُر خلوص لہجہ اپنایا ہے وہاں دل کے اندر گداز پیدا کیا اور خوابیدگی سے جگایا ہے۔ جب وہ نرم لہجے میں خطاب کرتے ہیں تو پُر تاثیر انداز سے قاری کو قائل کر لیتے ہیں۔

"میں یہ نہیں چاہتا کہ تمہاری عورتیں مشرقی شرافت کو بالائے طاق رکھ کر مغربی عشوہ گری اختیار کر لیں۔ میں یہ نہیں چاہتا تمہاری عورتیں پنڈلیاں اور بانہیں عریاں کر کے اونچی اونچی ایڑیوں پر کھٹکھٹاتی پھریں۔ میں یہ نہیں چاہتا تمہاری عورتیں پریاں بن کر لال دیو کے ساتھ

اڑن کھٹولوں پر سوار ہو کر راجہ اندر کے اکھاڑے میں اترنے لگیں۔ میں نہیں چاہتا تمہاری عورتیں فانوسِ خلوت کے عوض شمع جلوت بن جائیں اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تمہاری عورتیں یونیورسٹیوں کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر کے اپنے چہروں پر مجتہدانہ خشکی پیدا کرلیں... میرا تو تم سے یہ خفیف سا مطالبہ ہے کہ اپنی عورتوں کو کھلی ہوئی ہوا میں سانس لینے کا موقع دو، انہیں اس طرح پردے میں گھونٹ کر نہ رکھو۔ انہیں باہر نکالو، انہیں اتنی تعلیم دو کہ وہ تدبیر منزل اور تربیت اولاد کو سمجھنے لگیں۔ زندگی اور اس متقضیات سے واقف ہو جائیں اور بس"(۴۸)

اور ایک جگہ پھر نرم گرم انداز اختیار کرتے ہیں۔

"اے جھوٹی غیرت کے جھوٹے اتارو! اے اپنی عورتوں کی جہالت، کمزوری، وہم پرستی، بزدلی اور بدصورتی پر فخر کرنے والے حاجیو، قادریو! حافظو! ذرا سینماؤں میں جاؤ، تھیٹروں کی سیر کرو اور زنانِ بازاری کی خلوت گاہوں میں جھانک کر دیکھو، ان تمام مقامات پر تمہیں ستر فیصدی مسلمان نظر آئیں گے۔ تمہیں خبر نہیں تمہارے پردے کے ذوق ہی نے ان نوجوانوں کو یہاں بھیجا ہے... تمہیں ان تمام بداخلاقیوں کے ذمہ دار ہو"(۴۹)

اس مضمون میں جوش کی انفرادیت وانانیت بھی نظر آتی ہے، انہوں نے اپنی نکتہ آفرینی سے مسلمانوں کو وہ گوشے دکھائے ہیں جو ان کی نظروں سے پوشیدہ رہے ہیں۔

"عید" جوش مایوسی واضطراب میں خدا کو پکار رہے ہیں کہ ہندوستان میں نفسانفسی ہے۔ ہندو مسلمان اپنی اپنی سمتوں میں بھاگ رہے ہیں۔ بھائی بھائی کا خون بہا رہا ہے۔ حالات اس ڈگر تک آ گئے ہیں کہ اب خاتمہ ہی تمام دُکھوں اور جھگڑوں کا علاج ہے۔

"ہمارے شاعر" میں جوش کہتے ہیں کہ ہندوستان میں متغزلین کی ایک بڑی تعداد ہے لیکن ان کے درمیان عناد اور دشمنی پائی جاتی ہے۔ حقیقی شاعر کم ظرف، تنگدل، کینہ پرور اور اوچھا نہیں ہو سکتا۔ حقیقی شاعر بالغ دماغ اور گداختہ دل کا مالک ہوتا ہے۔ شعر کی بنیاد تو لامحدود اور عالمگیر محبت پر ہے۔ اگر کسی شخص کا ذوق اور وجدان ہمارے مطابق نہیں ہے تو اُسے ملامت کا نشانہ کیوں بنائیں۔ جوش شاعروں میں موجود دوسرے شاعروں کے بارے میں نظریات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"یہ حقائق سے کتنی بے پایاں ناواقفیت اور کیفیات سے کیسی لامحدود بیگانگی ہے کہ میں کسی شخص سے صرف اس بنا پر نفرت کرنے لگوں کہ وہ مجھے اچھا شاعر ہی نہیں سمجھتا"۔(۵۰)

"ہمارے مجتہد" میں جوش نے ہمارے معاشرے میں موجود ایک برائی کو ہدف تنقید بنایا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہمارے پیر اور ہمارے مجتہد اپنے آپ کو رسول اللہؐ کا وارث بتاتے ہیں لیکن غریب سائلین سے اچھا سلوک نہیں کرتے اور اپنے مقلدین کو غلط عقائد کی تربیت دے رہے ہیں اور آئے دن ارتداد اور الحاد کے لاکھوں سکّے ان کی زیر نگرانی ڈھلا کرتے ہیں۔

"ہمارے پیر" بھی ایک ایسا مضمون ہے جس میں جوش نے ان لوگوں پر طنز کی ہے جو پیروں کے آستانوں پر اندھی عقیدت میں مبتلا ہو کر جاتے ہیں اور قوالوں کی قوالیوں پر دھمال ڈالتے ہیں۔ پیر بھی عقیدت مندوں کی حیثیت اور ان کی نذر نیاز سے متاثر ہو کر ان سے حسب حیثیت ملاقات کرتے ہیں۔ کیا ہم ان باتوں سے دنیا کو فتح کرنے کے خواب دیکھتے ہیں۔ جوش ہمارے سامنے یہ سوال رکھتے ہیں۔

"الفاظ اور شاعر" جس میں جوش ملیح آبادی نے نہایت دلچسپ پیرائے میں اظہار خیال کیا ہے۔ وہ لفظوں کو بے جان سمجھنے کی بجائے جاندار سمجھتے ہیں اور ان میں بھی روح دوڑتی خیال کرتے ہیں۔ جوش کہتے ہیں کہ الفاظ انسانوں کی طرح ہوتے ہیں جو پیدا ہوتے ہیں، مرتے ہیں، بڑھتے اور گھٹتے ہیں۔ ان کی اپنی خاص عادات، رسومات اور مزاج ہوتے ہیں۔ ان کے خاندان، مذاہب اور طرزِ معاشرت بھی ہوتا ہے۔ ادیب اور شاعر معاشرے کا ایسا طبقہ ہے جس سے الفاظ بے تکلف اور ان کے دوست ہوتے ہیں۔ جوش الفاظ کے حوالے سے ایک جداگانہ نظریہ پیش

کرتے ہیں جو انوکھا بھی ہے، جوش کے خیال میں شاعر اور الفاظ کا تعلق قریبی ہے۔ شاعر جس طرح چاہیں لفظوں کو استعمال کر سکتے ہیں۔ انہیں اپنی مرضی کے مطابق گفتگو اور شاعری میں لاسکتے ہیں۔ جوش کہتے ہیں۔

'شاعروں کے ساتھ ان کا برتاؤ دوستوں کا سا ہی نہیں قرابت داروں کا سا ہوتا ہے۔ وہ شاعروں سے اس طرح ملتے جلتے ہیں جیسے ایک ہی گھر کے مختلف افراد یا ساتھ کھیلے ہوئے لنگوٹیے یار۔ شاعروں کو انہوں نے یہاں تک اختیار دے رکھا ہے کہ وہ جب چاہیں ان کے لباس تبدیل کر دیں، ان کی لے اور رنگ بدل دیں، ان کا رخ موڑ دیں، ان کے معنوں میں تنگی یا وسعت پیدا کر دیں اور ان کے خط وخال میں کمی بیشی فرمادیں۔"(۵۱)

جوش کا یہ مضمون اردو انشائیہ کے قریب ہے۔ اس میں انہوں نے اختصار، تخلیقی تازگی، نکتہ آفرینی اور ذہن کی آزادہ روی سے کام لیا ہے۔ الفاظ کو انسانی حیات سے مماثل قرار دے کر انہوں نے نیا پن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

''امرائے ہند'' جوش کا ایک ایسا مضمون ہے جس میں انہوں نے عصر حاضر میں ''امرائے ہند'' کے رویے کو موردِ الزام ٹھہرایا ہے کہ وہ اپنی دولت غریبوں پر خرچ کرنے کی بجائے، کونسل بازیوں، عیش پرستیوں، حکام نوازیوں، گھوڑ دوڑوں، ہاکیوں اور کتّوں پر خرچ کرتے ہیں۔ سرمایہ داروں کی یہ جماعت انسانوں میں خلوص، خودداری، اخلاقی جرأت اور راست بازی پیدا کرنے کی بجائے دنائیت، تمسکنت، دروغ بافی، سازش، بزدلی، طمع اور خوشامد پیدا کرنے کا ارتکاب کرتے ہیں۔ نااہلوں، مسخروں اور منافقوں کا ہجوم ان کے گرد جمع ہو جاتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب کامل تباہی اور مکمل ہلاکت ان سے ایک قدم دور ہوتی ہے تو ان کی متکبرانہ فرعونی وہامانی رفتار بڑھ جاتی ہے۔ جوش چونکہ امراء اور وزراء کی محفلوں کا احوال دیکھ چکے تھے ان کے متکبرانہ رویے کے گواہ تھے اس لیے انہوں نے امرائے سلطنت کی برائیوں کو کھل کر بیان کیا ہے۔

''بھارتیہ ساہتیہ پریشد کی اصل حقیقت'' اس نام کا ایک مضمون مولوی عبدالحق معتمد ترقیٔ اردو اورنگ آباد، دکن نے جوش ملیح آبادی کے رسالے کلیم کے لیے تحریر کیا تھا جسے پڑھ کر جوش کو شدید صدمہ ہوا۔ اس کے صدر مہاتما گاندھی اور روحِ رواں جواہر لال نہرو تھے۔ پہلے مہاتما گاندھی سے عقیدت تھی جو اب کم ہو گئی ہے لیکن جواہر لال نہرو کے اس فتنہ مرشد کے بانیوں میں سے ہونا بہت اذیت کی بات ہے۔ جس طرح جولیس سیزر نے بروٹس کو دیکھ کر کہا تھا کہ تم بھی میرے قتل پر آمادہ ہو اسی طرح ہندو مسلم اتحاد بھی اس کیفیت سے گزر رہا ہے۔ جوش اپنے جذباتی پن میں یہ بھی بھول گئے، مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد مذہب ہے تاکہ سرحدی حدود ان کے اور ہندوؤں کے مابین رشتۂ ازدواج قائم ہوا تو مسلمانوں کے دینی و مذہبی تشخص کا باقی رہنا ناممکن ہے۔ جوش کے سیکولر خیالات مسلمانوں کی مذہبی و تہذیبی زندگی کے خاتمہ میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

''میں تو ہندوؤں اور مسلمانوں کی روحوں میں اتحاد دیکھنا چاہتا ہوں اور میرے عقیدے میں ہندوستان کی کامل نجات ناممکن ہے۔ جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی ازدواج قائم ہو کر ان دونوں گروہوں کی تہذیب و معاشرت ایک نہ ہو جائے۔

آزادی واتحاد کی سی مقدس چیز میں مذہب کا ٹھونسنا صرف اُن خیرہ سروں کا وطیرہ ہو سکتا ہے جو یا تو ہندوستان میں پھوٹ ڈالنے کی روٹی کھاتے ہیں یا جن کی سرزمین دماغ قحط زدہ ہو کر خشک ہو چکی ہے۔"(۵۲)

آخر میں جوش ہندو، مسلم، سکھ اور پارسی سب کو نصیحت کرتے ہیں کہ اردو کو زندہ رکھنا سب کا قومی فریضہ ہے۔

"سیاسی انجمنیں" جوش نصیحت کرتے ہیں کہ متعدد و مختلف فرقے رکھنے والے ملک کی ہر اُس انجمن سے گریز کرنا چاہیے جو ملک کے مجموعی اور عمومی مفاد کو بھلا کر کسی خاص جماعت کے تحفظ کے لیے وجود میں آئی ہو۔ دوسرے خطاب یافتہ لوگوں کی سرپرستی میں چلنے والی انجمن سے بھی بچنا چاہیے۔

"اودھ کے زمیندار اور تعلقہ دار" مضمون میں جوش زمیندار و تعلقہ دار، ان افراد کا تذکرہ کر رہے جو شاہی زمانے میں بڑی بڑی جاگیروں کے مالک اور عہدے دار تھے۔ اپنے آباؤاجداد کی میراث پر زندگی گزارنے والے کاہل، کند ذہن، پست حوصلہ، تن پرور، وہم پرست، خود بیں، رسوم نواز اور جھوٹی عزت کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ کانوں کے کچے ہوتے ہیں، قومی و ملی امور میں حصہ لینا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ علم و اخلاق سے بیگانہ، حرکت و عمل سے محروم ہر قسم کی برائی میں ملوث یہ لوگ موجودہ دور کی اصلاحات کی زد میں آکر قابل رحم حالت کو پہنچ گئے ہیں۔ کمشنروں اور ڈپٹی کمشنروں کے سامنے اپنے آباء کی وفاداریوں کے قصے دہراتے اور اُن سے نظر کرم کے طالب ہوتے ہیں۔ جوش نے اس مضمون کی غایت یہ پیش کی ہے کہ شاید وہ اپنی حالت پر غور کر کے جمود، رسوائی، بے زری، بے عزتی، خوشامد اور جھوٹی عزت کے مغالطے سے باہر نکل آئیں۔ جوش نے حقائق سے پردہ اٹھاتے ہوئے زمینداروں اور تعلقہ داروں میں پرورش پانے والے عیوب کی نشاندہی کی ہے۔

"چار یار" ایک ایسا مضمون ہے جس میں جوش جذباتی انداز میں ہندوستان میں مذہبی طور پر ہونے والی خون ریزی و استبداد پر ماتم کناں ہیں۔ وہ طنزیہ لہجے میں ہندو مسلم کی مذہبیت پر اعتراضات کی بارش کرتے ہیں۔ جولائی کے وسط میں لکھنؤ میں 'مدح صحابہ'' کا ایک جلوس نکلا تھا۔ جو شیعہ سنی فساد پر منتج ہوا۔ جوش اپنے سیکولر انداز بیان کی وجہ سے ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، پارسی سب کو دعوت دے رہے ہیں کہ اگر وطن عزیز صحیح مذہب کی صحیح پیروی سے قاصر ہو چکا ہے تو ہم سب مل کر کامل بے دینی کا اعلان کریں اور "ہندوستان" کے علاوہ کسی کو مذہب تسلیم نہ کریں وہ اس مذہبی منافرت کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"یہ ایک بڑی دردناک صورت حال ہے کہ اس اندھے ہندوستان میں ہر سال بے گنتی قومیں، بے شمار جسم اور لاتعداد جانیں اغیار کی فتنہ پروری روایات کی بازیگری اور منافرت و اوہام کی قائدانہ مسخرگی پر بے دریغ بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ بعض بدنام تالابوں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہر بارش میں ایک بھینٹ لیا کرتے ہیں مگر ہندوستان کا "مذہب" وہ تالاب ہے جو آئے دن ایک نہیں، ہزاروں بھینٹیں لیا کرتا ہے اور لوگ ہیں کہ اس میں غسل کرنے کو ذریعۂ نجات سمجھے ہوئے ہیں۔"(۵۳)

"عصر حاضر کے ہلاکو اور ان کے مقتول" جوش کا ایک فکر انگیز مضمون ہے جس میں جوش آج لوگوں کو ہلاکت میں ڈالنے والے ان ظالموں کی نشاندہی کر رہے ہیں جنہوں نے اپنے مختلف بہروپوں سے لوگوں کو دھوکے میں ڈالا ہوا ہے اور وہ اپنے مقتلوں کو اس طرح قتل کرتے ہیں کہ وہ بھی ان کی بندہ پروری کی بے ساختہ داد دیتے ہیں۔ پرانا ہلاکو جسموں کو مار ڈالتا تھا، نیا ہلاکو روحوں کو کچل دیتا ہے۔

"محکوم ملک کے حکام" میں جوش آزاد ملک اور غلام یا محکوم ملک کے حکام کے بارے میں بتاتے ہیں کہ آزاد ممالک کے حکام لوگوں کے خادم اور خوش خلق ہوتے ہیں جبکہ محکوم ممالک کے حکام کی چار اقسام ہوتی ہیں۔

۱۔ وہ محکوم ملک پر اپنے رعب و اقتدار کو محکم سے محکم کرتے ہیں اور ان کے خون کی آخری بوند تک اپنی قوم کے جسم میں پہنچانے کی سعی کرتے ہیں۔

۲۔ دوسرے درجے کے حکام کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔ سائل کو بات بات پر ڈانٹتے اور جھوٹی شان و شوکت کے دیوانے اور چھچھورے ہوتے ہیں۔

۳۔ یہ حکام پبلک کو زیادہ سے زیادہ مرعوب کرنے کی فکر میں ہوتے ہیں اور ان کو ستانے اور لوٹنے کا کوئی موقع نہیں جانے دیتے۔ جھوٹے مقدمات بنانے کے ماہر ہوتے ہیں۔

۴۔ بد اخلاقی اور کمینگی میں یہ طبقہ ماہر ہوتا ہے۔ غریبوں کو ستانا، ان کا مال جبراً لے لینا اور ان کی عزتوں کو خاک میں ملانا ان کا شیوہ ہوتا ہے، رشوت ستانی کے بل پر یہ ملک کے شہریوں کی جان و مال سے کھیلتے ہیں۔

''انسانی فطرت اور خیر و شر'' بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ''خیر و شر'' کوئی حقیقی چیز نہیں ہے۔ محض اضافی و اعتباری چیز ہے اور محض اسی بنا پر عیر حقیقی کا کسی ذی حیات کی فطرت کے اندر تلاش کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جوش نے انسان کے فطری طور پر ''مائل بہ خیر'' یا ''مائل بہ شر'' ہونے کے سوال کو حل کرنے کے لیے تین نکات پر بحث کی ہے۔

۱۔ خیر و شر کا تعین اور انسانی فطرت

۲۔ انسان کی فطرت کا سادہ اور غیر منقش ہونا

۳۔ ماحول کی حقیقت اور اس کی اثر انگیزی

اس مقالے کے آخر میں جوش اس نتیجے پر پہنچے کہ انسانی فطرت کو ''مادۂ خیر'' کم بلکہ بہت کم اور ''مادہ شر'' زیادہ بلکہ بہت زیادہ عطا کیا گیا ہے اور قارئین کو دعوت دیتے ہیں کہ ان حالات میں انسانی افکار و کردار کی ذمہ داری کدھر جاتی ہے۔ مقالہ تحریر کریں اور مقالہ معقولی ہو منقولی نہ ہو۔ جوش وہ ادیب ہیں جو ہمیشہ دل کی بجائے عقل کی اہمیت کو تسلیم کرنے پر زور دیتے رہے ہیں۔ ان کے نزدیک وہ باتیں جو ہماری عقل درست نہیں مانتی ہمارے دل کو بھی انہیں نہیں ماننا چاہیے۔ عقل ہمیشہ حکمرانی کرتی ہے، مذہب کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے سے آدمی مذہب سے دور اور لادینیت سے قریب ہو جاتا ہے اور جوش کے ہاں ہمیں یہی اندازِ نظر نمایاں نظر آتا ہے۔

''مردہ پرست ہندوستان'' ایک ایسا مضمون ہے جو جلے دل کی پکار ہے۔ جوش اس المیے پر افسوس کر رہے ہیں کہ ہم نے اپنے صاحب کمال لوگوں کو ان کی زندگی میں توقیر دینا چھوڑ دی ہے۔ غالب اور حالی جیسے بڑے شاعر بھی اس زمانے کے اس ڈھب سے مستثنیٰ نہیں رہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''یہ کتنی تلخ حقیقت ہے کہ ہندوستان اس شدت کے ساتھ مردہ پرست واقع ہوا ہے جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ آج بھی بوڑھا ہندوستان اپنے جوان روح اہلِ کمال کو تیکھی نظروں سے دیکھ رہا ہے اور انہیں حسب دستور قدیم جی بھر کے پامال کر رہا ہے۔

ہندوستان اپنے ہر صاحب کمال سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ او نامراد جب تک تو زندہ رہنے کا جرم کیے جائے گا میں تجھے چین سے نہیں رہنے دوں گا اور جب تو ایک سعادت مند فرزند کی طرح مر کر میری حسرت نکال دے گا تو میں اغیار کی دست بُرد سے بچا کھچا اپنا تمام و کمال سونا تیری لوحِ مزار پر چڑھا دوں گا۔"(۵۴)

"نشہ اور بنی نوع انسان" جوش کا ایک ایسا مضمون ہے جو اپنے اندر انشائیہ کی خوبی سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کی شگفتگی اور ندرت اپنی مثال آپ ہے۔ جوش کا اپنا شخصی زاویہ نگاہ بھی موجود ہے اور موضوع کو کسی حد تک نئی روشنی میں دیکھنے کی کوشش موجود ہے۔ نشہ کو جس طرح وسعت دی گئی ہے وہ بھی انشائیہ نگاری کا ایک انداز ہے۔ جوش لکھتے ہیں:

مطالعہ کتب ہو کہ اخبار بینی، ایجاد و اختراع کا انہماک ہو کہ تفکر و تدبر کا استغراق اور اردو اصناف ہوں کہ ذاکری میلاد خوانی، مضمون نویسی ہو کہ خطابت، علمی مباحثہ ہو کہ مذہبی مناظرہ، وعظمت و قرأت ہو کہ مکاشفہ و مراقبہ، ان تمام مشاغل و اعمال کی دیدہ ریزی کے ساتھ تحلیل کی جائے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح ثابت ہو جائے گی کہ یہ سنجیدہ و مقدس اعمال بھی نشے کی حدود سے ایک انچ باہر نہیں ہوتے۔"(۶۷)

جوش ایک حیرت انگیز انکشاف کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ رامش و رنگ اور رقص و سرود ہی میں نشہ نہیں ہوتا بلکہ یہ ظالم نشہ ٹھنڈی آہوں اور گرم آنسوؤں کے اندر بھی ہوتا ہے اور یہ نشہ ہی ہے جو حیات انسانی کے ٹوٹے ہوئے سفینے کو حوادث کے ہولناک سمندروں میں سے گزار کر ساحل مراد تک پہنچا دیتا ہے اور دنیا کے دُکھوں کا مقابلہ کرنے کے لیے زندگی کے شیش محل پر لالہ و گل کا ایک ایسا رنگین سائبان تان دیتا ہے کہ دردمند انسانیت اس کی ٹھنڈی چھاؤں میں میٹھی نیند سے آشنا ہو جاتی ہے۔

مقالاتِ جوش: اپریل ۱۹۸۲ء

مقالاتِ جوش مُرتبہ سحر انصاری اپریل ۱۹۸۲ء میں اردو محل پبلشر بک سیلر، کراچی سے طبع ہوئی۔ ۴۸۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت پینتالیس روپے تھی۔

کتاب کا انتساب جوش ملیح آبادی کی طرف سے وزیر دفاع پاکستان اور جوش نے مربّی علی احمد تالپور کے نام کیا گیا ہے۔ پھر جوش کا خود نوشت مصرع تاریخ۔"میں شاعر آخر الزماں ہوں اے جوش" ۱۹۸۲ء

اور ظہور جارچوی کا تحریر کردہ قطعہ تاریخ وفات درج کیا گیا ہے۔ اس کے بعد نو مشق شعراء کو جوش کا پیغام درج کیا گیا ہے۔ تعارف کے عنوان سے جوش کے آباؤ اجداد، رجائی شاعری کے بارے میں ان کے خیالات درج کیے گئے ہیں۔

مضامین کی فہرست کو دس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ انشایئے ص ۱۷ تا ص ۴۶ پر درج ہیں۔

تنہائی، ہمہ دانی، زمانہ کی عیاری، راست گفتاری اور حسن اور شائد کوئی عبرت حاصل کرے مضامین دیئے گئے ہیں۔

۲۔ ادبیات ص۷۴تاص۱۲۲

اس حوالے سے دس مضامین دیئے گئے ہیں۔

اردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت، غزل گوئی، ہمارے شاعر، کھرے کھوٹے کی پہچان، ایک رند کا اعلان جنگ، شاعروں کی مفلسی اور اس کے اسباب، مردہ پرست ہندوستان، باز گلبانگ پریشان می زنم، پُھس پُھس کا کرت ہے، اور بدحواسیاں۔

۳۔ معقولات ص۱۲۳تاص۱۹۸

آٹھ مضامین دیئے گئے ہیں۔

علم و فکر، اسفل السافلین، انسانی فطرت اور خیر و شر، شوپنہار کا فلسفہ، عام پسند مغالطے، تجربہ، نشہ اور بنی نوع انسان اور قوت زندہ باد

۴۔ جمالیات ص۱۹۹تا۲۱۴

تین مضامین دیئے گئے ہیں:

فنونِ لطیفہ، الفاظ اور شاعر اور تخلیقِ شعر

۵۔ سماجیات ص۲۱۵تا۲۷۲

اس عنوان کے تحت گیارہ مضامین دیئے گئے ہیں جن کے عنوان درج ذیل ہیں۔ عقل کی باتں، تمدن کی ظالمانہ مسخرگی، ہندوستانی پردہ، غلامی کے نظارے، محکوم ملک کے حکام، وہ مظالم جو روز ہوتے ہیں، خدا کے تین قہر، امرائے ہند، اودھ کے زمیندار اور تعلقدار، والیانِ ریاست کی مہمان نوازیاں اور بدبختیاں

۶۔ سیاسیات۔ ص۲۷۳تا۳۲۲

اس عنوان کے تحت آٹھ مضامین دیئے گئے ہیں۔

قومیت کا تخیل، کچھ انتخابات کے بارے میں، ایک مکالمہ، نحوست کے پردے میں سعادت، عصر حاضر کے ہلاکو اور ان کے مقتول، سیاسی انجمنیں، بھارتی ساہتیہ پریشد کی اصل حقیقت اور ایک سوال

۷۔ مذہبیات۔ ص۳۲۳تا۳۴۸

اس عنوان کے تحت پانچ مضامین موجود ہیں۔

حلقۂ مفکرین، چار یار، عید، ہمارے پیر اور ہمارے مجتہد

۸۔ شخصیات۔ ص۳۴۹تا۳۸۲

اس عنوان کے تحت دس افراد پر مضامین اور ایک نظم موجود ہے جن کے عنوان یہ ہیں:

اقبال کی موت، اصغر گونڈوی، ڈاکٹر انصاری، سندر لال مشران، مصطفیٰ زیدی، میر صاحب (میر عترت حسین) خراج محبت (سید آلِ رضا) اربابِ انکسار (نظم) سید ہاشم رضا، کوثر نیازی اور صابر تھاریانی

۹۔ جوابیات ص ۳۸۳ تا ۴۳۸

اس میں دو خطوط بطرز مضمون موجود ہیں۔

ضرب شاہد بفرق شاہد، ایک دوسرا خط

۱۰۔ متفرقات ص ۴۳۹ تا ۴۵۶

اس عنوان سے چار ذیلی عنوان پر مضامین موجود ہیں۔

سالنامہ، کلیم اور میں، کلیم کی نیم سالہ زندگی، کچھ کلیم کے متعلق حصہ اول میں پانچ مضامین ہیں پہلا ''تنہائی'' کے عنوان سے ہے۔ تنہائی انسان کو بُری طرح گھائل کر دیتی ہے وہ اپنے آوارہ خیالات میں بہتا ہوا کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔ اس کی چشم خیال اسے عجب عجب تماشے دکھلاتی ہے اور جب شرابی کو شراب بھی مزہ نہ دے تو اُس کا تصور اُسے بھوت، چڑیلیں روپ بدل بدل کر اسے ڈراتے ہیں۔ سانپ اور اژدھے پھنکارے مارتے ہوئے اُسے گرفت میں لینے کو بے چین نظر آتے ہیں۔ اُس کا ماضی طرح طرح کی شکلیں لے کر اُس کے سامنے آتا ہے۔ تخلیقی تازگی اور اختصار نے اس نثرپارے کو انشائیہ کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ تکمیل کی تشنگی قاری کے سامنے معنی کی ایک نئی دنیا کھولتی ہے۔

دوسرا مضمون ''ہمہ دانی''، ''اشارات'' میں شامل ہے اور اس پر ہم پہلے تبصرہ کر آئے ہیں۔

''اشارات'' میں جوش کا ایک اور مضمون ''زمانہ کی عیاری'' بھی شامل ہے اس کا جائزہ ہم پہلے لے چکے ہیں۔

چوتھا مضمون ''راست گفتاری اور حسن ظن'' ہے۔ یہاں جوش طنزیہ لہجے میں ہمارے معاشرے کی ایک کمزوری کے بارے میں اظہار خیال کر رہے ہیں کہ جہاں سب لوگ کم یا زیادہ جھوٹ بولتے ہوں وہاں ایک شخص کا سچ گراں گزرتا ہے۔ ''ہمیشہ سچ بولو اور دوسروں کے بارے میں نیک گماں رکھو'' پڑھنے اور کہنے کی حد تک تو اچھا لگتا ہے مگر ہمارے معاشرے میں جو شخص اس راہ کو اپناتا ہے، نقصان اٹھاتا ہے، کاش نوع بشر کو یہ توفیق ارزانی ہوتی کہ وہ ضوابطِ مذہب واخلاق کی پابندی کرنے پر مجبور ہوتی۔

''شاید کوئی عبرت حاصل کرے'' اس عنوان سے جوش نے ''اشارات'' میں بھی ایک مضمون قلمبند کیا ہے۔ ایک واقعے کو بنیاد بنا کر یہ مضمون تحریر کیا گیا ہے کہ جوش کے دوست کے خسر نے قاہرہ میں ایک فاقہ کش بوڑھے کو پانچ روپے دیئے۔ روپے لے کر وہ بہت خوش ہوا اور وہاں سے چلا گیا لیکن تھوڑے وقت بعد وہ گداگر واپس آیا اور نواب صاحب سے پوچھا ''آپ کس ملک کے باشندے ہیں؟'' نواب صاحب نے جواب دیا ''ہندوستان کا اور الحمد اللہ مسلمان بھی ہوں۔ یہ سنتے ہی اس نے گھبرا کر نواب کے روپے میز پر پٹک دیئے اور نواب کے اصرار پر بتایا کہ مجھے آج تیسرا فاقہ ہے اور یہ روپے مجھے بہت دن تک آسودہ رکھ سکتے ہیں لیکن میں غلاموں کی بھیک سے اپنا فاقہ توڑنا نہیں چاہتا۔ مسلمان اور غلام ہو، یہ جھوٹ ہے، یہ رسول اللہ کی توہین ہے'' جوش اس مضمون کے ذریعے مسلمانوں کی غیرت وعزت کو بیدار کرنا چاہتے ہیں اور رسول اللہؐ کی امتی ہونے کی وجہ سے ہمارا دینی فریضہ ہے کہ ہم غلامی کی زنجیریں توڑ دیں۔

دوسرے حصے میں پہلا مضمون ''اردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت ہے''۔ ''اشارات'' میں ہم اس کا جائزہ لے چکے ہیں۔

دوسرا مضمون ''غزل گوئی'' بھی ''اشارات'' میں طبع ہو چکا ہے۔

تیسرا مضمون ''ہمارے شاعر'' بھی ''اشارات'' میں شامل ہے۔ ہم اس پر بحث کر چکے ہیں۔

چوتھا مضمون ''کھرے کھوٹے کی پہچان'' اور پانچواں مضمون ''ایک روز کا اعلان جنگ'' بھی ''اشارات'' میں طبع ہو چکے ہیں۔

چھٹا مضمون ''شاعروں کی مفلسی اور اس کے اسباب'' ہے۔ جوش اس مضمون میں شاعروں کی مفلسی کی مختلف وجوہات بتارہے ہیں جو کچھ یوں ہیں:

۱۔ شاعروں کے پاس تصورات کی دولت کے علاوہ کسی سے محبت نہیں اس لیے یہی دولت ان کے پاس زیادہ ہوتی ہے۔

۲۔ شاعر بند آنکھوں سے زندگی بسر کرتا ہے اور ہمیشہ سُکر ہی میں رہتا ہے اس لیے سوسائٹی ہمیشہ اس کا شکار کرتی رہتی ہے۔ وہ ترقی تو کُجا خود کو دوسروں کے حملوں سے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔

۳۔ وہ خود کو برتر سمجھتا ہے، سوسائٹی اس کو بدماغ سمجھ کر اُس سے ہمدردی نہیں کرتی۔

۴۔ اس کے اندرونی تصورات و ہیجانات اس قدر کثیر و شدید ہوتے ہیں کہ وہ معاش یا زر کا تصور تک نہیں کرسکتا۔

۵۔ عقل دنیا کے لحاظ سے شاعر کسی دور میں بھی بلوغ حاصل نہیں کرتا اور وہ اگلے وقت کے لیے پس انداز نہیں کرتا۔

۶۔ روپیہ ہاتھ آتے ہی وہ بے چین ہو جاتا ہے کہ اسے جلد سے جلد کس طرح خرچ کرے۔

جوش نے شاعروں کی مفلسی کے جو اسباب تحریر کیے ہیں وہ فی زمانہ شاعروں پر بعینہ صادق آتے ہیں۔

''مردہ پرست ہندوستان'' مضمون ''اشارات'' میں طبع ہو چکا ہے۔

''باز گلبانگِ پریشاں می زنم'' ایسا مضمون ہے جو ''روح ادب'' کے دوسرے ایڈیشن میں طبع ہو چکا ہے۔

''پھس پھس کا کرت ہے'' جوش کا ایک مضمون ہے جس میں انہوں نے نیاز فتح پوری اور اپنے مابین چلنے والی انتقادی جنگ کو ایک واقعے کے تناظر میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہدایت اللہ خان ایک نو مسلم ٹھاکر اور جوش کے خانہ زاد سپاہی تھے اور خلیل اللہ خاں جوش کے ایک قرابت دار نوجوان تھے۔ ایک دن کسی نے ہدایت اللہ کو کہا کہ تمہارے پوتے کو خلیل اللہ گھماتا پھراتا ہے اور تمہیں اس کی خبر نہیں ہے۔ خلیل خان کی آمد پر ہدایت اللہ نے جوانوں کی چستی سے اپنے ہونٹ چباتے ہوئے پوچھا کہ:

'' کھلیل کھاں! ہم تم سے یُو پوچھت ہیں کہ یو تم کا ہم رے کالے پوتے میں کا مجا آوت ہے کہ تم اُس سار کو باگن باگن کی ہوا کھلاوت پھرت ہو؟ (خلیل خاں ہم تم سے یہ پوچھتے ہیں کہ یہ تم کو ہمارے کالے پوتے میں کیا مزہ آتا ہے کہ تم اس سالے کو باغوں باغوں کی ہوا کھلاتے پھرتے ہو)(۵۵)

غرض ہدایت اللہ خلیل خان کو مارنے کو لپکے لیکن دیگر سپاہیوں کے بیچ میں آجانے سے معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ بعد میں ہدایت اللہ بڑے باغ پہنچ کر چھپ گئے اور خلیل خان کو اپنے پوتے کے ہمراہ آتے دیکھ کر للکارا۔ پوتے کے بھاگ جانے پر خلیل خان پر لاٹھی لے کر چڑھ دوڑے، خلیل خان نے وار اپنی لاٹھی پر روکا اور کہا 'فنش' اس غیر متوقع اور ذلت آمیز حیرت کے بعد ہدایت اللہ نے پوچھا ''پھس پھس کا کرت ہے؟'' ہدایت اللہ بار بار پوچھتے رہے اور خلیل اللہ اسے چڑاتے رہے ایسی ہی چھیڑ چھاڑ ''نگار'' کے نیاز فتح پوری اور جوش کے درمیان بھی چل رہی ہے۔ جوش کی صلح جوئی اور ٹھنڈے ٹھار انداز نے نیاز صاحب کو چاروں خانے چت کر دیا ہے۔ جوش کے انداز بیاں اور بھوج پوری زبان کی مٹھاس نے مضمون کی اثر انگیزی کو خوب بڑھا دیا ہے۔ بعض اوقات سرد اور لاتعلق انداز بھی دشمن کے دانت کھٹے کر دیتا ہے۔

''بدحواسیاں'' مضمون بھی ''اشارات'' میں طبع ہو چکا ہے۔ تیسرے باب معقولات کے سلسلے کا پہلا مقالہ ''علم و فکر'' ہے جس میں جوش نے فلسفیانہ نکتہ نظر کے تحت مسلمانوں کے دلوں میں اُٹھنے والے سوالوں کے تحت نظریہ توحید کا جائزہ لیا ہے کہ ہم اسلام کے اوامر و نواہی اور اس کے زہد و فسق، حق و باطل، خیر و شر اور حلال و حرام پر نظر دوڑائیں تو یہ تسلیم کرنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں کہ ان تمام احکام و امور کی پشت پر کوئی نہ کوئی حکمت بالغہ ضرور نظر آئے گی۔ تصورِ وحدانیت نے صرف یہی نہیں کیا کہ ہم پر ان باطل خداؤں کا پول کھول دیا بلکہ ہم کو اس

کا یقین بھی دلا دیا کہ ہم سب سے بمراحل ارفع و اعلیٰ واقع ہوئے ہیں اور اس قدر کہ ہم ان سب کو مسخر کر لینے کی طاقت بھی رکھتے ہیں۔ جوش ایک رومانی طرزِ فکر کے حامل دکھائی دیتے ہوئے مستقبل کا خوش کن خاکہ کھینچتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تصور وحدانیت کے روشن پہلو کے زیر اثر رنگ، نسل، وطن، قوم اور مذہبی معتقدات کے تحت لڑی جانے والی جنگوں پر انسان ماتم کرے گا اور جغرافیہ کے منہ پر تھوک دے گا جو اس کو مختلف نسلوں، اور قوموں میں تبدیل کر کے خون کے دھارے کو مختلف خطوں میں تقسیم کر کے اُس کو بے شمار ہلاکتوں میں ڈال چکا ہے۔ اس وقت تمام اسلحوں کا لوہا پگھلا کر اخوت، انسانی کی زنجیر ڈھائی جائے گی، جو قطبین کا محاصرہ کرے گی اور تمام آفاق اس گل بانگ سے گونج اُٹھے گا۔

اس حصے کا دوسرا مضمون ''اسفل السافلین'' میں جوش ملیح آبادی نے انسانوں کے ذہنوں میں پلنے والے مختلف سوالوں کو (جو خدا کے وجود اس کی حاکمیت اور حکمت کے بارے میں ہیں) زبان دے رہے ہیں۔ آدمی کی تشکیک اسے کفر کے قریب لے جاتی ہے۔ خدا کے وجود پر ایمان کسی منطق دلیل اور حدِ ادراک سے پرے ہو کر کیا جاتا ہے۔ ہم دنیادار خدا کے نام پر دنیا کما رہے ہیں۔ بڑی بڑی عباؤں اور داڑھیوں کی آڑ میں خدا کو نیلام کر رہے ہیں۔ الہامی و مقدس الفاظ دہرا کر لوگوں کی جیبوں پر چھاپے مار رہے ہیں۔ سنگین و دہشت ناک جرائم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ ریاکار اور نام نہاد دین دار لوگوں کو ڈرا رہے ہیں۔

اس حصے کا تیسرا مضمون ''انسانی فطرت اور خیر و شر'' ہے۔ ہم ''اشارات'' میں اس کا جائزہ لے چکے ہیں۔

چوتھا مضمون ''شوپنہار کا فلسفہ'' ہے۔ اس مضمون میں جوش ملیح آبادی نے مشہور فلسفی ''شوپنہار'' کے فلسفۂ غم اور فلسفۂ زندگی کو بیان کیا ہے کہ جس قدرت کاملہ نے ہستی کا اتنا زبردست جال پھیلا رکھا ہے وہ ایک اندھی قوت ہے جو سراسر ایک حسن یا ارادۂ محض ہے۔ اس میں استدلالِ عقلی کی صلاحیت نہیں ہے۔ وہ جو کچھ کرتی ہے اپنے ایک وقتی اُبھار یا اسی جذبے سے مغلوب ہو کر کرتی ہے۔ انسان کے اندر قوتِ انفعالی کے دوش بدوش ایک قوتِ فعلی بھی موجود ہے اور یہی اس کی اصل ہستی ہے۔ ہمارے شعور کو جب خود اپنا شعور ہوتا ہے تو وہ خود کو ''ارادہ'' پاتا ہے اور ہمارا جسم محض ایک مظہر ہے۔ دنیا ایک علت و معلول کا سلسلہ ہے۔ اس تعلق سے علیحدہ ہو کر ہمارا نفس کسی چیز کو بھی سمجھ نہیں سکتا۔ قدرت کے سارے کارخانے میں کوئی نہ کوئی قوت کارفرما ہے جو بالکل نفسِ انسانی کی اُس قوت کے مثل ہے جس کو ارادہ کہتے ہیں۔ نباتات میں یہی مشیت نمو اور بالیدگی کی صورت میں کام کرتی ہوئی ملتی ہے۔ یہی مشیت اصل کائنات ہے وہ ہستی کے مختلف مدارج میں مقناطیسیت، توازن، تجاذب کمیاوی، حرارت، برق اور دوسری بے شمار صورتوں میں ظہور فرما رہتی ہے۔ یہ مشیت ہماری قوتِ ادراک، حافظہ، متخیلہ اور ہمارے تصور و استدلال پر حکومت کرتی ہے۔ علم اور عقل اسی مشیت کی ارتقائی شکل ہے۔ اپنے کو عالم ہست و بود میں لانے کے لیے مشیت مختلف آلات پیدا کرتی رہتی ہے جبکہ ایک صورت اس کے کام کی نہیں رہتی تو نئے اعضا اور نئے قویٰ پیدا کر کے دوسری صورت اختیار کر لیتی ہے۔

مشیت اپنے منتہائے کمال رکھتی ہے۔ یعنی ارتقائے شعور اور اس ارتقاء کی آخری منزل، بظاہر شعور انسانی معلوم ہوتی ہے۔ ذاتیت یا خود پرستی کسی شاعر کے شایانِ شان نہیں۔ شاعر ذات اور غیر ذات لغو امتیازات کو بھول جاتا ہے۔ جب تک ہم اپنے ذاتی اغراض اور اپنی انانیت کو پیش نظر رکھتے ہیں اس وقت تک ہم کو مشیت کے ظالم اور جابر ہاتھوں سے پناہ نہیں مل سکتی۔ فنون لطیفہ کے سنہری پردے مشیت کی خون خواریوں سے بچا سکتے ہیں، ایک بار زندگی کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد مشیت اس کو دوبارہ پیدا کرتی ہے تاکہ کون و فساد کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے یوں خود بینی اور خود ستائی کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ انسان اگر نیک ہے تو اس لیے کہ کہیں دوسرے بھی اس کے ساتھ بُرائی نہ کریں۔

زندگی کی اصلیت شور و شر ہے اور انسان جنم کا پاپی ہے۔ شوپنہار کا فلسفہ ان کے اپنے خمیر اور ضمیر کی پیداوار ہے۔ بطور مسلمان ہمارا ایمان ہے کہ ہر کام من جانب اللہ ہے۔ زندگی جبر نہیں ہے۔ نہ غم ہے۔ انسان کی تخلیق کا مقصد محض انسان کی آزمائش ہے۔ قدرت کاملہ اندھی قوت نہیں ہے اس کے ہر کام میں مصلحت ہے۔ مشیت اللہ کی رضا ہے۔ کائنات کی ہر اک شے میں اسی کی مرضی و منشاء کارفرما ہے۔ ہم مسلمان

صرف ایک بار اس دنیا میں آئے ہیں بار بار جنم لینے کا نظریہ یعنی آواگون پر ہمارا ایمان نہیں ہے۔ زندگی کی اصل بنیاد شر کی بجائے نیکی پر رکھی گئی ہے اور انسان پیدائش کے اعتبار سے معصوم ہے جنم کا پاپی نہیں ہے۔ یہ ہندوؤں کا نظریہ ہے کہ انسان اپنے ایک جنم کے گناہوں کا بدلہ دوسرے جنم میں پاتا ہے اور جنم کے اعتبار سے پاپی ہے۔

''عام پسند مغالطے'' جوش نے اس مضمون میں کچھ نکات اٹھائے ہیں۔ جو ہمارے موجودہ نظام کے حوالے سے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ جوش نے استفہامیہ انداز میں چند مغالطے بیان کیے ہیں جن میں ہم میں سے بیشتر لوگ مبتلا ہیں۔ دنیا میں لوگوں نے اپنے حساب سے اچھائی اور برائی کے معیار مقرر کر رکھے ہیں اور ہر کوئی اپنی عینک سے لوگوں سے دیکھتا ہے۔ محبت، حب وطن، انتقام اور نفرت وغیرہ کے جذبات غیر طبعی ذہنیت سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض کو ہم مفید ہونے کی بنا پر اچھا اور بعض کو غیر مفید ہونے کی بنا پر بُرا کہتے ہیں۔ ایک حقیقی انسان اعظم اس قدر سادہ ہوتا ہے کہ ہم افسوس کرتے ہیں کہ ہر شخص بڑا آدمی کیوں نہیں بن سکتا۔

''تجربہ'' اس مضمون میں جوش نے کچھ ایسی باتیں بیان کی ہیں جو محض تجربے کی بنا پر حاصل ہوتی ہیں کیونکہ تجربہ بہترین استاد ہے۔ کسی تجربے سے گزرے بغیر کچھ سیکھا نہیں جا سکتا۔ چند نتائج جو تجربے کے بعد حاصل ہوتے ہیں درج ذیل ہیں:

(۱) ہر ناکامی، ایک کامیابی ہے جو کل پر اُٹھا رکھی گئی ہے۔

(۲) جس قدر جس کی ضرورتیں کم ہوں گی اسی قدر وہ آزاد ہو گا۔

(۳) ہر انسان اس وقت تک ایماندار ہے جب تک تمہیں اس کا موقع نہیں ملتا کہ تم اُس کی بے ایمانی پر مطلع ہو جاؤ۔

(۴) اپنی کمزوریوں کو اپنی طاقت پر غلبہ حاصل نہ کرنے دو۔

(۵) جو قائل نہ ہونے کی قسم کھا چکا ہو اس کو کسی طرح قائل نہیں کیا جا سکتا۔

(۶) بھیڑیں دوسرے جانوروں کے نقش قدم پر چلتی ہیں جبکہ شیر کسی کے نقش قدم پر نہیں چلتا اور اپنا راستہ خود نکالتا ہے۔

(۷) مردوں کی قدردانی وعزت افزائی کا بہترین اسلوب یہ ہے کہ زندہ آدمیوں کی خبر گیری کی جائے۔

''نشہ اور بنی نوع انسان'' اگلا مضمون ہے جو انشائے لطیف کی صف میں شامل ہے۔ یہ مضمون بھی ''اشارات'' میں طبع ہو چکا ہے اور ہم اس کا جائزہ لے چکے ہیں۔

''قوت زندہ باد'' اس باب کا آخری مضمون ہے۔ جوش لکھتے ہیں کہ دنیا کا سب سے بڑا نظام، سب سے بڑا قانون، سب سے بڑا اخلاق اور سب سے بڑا مذہب قوت اور صرف قوت ہے۔ جس طرح بڑا درخت اپنے سائے میں پیدا ہونے والے پودوں کو سکھا دیتا ہے اور بڑی مچھلی چھوٹی مچھلیوں کو نگل لیتی ہے اسی طرح قوی بھی کمزور کو ہضم کر لیتا ہے۔

ایک سال سے اٹلی حبش میں خاک وخون کا کھیل رہا ہے۔ بم برسائے، گیس کے گولے پھینکے، ہوائی جہازوں سے آبادیوں کو بھون ڈالا گیا، ہزاروں بچوں کو یتیم اور بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا۔ ماؤں کے کلیجوں سے بچوں کو نوچ لیا گیا اور سہاگنوں سے ان کے سہاگ کو چھین لیا گیا۔ اخبارات نے مہذب دنیا تک پل پل کی خبریں پہنچائیں لیکن عالمی امن کے ٹھیکے داروں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ کمزور کی آواز تھی کسی نے نہ سُنی، اگر طاقت نہ ہو تو مذہب واخلاق کے تمام ضابطے اور شرافت وتمدن کے تمام وکمال دفعات دھری رہ جاتی ہیں۔

ہندوستان کے لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ کمزور کے علم سے قوی کا جُہل، کمزور کی شرافت سے قوی کی رذالت، کمزور کی عبادت سے قوی کا فسق وفجور، کمزور کے دین سے قوی کی بے دینی اور کمزور کے خدا سے قوی کا شیطان بمراحل بہتر ہوتا ہے۔

جوش نے عالمی امن کے تناظر میں جو تجزیہ کیا ہے وہ فی زمانہ درست ہے لیکن ہر قوم نکبت وادبار سے گزر کر اوج کمال تک پہنچتی ہے اور ہر تاریک شب کی سیاہی کو صبح کا اُجالا نگل لیتا ہے۔

باب چہارم ''جمالیات'' کے عنوان سے ہے اس میں تین مضامین شامل ہیں۔ پہلا باب ''فنون لطیفہ'' کے عنوان سے ہے۔ جوش کہتے ہیں کہ فنون لطیفہ جذبات کے غلو کا نام ہے اور ان کے حقائق کا مدار واقعات پر نہیں بلکہ زیادہ تر تخیلات پر ہوتا ہے۔ تخیل کم و بیش مبالغے سے ہوتی ہے اور فنون لطیفہ میں اس کی قدر و قیمت کا اُس کے پُراسرار ہونے پر مدار ہوتا ہے۔ ایک صناع کی فطانت کو خنجرِ آبدار کی دھار سے بھی باریک تر، محکم تر اور تیز تر ہونا چاہیے۔

ادب میں دیانت، موسیقی میں الہام، رقص میں وقار، صنم تراشی میں تناسب اور نقاشی میں خواب ہائے بیداری کی نمود، یہ تمام چیزیں انتہا درجے کی نادر اور فنون لطیفہ کے اجزائے لاینفک میں سے ہے۔ سائنس اور فنون میں وہی فرق ہے جو احساس اور تعقّل میں پایا جاتا ہے۔ فرصت کے اوقات میں بیش بہا جواہر اور صاحبانِ فن قابلِ پرستش ہوتے ہیں لیکن مشغول لمحوں میں بسا اوقات ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔

جوش نے فنون لطیفہ کے مفہوم کو واضح کرتے ہوئے اس کی اہمیت وافادیت کو بیان کیا ہے اور فنون لطیفہ کو پرکھنے کے معیارات سے بھی قارئین کو آگاہ کیا ہے۔ جوش کا مضمون فنون لطیفہ کے اوصاف کا احاطہ کرتا ہے جن کو مد نظر رکھ کر اگر ہم کسی فن پارے کی تفہیم کریں تو فن اور فنکار کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ کر اس کی ستائش کا حق ادا کر سکتے ہیں۔

دوسرا مضمون ''الفاظ اور شاعر'' ہے یہ بھی ''اشارات'' میں طبع ہو چکا ہے۔

اس باب کا تیسرا اور آخری مضمون ''تخلیق شعر'' ہے۔ تخلیق ادب وشعر کے کرب کو بیان کے سانچے میں ڈھالا نہیں جا سکتا اور اگر اسے بیان کرنے کی سعی کی جائے گی تو الفاظ سے خون ٹپکنے لگے گا۔ اس صنف کے سمجھنے اور پرکھنے والے صدیوں بعد پیدا ہوا کرتے ہیں۔ شاعر کی عظمت اس کی موت کے بعد تسلیم کی جاتی ہے۔

''سماجیات'' باب نمبر پانچ میں گیارہ مقالات شامل ہیں۔ ''عقل کی باتیں'' پہلا مقالہ ہے جو ''اشارات'' میں طبع ہو چکا ہے۔

''تمدن کی ظالمانہ مسخرگی'' دوسرا مقالہ ہے ''اشارات'' کا پہلا مقالہ تھا۔

''ہندوستانی پردہ'' تیسرا مقالہ ہے۔ یہ بھی ''اشارات'' میں طبع ہو چکا ہے۔

''غلامی کے نظارے''، ''محکوم ملک کے حکام''، ''وہ مظالم جو روز ہوتے ہیں''، ''خدا کے تین قہر''، ''امرائے ہند''، ''اودھ کے زمیندار اور تعلقہ دار'' ایسے مقالات ہیں جو ''اشارات'' میں طبع ہو چکے ہیں۔

''والیانِ ریاست کی مہمان نوازیاں'' دسواں مقالہ ہے۔ جوش نے لکھا ہے کہ اگرچہ معاشی زبوں حالیوں اور سیاسی نحوستوں کے باعث ہماری مہمان نوازی متاثر ہو چکی ہے پھر بھی دوسرے ممالک کے مقابلے میں اس کی وسعتیں قابل فخر ہیں۔ ہر ریاست میں دو مہمان خانے ہوتے ہیں ایک دیسی اور ایک انگلش گیسٹ ہاؤس۔ دیسی گیسٹ ہاؤس میں جو مہمان ٹھہرائے جاتے ہیں ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ وہ والیان ریاست کے نہ ہم مذہب ہوتے ہیں نہ ہم وطن بلکہ جغرافیائی اور نسلی حیثیت سے قطعی اجنبی ہوتے ہیں۔ دیسی گیسٹ ہاؤس کی عمارت خراب وخستہ حال، ملازم گستاخ ومفلس، سامان خور ونوش بے مزہ ہوتا ہے۔

جبکہ انگلش گیسٹ ہاؤس کی عمارت اپنی وسعت خوبصورتی، سبزہ و گل کی فراوانی، خوش ذائقہ سامانِ خور و نوش، بیش قیمت اسباب، آرائش وزیبائش اور باادب وردی پوش ملازمین کی وجہ سے قابل فخر ہوتی ہے۔

محکومیت ومغلوبیت، محکوم ومغلوب قوم کو ایک ایسے سانچے میں ڈھال دیتی ہے کہ خود اس قوم کے افراد ایک دوسرے کو ذلیل سمجھنے لگتے ہیں۔ ان والیان ریاست کو کوئی کیونکر یہ بتائے کہ وہ ملک کیونکر ذلیل وحقیر ہو سکتا ہے جہاں ٹیپو سلطان اور رانا پرتاپ جیسے شیر دل اور غیور پیدا ہوئے ہوں۔ غلام ومحکوم قوموں کا مزاج بھی اپنے آقاؤں کے مزاج کا عکس ہو جاتا ہے۔ جوش اپنے ملک کے والیان کی اسی ذہنیت کو اس مقالے میں پیش کر رہے ہیں۔

''بدبختیاں'' اس باب کا گیارہواں اور آخری مقالہ ہے ''اشارات'' میں اس مقالے کو ''شائد کوئی عبرت حاصل کرے'' کے عنوان کے تحت دیا گیا ہے۔ ہم اشارات میں اس مقالے کا جائزہ لے چکے ہیں۔

چھٹا باب ''سیاسیات'' کے جلّی عنوان سے ہے۔ اس میں کل آٹھ مقالات ہیں۔ پہلا مقالہ قومیت کا تخیل ہے جو کہ ''اشارات'' میں طبع ہو چکا ہے۔

دوسرا مضمون ''کچھ انتخابات کے بارے میں'' ہے۔ جوش کے اس مضمون میں الیکشن سے پہلے اور الیکشن کے بعد امیدواروں کے عمل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ووٹروں کے پروپیگنڈے کے لیے ہر طرح کے ذرائع اختیار کیے جاتے ہیں۔ پیسہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے۔ ہر امیدوار اخلاق کا بہترین نمونہ بن کر سامنے آتا ہے۔ حریفِ مقابل کو ہر طرح سے نیچا دکھانے کی تدبیر کی جاتی ہے لیکن ووٹر کو بھی ووٹ ڈالنے سے پیشتر کچھ باتوں پر دھیان دینا ضروری ہے۔ ووٹر کو امیدوار کی گزشتہ زندگی، اس کی جماعت اور اس کے پیشے پر نظر ڈالنی چاہیے۔ ساتھ ہی گزشتہ امیدواروں کے کاموں پر بھی نظر ڈالیے کہ آیا ان کے وعدہ ایفا ہوئے یا آج بھی آپ کے مسائل جوں کے توں ہیں۔

جوش الیکشن سے پیشتر اپنے ملک کے عوام میں شعور پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ انہیں اپنے حق رائے دہی کے استعمال میں کن احتیاطی تدابیر کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے تب ہی وہ باشعور شہری کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کر سکیں گے۔

تیسرا مضمون ''ایک مکالمہ'' ہے جو کہ صغیر اور کبیر دو اشخاص کے مابین ہے ایک ہندو مسلم اتحاد کا داعی ہے اور دوسرا اس کا مخالف ہے۔ جوش نے نہایت باریک بینی اور خوبی کے ساتھ دونوں کے نقطہ نظر کو بیان کیا ہے۔ صغیر کہتا ہے کہ ہندو ہمیں ناپاک سمجھتے ہیں جبکہ کبیر کا کہنا ہے کہ ہندوؤں کا اپنی قوم کے افراد تو کیا اپنے گھر کے افراد کے ساتھ بھی یہی برتاؤ ہے۔ پھر رونا کس بات کا۔ صغیر جواب میں کہتا ہے کہ ’ہندو سرکاری دفاتر سے مسلمانوں کو چُن چُن کر نکال باہر کر رہے ہیں اور ہندو مسلم اتحاد کی سب سے بڑی یادگار یعنی اردو زبان کو نیست و نابود کرنے پر تل گئے ہیں۔ شہر میں گوروں کے لیے ہزاروں گائیں روز ذبح کی جاتی ہیں لیکن اگر بقر عید کے موقع پر مسلمان ایک گائے بھی قربان کریں تو ہنگامہ ہو جاتا ہے۔ کبیر نے کہا مگر مجھ سے مسلمانوں کی ہٹ دھرمیاں بھی سن لیں اور پھر فیصلہ کریں۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ محض ہندوؤں کی ضد میں گائے ذبح کرتے ہیں حالانکہ اسلام انہیں گائے کی قربانی پر ہرگز مجبور نہیں کرتا۔ دوسرے وہ گائے کو آراستہ کر کے گلیوں میں پھراتے ہیں تیسری ہٹ دھرمی یہ کہ وہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی آج تک ہندوستان کو اپنا وطن تسلیم نہیں کر سکے۔ بعض باتوں میں ہندو ہٹ دھرم ہیں اور بعض باتیں مسلمانوں میں غلط ہیں اور یہی انتہا پسندی دونوں کے مابین غلط فہمیاں پیدا کر رہی ہے۔ آخر میں جوش اس جھگڑے کا حل کبیر کی زبان سے یہ کہہ کر پیش کر رہے ہیں کہ دو بڑی مصیبتوں میں سے نسبتاً ہلکی مصیبت سے موافقت پیدا کر لے اس لیے انگریز کی محکومی سے بہتر ہے کہ ہندو سے مصالحت پیدا کر لے۔ جوش نے حالات وواقعات کے تناظر میں اپنے رسالے ''کلیم'' کے ذریعے ہندو اور مسلمان دونوں کو یہ احساس دلایا ہے کہ وقت کا تقاضا اسی بات میں ہے کہ ہم ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کی بجائے آپس میں مصالحت پیدا کریں۔

چوتھا مضمون ''نحوست کے پردے میں سعادت'' ہے۔ اپنے اس مقالے میں جوش کہتے ہیں ہنگامے تو مشرق و مغرب دونوں جگہ برپا ہیں۔ مشرق میں جہالت کی وجہ سے اور مغرب میں علمیت کے باعث۔ دونوں میں خطرناک حد تک نتائج عمل کی مماثلت پائی جاتی ہے۔ آج دنیا کی تمام حریص قومیں ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہیں۔ جوش کو امکان دکھائی دے رہا ہے کہ ایک بڑے آپریشن کے بغیر انسانیت اپنی اصلاح نہ کر سکے گی کیونکہ اس شکست و ریخت کے بعد بگڑی ہوئی انسانیت کی خاک سے ایک ایسا حیرت ناک نیا آدم پیدا ہو گا جسے دیکھ کر قدرت کا جذبہ الوہیت جھومنے لگے گا اور انسانیت کے ماتھے پر الوہیت کا تاج ہو گا۔

دنیا جنگ عظیم اوّل کے بعد جنگ عظیم دوئم کی تباہ کاریوں سے بھی گزر چکی اور اس شکست و ریخت کی خاک سے تعمیر دنیا کا کام بھی ہوا لیکن اقوام عالم آج بھی سیاسی، تجارتی اور صنعتی استیلاء کے نظام میں جکڑی ہوئی ہیں۔ رنگ، نسل اور مذہب کے جذبات پہلے سے زیادہ شدت سے حملہ آور ہیں اور دولت و ذرائع کی غیر منصفانہ تقسیم بھی جاری و ساری ہے۔ نحوست آج بھی نحوست ہے سعادت نہیں بن سکی۔

''عصرِ حاضر کے ہلا کو اور ان کے مقتول'' اگلا مضمون ہے۔ یہ بھی ''اشارات'' میں چھپ چکا ہے اور ہم اس کا جائزہ لے چکے ہیں۔

''بھارتیہ ساہتیہ پریشد کی اصل حقیقت'' یہ مضمون بھی ''اشارات'' میں طبع ہو چکا ہے۔

ساتواں باب ''مذہبیات'' میں پانچ مضامین شامل ہیں پہلا مضمون ''حلقۂ مفکرین'' ہے۔ ہندوستان میں ایک ایسے حلقۂ مفکرین کو قائم کرنے کی اشد ضرورت ہے جو ایسے درست افکار کو نشر و فروغ دے جو فلسفیانہ و انتقادی تحقیقات پر مبنی ہوں اور ایسے ادبیات کو آگے بڑھائے جو انسان کی قوتِ استدلال کو اوہام و روایات اور تنگ نظری و تعصبات کی زنجیروں سے رہائی دے۔ جہالت سے جنگ کی جائے۔ کوتاہ بینوں کو فنا کر دیا جائے۔ ''علم الاصنام اور مقدس حکایات'' کا تجزیہ کر کے اوہام کا بھانڈا پھوڑ دیا جائے۔ جدید حقائق اور تازہ انکشافات علمی حلقوں، درس گاہوں اور علمی رسائل تک محدود رکھنے کی بجائے تمام اطراف و اکناف میں پھیلا دیئے جائیں اور جو حضرات اس حلقۂ مفکرین کے رکن بنیں ان کے لیے ضروری ہو کہ کسی منفی یا مثبت خلافِ عقل مسلک کے پیرو کار نہ ہوں۔ یہ حلقہ روایتی دینیات، رسمی اخلاقیات اور مبنی بر اوہام تقلید کے مقابلے میں انسانی کردار و افکار پر بہت زیادہ اور پائیدار اثر ڈال سکے گا۔

ہندوستان ایک ایسا وسیع ملک ہے جہاں اوہام پرستی، جہالت، مذہبی بھید بھاؤ، روایات و اقدار کے جمود نے پنجے جمائے ہوئے ہیں۔ وہاں ایک ایسے دور کا خواب دیکھنا جب ہر لحاظ سے جدت و اختراع اپنے قدم جما لے، دیوانے کے خواب کے سوا کچھ نہیں لیکن جوش اس دور میں ہمیں اس دور کی تصویر دکھلا رہے ہیں اور حقائق کے تجزیاتی مطالعے کے بعد ایک قابل قبول حل کی طرف ہمارے اذہان کو متوجہ کروا رہے ہیں۔

''چار یار''، ''عید''، ''ہمارے پیر'' اور ''ہمارے مجتہد'' چاروں مضامین ''اشارات'' میں طبع ہو چکے ہیں۔

آٹھواں باب ''شخصیات'' کے عنوان سے ہے جس میں دس اشخاص پر مضامین تحریر کیے گئے ہیں۔

پہلا مضمون ''اقبال کی موت'' ہے۔ جوش نے اقبال جیسے بڑے شاعر اور فلسفی کی موت پر اپنے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ جوش لکھتے ہیں کہ اقبال کے مسلک و خیالات سے اختلاف کے باوجود مجھے اس کے شاعرانہ کمال اور مفکرانہ عظمت سے کبھی انکار نہ تھا۔ اقبال اُن لوگوں میں سے تھا جو صدیوں اور قرنوں کی سعی پیہم کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ جوش کو مخالفین نے ہمیشہ اقبال کا دشمن قرار دیا اور ان کے اس مضمون سے طرح طرح کے معنی و مطالب اخذ کرنے کی کوشش کی گئی۔ جوش نے اس بات پر رنج کا اظہار کیا ہے کہ اس دور رس نظر اور آفاقی شاعری کرنے والے شاعر نے خود کو محدود کر لیا اور مذہب تک اپنی شاعری کو پابند کر لیا۔ ان کی آفاقی فطرت نے یہ پابندی کیونکر گوارا کی۔ لیکن اس کے باوجود اقبال شاعر تھا اور عظیم شاعر، اقبال مفکر تھا اور عظیم مفکر۔ اس کی جگہ کوئی بھی پُر نہیں کر سکتا۔

آخر میں جوش نے ایک تجویز پیش کی کہ اقبال کی موت کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کرنے یااس کا مجسمہ بنانے یااس کی قبر کو مقبرہ بنانے یاہر سال اس کی برسی منانے کی بجائے 'دائرہ اقبال' کے نام سے ایک ایسی مستقل انجمن کی بنیاد ڈالی جائے جو ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں اپنی شاخیں قائم کرکے ہر جگہ ترجمہ اور تصنیف کا کام جاری کردے۔ اس مقصد کے لیے ہر اردو بولنے والا اور سمجھنے والا اپنی آمدنی میں سے ایک روپیہ فی صد سالانہ چندہ دیا کرے۔

جوش کی تجویز پر عمل ہوا اور دائرہ معارفِ اقبال اور اقبال اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا جہاں اقبال کی تصانیف اور خطبات کے علاوہ اقبال پر دیگر مصنفین کی کتابیں طبع کی جاتی ہیں اور ترجمہ کی جاتی ہیں۔ جوش نے ایک تجویز اور دی تھی کہ اس طرح ہم اقبال کے متعلقین کی مدد بھی کرسکتے ہیں اور ہر سال بہترین تصانیف پر انعام بھی دے سکتے ہیں۔ اقبال کی رائیلٹی کے حقدار اقبال کے متعلقین یقینی طور پر ہوں گے اور ہر سال اقبال پر لکھی جانے والی بہترین کتاب پر انعام بھی دیا جاتا ہے۔

دوسرا مضمون "اصغر گونڈوی" ہے۔ جوش نے اصغر گونڈوی کی وفات پر اصغر گونڈوی کو خراج تحسین پیش کیا ہے کہ اصغر بہت صابر وشاکر تھے۔ صاحبزادی کی وفات پر باوجود یہ کہ خود فالج میں مبتلا تھے، مرحوم کے چہرے پر کوئی شکن نہ تھی۔ ابھی پریم چند کا غم تازہ تھا کہ اصغر بھی چل بسے۔ فراقِ احباب کے ساتھ ساتھ وداعِ شباب نے جوش کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔

تیسرا مقالہ "ڈاکٹر انصاری کی موت" ہے۔ ڈاکٹر انصاری کی کمی زمانہ ایک عرصہ تک پوری نہ کرسکے گا۔ کانگریس میں ڈاکٹر انصاری کی حیثیت ایک مضبوط چٹان کی سی تھی۔ آپ متواضع، خلیق اور بردبار تھے۔ فنون لطیفہ اور جمالیات سے بھی رغبت تھی۔ ان کا دنیا سے چلے جانا ایک عظیم سانحہ ہے۔

چوتھا مقالہ "سندر لال مشرا" ہے۔ پنڈت سندر لال مشرا بلا تفریق مذہب وملت عربی وفارسی کی فاضل اور قدیم تہذیب کا بے مثال نمونہ تھے۔ آپ کو شاہنامہ فردوسی اور مثنوی مولانا روم پر عبور حاصل تھا۔ اسلامی تاریخ پر بھی نظر تھی۔ سینکڑوں اشعار یاد تھے۔ آپ ہندو مسلم اتحاد بورڈ کے صدر تھے۔ فرقہ واریت سے کوسوں دور تھے۔

پانچواں مضمون "مصطفیٰ زیدی" پر ہے۔ جوش نے مصطفیٰ زیدی کو اپنا "معنوی فرزند" قرار دیا ہے۔ مصطفیٰ زیدی کی جواں مرگی نے یہ دنیا سونی کردی ہے۔ جب زیدی زندہ تھے تو یہ فیصلہ آسان تھا کہ عصر نو میں اخلاف میں ایسا جوہر موجود ہے جو اسلاف سے بازی لے جاسکتا ہے۔ مصطفیٰ کی موت کے بعد کہا گیا کہ اُس نے خودکشی کی ہے لیکن جلد ہی منکشف ہوگیا کہ چند مخفی طاقتور افراد نے ایک قتالۂ عالم کو استعمال کر کے مصطفیٰ زیدی کو دوسری دنیا کی طرف روانہ کیا ہے۔ افسوس جسے جوش کا مرثیہ کہنا تھا آج جوش اس کا مرثیہ لکھ رہا ہے۔

چھٹا مضمون 'میر صاحب" ہے۔ جوش کے دوست ہیں میر عترت حسین عرف "میر صاحب" جانسٹھ کے سادات سے تعلق رکھتے ہیں۔ دماغی ساخت کے اعتبار سے مادر زاد عالم ہیں: روشن دماغ، پاکیزہ اور محبت واخلاص سے بھرپور دل کے مالک ہیں۔ نوع انسان کی آبرو، فرشتہ سیرت درویش دل ہیں۔

ساتواں مضمون "خراج محبت" ہے۔ سید آل رضا صاحب کی طبیعت میں قیامت کا سوز وگداز ہے اور بلا کی گداختگی ہے۔ انتہائی محتاط اور تصرفات سے گریز کرنے والے حسینی کردار کو سامنے لانے والے ہیں۔ مرثیوں کو انہوں نے ایک نیا انداز دیا۔

آٹھواں مضمون 'سید ہاشم رضا" ہے۔ پہلے ایک تمہید پر مرثیہ ہے۔ پھر سید صاحب کے حضائل پر بحث ہے۔ گورنری کے عہدے تک پہنچ جانے ے بعد بھی حاکمانہ تکبّر سے کوسوں دور رہنے والے تھے۔ غیر معمولی شرافت وراثت میں پائی تھی۔ ادبیت وشعریت کا جوہر اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

نواں مضمون ''کوثر نیازی'' ہے۔ جوش نے اپنی پاکستان آمد کے بعد لوگوں کی شقاوت کی داستان سناتے ہوئے اپنے مہربانوں وزیر اعظم سہروردی، ذوالفقار علی بھٹو اور کوثر نیازی کی عنایات بیان کی ہیں۔ جوش نے فی زمانہ غزل گو شاعروں کی خرابیاں اور کوثر نیازی کی شاعرانہ خصوصیات بیان کی ہیں۔ جوش کو یہ ملال ہے کہ کوثر نیازی اپنی وزیرانہ مصروفیات کی وجہ سے علم وادب کی طرف سے غافل ہیں۔

دسواں مقالہ ''صابر تھاریانی'' ہے۔ گجراتی زبان کے شاعر ہیں۔ جوانی میں ممبئی میں رہے اور بوڑھاپے میں پاکستان ہجرت کر لی۔ اردو، گجراتی اور انگریزی تینوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ ان کے گجراتی قطعات کو جوش نے اردو میں نظم کیا ہے۔ ''صابر کے موتی'' عنوان کے تحت مزاجوں اور عقائد کے فرق کے باوجود شاعرانہ اشتراک دونوں کو ملائے رکھتا ہے۔ جوش نے صابر تھاریانی کی فکر کو واضح کرنے کے لیے کچھ اشعار بھی درج کیے مثلاً

ساری محفل میں نور پھیلا ہے۔ وہ گئے ہیں ابھی ابھی شائد

خیال وفکر کے لاکھوں چراغ روشن ہیں۔ عجیب چیز ہے تنہائی، آدمی کے لیے(۵۶)

نواں باب ''جوابیات'' کے عنوان سے ہے اس میں دو مضامین شامل ہیں۔

پہلا مقالہ ''ضرب شاہد بفرق شاہد باز'' ہے۔ یہ افکار کے جوش نمبر میں چھپنے والے شاہد احمد دہلوی کے ایک مضمون کا جواب ہے۔ مضمون کا عنوان تھا ''جوش ملیح آبادی، دیدہ وشنیدہ'' جوش اپنے مضمون کی توجیہہ یوں بیان کرتے ہیں کہ دوستوں نے کہا کہ اگر میں نے جوش نمبر میں (جو کہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت اختیار کر جائے گا) شائع ہونے والے مضمون کا جواب نہ دیا تو اس میں جو کچھ دروغ بیانی اور تہمت تراشی کی گئی ہے آئندہ نسلیں اس کو سچ جانیں گی۔ جوش نے کچھ ذیلی عنوان قائم کر کے دلائل سے اپنے مؤقف کو ثابت کیا ہے۔ یہ درج ذیل ہیں۔

میری بلانوشی و مفت خوری: شاہد احمد دہلوی نے لکھا ہے کہ جوش صاحب بلانوش تھے جو بھی مل جائے چڑھا جاتے تھے۔ جوش نے جواب میں لکھا ہے کہ شاہد صاحب کو مجھ سے ہم نشینی کا شرف کبھی حاصل نہ ہوا۔ اس لیے سُنی سنائی کو بیان کرنا شرمناک دلیری کے سوا کچھ اور نہیں نیز وہ گھڑی سامنے رکھ کر چھ نہیں بلکہ چار پیگ روز پیتے ہیں اور ایسے آدمی کو بلانوش نہیں کہا جا سکتا۔ بلانوش دن رات شراب کے نشے میں دھت رہنے والے کو کہتے ہیں۔ ڈاکٹر اشرف الحق کے ہاں وہ مفت کی پینے نہیں جاتے تھے شاہد احمد نے نشے ہرن ہو گئے لکھ کر معنوی ولسانی دو غلطیاں کی ہیں، 'نشہ ہرن ہونا' اہل زبان کے ہاں درست ہے۔ معنوی غلطی یہ کہ اپنے پھوپھی زاد مرحوم بھائی پر حرف گیری کی ہے جو کہ ان کی بات کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ نیز ''مفت کی شراب پینے والا'' کہہ شاہد احمد نے جوش کی غیرت پر حملہ کیا ہے۔ مفت کی شراب وہ پیتے ہیں جن کی جیب میں پیسے نہیں ہوتے اور جو ٹٹ پو نجئے خاندانوں یا سود خور ملاؤں یا غاصب حاکموں کے پٹھو علمائے کرام کے گھر میں جنم لیتے اور وہیں تربیت پاتے ہیں یہاں پر جوش کا اشارہ شاہد احمد کے دادا مولوی نذیر احمد کی طرف ہے جنہوں نے مدرسے میں پرورش پائی اور سود خور تھے۔ یہاں جوش اپنے خاندان پر فخر کر رہے ہیں کہ ان کے جد امجد فقیر محمد بہادر خاں گویا گورنر خیر آباد و سپہ سالار سلطنت اودھ کا تذکرہ اودھ کی تاریخوں میں بکھرا ہوا ہے۔ خود جوش کو وراثت میں بڑی جائیداد ملی اور ان کے نام کے ساتھ رئیس ملیح آبادی لکھا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ اس دور میں حیدر آباد میں جوش کی تنخواہ معقول تھی نیز ملیح آباد سے بھی روپیہ آ جاتا تھا۔ جوش لکھتے ہیں کہ شاہد صاحب ایک طرف مجھے مفت خورا کہتے ہیں دوسری طرف ارشاد فرماتے ہیں کہ جوش کو واہ واہ کرنے والے گھیرے رہتے تھے۔ دن بھر چائے، شربت،

پان، سگریٹ سے تواضع ہوتی تھی۔ اِدھر سورج غروب ہوا اُدھر جوش صاحب پیمانہ بکف طلوع ہوئے اور مفت خوروں کو چُسکی لگانے کا موقع ملتا۔ شاہد صاحب اپنی باتوں کو جھٹلاتے بھی خود ہیں جو مفت خوروں کی تواضع کرے وہ خود مفت خورا کیونکر ہو سکتا ہے۔

(۲) حیدر آباد سے میرے اخراج کی مدت: شاہد احمد نے کہا کہ جوش کو چوبیس گھنٹے کے اندر ممالک محروسہ سے نکل جانے کا حکم ہوا تھا۔ یہ بارہ گھنٹے ہی میں وہاں سے نکل گئے۔ جوش کہتے ہیں کہ شاہد صاحب نے یہاں بھی غلط بیانی سے کام لیا۔ میرے اخراج کے لیے پورے پندرہ دن کی سکون آمیز میعاد دی گئی تھی وہ بھی اس لیے کہ میں اپنی غلطی کو محسوس کر کے نظام سے معافی مانگ سکوں۔ اس بات کی تصدیق امیر سید ابولاعلیٰ مودودی صاحب سے ہو سکتی ہے جو سکندر آباد اسٹیشن پر مجھے رخصت کرنے آئے تھے۔

(۳) دربارِ معظم جاہ: شاہد احمد نے دربارِ معظم جاہ (نظام حیدر آباد کے منجھلے صاحبزادے) میں ہونے والی بیہودگیوں کا نقشہ کھینچا ہے۔ جوش نے سخت لہجے میں اس کا جواب دیا ہے اور چار معتبر حاضر باش گواہوں کے نام پیش کیے ہیں جو اس دربار سے متعلق تھے۔ حضرت نجم آفندی، نواب قدرت نواز جنگ بہادر، حضرت مولانا ماہر القادری اور نواب شہید یار جنگ بہادر کے علاوہ نواب ناصر نواز الہ ولہ فانی جیسا شاعر بھی اسی دربار سے متعلق تھا۔

(۴) دکن سے علتِ اخراج: شاہد احمد کہتے ہیں کہ نظام شفقت پدری کی وجہ سے بیٹے کو تو کچھ نہ کہتے لیکن حاضر باشوں کی تاک میں لگ جاتے اور بندر کی بلا، طویلے کے سر، جوش پر نزلہ گرانے کا بہانہ انہیں ہاتھ آ گیا۔ جوش کہتے ہیں کہ حیدر آباد کا ہر اک شخص اس کا گواہ ہے کہ بزرگ خاندان کی حیثیت سے نظام اپنے بھائیوں، اپنے بچوں اور اپنی بیویوں کے ساتھ عدیم النظیر سختی سے پیش آیا کرتے تھے۔ وہ تو معظم جاہ اور اعظم جاہ نے انگریزوں سے دادرسی کی درخواست کی تو ان کی تنخواہیں مقرر کی گئیں۔ نظام اپنی فرماں روائی کے زعم میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا اور اپنے اعیان و اکابر، عمال و وزرا، متوسلین و متقربین اور علماءؒ و قضات تک کو کھلے بندوں ماں بہن کی گالیاں دینے میں ایک لمحے کے واسطے بھی نہیں جھجکتا تھا۔ وہ جوش کے سے ایک معمولی ملازم کو براہ راست سزا دینے میں کیوں جھجکتا اور اُس کو سزا دینے کے بہانے تلاش کرتا پھرتا۔ دکن سے اخراج کا سبب وہ نظم "غلط بخشی" تھی۔

عنایت اللہی، ناخوشی: شاہد احمد نے لکھا کہ قیامِ حیدر آباد کے زمانے میں ایک عنایت اللہ صاحب ناظم دارالترجمہ تھے جو مرنجانِ مرنج اور جوش سے ناخوش تھے۔ جوش کہتے ہیں کہ عنایت اللہی ناخوشی نہیں بغض اللّٰہی بول رہا ہے۔ شاہد احمد کا خیال ہے کہ وہ آدمی شاعر کیسے ہو سکتا ہے جس سے ایک مولوی اور مرنجان مرنج آدمی ناخوش رہتا ہو۔

میر اتقرر: شاہد احمد نے کہا کہ مہاراجہ کشن پرشاد نے جوش کو دارالترجمہ کی پول میں دھانس دیا جبکہ جوش نے جواب میں لکھا کہ ان کا تقرر براہ راست نظام دکن کے فرمان سے ہوا۔ جوش نے شاہد احمد کی دشمنی کی وجہ یہ بیان کی کہ ترقیٔ اردو بورڈ کی طرف سے ڈپٹی نذیر احمد کی کتاب "منتخب الحکایات" جس پر شاہد احمد کا مقدمہ تھا، نظر ثانی کے لیے میرے حوالے کی گئی۔ میں نے مقدمہ اور اصل کتاب میں جو خامیاں لسانی تھیں ان پر خط کھینچ دیا۔ جب یہ خبر شاہد احمد تک پہنچی تو غیظ و غضب میں انہوں نے "جوش دیدہ و شنیدہ" لکھ مارا۔

میری علت مہاجرت سے جوش نے وہ وجوہات بیان کی ہیں جن کی خاطر ہندوستان ترک کرنا پڑا نہ کہ پنڈت نہرو کی ناراضگی کے سبب سے جو شاہد احمد نے بیان کیا ہے۔

رائٹر گلڈ: رائٹر گلڈ میں شریک ہونے کے لیے جب جوش کو دعوت دی گئی تو انہوں نے قبول کر لی اور جب شرکت کا موقع آیا تو انکار کر دیا کیونکہ دوستوں نے منع کر دیا تھا کہ اگر اور ادباء و شعراء کی طرح آپ کو بھی گلڈ کے کسی جلسے کی صدارت کا موقع دیا جاتا تو ٹھیک تھا اس طرح جانا ٹھیک نہیں۔ آخر میں جوش نے کہا کہ میں آپ کی اور آپ کے دادا جان کی علمی قابلیت کو تسلیم کر کے سر جھکاتا ہوں اور آپ جیسے خاندانی آدمی سے توقع نہیں رکھتا ہوں کہ آپ میرے عیوب کی پردہ پوشی کی بجائے پردہ دری کریں۔

اگلا مضمون "ایک دوسرا خط" ہے جنوری ۳۸ میں ایک شخص کا خط مع جواب شائع ہوا جس کا جواب الجواب ملا تو جوش کے جواب کے ساتھ شائع ہوا۔ اس میں جوش نے طنز و تشنیع سے کام لیا ہے اور لہجے کی کڑواہٹ ادبی الٹ پھیر کے ذریعے چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

دسواں باب متفرقات کے عنوان سے ہے جس کا پہلا مقالہ "سالنامہ" ہے۔ یہ وہ اداریئے ہیں جن کو "کلیم" رسالہ کی زینت بنایا گیا تھا۔ "سالنامے" میں جوش سالنامہ نہ نکالنے کی وجہ یہ بتاتے ہیں۔ سالنامہ وہ نکالے جس کا ملک آزاد اور قوم آسودہ حال ہو۔ محکومی تمام امراض کی ماں ہے دسمبر کی اکتیس تاریخ کو وہ کانپتے ہوئے اپنے بستر پر دراز ہوتے ہیں۔

دوسرا مضمون "کلیم اور میں" ہے۔ جوش کہتے ہیں کہ تقریباً چار سال سے کلیم کا چلنا خود مجھے بھی حیران کر دیتا ہے۔ مجھ میں انتظامی قابلیت کے نہ ہوتے ہوئے بھی کلیم کا چلنا ایک معجزہ ہے اور اب سے کلیم کا انتظام میں اپنے بھانجے التفات احمد شہاب کے سپرد کر رہا ہوں۔ یا ہو سکتا ہے کہ میں ملیح آباد منتقل ہو جاؤں اور کلیم کو وہاں لے جاؤں:

تیسرا مضمون "کلیم کی نیم سالہ زندگی پر ایک سرسری نظر" اس مضمون میں جوش اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہے ہیں کہ کلیم کا آدھ سالہ سفر خوش اسلوبی سے ختم ہو گیا۔ قارئین خود اندازہ لگالیں کہ اس عرصے میں کلیم نے ملک کی کیا خدمت کی ہے اور باقی رسائل کیا مواد پیش کر رہے ہیں۔ چھ روپے سالانہ میں اتنا سستا پرچہ کہیں شائع نہیں ہوتا۔ کلیم پر اس دور میں مختلف رسالوں کے ریویو شائع ہوئے ہیں۔ یہ اندیشہ پیدا ہو رہا ہے کہ کلیم کی مصروفیات میری شاعری کے لیے مضر ہوں گی لیکن قدرت نے مجھے شاعری کا ایسا زبردست، تُند اور شدید مادہ ودیعت فرمایا ہے کہ وہ دنیا کی ہر مصروفیت کا کامیاب مقابلہ کر سکتا ہے۔ دوسرے ہندوستان کے لیے میں اپنی شاعری کے ایک ربع حصے کی قربانی دے سکتا ہوں۔

چوتھا مضمون "کچھ کلیم کے متعلق" ہے۔ جوش کہتے ہیں کہ ملک میں ذہنی انقلاب اُنہی افراد کے قلم پیدا کر سکتے ہیں جو خود بھی انقلابی ذہنیت کے حامل ہوں۔ لیکن ہندوستان میں ایسے ارباب قلم بہت کم ہیں جو اس معیار پر اتر سکتے ہوں۔ اپنے محدود وسائل اور نقصان کے باوجود یہ رسالہ چل رہا ہے کہ یہ میری روح کی آواز ہے۔ جب تک مجھ میں دم ہے یہ رسالہ چلتا رہے گا۔ بحیثیت مجموعی اس کتاب کا اگر جائزہ لیا جائے تو مرتب نے جوش کے زیادہ تر مقالے اس کتاب میں شامل کیے ہیں۔ "اشارات" کے بہت سے مقالے اس میں موجود ہیں۔ اپنی خطابت، بلند آہنگی اور طنزیہ اندازِ گفتگو کی توجیہہ جوش نے یہ کی ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کا مذہبی تعصب، سُستی اور بے حسی انہیں جوش خطابت پر اکساتی ہے اور ان کا لہجہ تلخ ہو جاتا ہے۔

اوراق جوش: مطبوعہ ۲۰۱۰ء

پہلے یہ کتاب ''جوش ملیح آبادی کی نادر و غیر مطبوعہ تحریروں کے عنوان سے ۱۹۹۲ء میں حیات اکیڈمی کراچی سید سفیر رضا نقوی پبلشر نے شائع کی۔ تحقیق و تدوین ڈاکٹر ہلال نقوی کی تھی لیکن کتاب صحیح طور پر ادبی حلقوں تک نہ پہنچ سکی جس کی وجہ سے محقق و مدون ڈاکٹر ہلال نقوی نے کئی اضافوں کے ساتھ اسے اظہار سنز لاہور سے طبع کروایا۔

کتاب ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ انتساب کراچی یونیورسٹی کے ڈاکٹر سید جعفر احمد اور الہ آباد یونیورسٹی کے ڈاکٹر علی احمد فاطمی کے نام ہے۔ اس میں خاکے، مضامین، کالم، نظمیں، خطوط اور تعزیت نامے موجود ہیں کیونکہ ہمارا موضوع مقالہ جات ہے اس لیے ہم اس کتاب میں طبع ہو جانے مضامین کا جائزہ لیں گے۔

پہلا مضمون ''الفاظ اور شاعر'' حصہ دوم ہے۔ یہ مدون کو راغب مراد آبادی سے دستیاب ہوا۔ یہ مضمون ''اشارات'' میں طبع ہو چکا ہے ہم اس پر بحث کر چکے ہیں۔

دوسرا مقالہ ''ابوالعالمین'' ہے۔ یہ شان الحق حقی سے (جو ترقیٔ اردو بورڈ کراچی میں جوش کے شریک کار تھے) دستیاب ہوا ہے۔ جوش کا یہ مضمون جوش کی فلسفیانہ فکر کی پیداوار ہے۔ جوش حیات اور کائنات کی گُتھیوں کو سلجھانے کی دھن میں ہیں۔ وہ ایک ایسے مثالی فرد کی خودی کو پورے نظام شمسی پر محیط کر کے اس کی ذات کو اُس بحر بیکراں میں جذب کرنا چاہتے ہیں جہاں اس کی عبدیت معبودیت کے درجے تک پہنچ جاتی ہے۔ صحتِ عقل سے اسے وہ شرف حاصل ہوتا ہے کہ اُس کے سر پر رحمۃ اللعالمین کا تاج رکھ دیا جاتا ہے اور وہ انسانِ کامل بن جاتا ہے۔ یہ انسان جو کہ ابن آدم ہے لیکن ابوالعالمین کا جس پر گماں ہوتا ہے جو کسی سے نفرت نہیں کرتا۔ یہ دانائے اسرار برائی سے شدید نفرت کے باوجود بروں سے نفرت نہیں کرتا کیونکہ اس کی انائے کلّی اس کرہ ارض ہی کو نہیں تمام انفس و آفاق اور نظام شمسی کا احاطہ کر لیتی ہے۔

جوش کے پیش نظر آپؐ کا نقشہ ہے۔ آپ جو کہ تمام کائنات کے لیے رحمت اللعالمین کا تاج سر پر سجا کر آئے۔ آپؐ نے دشمنوں کو معاف فرما کر ایک ایسی مثال قائم کی کہ صدیوں تک اس کی نظیر پیش کی جاتی رہے گی۔

''صبح دیر سے بیدار ہونے پر'' ایک ''رباعی'' اور طویل نظم حرفِ آخر سے ایک اقتباس ''ارتقاء کا اعلان''، ''سہانی سزائیں'' حصہ نظم میں آتے ہیں۔

''اگر مسلمانوں نے خودکشی کا عزم نہیں فرمالیا ہے!'' اس میں جوش مسلمانوں کی حالت زار کو دیکھ کر سخت فکر مند ہیں، ان کا حساس دل تڑپ تڑپ جاتا ہے کہ دنیا کی ہر متمدن قوم میں عالموں، تندرستوں، دولت مندوں، خوش کرداروں اور دانش مآبوں کا اوسط مسلمانوں کے مقابلے میں بڑھا ہوا ہے۔ ساڑھے تین سو برس سے جہالت، جرائم، افلاس، غیبت، دروغ بانی، حسد، نفاق، اختلاف اور عقلی بے مائیگی کے جراثیم نے مسلمانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور مسلمان دنیا کے ہر خطے میں زبوں حال ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ کچھ لوگوں نے اس زوال کی علت یہ بیان کی ہے کہ مسلمانوں نے شریعت کے اتباع سے روگردانی کر لی ہے۔ جوش کہتے ہیں کہ اگر شریعت کا اتباع ہی اس حیاتِ عارضی کی تمام مشکلات کا حل ہوتا تو حضرت سرور کائنات نہ تو مجلس شوریٰ قائم کرتے، نہ فوجوں کی بھرتی اور تنظیم ہی، نہ اسلحہ فراہم کیا جاتا نہ سفراء و اعمال ہی کا تقرر ہوتا اور نہ غزوات و ہجرت پر عمل ہی ہوتا اور صرف نمازوں، درودوں اور دعاؤں کی مدد سے اپنی حفاظت اور اسلام کی اشاعت کا ساز و سامان مہیا کیا جاتا۔ لیکن وہ افراد جو نفسِ پیغمبر اور روحِ قرآن سے واقف ہیں ان کے نزدیک شریعت کا اتباع نصف اسلام ہے۔ کل اسلام ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مسلمان قرآن اور مظاہر فطرت کا مطالعہ کریں۔ مستند تاریخوں کا مطالعہ کریں کہ اپنے دور عروج میں کس طرح اعتدال پر سختی سے قائم تھے۔ جوش نے مسلمانوں کے تابناک ماضی کے مختلف حصوں سے پردہ اٹھاتے ہوئے مسلمانوں کی کامرانیوں کو واضح کیا

ہے کہ بری، بحری برتری انہیں حاصل تھی۔ صنعت و حرفت، تجارت، کاروبار، زراعت و باغبانی، درآمد و برآمد اور سیر و سیاحت کو فروغ تھا۔ مساوات، عدل و انصاف، دیانت و امانت میں انہیں شہرہ حاصل تھا۔ فنونِ لطیفہ، طب، جراحت اور ادب کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔ ہیئت، نجوم، جغرافیہ، تاریخ میں ترقی بے مثال تھی۔ ارض و سما کی تسخیر کے لیے کام ہو رہے تھے۔ یورپ جس کی ترقی کی آج نظیر نہیں ملتی مسلمانوں کا خوشہ چین تھا لیکن آج مسلمان اپنی بدبختی کی بنا پر جدید تعلیم و نئی روشنی سے آنکھیں چُرا رہے ہیں۔ یورپ کے نشاۃ ثانیہ سے قبل مشرق و مغرب دونوں واقعات عالم کی تفسیر و تعبیر کی خاطر مصروفِ کار تھے۔ اسلامی فلسفۂ فطرت مغربی دنیا میں بھی عقلی بنیاد کا کام کرتا تھا لیکن جب یورپ پر لیوناڈو ڈوانچی اور بیکن کے سے چند غیر معمولی اربابِ فطانت نے اثر ڈالنا شروع کیا تو تعبیرات فطرت کے باب میں عربی تصورات کی صداقت معرضِ اشتباہ میں آگئی۔ قوانین فطرت کی جانچ پڑتال اسی جدید نہج سے شروع ہوگئی اور یہی طرز فکر تمام یورپ میں رائج ہو گیا۔ مسلمانوں نے تجسّس و تحقیقات کے واسطے اس راستے کا انتخاب کر لیا جو مغرب کے جدید جادہ فکر سے قطعی طور پر برعکس واقع ہوا تھا۔ مغرب حال کو جگا کر مستقبل کی طرف روانہ ہو گیا اور مشرق حال کو سُلا کر ماضی کی جانب روانہ ہو گیا۔ مغرب نے جدت پسندی اور عقل فروزی کو اپنا شعار بنا لیا اور مشرق نے قدامت پرستی اور عقل سوزی کی عبا دوش پر ڈال لی۔ معرب نے ترقی کرتے کرتے جوہری توانائی کا خیمہ نصب کر لیا اور مشرق تنزل کرتے کرتے ناتوانی کے بوریے پر بیٹھ گیا۔ ان تصورات نے یہ واضح کر دیا کہ ماضی کے ارباب علم عقلی دیو اور فکری ابوالہول تھے اور ہم سب علمی طالب علم مادر زاد تقلیدی بونے ہیں۔

آخر میں جوش مسلمانوں کو عقلی رویوں کو درست کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کارخانۂ عالم کا مستقبل سیاست پر نہیں فلسفہ وادب و سائنس پر مبنی ہے۔ اگر ان جوہر ثلاثہ پر مسلمانوں نے اقتدار حاصل کر لیا تو یہ کائنات ان کے قدموں میں جھک جائے گی اور قرآن کا وعدہ پورا ہو جائے گا کہ اگر مومن ہو تو اس زمین پر صاحب اقتدار بن کر رہو گے۔ اگر پاکستانیوں نے اپنے تمام مادی و ذہنی تصورات کو ابھی سے جدید ترین سانچوں میں ڈھالنا شروع نہیں کیا تو ان آنے والی قوموں کے صف آراء مسابقت خواہ ضرب واتصال میں بہت قلیل مدت میں سب کو پامال کر کے رکھ دیں گے اور اپنی جسمانی اور روحانی فلاح کے واسطے ایک پرورش گاہ فکر و قلم (اکادمی آف تھاٹس اینڈ لٹرز) قائم کر لو۔

جوش مسلمانوں کو ماضی کے فسوں کار دھندلکے میں سے نکال کر عقل کی رہنمائی میں آگے بڑھنے کا درس دے رہے ہیں اور انہیں مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے مشورہ دیتے دکھائی دے رہے ہیں۔

اس مقالے میں جوش قومی درد سے بے حال دکھائی دے رہ ہیں جو آنے والے دور کی تصویر لوگوں کو دکھا کر ان میں آگے بڑھنے کی لگن پیدا کر رہے ہیں۔ مذہب کی رہنمائی کا جو تصور مسلمانوں نے باندھا ہے جوش اس کی تعبیر نئی روشنی میں کرتے ہوئے انہیں عمل کی دعوت دے رہے ہیں۔ جوش کا رجائی انداز ان کی ترقی پسندی پر دال ہے۔

''اسلام ایک اصلاحی و انقلابی تحریک'' جوش کہتے ہیں کہ اسلام ادیانِ پارینہ کی مانند کوئی ٹونے، ٹوٹکے اور جادو گنڈے کا دین نہیں ہے۔ اسلام شدت کے ساتھ ایک اصلاحی و انقلابی تحریک اور ایک معاشرتی و مدنی تہذیب و تنظیم کا نام ہے۔ اسلام نام ہے حکمت کا، اس کا کوئی قول و فعل حکمت سے خالی نہیں ہے۔ خدائے حکیم نے مریض انسانیت کی شفا کے واسطے ایک نسخہ اوامر نواہی تحریر فرمایا ہے جس طرح دوا، پرہیز مقصود بالذات چیزیں نہیں بلکہ وسیلہ و ذریعہ ہیں اعادۂ صحت کا، بالکل اسی طرح اسلام کے تمام اوامر و نواہی، جملہ تکلیفات شرعیہ بھی مقصود بالذات چیزیں نہیں بلکہ وسیلہ و ذریعہ ہیں۔ آدمی کے انسان اور انسان کے صاحب خیر حد تک شریف ترین انسان بن جانے کے چونکہ تصور وحدانیت سے عظمت آدم اور وحدتِ نوع انسانی کی بنیاد پڑتی ہے اور چونکہ تصورِ شرک ایک ایسا زبردست گھن ہے جس کی ایک ضرب سے

عظمتِ آدم اور وحدتِ نوعِ انسانی کی عمارت ایک پل میں گر جاتی ہے اس بنا پر شرک بدترین گناہ قرار دیا گیا ہے اور اس کی سنگین ترین سزا تجویز کی گئی ہے۔ جوش اس مضمون میں وحدت نوع انسانی کے ایک مبلغ کے طور پر سامنے آئے ہیں۔

''خود کار پرورش گاہِ فکر و قلم پاکستان'' میں جوش امن دوستی، قانون نوازی، معاش کشائی، صحت افزائی، دفاع پناہی، تعلیم وروزی، ثقافت آرائی، لسان پروری اور فکر پروری کی پرورش کے لیے اولیائے عمل و نظر کو ایک مرکز پر جمع کر کے ایک قومی دماغی وقف National Brain Trust کی بنیاد ڈالیں اور اس کی نگرانی میں ایک کروڑ روپے کے سالانہ سرمائے سے ایک خود کار پرورشِ فکر و قلم پاکستان (Autonomous Academy of thoughts and letters) جلد از جلد قائم کر لے اور اسے مندرجہ ذیل دو شعبوں میں منقسم کر کے آغاز کار کی طرح ڈال دے۔ (الف) شعبۂ صحتِ عقل (ب) شعبۂ وسعت زبان۔ جوش نے ان دونوں شعبوں کے فرائض متعین کیے ہیں۔ چیدہ چیدہ فرائض درج ذیل ہیں۔ (الف) شعبۂ صحتِ عقل کے فرائض۔

عظمت عقل، تربیت عقل، ذکاوتِ بے لگام کے بے لگام دھانے پر سلیم عقل و دقیق۔ فکر کی خاردار لگام لگانا، خیر العمل، تیقن و تجسّس، عمل گاہ بنانا، وظائف مقرر کرنا، تولیت تعلیمات، علمی و فنی ریسرچ بورڈ قائم کرنا، ادارہ ثقافت، اقوام سے روابط پیدا کرنا، ایک خاص دارالترجمہ قائم کر کے صرف سائنس اور فلسفے کی کتابوں کا ترجمہ کرنا، فنونِ لطیفہ اور فلم کو فروغ دینا، اخلاق اور اقدار، خیر و شر کے مسئلے پر نظر ڈالنا، شخصیت کو اجالنا، کردار میں تخلیق و تہذیب کے واسطے انسان میں راست اندیشی پیدا کرنا، نشر و اشاعت کے ذریعے ادب کی معرفت دقیق افکار، صحیح گفتار اور کردار پیدا کرنا۔

شعبۂ وسعت زبان کے فرائض میں فرہنگ ادبیات فراہم کرنا، زبانوں میں ملکی اور غیر ملکی فرہنگ پیدا کرنا، فرہنگ تضادات و توافقات، فرہنگ مہندات، لغت مرکبات کی تدوین کرنا، سیاسی تجارتی زبان، صحافت کی درس گاہیں قائم کرنا، خطابت کی تعلیم دینا، دائرہ معارف کا مرتب کرنا، جدید سائنٹفک گرائمر بنانا، تاریخ و تذکرہ مدون کرنا، رسم الخط وضع کرنا، تمام علاقائی زبانوں کی ترقی و توسیع کی خدمت انجام دینا، لسانی ریسرچ کا محکمہ قائم کرنا، لسانی مکتب خانہ قائم کرنا، ادارۂ تصنیف و ترجمہ قائم کرنا، دارالضرب قائم کرنا، انتخاب و تدوین کا ادارہ قائم کرنا، نشر و اشاعت کا محکمہ قائم کرنا۔

جوش نے 1960ء کے اس مقالے میں جو تجاویز پیش کیں ان میں سے بہت سی تجاویز کو عملی جامہ پہنایا جا چکا ہے اور یہ اکیڈمی بھی قائم ہو چکی ہے۔ جوش نے اس مقالے میں جس ذہنی پختگی کے ساتھ اپنا مطمع نظر پیش کیا ہے وہ ان کی بالغ نظری کو ظاہر کرتا ہے۔

اگلا مضمون ''دیباچہ سیف و سبو ہے'' یہ دیباچہ جوش نے اپنی کتاب ''سیف و سبو'' کے لیے تحریر کیا تھا جو کہ مکتبۂ اردو لاہور سے ۱۹۴۷ء میں پہلی بار طبع ہوئی۔ اس کتاب میں جوش نے انتقاد کی تین اقسام بیان کی ہیں۔ تخیلی انتقاد، تخریبی انتقاد اور تحقیقی انتقاد، جوش نے وضاحت کی ہے کہ اب تک شائع ہونے والی تقریباً تمام کتابوں کا انتخاب انہوں نے اس میں شامل کیا ہے۔ کن کن احتیاطوں کو ملحوظ خاطر رکھ کر انہوں نے اس انتخاب کو عملی صورت دی ہے۔

''کچھ اپنے بارے میں'' اس مقالے میں جوش نے اپنے بارے میں بتایا ہے کہ ان کی طبیعت کس قسم کی ہے۔ اعتقاد و عقائد کے لحاظ سے مزاج کیسا ہے۔ اگر آپ کو روئے زمین کے تمام اکابر و اقطابِ فکر کی دل سے عزت منظور ہے اور سقراط، ارسطو، بیکن، اپی نورا، والٹیئر، ہیوم، شوپنہار، کانٹ، برگساں، نٹشے اور برٹرنڈرسل کو دل سے پسند کرتا ہوں لیکن محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات ہی کچھ اور ہے۔ جوش کہتے ہیں کہ آج تک اس روئے زمین پر آپؐ سا انسان نہیں آیا۔ مقامِ شاعری کے بارے میں یہ بات ہے کہ نو برس کی عمر میں شاعری کی دیوی مجھ پر مہربانی ہوئی اور میں نے اقلیم سُخن میں قدم رکھ دیا۔ جوش نے اپنے مزاج اور اپنی شعری برتری کو مزاح کے پیرائے میں ہلکے پھلکے انداز میں بیان

کیا ہے۔ جوش کا یہ مضمون ڈاکٹر ہلال نقوی کو جوش کی صاحبزادی سعیدہ خاتون سے حاصل ہوا۔ ۱۹۷۰ء میں یہ مضمون تحریر کیا گیا جبکہ ۱۹۷۷ء میں طبع ہوا۔

"تنگنائے غزل" جوش نے یہ مضمون ۱۹۵۸ء میں ریڈیو پاکستان کراچی میں پڑھا اور اگست ۱۹۵۸ء میں "ماہ نو" میں طبع ہوا۔ جوش نے اس مضمون میں غزل سے متعلق اپنے اُن خیالات کو دلائل و براہین سے ثابت کیا ہے جو غزل کی مخالفت میں ہیں۔ غزل کے بارے میں یہ خیالات جوش کے ابتدائی دور میں ہی مرتب ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب "اشارات" میں بھی غزل کی مخالفت میں مضمون لکھا تھا۔ یہ مضمون بھی جوش کے انہی خیالات کا اعادہ ہے۔ جوش کے نزدیک غزل ایک غیر فطری اور غلط صنف کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔ اگرچہ ابتدائی دور میں جوش نے خود بھی غزلیں کہی ہیں۔ بعد میں جوش نظم نگاری کی طرف راغب ہو گئے۔ پہلے پہل جوش نے اپنے ماہنامے "کلیم" میں غزل گوئی کی مخالفت میں آواز اٹھائی اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ آواز توانا ہوتی چلی گئی۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ شاعر کے کردار اور کلام میں ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ ریاض خیر آبادی نے زندگی بھر شراب چکھی نہیں لیکن ان کی شاعری خُمریات کی شاعری ہے فطری شاعر کے کلام میں جگ بیتی آٹے میں نمک کے برابر ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ نمک میں آٹے کے برابر ہو جائے۔ جس نے شراب نہ چکھی ہو وہ اس کا ذائقہ اس کی تاثیر اور کیفیت کے بیان سے قاصر ہے۔ اسی طرح حضرت امیر احمد صاحب مینائی بہت متقی اور پرہیز گار خانوادے سے تعلق رکھتے تھے اور خود بھی ان کا تقشف اور تقدس اس قدر تھا کہ زندگی میں کبھی ایک بار بھی زنانِ بازاری کا کوٹھا نہ دیکھا تھا لیکن ان کی غزلوں میں بازاری عورتوں، بداطوار لڑکوں کے لچھنوں اور شاہد پرستی کے نعرے گونجتے محسوس ہوتے ہیں۔ اسی طرح عشق مشرب رند پیشہ شخص مسائل تصوف و ایمان کے دریا بہاتا دکھائی دیتا ہے۔ جوش نے پہلے کے غزل کے شاعروں اور اب کے غزل گو شاعروں کا موازنہ بھی کیا ہے۔ جوش لکھتے ہیں۔

> "اگر یہ قول صحیح ہے کہ شاعری اپنے زمانے کی موزوں اور شیریں تاریخ اور شاعری شخصیت کا ایک کھنکتا ہوا افسانہ اور خود نوشت حیات نامہ ہوتی ہے تو اس قول کی روشنی میں جب ہم اپنے دواوین کی ورق گردانی کرتے ہیں تو ایک زبردست شرمندگی اور عظیم مایوسی ہمارا احاطہ کر لیتی ہے اور ہمیں یہ جرأت نہیں ہوتی کہ ہم دنیا کی عظیم شاعری اور دنیا کے عظیم شاعروں کے روبرو اپنی غزل کی اوچھی پونجی کو پیش کریں جو خوردہ اندیشی و خوردہ فروشی کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں رکھتی ہے۔(۵۷)

اس کے بعد محقق نے جوش کے نو عدد خطوط درج کیے ہیں جن کے مکتوب الیہ میں بیٹی سعیدہ خاتون، نواسہ سراج انور، ڈاکٹر ہلال نقوی، ڈاکٹر رالف رسل، علامہ جمیل مظہر، باباذہن شاہ تاجی، راغب مراد آبادی، میاں ممتاز دولتانہ اور خورشید علی خاں شامل ہیں۔ خطوط کا جائزہ مکتوب نگاری میں لیا جا چکا ہے۔

مکالمہ مابین شبیر حسن خاں اور جوش ملیح آبادی ۱۲ فروری ۱۹۷۵ کو جوش نے یہ مکالمہ تحریر کیا اور ڈاکٹر ہلال نقوی کو خورشید علی خاں سے یہ مکالمہ دستیاب ہوا۔ مکالمات کے تحت اس مکالمے کا جائزہ لیا جائے گا۔

اگلا مضمون "متحدہ اردو محاذ کراچی کے جلسے سے خطاب" ہے۔ یہ مضمون ڈاکٹر یاور عباس سے ڈاکٹر ہلال نقوی کو ملا۔ جوش ملیح آبادی نے متحدہ اردو محاذ کو خوش آمدید کہا ہے کہ کوئی تو ایسا ہے جو اردو کی حمایت کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ جوش اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لیے عمر بھر کوشاں رہے اور اس مقصد کے لیے انہوں نے ہندوستان سے پاکستان ہجرت بھی کی۔ اردو کی ترقی کے لیے انہوں نے چند سفارشات مرتب کی ہیں چند درج ذیل ہیں۔

(۱) حکومت کو مجبور کیا جائے کہ جلد از جلد اردو کو دفتری زبان کا درجہ دے۔

(۲) ایک دارالترجمہ و تصنیف قائم کر کے اعلیٰ تصنیفات کے ساتھ ساتھ دنیا کے تمام علوم اور تمام اصطلاحوں کا اردو میں ترجمہ کرایا جائے۔

(۳) ایک قاموس الاغلاط کو مرتب و مدون کیا جائے۔

(۴) جدید مفردات و مرکبات کی تعمیر کی جائے۔

(۵) فلموں، رسالوں، اخباروں، جلسوں، جلوسوں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے سے اردو کو فروغ دیا جائے۔

اگلا مضمون ''غیر مرتب (محاورے و معنی)'' ہے۔ اس کا جائزہ بعد میں محاورات میں لیا جائے گا۔

اس کے بعد چند تعزیت نامے ہیں جو علامہ رشید ترابی کی وفات پر، نواسی صبوحی خاتون کی بیوگی پر اور حسرت موہانی کی وفات پر لکھے گئے۔

چند خاکے ہیں جن میں سے کچھ تاثراتی نوعیت کے ہیں۔ پریم چند، جلال لکھنوی، میر بارق لکھنوی، میرزا محمد ہادی رسوا، بلبل پاکستان ڈاکٹر عالیہ امام، سید محمد عسکری، بابا ذہین شاہ تاجی اور فانی مرحوم کے خاکے ہیں جن کا جائزہ ہم خاکہ نگاری کے حوالے سے لے چکے ہیں۔

ایک اور مقالہ ''رباعی کے متعلق'' ہے۔ جوش کہتے ہیں کہ قلیل الفاظ کی وساطت سے کثیر معانی کا احاطہ کر کے صرف چار مصرعوں میں اس ربع سکول کے تمام تجربات، تاثرات، نظریات اور افکار کا سمیٹ لینا رباعی ہے۔ رباعی ہر شاعر کے بس کا روگ نہیں ہے۔ جوش نے رباعی کہنا حیدر آباد سے شروع کیا تھا۔ عمر چالیس سال نہیں ہوئی تھی۔ اس عمر تک جوش نے تقریباً چار سو رباعیاں کہی تھیں جو رومان میں زیادہ اور فکر میں کم تھیں جو دستبرد زمانہ ہو گئیں اس کے بعد تین سو رباعیاں جو قطع و برید کے بعد طبع ہونے کے لیے تیار تھیں، چوری ہو گئیں۔ جوش نے یہ مقالہ اپنی رباعیوں کے مجموعے ''قطرۂ و قلزم'' کے دیباچے کے لیے لکھا تھا جو پاکٹ سائز ایڈیشن میں سٹار پبلی کیشنز، دریا گنج دہلی سے ۱۹۶۳ء میں طبع ہوئی۔ اس میں طبع ہونے والی رباعیاں پہلے کہیں طبع نہیں ہوئیں۔ جوش نے نقادانِ سخن کو دعوت دی ہے کہ اگر انہیں ان میں کچھ عیب دکھائی دیں تو ضرور مطلع فرمائیں مگر یوپی کے نقادوں سے معذرت جو اپنے اہل وطن پر کیچڑ اچھالنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

''چند سطریں'' کے عنوان سے جوش نے کچھ ایسی باتیں لکھی ہیں جو ان کے دل کو بھائی ہیں ہو سکتا ہے کہ کسی اور کو جوش سے اتفاق نہ ہو مگر ہر شخص کی اپنی نظر اور اپنا نظریہ ہے۔

''اجزاو عناصر'' اس مضمون کو جوش نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے کو ''متعلقات بشریٰ'' کا نام دیا ہے اور دوسرے کو ''حواس خمسہ'' کا نام دیا ہے۔ پہلے حصے میں انسانی اعضاء بیان کیے گئے ہیں اور دوسرے میں حواس خمسہ کے تحت اعضاء کو جو جو نام دیئے گئے ہیں، ان کا بیان ہے۔ جوش نے ایک ایک عضو کے حوالے سے اس کے کئی کئی نام درج کیے ہیں۔

''آخری زمانے کی ایک تحریر'' ابتداء ایک رباعی سے ہوتی ہے جس کا یہ شعر بہت مشہور ہے کہ ''جوش آؤ کہ منتظر ہے بزمِ ارواح، آیا، یارانِ رفتہ، آیا آیا۔'' جوش یہاں عمر کی آخری سیڑھی طے کر رہے ہیں اور موت کا ہر دم انتظار۔ کہتے ہیں کہ شائد عزرائیل کو اللہ تعالیٰ نے میرے گھر نہ آنے کا حکم دے دیا ہے۔ جو لوگ دم بھرا کرتے تھے اب مڑ کر بھی نہیں دیکھتے۔ مایوسی کی انتہا ہے کہ جوش دشنام طرازیوں پر اتر آئے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر ہلال نقوی کو سراہ رہے ہیں جو ان سے ملنے آتے ہیں۔ کراچی کے زمانہ قیام میں جب پروفیسر مجتبیٰ حسین نے جوش سے ان کو ملوایا تھا۔ وہ جوش کے نواسے کو بلا معاوضہ اردو پڑھاتے اور جوش سے اصلاح لیتے۔ اپنی شاعری پر یہاں جوش آزاد نظم سے نالاں دکھائی دیتے ہیں اور ڈاکٹر ہلال نقوی کی آزاد نظم کی طرف رغبت کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"آزاد نظم ان تساہل پسند ضعیف اذہان کی پیداوار ہے جنہیں الفاظ کے صرف پر قدرتِ کامل نہیں ہے اور جو وزن و بحر کے کوزے میں تجربات واحساسات کے سمندر کو سمیٹ لینے کا جوہر نہیں رکھتے۔(۵۸)

آخر میں جوش اعتراف کرتے ہیں کہ یہاں ہلال نقوی میں بڑی صلاحیتیں ہیں لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ تجربات واحساسات کی بھٹی میں اپنے دل و دماغ کو اس قدر تپالیں کہ اُن کے حرف حرف سے آفتاب فن طلوع ہونے لگیں۔ جوش جوہر قابل کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور ان کی قدر شناس نظروں نے ہلال نقوی کو ڈاکٹر ہلال نقوی بنتے دیکھ لیا تھا۔ نیز ایک رومانی کی طرح جوش بار بار اپنے شاندار ماضی کی طرف مراجعت کر لیتے تھے۔

"صفیہ شمیم کی رباعیات" اگلا مقالہ ہے جو جوش نے صفیہ شمیم کی کتاب "گریہ تبسم" پر اظہار خیال کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔ صفیہ شمیم جوش کی بہن انیس جہاں بیگم کی صاحبزادی ہیں۔ گھر کی تمام خواتین کو شعر و ادب سے لگاؤ تھا۔ یہ شدت احساس ہے جس نے صفیہ سے یہ رباعیاں لکھوائی ہیں۔ ٹھوس تجربات، عمیق مشاہدات اور حکیمانہ مطالعہ حیات رباعی کی خصوصیات ہیں۔ اگرچہ شمیم کی عمر کم ہے لیکن پھر بھی اس کے تجربات نے رباعی کو ایک خوبصورت نکھار بخشا ہے۔ جوش کا یہ مضمون نومبر ۱۹۵۱ء میں طبع ہوا۔ جوش نے خاندان کے ادبی ذوق کے تناظر میں صفیہ شمیم کے مزاج کو بیان کیا ہے۔ "شاعری کا مستقبل" ایک اور مقالہ ہے۔ جوش کا موقف ہے کہ اردو شاعری کو بڑی شاعری اس لیے نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ہماری زبان میں حقیقی شاعری بہت کم ہوتی ہے۔ عام طور پر غزل ہی کو شعر سمجھ لیا جاتا ہے اور اسی تناظر میں شاعری کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ چند گنے چنے شاعروں کے سوا کسی شاعر کو شہرت عام بقائے دوام حاصل نہیں ہوئی۔ نظیرا کبر آبادی جیسے بے مثال شاعر کو بھلا دیا گیا۔ مجاز خودکشی کر چکا فیض کے بارے میں جوش کا نقطہ نظر خالص اپنا ہے۔ وہ رومان سے سیاست کی طرف آئے۔ جوش کے بقول ناموری کی تمنا نے فیض کو خراب کر دیا۔ داغ جیسے شاعر کو بھلا دیا گیا۔ شاعری میں سائنس اور فلسفے کو بھی موضوع بنایا جا رہا ہے۔ جوش کہتے ہیں میری شاعری پہلی شاعری سے بالکل مختلف ہو گئی ہے۔ عقل کی بات کرو تو لوگ کہتے ہیں کڑک ہو گیا ہے۔ حسن وعشق کی بات ہو تو لوگ کہتے ہیں زندہ ہو گیا ہے۔ زبان کا انحطاط شاعری کا انحطاط ہے۔ جوش اس مقالے میں عقل کی فضیلت کو سامنے لا رہے ہیں جس کے تحت زمین سے آسمان تک اسی کی حکمرانی ہے۔ شاعری عقل کا راستہ اختیار کرے گی تو پھلے پھولے گی۔

"کچھ اردو کے باب میں" اس مقالے میں جوش نے اردو زبان کی ابتدا اور اس کی ترقی و ترویج میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا حصہ اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے۔ اس زبان کی بدقسمتی ہے کہ مسلمانوں کے ادبار میں پیدا ہوئی۔ معاشرتی، معاشی یا فکری اور علمی انحطاط کا دور دورہ تھا۔ تن آسانی اور عیاشی کا زہر پھیلا ہوا تھا اور ارباب علم وادب اس کو عربی و فارسی کے مقابلے میں قابل اعتناء نہ سمجھتے تھے۔ لیکن تقاضائے محکم کی پیداوار یہ زبان کارخانوں، چھاؤنیوں، بازاروں، منڈیوں، گلی کوچوں اور میلوں ٹھیلوں میں بولی جاتی رہی۔ شعراء وصوفیا نے اسے پروان چڑھایا۔ عشق حقیقی و مجازی کی اصطلاحیں اس میں وضع ہوئیں۔ لیکن ہماری زبان عالمانہ الفاظ، محققانہ طرز بیان اور مجتہدانہ انداز کلام تک رسائی حاصل نہ کر سکی۔ جوش جدید دور کے نظریات کو جب مد نظر رکھتے ہیں تو انہیں اپنے شعری و نثری سرمائے میں کچھ ایسا نہیں ملتا کہ وہ فخر سے گردن اکڑا سکیں۔ موجودہ زمانہ میں تراجم کی معرفت کچھ علوم اور شعری میدان میں تخلیقی و فکری ادب کا کچھ پرتو دکھائی دے رہا ہے۔ جوش مشورہ دے رہے ہیں کہ تعلیم عام کی جائے، نصاب عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہو، دارالترجمہ و تصنیف قائم کیا جائے۔ جدید فرہنگ مدون کی جائے۔ کتب خانے قائم کیے جائیں، اقطاب علم و امامان ادب کو فکر معاش سے آزاد کر کے تخلیقی کاموں کی آزادی دی جائے اور ان کی کتابوں کی طباعت کا انتظام کیا جائے۔

"پبلک ہائی سکول کینٹ کراچی میں بچیوں سے خطاب" اپنی اس تقریر میں جوش نے بچیوں کو خراج تحسین پیش کیا ہے جن کے لہجے، نشست و برخواست کے طریقے اور جن کی خاموش نظریں ایسے مدرسے ہیں جن کے سانچے میں ڈھل کر نئی نسلیں پروان چڑھیں گی۔ اس لیے اپنی اس کمسنی کو غنیمت جانو اور آئندہ زمانے کے لیے تیار ہو جاؤ، علم حاصل کرو، تمہاری نزاکت میں وہ سختی ہے جو بچوں کی فطرت کے لوہے کو گلا ڈالتی ہے۔ اگر تم نہ ہوتیں تو یہ کرۂ ارض تاریک رہتا۔ انسانیت، شرافت اور شاعری کو فروغ حاصل نہ ہوتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ آج تک کسی عورت نے پیغمبری کا رتبہ حاصل نہ کیا لیکن میں کہتا ہوں کہ اُس کو پیغمبری کی حاجت کیا ہے جس کو جوہر تخلیق بخش کر خدائی منصب عطا کیا گیا ہے۔

جوش بچیوں کو آنے والے زمانے کی جھلک دکھا رہے ہیں جب یہی بچیاں بڑی ہو کر ایک خاندان اور ایک نسل کا بار اُٹھائیں گی اور ان کی گودوں میں پل کر جوان ہونے والے اپنے ملک و قوم کی تعمیر و ترقی کے لیے کوشاں ہوں گے۔

"الفاظ اور شاعر" حصہ اوّل اشارات میں طبع ہو چکا ہے۔

جوش ملیح آبادی کے مقالات میں ہمیں انشائیہ نگاری خصوصاً ادب لطیف کے قابل ذکر نمونے بھی ملتے ہیں اور مضمون نگاری کی بیشتر خصوصیات سے مزین تحریریں بھی۔ لیکن کہیں منطقی انداز غالب ہے اور کہیں خطابت کا انداز چھایا ہوا ہے۔ کہیں کہیں طنز اور تمسخر کا انداز بھی دکھائی دیتا ہے لیکن جوش کی اردو، مسلمانوں اور پاکستان سے محبت کا احساس بھی قدم قدم پر محسوس ہوتا ہے اور تقسیم سے قبل ہندو مسلمانوں کو مل کر آگے بڑھنے کا ناصحانہ انداز مقالات کی شگفتگی سلب کرنے کا سبب بھی بنتا ہے۔ جوش کی تحریر میں یعنی بیک وقت "ایسے" اور "انشائیہ" دونوں میں جذبہ فکر کے ساتھ آمیز ہو کر سامنے آتا ہے اسی لیے محسوسات اور سوچ کے وسیع تر امکانات سامنے لاتا ہے۔ ساتھ ہی لفظیات اور انشایہ نگار کے برتاؤ کی بہت مربوط صورت جوش کے انشائیوں میں ملتی ہے۔ جوش نے اپنے ارد گرد پھیلے ماحول کو کسی حد تک ہموار سطح سے دیکھا ہے لیکن کہیں احساس برتری نے ان کے مضامین کو طنزیہ کر دیا ہے اور وہ انشائیہ کو متوازن صورت دینے سے قاصر رہے ہیں۔ کہیں کہیں مضامین کی علمیت اور بقراطیت نے خالص مقالے کا انداز پیدا کر دیا ہے۔

جوش ملیح آبادی نے مختلف ادبی، سیاسی، معاشی، سماجی اور مذہبی موضوعات پر اپنے مخصوص انداز میں اپنے افکار کو پیش کیا ہے۔

مذہب، اخلاق، ادب اور سماج جوش ملیح آبادی ہر موضوع پر معلومات رکھتے ہیں اور انہیں بیان کرنے میں پس و پیش سے کام نہیں لیتے۔ ان کی تنقیدی آراء ان کی اپنی فکر اور آزادہ روی کا نتیجہ ہیں۔ ان کے افکار و خیالات بیسویں صدی کے بدلتے ہوئے منظر نامے کے عکاس ہیں۔ ان کے تنقیدی تجزیے فکری روایات و نظریات سے قطع نظر حقائق کے ادراک پر مبنی ہیں۔ وہ اپنے دور میں ہونے والی تبدیلیوں کو بیان کرتے ہیں اور اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں بحث کرتے ہوئے بات سے بات پیدا کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کے بعض نظریات لوگوں کے نزدیک قابل قبول نہیں لیکن وہ بلا کسی خوف کے اپنی بات کہہ کر دم لیتے ہیں۔ غزل کے بارے میں اُن کے خیالات، ہندوستانی شاعروں اور عاشقوں کے بارے میں ان کی سوچ، ہندوستانی لوگوں کے عقائد و نظریات اور عقل کی جبلت اور وجدان کی بجائے حکمرانی، عشق پر عقل کو ترجیح یہ سب ایسی باتیں ہیں جنہوں نے جوش کو منفرد بنایا ہے۔ خاص طور پر مناظر فطرت یا قدرت کی محبت میں، انسانیت کو اولیت دینا، سب ایسے تصورات ہیں جہاں تنقیدی نظریات اور مقصدی و اصلاحی تصورات کی بنا پر ہم انہیں سرسید اور حالی کے اسلوب کے پرستار کہہ کر بلا سکتے ہیں۔ غزل کے حوالے سے تنقید کرتے ہوئے وہ حالی کے پرتو دکھائی دیتے ہیں۔ "مقدمہ شعر و شاعری" میں حالی نے جن خیالات کو ظاہر کیا۔ جوش ان کا اعادہ کرتے ہیں وہ اپنے عہد میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو نہ صرف قبول کرتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اس تبدیلی کے خیر مقدم کا کہتے ہیں۔ ادب اور جمالیات کے حوالے سے ان کا نقطہ نظر بڑا منطقی اور مدلل ہے۔ تاریخی و سماجی شعور اور ژرف نگاہی ان کے اسلوب کی کئی پرتوں کو کھولتے ہیں۔

باب سوم: مقالہ نگاری۔ حوالہ جات و حواشی

(۱) رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، اصنافِ ادب، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۴۸

(۲) حامد حسن قادری، مولانا داستانِ تاریخ اردو، سندھ، اردو اکیڈمی، تیسرا ایڈیشن، ۱۹۶۶ء، ص ۳۸

(۳) اظہر زیدی، مرتب، متاع ادب، لاہور، مکتبہ میری لائبریری، جنوری ۱۹۶۵ء ص ۲۱

(۴) سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، جلد چہارم، لاہور، مکتبہ حسن، سہیل لمیٹڈ، اردو بازار، طبع اوّل، ۱۹۰۱ء طبع سوم پاکستان میں پہلی اشاعت مرتبہ خورشید جہاں ایم اے ص ۳۴۵

(۵) بحوالہ سیدہ جعفر، ڈاکٹر، اردو مضمون کا ارتقاء، ۱۹۵۰ء تک، حیدر آباد، بھارت، نیشنل فائن پرنٹنگ پریس ۴ کمان حیدر آباد، ۱۹۷۲ء ص ۱۰

(۶) بحوالہ طیبہ خاتون، ڈاکٹر، اردو میں ادبی نثر کی تاریخ ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء، شعبہ اردو، کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی، اردو اکادمی دہلی، اپریل ۱۹۸۹ء، ص ۸۱۔۸۰

(۷) سیدہ جعفر، ڈاکٹر، اردو مضمون کا ارتقاء ۱۹۵۰ء تک، ص ۱۰

(۸) سلیم اختر، ڈاکٹر، ایسے مغرب میں، نقوش سالنامہ، جون ۱۹۸۵ء شمارہ، ۱۲۲، ص ۱۷۵۔۱۷۶ (فٹ نوٹ میں وضاحت)

(۹) بحوالہ بشیر سیفی، ڈاکٹر اردو میں انشائیہ نگاری، لاہور، نذیر سنز پبلشرز، طبع اول ۱۹۸۹ء ص ۱۴۔۱۵

(۱۰) سیدہ جعفر، ڈاکٹر، اردو مضمون کا ارتقاء ۱۹۵۰ء تک، ص ۲

(۱۱) An introduction to study of English literature, by W.H. Hudson, page No 331.

(۱۲) رضی عابدی، پروفیسر، تیسری دنیا کا ادب، مکتبہ فکر و دانش، ۱۸اے مزنگ روڈ، لاہور، ۱۹۸۸ء صفحہ نمبر ۴۵

(۱۳) بحوالہ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، مضامین سرسید، منتخبات تہذیب الاخلاق، ترتیب و مقدمہ، مکتبہ خیابان ادب، لاہور، جنوری ۱۹۶۷ء، ص ۱۱

(۱۴) بحوالہ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، مضامین سرسید، منتخبات تہذیب الاخلاق، ترتیب و مقدمہ مکتبہ خیابان ادب، لاہور، جنوری ۱۹۶۷ء، ص ۱۱

(۱۵) بحوالہ تسنیم اختر، سرسید کی مضمون نگاری، مقالہ ایم اے اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، غیر مطبوعہ، ۱۹۷۰ء ص ۱

(۱۶) سلام سندیلوی، ڈاکٹر، ادب کا تنقیدی مطالعہ، مکتبہ میری لائبریری، طبع چہارم ۱۹۷۱ء ص ۲۰۴

(۱۷) نظیر صدیقی، پروفیسر، ادبی جائزے، الوقار پبلیکیشنز، لاہور ۱۹۹۷ء ص ۸۵

(۱۸) طیبہ خاتون، ڈاکٹر، اردو میں ادبی تاریخ، ۱۷۵۷ء تا ۱۹۱۴ء، ۳۲۱ گلی گڑھیا، جامع مسجد دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۸۳

(۱۹) گارساں دتاسی، گارسان دساسی کے تمہیدی خطبے مشمولہ ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں) محمد عتیق صدیقی، علی گڑھ، انجمن ترقی اردو (ہند) دسمبر ۱۹۵۷ء بار اوّل، ص ۳۲۹

(۲۰) ضیاء الحق۔ مضمون نویسی، مشمولہ مخزن، لاہور، ستمبر ۱۹۰۱ء جلد نمبر ۶ ص ۳۱

(۲۱) عبدالحلیم شرر، مضامین شرر، جلد اول، حصہ دوم، شاعرانہ و عاشقانہ مصامین، مبارک علی اینڈ سنز، لاہور، س ن، ص ۱۲۰

(۲۲) اظہر زیدی، متاع ادب، مرتبہ، مکتبہ میری لائبریری، جنوری ۱۹۶۵ء ص ۲۲۔۲۳

(۲۳) Cynthia Ozick, the best American essays, Edited by Robert Atwan, Boston, Now York, Houghton Mhiffer company 2008-P26

(۲۴) محمد حسن، ڈاکٹر، اردو میں رومانوی تحریک، ملتان، صدر، کاروانِ ادب، اشاعت ۱۹۸۶ء ص ۳۲۔۳۳
(۲۵) خورشید اسلام، ڈاکٹر، نقوش طنز و ظرافت نمبر ۷۱۔۷۲، مرتب محمد طفیل، لاہور، ادارہ فروغ اردو، ۱۹۸۹ء دوسرا ایڈیشن، ص ۱۸
(۲۶) جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، ۱۹۷۰ ص ۲۶۶
(۲۷) محمد حبیب اللہ رشدی، جوش حیدر آباد دکن میں، مشمولہ افکار جوش نمبر پہلا ایڈیشن ۱۹۶۱ء ص ۷۷
(۲۸) جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، ص ۱۶۹
(۲۹) جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، ص ۲۷۰
(۳۰) اکبر الہ آبادی کی رائے، مشمولہ روح ادب، طبع ثانی، لاہور، مکتبہ اردو، ۱۹۴۲ء ص ۵
(۳۱) عبد الحق، ادبی تبصرے، طبع دوم، لکھنؤ، دانش محل، ۱۹۶۴ ص ۲۰۵
(۳۲) آلِ احمد سرور، جوش کی نثر نگاری، مشمولہ درس، علی گڑھ، اپریل مئی ۱۹۵۶ ص ۱۵
(۳۳) بشیر سیفی، ڈاکٹر، اردو میں انشائیہ نگاری، لاہور، نذیر سنز پبلشرز، ۱۹۸۹ء ص ۱۶۳
(۳۴) جوش ملیح آبادی، روح ادب، لاہور، مکتبہ اردو، ۱۹۴۲، ص ۱۵۹
(۳۵) جوش ملیح آبادی، روح ادب، لاہور، مکتبہ اردو، ۱۹۴۲، ص ۶۰۔۱۵۹
(۳۶) عبد الودود خان، ڈاکٹر، اردو نثر میں ادب لطیف، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، ستمبر ۱۹۶۷، ص ۵۴۔۳۵۳
(۳۷) جوش ملیح آبادی، مقالاتِ زریں، لکھنؤ ۱۹۲۱ء ص ۳
بحوالہ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی، شخصیت اور فن، اسلام آباد، اکادمی ادبیات، پاکستان ۲۰۰۷، ص ۱۵۵
(۳۸) جوش ملیح آبادی، مقالاتِ زریں، لکھنؤ ۱۹۲۱ء ص ۳
بحوالہ ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی، شخصیت اور فن، اسلام آباد و اکادمی ادبیات، پاکستان ۲۰۰۷، ص ۱۵۶
(۳۹) جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، کراچی، جوش اکیڈمی ۱۹۷۰ء ص ۳۸۶
(۴۰) جوش ملیح آبادی، اشارات، دلّی، نگارستان ایجنسی، ۱۹۴۲ء ص ۱۱۶
(۴۱) جوش ملیح آبادی، اشارات، دلّی، نگارستان ایجنسی، ۱۹۴۲ء ص ۵
(۴۲) جوش ملیح آبادی، اشارات، دلّی، نگارستان ایجنسی، ۱۹۴۲ء ص ۸
(۴۳) بشیر سیفی، ڈاکٹر، اردو میں انشائیہ نگاری، لاہور، نذیر سنز پبلشرز، ۱۹۸۹ء ص ۱۶۸۔۱۶۷
(۴۴) جوش ملیح آبادی، اشارات، ص ۴۷
(۴۵) جوش ملیح آبادی، اشارات، ص ۱۰۶
(۴۶) عبد الماجد دریا آبادی، صدق، لکھنؤ، جلد اول نمبر ۳۱، لکھنؤ، ۱۱ مارچ ۱۹۳۶ء
(۴۷) فضل امام، ڈاکٹر شاعر آخر الزماں، جوش ملیح آبادی، دہلی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۲ء ص ۱۷۲
(۴۸) جوش ملیح آبادی، اشارات، ص ۱۲۲
(۴۹) جوش ملیح آبادی، اشارات، ص ۱۲۵، ۲۳
(۵۰) جوش ملیح آبادی، اشارات۔ ص ۱۳۴

(۵۱) جوش ملیح آبادی، اشارات۔ ص ۴۴۔۱۴۳

(۵۲) جوش ملیح آبادی، اشارات۔ ص ۱۵۴

(۵۳) جوش ملیح آبادی، اشارات۔ ص ۱۶۹۔۱۶۸

(۵۴) جوش ملیح آبادی، اشارات۔ ص ۱۹۴

(۵۵) سحر انصاری، مرتب، مقالات جوش، کراچی، اردو محل پبلشرز بک سیلرز، ۱۹۸۲ء ۲۲۰

(۵۶) اوراقِ جوش، تحقیق و تدوین، ڈاکٹر ہلال نقوی، لاہور، اظہار سنز، ۲۰۱۰، ص ۱۴۹

(۵۷) اوراقِ جوش، تحقیق و تدوین، ڈاکٹر ہلال نقوی، لاہور، اظہار سنز، ۲۰۱۰، ص ۱۷۰

(۵۸) اوراقِ جوش، تحقیق و تدوین، ڈاکٹر ہلال نقوی، لاہور، اظہار سنز، ۲۰۱۰، ص ۱۹۵

باب چہارم

خطوط نویسی

خط کو آدھی ملاقات کہا جاتا ہے۔ ایک دوسرے کے احوال سے گھر بیٹھے آگاہ ہونے کا ذریعہ خطوط ہیں۔ کسی فرد کے خیالات، تصورات اور میلانات کو سماجی، نفسیاتی، معاشی، معاشرتی، اخلاقی، مذہبی اور سیاسی پیمانے پر جانچنے کا بہترین پیمانہ خطوط ہیں۔ بہترین خطوط ادبی کارنامہ ہوتے ہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے مل کر بنتے ہیں۔ زندگی انہی قیمتی لمحات سے عبارت ہے جہاں مکتوب نگار (یعنی خط نویس) اور مکتوب الیہ اپنے دُکھ سُکھ ایک دوسرے کے ساتھ بانٹتے ہیں۔ جن خطوط میں فلسفیانہ موشگافیاں ہوں، استدلالیت ہو، جان بوجھ کر ادبی صنعت کاری ہو، ملّمع سازی ہو، بالارادہ فنکاری ہو، خطوط تو ہوتے ہیں لیکن شاہکار خطوط نہیں ہوتے۔ خطوط نویس اپنے خطوط میں رو سکتے ہیں، رُلا سکتے ہیں، ہنس سکتے ہیں، ہنسا سکتے ہیں لیکن ہنسی اور غم کی فلسفیانہ توجیہہ کے علاوہ آپ ان پر مضمون قلمبند نہیں کر سکتے۔ جب ایک مکتوب نگار مکتوب الیہ کو اپنے جیسا انسان تصور کرتے ہوئے اس سے اپنے دل کی بات کرتا ہے اور اس اظہار میں نمود و نمائش اور ریاکاری کا شائبہ نہیں ہوتا تو اُس کی تحریر خط لکھنے کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ انسان کے وہ نازک، لطیف اور دل پسند رویے اُس کے خطوں کو ادبی کارنامہ بنا دیتے ہیں۔ خط کے ذریعے انسان کی شخصیت ظاہر ہوتی ہے۔ انسان بالکل پیاز کی طرح پرت در پرت پردوں میں ملفوف ہے۔ کہیں سماجی قدغنیں ہیں، کہیں معاشرتی اور اخلاقی رویے ہیں، کہیں سیاسی مصلحتیں ہیں، لیکن خطوط نگار اپنے بے تکلف دوستوں اور قریبی عزیزوں پر بغیر کسی خوف اور جھجک کے عیاں ہو جاتا ہے۔ وہ کیا سوچتا ہے، کیا کرتا ہے اور کیوں کرتا ہے سب کچھ سامنے آجاتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان پوری خطوط نگاری کے حوالے سے رقمطراز ہیں۔

> "ریاضی سے مسئلے، ایمان کی نفاستیں افسانوں کی پرچھائیاں یہ سب پردے ہیں۔ اس لیے اگر آپ اپنے ہمسائے کی سرگوشیاں سُننا چاہتے ہیں، اسے برہنہ دیکھ کر قہقہہ لگانے کا جذبہ آپ کے دل میں ہو تو ادبی کارناموں کی بجائے اس کے خطوط کا روحانی سفر کیجئے۔ یہ نسخہ سہل ہے"(۱)

خطوں میں انسان کی اصلیت کھل کر سامنے آجاتی ہے جنہیں ہم متکبر سمجھتے ہیں۔ خطوں میں ان کے چہرے کی سادگی اور معصومیت دکھائی دیتی ہے۔ مردم بیزار، نرم خُو ہمدرد اور دُکھوں کا مارا نظر آئے گا۔ انقلاب اور اشتراکیت کے گن گانے والے مزدور پر سختی کرنے والے اور ان کا حق مارنے والے دکھائی دیں گے۔ پریم چند جو مزدوروں کا ہمدرد اور ان کے لیے آواز بلند کرنے والا دکھائی دیتا ہے، اپنی بیوی کو خط میں مزدوروں سے ڈٹ کر کام لینے کی تلقین کرتا دکھائی دیتا ہے۔

خطوں کے ذریعے ہم حکومت وقت کی سختی اور لوگوں پر ان کا ظلم و جبر بھی جان سکتے ہیں۔ غالب کے خطوط سے اُس وقت کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ انگریزوں کا پورا نظام حکومت رقم ہو سکتا ہے۔

نجی خطوط باتوں کی رنگارنگی، دلچسپی، تنوع اور خلوص سے عبارت ہوتے ہیں۔ ایک اچھے خط میں وہ بات ہوتی ہے کہ پڑھنے والا سمجھتا ہے کہ یہ اُس ہی کی کہانی ہے اس ہی کے جذبات ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں خاکے میں رنگ بھرتی ہیں اور خدوخال ابھرنے لگتے ہیں۔ خط ختم ہوتے ہوتے ایک پیکر ہمیں اپنے سامنے بیٹھا دکھائی دیتا ہے۔

خط نویس اپنے انداز بیاں اور اسلوب سے پہچانا جاتا ہے اور ہم فوراً کہہ اُٹھتے ہیں کہ یہ غالب کا اندازِ تحریر ہے یا ابوالکلام آزاد کا خط ہے، یہ نامہ نیاز فتح پوری کا ہے۔ یہ مکتوب فیض احمد فیض نے رقم کیا ہے یا جوش ملیح آبادی اس کے راقم ہیں۔

شیلے نے ڈکشنری آف ورلڈ لٹریچر میں اس کی تعریف یوں کی ہے کہ

''نشاۃ ثانیہ کے دوران تمہید باندھنے کا رواج ختم ہو گیا اور اس کی جگہ کسی نام سے منسوب کر کے تصنیف کرنے کا رواج چل پڑا۔ اسی نے (Epistle) کی شکل اختیار کر لی۔ اس سے قبل لفظ((Epistle کے معنی دیباچہ کے طور پر لیے جاتے تھے اور تمہید (جو کہ ایک (Epistle) ہر گز نہیں ہے) کو بھی یہی نام دیا جاتا تھا۔ اسی طرح مذہبی تعلیم کے اداروں میں جتنے بھی سبق بائبل کے متعلق پڑھائے جاتے تھے۔ وہ ایک طرح سے مذہبی رقعات بن گئے تھے۔ خواہ وہ اس کی متعین شکل میں ہوں یا نہ ہوں'' (۲)

سید سلیمان ندوی اپنے ایک مکتوب میں مہدی افادی کو لکھتے ہیں: ''خط کیا ہے، آپس میں دو آدمیوں کی بات چیت ہے'' (۳)

خط بندھے ٹکے اصولوں اور گرائمر کے قواعد سے ماوراء ہوتا ہے جبکہ رقعے میں ان اصولوں کا دھیان رکھا جاتا ہے۔ نجی خطوط میں مکتوب نگار کی شخصیت کا بے لاگ اور بے تکلف اظہار دکھائی دیتا ہے۔ محمد طفیل لکھتے ہیں:

> ''خط کا فن ایک شخصی فن ہونے کے علاوہ شخصیتوں کا فن بھی بن جاتا ہے۔ آسان ترین فن... غرض یہ کہ خط نگاری اصلاً فن لطیف نہ بھی ہو تب بھی بسا اوقات لطیف بلکہ لطیف ترین فن ہے... جن خطوط کی انسانی یا سوشل اپیل کامیاب ہو گی وہی خط زیادہ مقبول اور مستقل طور پر دلچسپ ہوں گے۔ (۴)

غالب کے خطوط میں جزئیات نگاری قاری کو اُس ماحول میں لے جاتی ہے اور وہ اپنی آنکھوں کے سامنے غالب کو چلتے پھرتے، زندگی کے معاملات میں مصروف دیکھتا ہے۔ محمد حسین آزاد اور مولانا عبدالکلام آزاد کے ہاں بھی جزئیات نگاری موجود ہے۔ غالب کی جزئیات ناول کی جزئیات کی طرح پوری تفصیل بیان کرتی ہے۔ ان کے خطوط کے ذریعے صرف ان کی شخصیت ہی کو سمجھنے کا موقع نہیں ملتا بلکہ اس ماحول کو بھی سمجھنے کا موقع ملتا ہے جس میں غالب کی شخصیت پروان چڑھی۔

خط نویس اپنے دل کی باتیں دوسرے تک پہنچاتا ہے اور یہ صرف نجی حیثیت سے ہی تحریر کی جاتی ہیں کیونکہ خط سے زیادہ کوئی چیز ذاتی اور نجی نہیں ہوتی۔ خط مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے مابین فاصلہ کم کرتا ہے۔ اسی وجہ سے خط کو مکمل اظہار کا نام دیا گیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے اسی لیے لکھا ہے کہ خط دلی خیالات و جذبات کا روزنامچہ اور اسرارِ حیات کا صحیفہ ہے۔ اس میں وہ صداقت اور وہ خلوص ہے جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا۔ خطوں سے انسان کی جس سیرت کا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسری صورت سے نہیں ہو سکتا۔ حالی کی مکمل شخصیت ان کے خطوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ قومی ہمدردی، جاں سوزی اور خود سپاری کے جذبات حالی کے خطوط سے عیاں ہیں۔ غالب کی شخصیت تو مکمل طور پر ان کے خطوں میں دکھائی دیتی ہے۔

شعوری طور پر لکھے گئے خطوط میں وہ بات نہیں ہوتی جو لاشعوری طور پر تحریر کیے گئے خطوط میں ہوتی ہے۔ جب کوئی یہ سمجھتا ہے کہ میرے یہ خطوط شائع ہوں گے تو نتیجتاً وہ احتیاط سے کام لیتا ہے اور پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کے خطوط میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی جو بے اختیار میں لکھے گئے خطوط کی ہوتی ہے۔ غالب نے لاشعوری کوشش کی ہے کہ ان کی تحریر ان کی گفتگو کے قائم مقام بن جائے اسی لیے ان کے خطوط کے الفاظ بول چال کی زبان کے زیادہ قریب ہیں مگر اس میں مصنوعی پن نہیں ہے۔ اچھے مکتوب بے ارادہ لکھے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کم ادبی شخصیات اچھے خطوط لکھ سکی ہیں۔

مکتوب نگاری کی ابتدا سلطنتِ روما کے زیرِ سایہ ہوئی۔ یونان میں اس فن کو فروغ حاصل نہ ہوا۔ اس دور میں فن کتابت کے اصول اور بلاغت کے قوانین کو مدنظر رکھا جاتا تھا۔ اسی لیے رومیوں کے خطوط خطابات اور روزمرہ کی بول چال کے درمیان کی کڑی ہے۔ خسرو کے مکاتیب میں روم کی عملی زندگی کی جھلک اور اس کی معاشرت جھلکتی ہے۔ لیکن سادگی کا فقدان ہے۔

انگلستان میں خطوط نویسی کی شروعات اطالوی خطوط سے ترجموں سے ہوئی۔ انگلستان میں (انگریزی زبان میں) پندرھویں صدی میں خط لکھنے کا آغاز ہوا۔ پندرھویں اور سولہویں صدی کے خطوط میں الفاظ واقعات کی صورت میں رقم ہیں یعنی مکاتیب میں تفصیلات کی بھرمار ہے۔

سترھویں صدی میں جیمز ہاول کے خطوط ملتے ہیں۔ جو کہ انگلستان میں مکتوب نویسی کا باوا آدم سمجھا جاتا ہے۔ اس کے خطوط میں بھی سادگی نہیں ہے بلکہ کاریگری اور ادبی نفاستیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔

اٹھارہویں صدی میں ولیم کوپر اور گرے دو مشہور مکتوب نگار ملتے ہیں۔ خطوط نویسی میں گرے اپنی طبعی نفاست، ادبی ذوق اور انسانیت نوازی کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔ مسز ارٹلے میری مانٹینگ کے خطوط میں زندگی کی تازگی اور ہمہ گیری کا احساس ملتا ہے۔

چالس لیمب کے خطوط ادب کا سرمایہ ہیں۔ لیمب کا اندازِ بیاں دھیما لیکن جذبات کی پرجوش حرارت سے لبریز ہے۔ کیٹس کے خطوط میں ندرت، محبت اور تنوع ہے۔ شیلی اور بائرن کے خطوط میں بھی خطوط نویسی کے بیشتر تقاضے پورے ہو جاتے ہیں۔

ہندوستان میں خطوط نویسی مغلیہ عہد میں شروع ہوئی۔ مغلوں نے پیغام رسانی کے لیے "دیوان البرید" کے نام سے ایک محکمہ بھی قائم کیا تھا جہاں سے ڈاک گاڑیوں کے ذریعے سے پیغام رسانی کی جاتی تھی۔ اردو میں مکتوب نگاری کا آغاز غالب سے ہوتا ہے۔ غالب سے پہلے خطوط نویسی فارسی میں ہوتی تھی کیونکہ خواص کی ادبی زبان فارسی تھی۔ رقعاتِ عالمگیری میں جو مکاتیب ہیں ان کا انداز اپنے دور کے حساب سے تو فطری ہے لیکن ہمارے لیے وہ انداز سراسر پُر تکلف اور مشکل ہے۔ غالب کی زندگی ان کے فن کا وسیلہ بن گئی۔ غالب سے قبل ہمیں غلام غوث بے خبر کے خطوط "انشائے بے خبر" کے نام سے ملتے ہیں۔ ان کے خطوط میں بے تکلفی اور سادگی کے باوجود اس فضا کا نشان نہیں ملتا جو بے تکلف دوستوں کی مکتوب نگاری میں نظر آنی چاہیے۔ غالب کے خطوط تو دوستوں کی محبت اور ان کے جوش وولولے سے عبارت ہیں۔ ڈاکٹر طیبہ خاتون اپنی کتاب "اردو میں ادبی نثر کی تاریخ 1857ء تا 1914ء میں غالب کی خطوط نویسی پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

> "غالب کے خطوط تو تعلقات اور دوستوں کی حرارت و حلاوت سے پُر ہیں۔ مکتوب نگاری نے غالب کو تسکین ذوق کا سامان بہم پہنچایا۔ دور بیٹھے ہوئے دوستوں کے ساتھ ہم کلامی کا وسیلہ بھی فراہم کیا اور تنہائیوں میں غالب کو خود کلامی کا موقع بھی بہم پہنچایا۔ ان کا یہ دعویٰ بالکل درست ہے کہ انہوں نے مراسلے کو مکالمہ بنادیا۔"(۵)

غالب نے اپنے خطوط میں روایت سے انحراف کیا۔ انہوں نے وہ انداز ایجاد کیا کہ مراسلے کو مکالمہ بنادیا اور یوں محسوس ہونے لگا کہ غالب اور ان کے احباب آمنے سامنے بیٹھے گفتگو کے مزے اٹھا رہے ہیں۔ آپس میں چھیڑ چھاڑ جاری ہے۔ غالب کی شخصیت اور زندگی کے بہت سے گوشے بے نقاب ہو جاتے ہیں۔

سرسید کا بھی ایک وسیع ذخیرہ خطوط ہمیں ملتا ہے۔ ان کے خطوط ان کی شخصی صداقت اور قومی ہمدردی سے لبریز ہیں۔ ان کی بھی کچھ خطوط میں نہ القاب ہیں نہ آداب اور سادگی و بے تکلفی کی ایک فضا ہے جو قاری کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اپنے نظریات کی تبلیغ کے لیے انہوں نے حد درجہ سادہ اور رواں زبان استعمال کی ہے لیکن سرسید کے ہاں نجی معمولات خطوط میں جگہ نہ بنا سکے۔

سرسید کے دوستوں میں الطاف حسین حالی نے ان کا ہر مرحلہ پر ساتھ دیا۔ ان کے مزاج کی نرمی، دھیما پن، اعتدال اور قومی ہمدردی کا احساس ان کے خطوط میں نمایاں ہے اور سب سے بڑھ کر محبت کا احساس جو اولاد، عزیز و اقارب، اہل محلہ پڑوسی اور ہم وطنوں سب کے لیے بے پایاں ہے۔

شبلی کے ہاں جذبات و احساسات کی ایک دنیا ہے جو ان کے خطوط میں پوشیدہ ہے۔ حسن و لطافت کا احساس ہے لیکن شبلی اپنے خطوط میں پورے نہیں کُھلتے۔ انہوں نے عطیہ فیضی کو جو خطوط لکھے ہیں وہ ادبی چاشنی اور لطیف جذبات سے پُر ہیں اور اسی کو بنیاد بنا کر ڈاکٹر وحید قریشی

نے ''شبلی کی حیات معاشقہ'' تحریر کی۔ شبلی نے اپنے خطوط میں اپنے شاگردوں کو علمی مشورے بھی دیئے ہیں۔ اختصار ان خطوط کی شان ہے۔ مکتوباتِ آزاد کو سب سے پہلے مخزن میں 1906ء شائع کیا گیا۔ 1907ء میں سید جالب بلگرامی نے کتابی شکل میں شائع کیا۔ یہ تمام خطوط مختصر ہیں اور یوں لگتا ہے کہ دو افراد آمنے سامنے بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں۔ غالب کے رقعات کی تقلید میں مکالمہ نگاری، سادگی اور بے تکلفی کو ہر مکتوب نویس نے اپنایا ہے۔ آزاد کے ہاں لطافت کے باوجود غالب کی سی لطیف ظرافت نظر نہیں آتی۔

محمد امین زبیری مارہروی نے آگرہ سے ''مکاتیب مہدی علی خان'' حصہ اوّل اور ''مکتوبات وقار الملک'' حصہ دوم شائع کیا۔ ان کی تحریر میں بھی سرسید کی سی مقصدیت ہے۔ اپنے زمانے کے قومی و تاریخی حالات پر روشنی بھی ڈالتے ہیں۔ خطوط میں ادبی زبان استعمال کی ہے، کہیں کہیں ان کی شخصیت کی جھلک دکھاتی ہے۔ لسان العصر اکبر الہ آبادی کے مکاتیب کے ذریعے سے ان کا روزنامچہ مرتب کیا جا چکا ہے۔ انہوں نے اپنے عزیزوں اور دوستوں سے کافی خط و کتابت کی ہے۔ شعر و شاعری کی رہبری بھی ان کی تحریروں میں ملتی ہے۔ ان کے ہاں زمانے کی تبدیلی اور کشمکش کے آثار ملتے ہیں۔ انداز بیاں سادہ اور دلچسپ ہے۔ موضوعات کے تنوع کے حوالے سے اکبر کے خطوط اہم ہیں۔ مولوی نذیر احمد نے اپنے خطوط کو ہدایت اور نصیحت کا ذریعہ بنایا۔ ملک کے مختلف مقامات سے یہ خطوط انہوں نے اپنے بیٹے بشیر الدین احمد کو لکھے۔ کچھ خطوط ملکی سیاستوں اور خانگی زندگی کے مسائل پر ہیں۔ کچھ میں انگریزی تہذیب و تمدن کی خوبیوں اور خامیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ داغ دہلوی، امیر مینائی، شوق قدوائی، ریاض خیر آبادی، سید ناصر علی نے بھی اپنے مخصوص ماحول اور ذاتی دلچسپیوں کے زیر اثر خطوط لکھے۔

اقبال کے خطوط ان کی ذاتی دلچسپیوں اور خیالات و نظریات کے آئینہ دار ہیں۔ ان کے خطوط میں زندگی، مذہب، سیاست، خانگی حالات کے بے شمار مسائل زیر بحث آئے ہیں۔ کچھ میں اسلام، مسلمان اور افرنگ کے کردار کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مکاتیب اقبال کے اردو مجموعوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ اقبال پر جو مختلف مجموعے مرتب ہوئے ہیں۔ چند کے نام یہ ہیں۔ شاد اقبال مرتبہ ڈاکٹر محیی الدین قادری زور، اقبال نامہ (دو حصے) مرتبہ شیخ عطاء اللہ، مکاتیبِ اقبال بنام خان نیاز الدین خان، مکتوبات اقبال بنام نذیر نیازی، مکاتیب اقبال بنام مولانا گرامی، مرتبہ عبداللہ قریشی، انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار، خطوط اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی اور خطوط اقبال بنام بیگم گرامی مرتبہ حمید اللہ شاہ ہاشمی وغیرہ۔ خطوط اقبال کی ایک اہم خوبی ان کا اختصار ہے۔

مولوی عبدالحق کے خطوط کی تعداد تقریباً ایک لاکھ سے اوپر ہے۔ آپ کے خطوط میں زبان کا چٹخارہ، شگفتگی اور اردو تراکیب کا استعمال ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط میں ان کے ذہن و فکر کی بلند پروازی اور کمال انشاء پردازی کا رنگ نمایاں ہے۔ علاوہ ازیں چند مشہور اور اہم خطوط کے مجموعے درج ذیل ہیں۔

مکاتیب مہدی مرتبہ بیگم مہدی، خطوط محمد علی جوہر، مرتبہ پروفیسر محمد سرور، مکتوب سلیمانی، مرتبہ مسعود عالم ندوی، مکتوبات سلیمانی مرتبہ عبدالماجد دریا آبادی، رشید احمد صدیقی، قاضی عبدالغفار، عبدالماجد دریا آبادی، نیاز فتح پوری، محمد علی رودلوی تاثیر کے خطوط عزیزم کے نام مرتبہ محمود نظامی، جگر مراد آبادی کے خطوط مکاتیب گل کے نام سے تسکین قریشی نے مرتب کیے۔ جگر کے خطوط، مرتبہ محمد اسلام، فراق گورکھپوری کے خطوط ''من آنم'' کے نام سے مرتب ہوئے۔ منٹو کے خطوط احمد ندیم قاسمی نے مرتب کیے۔ صفیہ اختر کے خطوط ''زیر لب'' اور ''حرف آشنا'' کے ناموں سے مرتب ہوئے۔ پطرس بخاری کے خطوط بھی علمی اور ادبی اہمیت کے حامل ہیں۔ مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودی (دو حصے) ہر لحاظ سے اہم ہیں کیونکہ ان خطوط میں مولانا نے علمی، ادبی، مذہبی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل پر لوگوں کے خطوط کے جوابات مرحمت فرمائے ہیں۔ اسعد گیلانی کے مکاتیب کے مجموعے تلاشِ راہِ حق، قافلہ سخت جاں اور ساتھی کے نام سے مرتب ہوئے۔ فیض احمد فیض کے

خطوط کا مجموعہ ''صلیبیں مرے دریچے کی'' کے نام سے شائع ہوا۔ نقوش کے خطوط نمبر 3 اور مکاتیب نمبر دو حصے بھی شائع ہو چکا ہے۔ ایشیاء ممبئی کا مکاتیب نمبر اور ماہنامہ ''آج کل'' کا خطوط نمبر بھی اردو مکتوب نگاری کی روایت کا ایک سنگ میل ہے۔

جوش ملیح آبادی کے خطوط کے مجموعے اور جوش کی خطوط نگاری

جوش ملیح آبادی کثیر الاحباب شخص تھے۔ آپ کو خط لکھنا پسند تھا۔ متعدد دوستوں کے علاوہ اعزہ و اقربا کے نام مختلف خطوط میں جوش کی طبیعت کے مختلف رنگ سامنے آئے ہیں۔ احباب کی ایک طویل فہرست ہے جن کے نام جوش کے خطوط موجود ہیں۔ اب تک جوش کے خطوط کے جو مجموعے منظرِ عام پر آئے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ نقد اخلاص، مرتبہ ڈاکٹر سید صفدر حسین ملک، ۱۹۷۶ء

۲۔ جوش بنام ساغر مرتبہ خلیق انجم، ۱۹۹۱ء

۳۔ خطوطِ جوش ملیح آبادی، جامع و مرتب راغب مراد آبادی ۱۹۹۳ء

۴۔ جوش کے خطوط مرتب، خلیق انجم، ۱۸۸۹ء

۱۔ نقد اخلاص، ۱۹۷۶ء

یہ کتاب مکاتیب جوش ملیح آبادی بنام میر عترت حسین پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو ڈاکٹر سید صفدر حسین ملک نے مرتب کیا ہے۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کے زیر اہتمام ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی۔ کتاب کی قیمت دس روپے ہے۔ کتاب میں جوش ملیح آبادی کے خطوط کے علاوہ میر عترت حسین پر تین مضامین موجود ہیں۔ کل صفحات ۱۱۴ ہیں۔ مضامین کی ترتیب یوں ہے۔

پہلا مضمون ڈاکٹر سید صفدر حسین کا تحریر کردہ ہے جو ''شخصیت اور ماحول'' کے عنوان سے ہے۔ دوسرا مضمون ڈاکٹر عبادت بریلوی کا تحریر کردہ ہے جس کا عنوان ''میر صاحب'' ہے۔ تیسرا مضمون ''میر صاحب'' کے نام سے جوش ملیح آبادی نے لکھا ہے۔

''شخصیت اور ماحول'' کے حوالے سے ڈاکٹر سید صفدر حسین نے اپنی یادوں کے دریچوں سے اپنے ماضی پر نظر ڈالی ہے۔ میر صاحب مغربی یو پی کے ضلع مظفر نگر کے قصبے جانسٹھ کے رہنے والے تھے اور سید صفدر حسین سے دس بارہ برس بڑے تھے اور ساداتِ بارہہ سے تعلق رکھنے کے باوصف ڈاکٹر صفدر اور میر عترت حسین ایک دوسرے سے ہمیشہ باخبر رہے۔ جس وقت وہ لاہور کرشن نگر ارجن روڈ (حیدر روڈ) میں رہائش پذیر ہوئے ڈاکٹر صفدر ملک ان کے ہم محلہ تھے۔ یہاں پر ان کی دکان کو ثقافتی مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی اور ڈاکٹر صاحب کے راولپنڈی جانے کے بعد بھی دونوں کا تعلق مضبوط رہا۔ ڈاکٹر صاحب نے میر عترت حسین کا حلیہ یوں درج کیا ہے۔

> ''عمر تقریباً چالیس سال۔ ازدواجی زندگی سے ناآشنا اور خانگی مسائل سے بیگانہ، رفتار کڑی کمان کے تیر کی مانند، آواز عموماً سریلی مگر حسب ضرورت ریوالور کی گولی کی طرح تیز و تند، سر کے بال اور مونچھوں سے ہٹلر کا انداز، جسم میں شیروانی جو موسم گرما میں سفید اور سردیوں میں سیاہ رنگ کی ہوتی تھی۔ پائجامہ چوڑی مُہری کا ہوتا۔ ہر موسم میں موزہ اور بنیان پہنتے تھے۔ گرمیوں میں وَیل یا ململ کا کُرتا زیب تن کرتے جس سے ان کا کُندنی رنگ جھلکتا رہتا۔ پاؤں میں ولایتی بوٹ ہوتا جس کو کُسے رہتے۔ مزاج میں اگرچہ ملاطفت، نرمی اور محبت کی کمی نہ تھی لیکن نازک مزاجی کے سبب شعلہ بھی جلد ہی بھڑک اٹھتا تھا۔ ایسی صورت میں اگر ان کا نام تاناشاہ رکھ دیا جاتا تو کچھ غلط نہ ہوتا۔''(۶)

ان کا رہن سہن ان کے لکھنوی ہونے کا گمان کرتا لیکن درحقیقت وہ اپنی وضع قطع، چال ڈھال، رکھ رکھاؤ، اور طریق معاشرت سے سادات بارہہ کے رئیسوں کا پرتو تھے۔ جیسا انہوں نے اپنے بزرگوں کو کرتے دیکھا تھا ویسا ہی وہ خود بھی عمل کرتے تھے۔ میر صاحب اور جوش

کے روابط ۱۹۵۷ تا ۳۰ جون ۱۹۷۴ء تک برابر ترقی کرتے رہے۔ جوش کے تعلق سے قطع نظر بھی میر عترت حسین لاہور کی ادبی و ثقافتی شخصیت کے طور پر محبوب رہے۔ ڈاکٹر صفدر حسین نے شوکت تھانوی کا ۱۹۵۶ء کا ایک خط اور انتظار حسین کا ۲۶ فروری ۱۹۵۸ء کو روزنامہ آفاق کو بھیجا گیا ایک خط بھی رقم کیا ہے اور دو اقتباس خطوطِ جوش میں سے بھی درج کیے ہیں۔

صفحہ نمبر ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰ اور ۳۱ پر پانچ تصویریں ہیں جو میر عترت حسین سے متعلق ہیں۔ صفحہ نمبر ۳۲ خالی ہے۔ صفحہ نمبر ۳۳ سے ڈاکٹر عبادت بریلوی کا مضمون "میر صاحب" شروع ہوتا ہے۔ عبادت صاحب کی میر عترت سے ملاقات قیام پاکستان کے بعد اپنے ماموں زاد بھائی کے توسط سے ہوئی اور روابط بڑھتے چلے گئے۔ جگر اور جوش سے میر صاحب کو خصوصی محبت تھی، ہر طرح کے لوگ ان کے حلقۂ احباب میں شامل تھے، عبادت بریلوی رقمطراز ہیں۔

> "بات یہ ہے کہ میر صاحب اپنی ذات سے ایک انجمن تھے اور اس انجمن میں بعض لوگوں کی سیلانی مزاجی کو بھی پناہ مل جاتی تھی۔ میر صاحب میں وضعداری بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور خلوص اور محبت کا ایک مجسمہ تھے۔ اسی لیے ان کی شخصیت ایسے لوگوں کے دامنِ دل کو بھی اپنی طرف کھینچتی تھی۔(۷)

عبادت صاحب کا مضمون صفحہ ۴۵ تک ہے۔ صفحہ نمبر ۴۶ خالی ہے۔ صفحہ ۴۷ سے جوش ملیح آبادی کا مضمون "میر صاحب" شروع ہوتا ہے۔ دراصل یہ ایک مدحیہ خط ہے جس میں جوش نے میر عترت کا خاکہ کھینچا ہے۔ اس کے بعد جوش کا اجازت نامہ ہے جو انہوں نے ڈاکٹر صفدر ملک کو اپنے خط شائع کرنے کے متعلق دیا ہے۔ یہ ۲۴، فروری مرقومہ ۱۹۷۴ مرقومہ ہے۔ اس کے بعد میر صاحب کی مدح میں ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے۔

یہاں کی گردِ حسنِ کہکشاں سے بات کرتی ہے
زمینِ میر صاحب آسماں سے بات کرتی ہے

صفحہ نمبر ۵۰ سے جوش کے خطوط شروع ہوتے ہیں۔ پہلا خط ۲ اپریل ۱۹۵۷ء کا تحریر کردہ ہے۔ جوش نے میر صاحب کی محبت کا شکریہ ادا کیا ہے اور احسان دانش کے ملنے نہ آنے کا گلہ کیا ہے کہ وہ ان کے لاہور کے قیام کے دوران ان کی مزاج پرسی کو نہ آ سکے۔ دوسرا خط ۱۶ جون ۱۹۵۷ء کا تحریر کردہ ہے۔ اس میں وزیر اعظم کی قدر شناسی کی وجہ سے حالات کی تبدیلی کی طرف اشارہ ہے۔ اگلے چار خطوط ۱۹۵۸ء کے تحریر کردہ ہیں۔ ایک خط میں اطلاع دی ہے کہ انہیں اردو ڈویلپ منٹ بورڈ کا آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی مقرر کر دیا گیا ہے اور سولہ سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی ہے۔

ایک خط میں کہتے ہیں کہ میر شراب کا پرمٹ جلد حاصل کر لیں تا کہ لاہور آنے پر کوئی مشکل نہ ہو۔ تین خطوط سن ۱۹۵۹ء کے رقم ہیں ایک خط میں تاریخ ندارد ہے اور اسے ۱۹۶۰ء کے خطوط میں شامل کیا گیا ہے۔ ایک خط میں پاؤں میں چوٹ لگنے کا واقعہ بیان کیا ہے اور موسم سرما کے وسط میں ہندوستان جانے کی نوید سنائی ہے۔ سن ۱۹۶۰ء کے پانچ خطوط ہیں۔ پہلے خط میں دو مرتبہ ہندوستان آنے جانے کا تذکرہ ہے۔ محکمہ آبادکاری کی طرف سے ایک مکان کا بالائی حصہ ملنے کا تذکرہ ہے۔ سکھر کے مشاعرے کے لیے سفر خرچ کی رقم کی ادائیگی کا تذکرہ ہے۔ ایک خط میں خالی جیب سفر سے معذرت کی ہے۔ دو خطوط سن ۱۹۶۱ء کے مرقومہ ہیں۔ ایک خط میں اپنی بیماری کی اطلاع اور ہندوستان جانے کا ذکر ہے اور ایک خط میں میر صاحب کی طرف سے بھیجے جانے والے آموں کی وصولی کا ذکر ہے۔ سن ۱۹۶۲ء میں ایک خط تحریر کیا جس میں اپنی بیٹی سعیدہ کے ہندوستان جانے اور اس کے لیے سفر میں آسانیاں پیدا کرانے کی سفارش کی ہے۔ لغت کی تدوین کی جان کاہ مصروفیات کا ذکر بھی ہے۔ سن ۱۹۶۳ء میں جوش نے میر عترت کو چھ خطوط روانہ کیے۔ ایک خط میں اپنی بیگم "ام الشعراء" کو سفر میں سہولتوں کی فراہمی کے لیے شکریہ ادا کیا

ہے اور یہ خط ملیح آباد لکھنؤ سے لکھا گیا ہے۔ یہاں جوش نے میر عترت کی بیگم کو اپنی بیگم کی طرف سے سلام کہلوایا ہے۔ (جبکہ ڈاکٹر صفدر کے مضمون کے مطابق انہوں نے شادی نہیں کی تھی) ایک خط میں اپنی طبیعت کی خرابی کا تذکرہ کیا ہے کہ شائد زندگی کے دن گنے جا چکے ہیں۔ ایک اور خط میں ہندوستان، ممبئی جانے کا تذکرہ کیا ہے اور اپنی بیگم کو باسہولت ہندوستان کی گاڑی میں سوار کرانے کی فرمائش کی ہے۔ واپسی پر لاہور میں قیام کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ ایک خط میں ہندوستان سے بدیر روانگی کا تذکرہ ہے اور کراچی کے لیے سیٹیں ریزرو کرانے کی درخواست ہے۔ چھ خطوط ۱۹۶۴ء کے زمانے کی تحریر ہیں۔ ایک خط میں ہندوستان جانے کا تذکرہ ہے اور مختار بیگم کے ہاں جا کر گانا سننے کا اور میر عترت کے نام سے جام اٹھانے کا تذکرہ ہے۔ ایک خط ملیح آباد سے تحریر کردہ ہے۔ کراچی کے لیے دو ائیر کنڈیشنڈ سیٹیں ریزرو کرانے کی درخواست ہے، تین خطوط دہلی سے مرقومہ ہیں۔ ایک میں لاہور آمد کا تذکرہ ہے اور روپے کے لیے بندوبست کا پوچھا ہے۔ سن ۱۹۶۵ء کا کوئی خط نہیں ہے۔ دو خطوط ۱۹۶۶ء کے تحریر کردہ ہیں۔ دو خطوط ۱۹۶۷ء کے ہیں اور ایک خط میں مزاج پُرسی کے لیے صرف ایک شعر ہے۔ میر صاحب! مزاج کیسا ہے، آج کل، اختلاج کیسا ہے، دوسرے مختصر خط میں ہندوستان جانے کی خواہش ہے۔ دو خطوط ۱۹۶۸ء کے ہیں۔ مشاعرے کے لیے سفر خرچ کی وجہ سے آنے سے معذرت کی ہے۔

ایک خط میں تاریخِ تحریر نہیں درج کی گئی۔ ایک میں پنڈی سے لاہور تشریف لانے کی اطلاع ہے۔ ایک خط میں میر صاحب کا مالِ دریافت کیا ہے۔ سات خطوط میں تاریخ تحریر درج ہے۔ ایک خط میں ڈھاکہ، حیدر آباد اور میر پور خاص جانے کا ذکر ہے۔ ۲ ستمبر ۱۹۶۹ء کے خط میں غیر مطبوعہ نظموں کی موٹی بیاض کے گم ہو جانے کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک خط میں جوش نے گلہ کیا ہے کہ جوش کی کم آمدنی کے اعلان کے بعد بھی اس کے دل سے آپ کی محبت کم نہیں ہوئی۔ ایک خط میں "میر عترت کے جواب سے گلہ جاتا رہا" کے الفاظ جوش سے ادا کروائے ہیں۔ سن ۱۹۷۰ء کا ایک خط موجود ہے۔ جس میں مراسلت ختم ہونے پر پرسِش ہے۔ تین خطوط ۱۹۷۱ء کے تحریر کردہ ہیں۔ دوبارہ خطوط کا سلسلہ قائم ہونے پر خوشی کا اظہار کیا ہے۔ ایک خط میں لاہور آنے کی اطلاع ہے۔ چار خطوط سن بہتر میں تحریر کیے ہیں۔ بیوی کی بیماری کی اطلاع ہے۔ میر عترت کی بیماری پر تشویش ظاہر کی ہے۔

چھ اگست ۱۹۷۲ء کا ایک خط ہے، جس میں جوش کی طبیعت کا ایک اور رنگ دکھائی دے رہا ہے اور وہ ہے امرد پرستی کا رجحان وہ لکھتے ہیں:

> "میر صاحب کو میرا سلام پہنچے اور اُن کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ میں ان کو بے حد یاد کرتا ہوں۔ اور جب کبھی ان کو خواب میں دیکھ لیتا ہوں تو، مجھ پر غسل واجب ہو جاتا ہے۔ (۸)

ایک خط میں ذیشان کے قرض کی واپسی کی اطلاع ہے۔ ۱۹۷۳ء کے مرقومہ تین خطوط ہیں۔ ایک خط میں دنیا کو "حرامی کارخانہ" قرار دیا ہے۔ بے بسی اور بیچارگی کی انتہا ہے کہ جوش گالیاں دے کر دل کی بھڑاس نکال رہے ہیں۔ میر عترت کی خیریت معلوم کر رہے ہیں۔ ایک خط میں میر صاحب کے بار بار بیمار پڑ جانے پر گہری تشویش کا اظہار کر رہے۔ میر صاحب کو یہ اطلاع ۳ نومبر ۱۹۷۳ء کے خط میں دے رہے ہیں کہ بھٹو نے تعلیمات کی وزارت میں ان کا تقرر کر دیا ہے اور ماہانہ تنخواہ اڑھائی ہزار روپے ہے۔ یہاں پھر جوش لغزش مستانہ کا شکار نظر آ رہے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

> "اب میں ہفتے عشرے کے بعد لاہور آ رہا ہوں۔ اس تصور سے دل باغ باغ ہوا جا رہا ہے کہ لاہور آ کر آپ کو کلیجے سے لگاؤں گا اور..." (۹)

۱۹۷۴ء میں میر عترت حسین کا انتقال ہو گیا۔ اس لیے اس سال صرف دو خطوط جوش نے تحریر کیے ہیں اور میر صاحب کی خیریت دریافت کی ہے۔

اس کتاب میں ہم جوش کو دوستوں سے محبت کرنے والا، ان کی خیریت کے لیے فکر مند رہنے والا اور بڑھاپے کے ہاتھوں مر جانے کی تمنا کرنے والا محسوس کرتے ہیں۔ جوش کا بار بار ماضی کی یادوں کو سینے سے لگانے کے لیے ہندوستان کا سفر کرنا اور گزرے ہوئے دوستوں کا ذکر کرنا ان کی رومانیت پر دال ہے۔ اس مجموعے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جوش کو جہاں اپنے آرام کے دیگر اسباب کی فکر رہتی تھی وہاں اپنی شراب کے پرمٹ کا پوچھتے بھی نظر آتے ہیں۔ ان کے شغل مے خوری میں کوئی آڑے نہ آئے اس کے لیے پہلے ہی سے تیاری کر رکھتے تھے۔ دوستوں کی خوشی اور غمی میں جوش ہر دم تیار نظر آتے ہیں۔ اپنے دُکھ سُکھ دوستوں کے ساتھ بانٹنا بھی جوش ہی کا کام ہے۔ جن لوگوں سے دوستوں کو محبت ہے جوش نے خود بھی ان سے محبت کی۔ اپنے خطوط میں ان کی خیریت کے بارے میں استفسار اور سلام دعا کہلوانا جوش نہیں بھولتے۔ میر صاحب سے ٹکٹوں کی ریزرویشن کروانا، اپنے قیام کا بندوبست کروانا، اور اپنے گھر والوں کے باسہولت سفر کے لیے انتظامات کروانا میر عترت کے جوش کے قابل بھروسہ دوست ہونے کی دلیل ہے۔ ان خطوط سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ دوستوں سے لیا گیا قرض "حساب دوستاں دردِل دوست" کرنے کی بجائے جوش اس کی واپسی کا جتن کرتے تھے۔

۲۔ جوش بنام ساغر ۱۹۹۱ء

اس مجموعے کو خلیق انجم نے مرتب کیا ہے۔ اس میں جوش کے خطوط، ساغر نظامی کے نام مرتب کیے گئے ہیں۔ اس مجموعے میں جوش کے ساغر کے نام پچپن خطوط، ذکیہ ساغر کے نام دو خطوط، ساغر کے بھائی اسد کے نام ایک خط اور ایک خط کرنل بشیر حسین زیدی کے نام ہے۔ یہ مجموعہ مونومینٹل پبلشرز نئی دلی سے شائع ہوا۔ انتساب ضامن علی خاں مرحوم کے نام ہے۔ حرفِ آغاز خلیق انجم کا تحریر کردہ ہے اس میں انہوں نے ساغر نظامی سے اپنے روابط کی ابتداء ۱۹۷۹ء میں "غالب کو آپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی" کے ساتھ بیان کی ہے۔ ساغر نظامی اس سوسائٹی کے صدر مقرر ہوئے۔ یہاں ان کی شخصیت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کے انتقال کے بعد خطوط جوش کو مرتب کرنے کی ذمہ داری ملی۔ اس کے بعد مقدمہ ہے مقدمے میں خلیق انجم نے جوش و ساغر کی ابتدائی ملاقات سے ان کی وفات تک دونوں کے روابط پر روشنی ڈالی ہے۔ ساغر جوش سے تقریباً ۹، ۱۰ برس چھوٹے تھے اور "روح ادب" پڑھنے کے بعد جوش کے لیے ان کے دل میں ادب و اشتیاق کے جذبات پیدا ہو چکے تھے۔ خلیق انجم نے ایس ایم شارق کے اس انٹرویو کو بنیاد بنایا ہے جو ماہانہ بیسویں صدی، دہلی کے جون ۱۹۸۲ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ شالیمار پکچر پونا کے ساتھ جوش اور ساغر نظامی دونوں کا معاہدہ ہوا اور ۱۱ ماہ جوش و ساغر نے اکٹھے کام کیا لیکن جب تک قربت نہیں تھی دونوں کے مفادات نہیں ٹکرائے تھے۔ تمدنی تعارف نہیں ہوا تھا اور آسودگی حاصل نہیں ہوئی تھی وہ زمانہ نہایت خوش و خرم گزرا لیکن جب طاہر پیلس میں پہلو بہ پہلو رہنے کا موقع ملا تو تلخیوں نے آگھیرا۔ غلط فہمیوں نے اپنے ڈیرے جمائے۔ ہر چند کے باہمی محبت اور عزت میں فرق نہیں آیا لیکن وہ پہلے سے تعلقات باقی نہ رہے۔ خلیق انجم نے ساغر کے نقطہ نظر کو واضح کیا ہے جبکہ یادوں کی برات میں جوش نے اپنے نقطہ نظر سے واقعات کو پیش کیا ہے۔

"جوش کے انتقال کی خبر نے ساغر کے دل پر بہت گہرا اثر پڑا۔ ایک انٹرویو کے دوران تو ساغر پر رقت طاری ہو گئی اور وہ اپنی تقریباً ساٹھ سالہ دوستی کی یادوں کو کریدتے رہے۔ اور ایک دم خاموشی کے بعد انہوں نے ایسے کہا جیسے جوش ان کے سامنے بیٹھے ہیں کہ "جوش صاحب ہم نے بھی تیاری کر لی ہے۔ اب ہم بھی آنے والے ہیں۔" (۱۰)

۲۷ فروری ۱۹۸۳ کو کینسر کی وجہ سے ساغر نظامی اس جہانِ فانی کو الوداع کہہ گئے۔ خطوط کی عکسی نقول ساتھ میں دی گئی ہیں۔

جوش اور ساغر کے درمیان مراسلت کی ابتدا ۱۹۲۳ء میں ہوئی۔ پہلے خط میں جوش معذرت کر رہے ہیں کہ ان کے کہنے پر ساغر نے اپنی کتب ملیح آباد بھیجیں جو کہ واپس ہو گئی۔ جن صاحبان کو کتب روانہ کی گئی تھیں، جوش ان سے تذکرہ کرنا بھول گئے اور جوش کے پاس خرچ نہیں تھا انہوں نے پوسٹ ماسٹر کو کہا تھا کہ میر اوی پی بطور امانت رکھ لے لیکن اس نے واپس بھجوا دیا۔ اب ساغر وی پی واپس بھجوا دیں اور نقصان کو بھی شامل کر دیں۔ یہ خطوط لکھنؤ سے لکھا گیا تھا اور تاریخ تحریر یکم نومبر ۱۹۲۳ ہے۔ ایک خط س ۱۹۲۴ کا تحریر کردہ ہے۔ تاریخ تحریر ۱۶ فروری ۱۹۲۴ء ہے۔ ساغر نے کچھ تصویریں بھیجی تھیں کہ نظم لکھ کر روانہ کر دیں لیکن حیدر آباد جانے کی تیاری، بیماری اور مصروفیات کی بنا پر جوش عرق ندامت کے ساتھ ان کو واپس بھیج رہے ہیں۔

اس کے بعد ایک طویل وقفہ ہے۔ تیسرا خط ۱۱۶ اکتوبر ۱۹۳۵ء کا تحریر کردہ ہے ابتدا میں اپنی نظم شام رخصت تحریر کی ہے جو "ایشیا" کے لیے مکمل صورت میں بھیجی گئی ہے۔ اختر نے اسے رومان میں نامکمل شائع کیا تھا۔ ساغر کی صحت یابی کی دعا کی گئی ہے اور ماہانہ کلیم کے لیے اعلان شائع کرنے کا کہا ہے۔ نیز ساغر سے مشورے کے لیے میرٹھ آنے کی خبر بھی دی ہے۔ اس خط میں "کاخ بلند" کا نام "کلیم" کرنے کا اعلان بھی "ایشیا" میں طبع کرنے کا کہا ہے۔ ۱۹۳۵ء میں جوش نے تین خط ساغر کو روانہ کیے ہیں۔ سن ۱۹۳۶ء میں جوش نے پانچ مختصر خطوط ساغر کو روانہ کیے۔ ان خطوط میں کاروباری معاملات پر بات چیت ہے۔ ساغر کی بیماری پر تشویش ہے اور اپنے میرٹھ جانے اور ملاقات نہ ہونے پر رنج کا اظہار ہے۔

۱۹۳۷ء میں بھی جوش نے پانچ خطوط ساغر کے نام روانہ کیے۔ اسرائیل احمد خان کے معاوضے کی ادائیگی کے لیے زور ہے اور کسی شخص کی بد خصلتی کا تذکرہ ہے جو دولوگوں کے تعلقات بڑھنے کو غلط رُخ سے دیکھتا ہے۔ سیماب اور ساغر کے درمیان صلح صفائی کروانا اور دونوں کی شکر رنجی دور کرنا چاہ رہے ہیں۔ اس لیے ساغر کو دہلی بلوا رہے ہیں۔ مشاعرے میں شرکت کا دعوت نامہ لاہور سے ملا ہے۔ ساغر کو کہہ رہے ہیں کہ اگر میں نے دعوت بلا معاوضہ قبول کر لی تو روایت پڑ جائے گی اور اگر صاحب مشاعرہ رقم بھیج رہے ہیں تو انکار کیوں کیا جائے۔ سردی کی شدت ہے۔

۱۹۳۸ء میں جوش نے کوئی خط روانہ نہیں کیا۔ ۱۹۳۹ء میں جوش نے دو خطوط روانہ کیے ہیں۔

ایک سفارشی خط ہے جو حکیم محمد بشیر الدین محمود کی اعانت کے لیے لکھا گیا ہے۔ دوسرے خط میں دوستوں کی طرف سے تلخ تجربہ ہونے پر ساغر کی ڈھارس بندھائی ہے۔ جوش نے ساغر کو کہا کہ اگر ہم آپس میں محبت رکھتے ہیں۔ تم میری صحبت کے تمنائی ہو اور میں تمہارے دیدار کا طالب ہوں تو اس طلب و تمنا کی تہہ میں خلوص و محبت نہیں بلکہ ہم میں اکثر مصائب اور کمتر محاسن اتفاقیہ طور پر مشترک ہو گئے ہیں اور یہ اشتراک اگر باطل ہو جائے تو ہم ایک دوسرے کی ناک کاٹنے پر آمادہ ہو جائیں۔ یہاں جوش ایک نفسیات دان کی طرح انسانی فطرت کی رنگارنگی کو بیان کر رہے ہیں۔ انسان کے اندر کا پاجی بن شیطان کی جے جے کار کرواتا ہے۔

۱۹۴۰ء میں جوش نے تین خطوط تحریر کیے۔ ایک ملیح آباد لکھنؤ سے اور دوسرا بنارس باغ لکھنؤ سے لکھا گیا۔ شکوہ کیا گیا ہے کہ الہٰ آباد میں خراب طبیعت کو دیکھتے ہوئے بھی خط لکھ کر حال نہ پوچھا گیا۔ ساغر کو ملیح آباد آنے کی دعوت دی گئی ہے اور جولائی میں مسوری جانے کی اطلاع دی گئی ہے۔ دوسرے خط میں جواب لکھنے میں تاخیر کی معذرت کی گئی ہے۔ تیسرے خط میں خط لکھنے پر شکریہ ادا کیا ہے اس خط میں غالب کی تقلید میں مراسلے کو مکالمہ بنانے کی کوشش ہے۔ لکھتے ہیں:

"کہیے مزاج گرامی کیسا ہے! جی ہاں میں "خیریت" سے ہوں۔ آپ کی پُرسش کا شکریہ۔ تشریف رکھیے۔ ماحضر تناول فرما کر جایئے گا۔ سرِ دست پان حاضر ہے۔ تخت پر تکلیف ہو رہی ہو تو کوچ پر تشریف لے آیئے۔ میں تو آپ کا بے حد مشتاق رہتا ہوں لیکن دل میں کراہت آمیز قہقہے اور جلد تشریف لے جانے کی تمنا۔"(۱۱)

جوش نے ۱۹۴۱ء میں ایک مختصر خط تحریر کیا ہے جو نظر باغ لکھنؤ سے لکھا گیا ہے۔ مشاعرے میں جانے سے متعلق معاملات ہیں کہ اگر ان کی شرط مانی جاتی ہے تو وہ دونوں شریک ہوں گے ورنہ نہیں۔ ۱۹۴۲ء میں جوش نے تین عدد خط ساغر کو لکھے ہیں۔ دو خطوط نظر باغ لکھنؤ سے اور ایک چیل (دامنِ ہمالیہ) سے مرقوم ہے۔ لائل پور (فیصل آباد) کے مشاعرے میں پہنچنے کے لیے دو سو روپے روانہ کرنے کی شرط کا ذکر ہے اور مجاز کو بھی اگر مدعو کر لیا جائے تو سفر کا لطف دوبالا ہو سکتا ہے۔ اگلے خط میں لائل پور نہ پہنچ سکنے کی معذرت ہے اور روپیہ واپس کرنے کی اطلاع ہے۔ دو مارچ کو ہولی کے دن الٰہ آباد آنے کی دعوت دی ہے۔ تیسرے خط میں چَیل میں موسم کی خوبصورتی، پہاڑوں کا منظر برستی ہوئی بارش ساغر کو بھی جوش کے ہمراہ موجود ہونے کی تمنا دل میں جاگ رہی ہے۔ جوش کا دل کہہ رہا ہے کہ ایک معجزہ ہو جائے اور ساغر میرے پاس موجود ہو تو میں خدا کا قائل ہو جاؤں۔ لیکن معجزہ نہیں ہوا۔

۱۹۴۳ء میں جوش نے ایک خط تحریر کیا ہے۔ چوالیس اور پنتالیس میں بھی کوئی خط نہیں لکھا جا سکا۔ ۱۹۴۶ء کا ایک خط موجود ہے جس میں پرچہ ملتے ہی اپنی بیگم کے ساتھ سجاد ظہیر (بنے میاں) کے گھر پہنچنے کا کہا ہے۔

۱۹۴۸ء میں جوش نے ساغر نظامی کو آٹھ عدد خطوط لکھے ہیں۔ اس دوران جوش "آج کل" کے دفتر اولڈ سیکرٹریٹ، انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ ڈیپارٹمنٹ میں بیٹھا کرتے تھے وہاں سے یہ خط تحریر کیا ہے۔ اپنی خیریت کی اطلاع اور مکان مل جانے کا تذکرہ ہے۔

ایک خط میں شدید گرمی کے بعد مینہ کے سلسلے شروع ہونے کا ذکر ہے۔ جوش لکھتے ہیں کہ تم میرے معائب کے بہت بڑے عارف ہو اور میری طرف سے حسن ظن کو گُو کھانا سمجھتے ہو۔ لیکن پھر بھی ہمیں تم سے محبت ہے۔ ایک خط میں صرف ایک شعر درج ہے۔

اپنے ذرے کو آفتاب تو دو
میرے مکتوب کا جواب تو دو

(جوش بنام ساغر ص ۱۷)

ایک اور خط میں گلہ کرتے ہیں کہ ساغر خوش گمان بہت کم، بدگمان بہت زیادہ ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ میں دھوکہ دیتا نہیں ہوں، دھوکہ کھاتا ہوں۔ اگر میں آپ کا کام کر سکا تو کام خود آپ کو جھوٹا ثابت کرے گا اور اگر کام نہ ہو سکا تو آپ میری قسموں کے باوجود مجھ پر یقین نہ کریں۔

جوش یہاں اپنا نام جوش بخاری تحریر کر رہے ہیں۔ اسی سال کے ایک خط میں "عارف معائبِ جوش" کے لقب سے ساغر کو مخاطب کر رہے ہیں۔ ایک اور خط میں اپنی طویل نظم "حرفِ آخر" چھاپنے کی اجازت دے رہے ہیں اور رائلٹی کے سلسلے میں اپنی مجبوری کی طرف اشارہ بھی کر رہے ہیں۔ مولانا آزاد اور جواہر لال نہرو سے ساغر کے بارے میں سفارش کا تذکرہ بھی کر رہے ہیں۔ جوش نے اپنے دوستوں کو "ساغر وا" اور "مجر وا" کی عرفیت سے پکار رہے ہیں۔ آخر میں "تمہارا ہدف ناوکِ بد ظنی، جوش نادرو غنی"

۱۹۴۹ء میں بھی جوش نے پانچ خطوط ساغر کو تحریر کیے ہیں۔ جوش کی رائلٹی کی بات پر ساغر نے لکھا تھا کہ کیا آپ مجھ کو سیٹھ سمجھ رہے ہیں۔ جو پچیس فیصد رائلٹی مانگ رہے ہیں جواب میں جوش لکھتے ہیں کہ تم سے کون رائلٹی مانگ رہا ہے۔ رائلٹی تو وہ دے گا جو تم سے "حرفِ آخر" طبع کرنے کا معاملہ کرے گا۔ تمہیں تو روپیہ اپنی جیب سے ادا نہیں کرنا پڑے گا۔ پھر کیوں تمہیں مسئلہ ہو رہا ہے۔ نذیر احمد صاحب سے بھی میں نے پچیس فیصد سے کم رائلٹی نہیں لی۔ ہالکسر صاحب نے اگر میری کتابیں طبع کیں تو پونے اور ممبئی کے دوران لینے والے قرض سے سبکدوش ہو

سکوں گا۔ بصورتِ دیگر میری نظم صرف تمہارے پاس طبع ہو گی۔ پنڈت نہرو اور مولانا آزاد سے سفارش کا ذکر ہے کہ اگر خود آ کر ملو تو بات زیادہ اثر کرے گی۔ ''ایشیا'' کے ملنے پر تعریف کی گئی ہے۔ ایک جگہ اپنا نام ''جوشِ خر گوش'' تحریر کیا ہے۔ جوش صاحب دوستوں کو خط میں کھل کر اظہار بیاں کے عادی ہیں۔ بعض اوقات یہ ابتذال اور پھکڑ پن معیوب لگتا ہے۔ ایک خط میں ساغر کو لکھتے ہیں کہ ترقی پسندوں پر سب و شتم کے سلسلے میں دیسی ریاستوں اور وظیفہ خواروں کی طرف جو اشارہ کیا گیا ہے شایان صد ہزار آفرین ہے۔ اب قطعی مایوسی ہے کہ آپ کا دل صاف نہیں ہو سکتا۔

۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۱ء میں جوش نے کوئی خط تحریر نہیں کیا جبکہ ۱۹۵۲ء میں ایک خط تحریر کیا گیا ہے۔ جس میں ساغر کے دلی آنے اور جوش کے ملنے نہ جانے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ انہیں ساغر کے میزبان کا گھر معلوم نہ تھا نیز انہیں ساغر کی مزاجی کیفیت کا ڈر تھا جو پل پل بد گمانی کی دلدل میں دھنسا دیتی تھی۔ ۱۹۵۳ء میں ایک خط ساغر کو بھیجا ہے اور ساغر کے جے پور میں نواب لوہارو کے گھر قیام کا تذکرہ ہے۔ ۱۹۵۴ء میں جوش نے ساغر کو تین خطوط روانہ کیے ہیں۔ ایک خط میں جوش کو خود کو ''زنگ خوردہ پہیہ یا چکٹا ہوا ٹاٹ کا ٹکڑا'' کہہ رہے ہیں اور جبرائیل کو ''اللہ میاں کا مرغا'' قرار دے رہے ہیں۔ دو خطوط سفارشی تحریر کیے ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں دو خطوط تحریر کیے ہیں جو ''سفارشی رقعے'' کی ذیل میں آتے ہیں۔ اس کے بعد ایک طویل وقفہ ہے جو جوش کے پاکستان ہجرت کر جانے کی وجہ سے ہے۔ یہ خط ترقیٔ اردو بورڈ، کراچی کے پتے سے روانہ کیا گیا ہے اور ساغر کے والد کے انتقال کے بعد بھیجا گیا۔ تعزیتی خط ہے۔ والد کے انتقال کو قدیم تہذیب کے اعلیٰ نمونے اور قدیم دوست سے محرومی قرار دیا ہے۔ ۱۹۶۶ء میں ایک خط بھیجا گیا ہے۔ ۱۹۶۷ء کا ایک خط ہے جس میں سفارش کی گئی ہے کہ حاملِ رقعہ کی مدد کریں۔

اس کے بعد سات عدد خطوط ہیں جن پر تاریخ روانگی تحریر نہیں ہے۔ ایک خط میں ساغر کی طرف سے بھیجے جانے والے کپڑوں کے لوٹانے کی توجیہہ یہ پیش کی گئی ہے کہ جب تک ان کے پاس دولت و ریاست باقی تھی وہ دوستوں کے تحائف قبول بھی کرتے تھے اور انہیں جوابی تحائف بھی دیتے تھے۔ اب جبکہ وہ معاوضہ پیش نہیں کر سکتے تو تحائف قبول کرنا اصول کے خلاف تصور کرتے ہیں۔ لیکن ساغر کی شرافت و محبت کی دھاک ان کے دل پر بیٹھ کر عزت پیدا کر چکی ہے۔ ایک خط میں جوش اپنی محفل میں حاضری کو بارگاہِ الوہیت میں حاضری قرار دے رہے ہیں اور خود کو ''الہِ دوراں'' کہہ رہے ہیں۔ دو خطوط ذکیہ ساغر کے نام ہیں۔ ۵ جولائی ۱۹۴۵ء کے مرقومہ خط میں ذکیہ بیگم کو اپنی طویل نظم ''حرفِ آخر'' کے ''تین سین'' اور دو نظمیں اپنی کتاب میں طبع کرنے کی اجازت دے رہے ہیں۔ ۱۳ اکتوبر کو جوش نے دیکھا کہ وہ اس خط کو روانہ کرنا بھول گئے ہیں تو انہوں نے بدیر اس خط کو معذرت کے ساتھ روانہ کیا۔ دوسرا خط ۲۴ فروری ۱۹۴۹ء کا ہے۔ ساغر کو ذکیہ کے ذریعے یاددہانی کروا رہے کہ جلد اپنا کلام روانہ کریں۔ ایک خط ساغر کے چھوٹے بھائی اسد کے نام ہے۔ اس خط کو بریلی ملٹری ہوٹل سے لکھا گیا ہے اور ساغر کی بخار کی وجہ سے روانگی میں تاخیر بیان کی گئی ہے۔ ایک خط بشیر حسین زیدی صاحب کے نام ہے جن کے دفتر کے باہر جوش ملاقات کے انتظار میں بیٹھے تھے کہ کوئی اور صاحب کو بلایا گیا تو جوش نے ایک رقعہ احتیاج، احتیاج، احتیاج روئے احتیاج سیاہ لکھ کر روانہ کیا۔ جوش نے کہا کہ میں پہلی گاڑی سے واپس روانہ ہو جاؤں گا اور آپ کے احسان کو یاد رکھوں گا۔ اسی خط کی پُشت پر زیدی صاحب کا مرقومہ رقعہ بھی ہے کہ شاعر ذکی الحسن ہوتے ہیں اور انہیں سب باتیں معاف ہیں مگر جوش میں ہوش نہ کھونا چاہیے۔ انسان کا کردار اور اس کی نفسیات اس کی تحریر و تقریر سے عیاں ہوتے ہیں۔ جب انسان اپنی قریبی شخصیت کے نام کچھ تحریر کرتا ہے تو گویا وہ اس خط کو اس کا قائم مقام تصور کر کے اس سے اپنے دل کی باتیں کرتا ہے۔ بے تکلف دوستوں کو انسان من و عن اپنے پر گزرنے والے حالات و واقعات بتا کر دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہے۔ بعض اوقات انتہائی نجی باتیں بھی خطوط کے ذریعے منظر عام پر آ جاتی ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں۔

"خطوط اور عام کردار، انسانی فطرت اور تحریر و تقریر اس کے انعکاسات ان تمام باتوں کا بہترین مظاہرہ جوش کے خطوط ہیں۔ وہ خطوط میں بھی اسی طرح (Satirist) طنز نگار ہیں جس طرح اپنی شاعری میں"(۱۲)

جوش نے ان خطوط میں اپنی حد تک ساغر کے دل پر چھائی ہوئی گرد کدورت کو دور کرنے کی کوشش کی ہے کہیں کہیں انہوں نے طنز و تعریض کے تیر برسائے ہیں لیکن اکثر دوست کے بارے میں فکر مندی ان کے لہجے سے عیاں ہے۔ جوش و ساغر کے گھریلو مراسم تھے۔ دونوں خاندانوں کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا تھا۔ جوش اپنے سفر کی تفصیلات سے ساغر کو آگاہ کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ دوسرے کی تکلیف کا احساس جوش کی حساس طبیعت کو تڑپا دیتا ہے۔ القاب و آداب کا نیا پن بھی ان خطوط میں دکھائی دیتا ہے۔ تشبیہات، استعارات اور محاورات کا استعمال بھی جوش کی قادر الکلامی کو ظاہر کرتا ہے۔ کہیں کہیں کرم خوردہ اور کہیں کہیں نا قابل اشاعت ہونے کی وجہ سے تحریر کو حذف کیا گیا ہے۔ جوش بار بار ساغر کو ان کی بد گمانی کا احساس دلاتے ہیں۔ تعلقات میں رخنہ تو پونا کمپنی میں ملازمت کے دوران پڑ گیا تھا۔ دلوں کی پھانس نے دو مخلص دوستوں کو الگ کر دیا لیکن پھر بھی قربت کا احساس دوریوں کے باوجود اکثر دونوں کو تعلقات کی تجدید پر اکسایا کرتا تھا۔ طنز کے کٹیلے وار جوش ساغر پر کرتے ہیں تو ساغر آہِ پُر درد کے ساتھ ان کو سہہ جاتے ہیں۔ شگفتگی اور اپنائیت جوش کے خطوط سے عیاں ہے۔

3- خطوط جوش ملیح آبادی

جامع و مرتب: راغب مراد آبادی

یہ مجموعہ ویلکم بک پورٹ، کراچی سے ۱۹۹۳ء میں طبع ہوا۔ انتساب کتابوں کے دل دادہ اہل ذوق کے نام ہے۔ ابتداء میں ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا مقالہ ''خطوط جوش۔ جوش شناسی کی طرف ایک اہم قدم'' ہے۔ ۳ جولائی ۱۹۹۳ء کا تحریر کردہ مقالہ ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب نے جوش کے خطوط کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے اس کے ساتھ ساتھ راغب مراد آبادی کی مساعی کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے کہ انہوں نے جوش کی زندگی کے آخری ۳۷ سال ساتھ گزارے اور آخری دس سال ایک عجیب و غریب دوستانہ روش کے ساتھ گزارے۔

اگلا مقالہ خطوط نگاری اور جوش ملیح آبادی ہے۔ یہ راغب مراد آبادی کا تحریر کردہ ہے اس میں انہوں نے اردو خطوط نویسی کی مختصر روایت بیان کر کے خطوط جوش کو مرتب کرنے میں جن باتوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے، ان کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں علامہ شبلی نعمانی کے اُس مشورے کو مد نظر رکھا گیا ہے جو انہوں نے مولوی احسن اللہ خاں ثاقب کو دیا تھا۔ مولوی احسن اللہ نے مکتوبات امیر مینائی کے دیباچے طبع اوّل میں لکھا ہے۔

> "میرا مقصد تھا کہ صرف وہی خطوط کتابی حیثیت میں شائع کیے جائیں کہ جن میں ادب کی رنگینی ہو یا فن شعر کے متعلق کوئی نکتہ بحث یا کوئی بات ہو مگر شمس العلماء مخدومی حضرت مولانا شبلی نعمانی دامت افافتہم نے فرمایا کہ نہیں، تمام تحریریں جو مل سکیں بلا ترک و حذف درج کی جائیں کیونکہ مصنف کے فقرے فقرے اور لفظ لفظ سے ان کے حالات، خیالات، ذکاوت اور طبیعت کا پتہ لگتا ہے۔ پھر ایسے خط ہیں جن میں انشاء کی رنگینی یا بحثِ فن ہو، بہت کم مل سکے، پس جو مکاتیب استاد مرحوم کے مجھ کو بہم پہنچے وہ سب شائع کیے جا رہے ہیں۔"(۱۳)

اسی لیے راغب مراد آبادی نے جوش کے دستیاب شدہ تقریباً سو(۱۰۰) خطوط مع چند خطوط عکسی نقول اور اشاریہ کے اس مجموعے میں پیش کیے ہیں۔ ان خطوط میں ہم جوش کو مختلف رنگوں میں دیکھیں گے کبھی عاشقِ جانثار اور کبھی عاشقِ بدگمان کی صورت (جو تقریباً ۷۶ سال کی پیرانہ سالی میں لاحق ہونے والے عشق کا نتیجہ ہے) کسی خط میں ان کی خلوتِ خاص کا جلوہ ہے تو کسی میں ایک رندِ خراباتی دکھائی دیتے ہیں۔ کسی خط کے ذریعے جوش کے نفسیاتی رویے واضح ہوتے ہیں۔ کہیں جوش مذہبی طور پر فراخدل اور وسیع المشرب شخص کے روپ میں دکھائی دیتے

ہیں۔ مذہبی منافرت کے خلاف جوش کے خیالات بڑے واضح اور نام نہاد علماء اور علمائے سُو کی منافقت کے خلاف جوش کے مذہبی خیالات کا اعادہ نظر آتا ہے۔ پہلے دو خطوط بابا ذہین شاہ تاجی کے نام ہیں۔ پہلا خط ۱۵ جولائی ۱۹۷۲ کا مرقومہ ہے۔ اس میں جوش نے اپنی خیریت کی اطلاع دیتے ہوئے اس امر پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ طبیعتوں کے تفاوت کے باوجود ان کا دل کیوں بابا جی کی طرف کھنچتا ہے۔ جوش لکھتے ہیں۔

> "آپ پیر ہیں، میں رند ہوں۔ آپ صد حیف کہ "دین دار" ہیں: میں بحمد اللہ کہ بے دین ہوں۔ آپ پانی بھری بوتلوں پر دم فرماتے ہیں۔ میں آگ بھرے ساغروں پر دم دیتا ہوں۔ آپ کے ہات میں سبحہ صد دانہ اور میرے ہات میں زلفِ جانانہ ہے۔ آپ کے گرد و پیش، مریدوں کی سانسیں ہیں، میرے سینے میں کچی جوانیوں کے انفاس کی پھانس ہیں۔ الغرض ایک شے بھی مشترک نہیں۔ ہمارے درمیان پھر بھی، میرا دل آپ کی طرف کھنچتا ہے"(۱۴)

اگلا خط ۲۲ نومبر ۱۹۷۲ء کا تحریر کردہ ہے، اس میں گھر میں تنہا ہونے اور اپنے دل میں پیدا ہونے والے اس دھڑکے کو بیان کر رہے ہیں کہ شائد دل کے دورے میں ان کی جان چلی جائے۔ یہاں جوش ایک قنوطی کا روپ دھارے دکھائی دے رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ "حیاتِ انسانی ایک عبرت ناک ٹریجڈی اور کرۂ خاکی ایک ہولناک مقتل ہے۔(۱۵)

اگلے چھ خطوط محمد حبیب اللہ رشدی کے نام ہیں۔ پہلا خط طاہر پیلس پونا سے لکھا گیا ہے۔ بنا کسی القاب و آداب کے خط شروع ہوتا ہے۔ رسمی خط ہے جس میں مکتوب الیہ کو پونا آنے کی دعوت دی گئی ہے اور دیگر دوستوں کے بارے میں استفسار ہے تاریخ اور مقام روانگی آخر میں تحریر کیا گیا ہے۔ تاریخ ۴۳ / ۶۱ درج ہے۔ اگلا خط سن ۴۴ء میں تحریر کیا گیا ہے۔ یہ بھی رسمی ہے لیکن اس میں مقام روانگی اور تاریخ ابتدا میں تحریر کر دی گئی ہے۔ القاب موجود ہے لیکن آداب نہیں ہے۔ اگلا خط اولڈ سیکرٹریٹ دلی سے تحریر کردہ ہے۔ تاریخ درج نہیں کی گئی ہے۔ ایک اور خط سن ۴۶ء کا تحریر کردہ ہے۔ یہ بھی پونا سے لکھا گیا ہے۔ رشدی صاحب کی طرف سے لیے گئے قرض کی ادائیگی کا تذکرہ ہے۔ ایک خط ۴۷ء کا تحریر کردہ ہے جو رسمی خط ہے۔ ۱۸ نومبر ۱۹۵۰ء کا تحریر کردہ خط دہلی سے لکھا گیا ہے۔ مقام روانگی اور تاریخ خط کے آخر میں ہے۔ القاب نفسِ مضمون کے ساتھ ہے۔ آداب کی جگہ نہیں ہے۔ حیدر آباد جانے کے بعد دوستوں کی یاد ہر ہر قدم پر ہمراہ تھی۔ جوش دوستوں کے حالات سے باخبر رہنا اور ان کو اپنے حالات سے باخبر رکھنا ضروری سمجھتے تھے۔ تین خطوط زاہد کلیم کے نام ہیں جو مظفر آباد آزاد کشمیر کے رہنے والے اور جوش کے مداح ہیں "یوم جوش" منانا چاہتے ہیں جبکہ جوش کہتے ہیں کہ کچھ وقت انتظار کرو پھر "یوم وفات جوش منالینا" دو خطوط خان بہادر میاں محمد صادق ڈی ایس پی سی آئی ڈی کے نام ہیں۔ ایک خط سن ۴۶ء کا تحریر کردہ ہے اور دوسرا سن ۱۹۴۸ء کا مرقومہ ہے۔ دوستوں سے چاہے عرصہ تک نہ ملیں لیکن ان کی یاد انسان کے دل کو کانٹے کی طرح چبھتی ہے۔

۱۹ خطوط خورشید علی خان صاحب کے نام ہیں۔ پہلا خط ۲۱ ستمبر ۱۹۷۱ء کا تحریر کردہ ہے۔ اس میں قدرت اللہ شہاب سے خورشید علی خان کے کام کی بابت کوشش کا ذکر کیا ہے کہ میں آپ کے کام کے سلسلے میں ان کو لاکھوں فون کر چکا ہوں لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ جوش دوستوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے ہیں۔ یکم فروری کے خط میں جوش ابتدا کرتے ہیں، حکومت کا فراز اسلام آباد جوش نے یہ خط خورشید علی خان کے چھوٹے بھائی کی رحلت پر تعزیت کے لیے تحریر کیا ہے۔

۳ مارچ ۱۹۷۳ء کے ایک خط میں جوش نے بھٹو کی طرف سے وزارت تعلیمات میں تقرر کا بتایا ہے اور پچھلے چھ مہینوں سے بند تنخواہ کے جاری ہونے کی خبر دی ہے۔ نیز اکادمی آف لیٹرز کے قائم ہونے کا ذکر بھی کیا ہے۔

جوش نے اکادمی کا یہ مقصد بیان کیا ہے کہ انقباض جہل و انشراح علم" ہے۔ جوش عقل و شعور کو جگانے اور حکمت و منطق کی راہ پر چلنا ہی مسلمانوں کا مقصد حیات قرار دے رہے۔ ۱۲ جنوری ۱۹۷۴ کے خط میں کراچی جانے اور خورشید علی خان کے گھر ٹھہرنے کا ذکر کیا ہے کیونکہ

جوش کے گھر میں نہ سواری ہے اور نہ ٹیلی فون موجود ہے۔ قیام و طعام خورشید صاحب کے ذمے ہوگا جبکہ پینے کا بار جوش خود اٹھائیں گے۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۵ء کے ایک خط میں جوش لکھتے ہیں کہ زندگی تین عدد موذی میموں یعنی مسائل، معاشقے اور معاش میں گھری ہے۔ ۶ اگست ۱۹۷۵ء کے خط میں جوش خورشید علی خاں کے اس احسان کا ذکر کر رہے ہیں جس کی وجہ سے انہیں اپنی محبوب فتنۂ آخر الزمان کے ساتھ تنہائی کے لمحات میسر آئے۔

جنوری ۱۹۷۵ء کے ایک خط میں جوش نے ایک مطلع اور چار رباعیاں لکھ کر روانہ کی ہیں۔ خورشید علی خاں کو ۲۱ اگست ۱۹۷۵ء کے ایک خط میں خورشید علی خاں کو اپنے بے وقت کے عشق کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"میں تو بڑے لفڑے میں پڑا ہوا ہوں۔ خورشید صاحب، خوب جانتا ہوں یہ موسم ان لغویات کا نہیں ہے۔ لیکن کیا کروں، میری عقل، گدھوں کی کھائی ہوئی جھوٹی گھاس چر رہی ہے اور میرے سینے کا لونڈا، عقل کو ٹھینگا دکھا دکھا کر، سیٹیاں بجا اور ہپ ہپ ہرا کر رہا ہے۔(۱۶)

ایک تعریفی خط محمد برہان الدین بقا نظامی کی "حمد و نعت" پر رائے کے سلسلے میں ۱۹ مارچ ۱۹۷۸ء کا مرقومہ ہے۔

ایک سفارشی چھٹی اختر حسین رائے پوری کے نام ہے جو کہ کراچی پاکستان میں محکمۂ تعلیم سے منسلک تھے۔ یہ رشدی صاحب کے بارے میں ہے جنہوں نے اردو نستعلیق ٹائپ ایجاد کیا ہے۔ اور ایک خط رشدی صاحب کی سفارش کے لیے سید ہاشم رضا کو بھی روانہ کیا ہے۔ ہاشم رضا کے نام جوش کے چار خطوط ہیں۔ ایک دوسرے خط میں مشاعرے میں پہنچنے کی فرمائش کی گئی ہے جہاں حُسینیہ ایرانیاں کھارادر میں اپنا مسدس پڑھ رہے ہیں۔ اگلا خط مکتوب الیہ کے معذرتی خط کے جواب میں ہے۔

اگلے پندرہ خطوط میرزا جعفر حسین ایڈووکیٹ، لکھنؤ کے نام لکھے گئے ہیں۔ زیادہ تر خطوط طاہر پیلس پونا کے پتے سے لکھے گئے ہیں جب جوش شالیمار فلم کمپنی میں کام سے گئے تھے۔ دوستوں کے ہاں قیام کرنا اور ان کو اپنے احوال کی خبر دینا جوش کو ہمیشہ مرغوب رہا ہے۔ دوستوں سے بے تکلفی اس حد تک ہے کہ گھریلو مراسم بھی قائم ہو چکے ہیں۔ جوش کے اہل خانہ جب لکھنؤ جائیں تو انہیں میرزا جعفر حسین کے ہاں اپنے گھر جیسا ماحول ملے۔ جوش کو اپنے دوستوں پہ بہت مان تھا جب یہ مان ٹوٹا تو جوش کو بہت رنج ہوا۔ اس کا اعلان ایک خط میں جوش اپنی اس رنجش کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

"میر جعفر صاحب، اگر احساسات کی نازکی اور خلاف توقع امور پر دل کی شکستگی کا نام ہے انتقام، تو میں منتقمِ حقیقی سے بھی زیادہ منتقم ہوں۔"(۱۷)

دو خطوط میں اپنی رباعیات اور عرش و فرش کا مسودہ برادرِ خورد رئیس احمد خاں کی وساطت سے واپس منگوانے کا تذکرہ ہے۔

جوش اپنی طبیعت اور صحت کی خرابی یا شگفتگی کی اطلاع بھی دوستوں کو اپنے خطوط میں دے دیا کرتے تھے۔ ایک خط میں رقمطراز ہیں۔

"یہ اتار کا وقت ہے۔ کھانا دیر میں کھانے اور حسب معمول آرام نہ کرنے کے باعث طبیعت میں، بدرجہ غبادت، افسردگی ہے۔"(۱۸)

چونکہ میرزا جعفر حسین جوش کے وکیل بھی ہیں اس لیے قانونی مسائل کے بارے میں بھی ان سے مراسلت تھی۔ علاوہ ازیں دوستی کا رشتہ بھی محکم تھا۔ جوش نے ساری عمر عیش کوشی میں گزار دی۔ اکثر قرض پر گزارا چلتا تھا۔ ایک خط میں جو کہ ۲۷ ستمبر ۱۹۵۰ء کا مرقومہ ہے۔ میرزا جعفر کو بتا رہے ہیں کہ ۹۸۰ روپے میں سے صرف چار سو چالیس بچتے ہیں۔ اخراجات وہی ہیں اب تو یہ حال ہے کہ سخاوت ۴ فی صد روپیہ سود پر رقم لا رہا ہے جس سے گزارا چل رہا ہے۔ دو خطوط شہزادہ میرزا عالمگیر قدر کے نام ہیں جو کہ جوش کے خاص دوستوں میں سے ہیں۔ پہلا خط

جوش، منور عباس اور علی حسنین زیبا کے نام سے مشترکہ ہے۔ اگر آپ ہمیں معاف فرما کر پھر سے ملنے جلنے کا آغاز کریں گے تو خوشی ہو گی۔ دوسرے خط میں اپنے خط نہ لکھنے کی وضاحت کی ہے اور جو نظم روانہ کی ہے اسے نقوی صاحب کو پہنچا دو۔ اگلا مکتوب سید فراست رضوی کے نام ہے۔ جوش فراست کو چھیڑ رہے ہیں کہ نام تو فراست ہے لیکن چھائی ہوئی غباوت ہے۔ سب نے امرد کہا تو شرما گئے۔ جوش فراست کو احتیاط کی تلقین کر رہے ہے کہ اس فتنۂ روز گار کا پورا نام لکھنے کی بجائے فقط "ص" لکھنا اور اپنی تازہ رباعیاں ضرور درج کرنا کہ اس امردیت میں تم کتنی اچھی رباعی کہنے پر قادر رہو۔

راغب مراد آبادی کے نام جوش نے کل '۳۰' خطوط روانہ کیے۔ ان خطوط میں استفساراتی، رسمی اور وضاحتی خطوط شامل ہیں۔ پہلے خط میں جو کہ چھ اپریل ۱۹۵۵ء کا تحریر کردہ ہے، جوش نے راغب مراد آبادی سے پوچھا ہے کہ مشاعرے والوں نے چودہ سو روپیہ آمدورفت کا کرایہ جمع کرا دیا ہو تو آپ اور آغا قزلباش مجھے بذریعہ تار مطلع کریں۔ کچھ خطوط میں مختلف مشاعروں میں جانے کے لیے انتظامیہ کی طرف سے دی جانے والی رقم کے بارے میں وضاحت طلب کی گئی ہے۔ کچھ میں اپنی بیماریوں کے بارے میں اطلاع ہے، کچھ خطوط میں اپنی مصروفیات کے بارے میں اطلاع ہے۔ کچھ خطوط میں مشاعرے میں اپنے ساتھ شرکت کی دعوت ہے جو کہ انتظامیہ کی طرف سے اختیارات حاصل ہونے کے بعد دی گئی ہے۔ نیز وہاں سے ملنے والے سفر خرچ کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے۔ ۱۸ اگست ۱۹۵۵ء کے ایک خط میں راغب مراد آبادی کی سلاموں اور رباعیوں پر مشتمل کتاب پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور ان کے محاسنِ شعری کی داد دی ہے کہ سید الشہداء سے آپ کو جو محبت ہے اس نے اس مجموعے کو بلند مقام تک پہنچا دیا ہے۔ جوش نے کراچی سے اسلام آباد جانے اور وہاں دوستوں کو محفل میں شریک نہ ہو سکنے کا افسوس کیا ہے کہ منور عباس کے ہاں تمام دوست شریک محفل ہوں گے اور میں بدبخت یہاں بیٹھا رہوں گا۔ جوش نے اسلام آباد سے سولہ خطوط راغب کو روانہ کیے ہیں۔

۲۲ جون ۱۹۷۳ء کا ایک خط ہے جو کہ کتابت کی غلطی سے ۲۲۔۶۔۲۳ ہو گیا ہے۔ جوش و راغب کی پہلی ملاقات ۱۹۳۵ء میں ہوئی تھی اس لیے اس کا امکان بھی نہیں ہے۔ دوسرے راغب کی عمر اس وقت بہت کم تھی کیونکہ راغب کی تاریخ پیدائش ۲۷ مارچ ۱۹۱۸ء ہے۔ دوسرے اس خط میں فتنۂ آخر الزماں کا تذکرہ ہے اور یہ لگ بھگ ۱۹۷۳ء کا زمانہ ہے۔ اسی لیے ہم اس خط کو ۲۲ جون ۱۹۷۳ء کا خط کہہ سکتے ہیں۔ اس خط میں جوش نے آخری عمر میں عشق میں گرفتار ہونے پر خود کو لعن طعن کی۔ جوش تمام عمر اپنے بیٹے، بیٹی اور ان کے بچوں کے لیے پریشان رہے۔ وہ مشاعروں سے اور ادھر ادھر سے جو بھی رقم حاصل ہوتی تھی اپنے متعلقین کو پہنچا دیا کرتے تھے۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۷۳ء کے ایک خط میں چودہ سو کا ڈرافٹ اپنے بیٹے سجاد اور بیٹی سعدیہ کے نام روانہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "آپ کو تکلیف یوں دے رہا ہوں کہ بلوڈا کو کے ہات کہیں یہ رقم نہ پڑ جائے۔"(۱۹)
>
> ۵ اگست ۱۹۷۳ء کے مکتوب میں "میرے معاصر احباب" جو کہ جوش کی آپ بیتی کا ایک اہم حصہ ہے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ "ابھی تک میرے ذہن کی باگ اس طرف مڑی نہیں ہے۔" ساتھ ساتھ منظر نگاری بھی کر رہے ہیں۔ اس وقت گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں، ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے، ہوا میں سردی کی دھار اتنی ہے کہ بدن میں چُبھ رہی ہے۔ سہ پہر کا وقت ہے، چار بجنے میں سترہ منٹ باقی ہیں۔"(۲۰)

میرزا جعفر کی موت پر دلی رنج و غم کو ظاہر کیا ہے کہ ابوالحسن بلگرامی، زیبا، رشدی، قیصر، حکیم ندیم کے بعد اب میرزا جعفر بھی چلے گئے۔

کراچی بیٹھ کر بھی جوش چین سے نہیں تھے۔ گھر کے بل بھی جوش دیا کرتے تھے۔ راغب کو بل روانہ کیے ہیں کہ کسی طرح ان میں کمی کروادو نہیں تو میرا امکان ان کی نذر ہو جائے گا۔

یادیں ہیں جو ان کا سرمایۂ حیات ہیں اسلام آباد کے موسم کراچی کی محبتیں ہیں جو جوش کو رہ رہ کر تڑپا رہی ہیں۔ حسیناؤں کی محبتیں ہیں اور نوجوان عقیدت مند شاعروں کا التفات ہے جو جوش کو ان محفلوں کی یاد سے غافل نہیں ہونے دیتا جو کہ ختم ہو چکی ہیں۔ اپنے بیٹے سجاد کے نام کئی مرقبہ ڈرافٹ روانہ کیا ہے بذریعہ راغب مراد آبادی۔

۳۱ اکتوبر ۱۹۷۴ء کا ایک خط ہے جس میں ''یادوں کی برات'' کا مسودہ کتابت کرنے والے صاحب کے حوالے کرنا کا کہا ہے۔ نیز کتابت کی تصحیح (پروف ریڈنگ) بھی راغب صاحب کی ذمہ داری قرار دی ہے۔ ممتاز حسن کی موت پر تاثرات تحریر کیے، ان کو بھی کسی اخبار میں چھپوانے کی ذمہ داری راغب مراد آبادی پر ڈالی ہے۔ خط کی ابتداء کچھ یوں ہے۔ مرغوب جوش، راغب، محبوبِ جوش، راغب

۹ اگست ۱۹۷۵ء کے ایک خط میں ''یادوں کی برات'' کی کتابت جلد از جلد مکمل کرنے کی تاکید کی ہے۔ لاہور سے تقاضوں پر تقاضے آ رہے ہیں۔ اگر کتابت میں دیر ہو گئی تو کہیں طباعت ہی خطرے میں نہ پڑ جائے۔ اس کے علاوہ ذکر و فکر کے لیے ایک مضمون لکھا ہے وہ بھی برائے ملاحظہ ارسال کیا ہے۔ مضمون میں عورت کو بلائے بے درماں کہا ہے کہ افلاطون کی پشت پر سوار ہو کر اسے گھوڑا بنا اور نپولین اعظم کی ناک چھید ا سے نتھنی پہنا چکی ہے۔ ۱۷ جنوری ۱۹۷۷ء کے خط میں فتنۂ آخر الزماں کے کام کروانے کا کہا ہے ورنہ وہ جوش سے بولنا ترک کر دے گی۔ جتوئی صاحب ہی یہ کام کروا سکتے ہیں جو کہ سندھ کے چیف منسٹر اور (عبوری دور میں وزیر اعظم پاکستان بھی ہوئے)

تین خطوط راغب صاحب کے بیٹے کی وفات پر تعزیت کے لیے تحریر کیے ہیں۔ ایک خط ۲۲ دسمبر ۱۹۸۰ء کا ہے اور ۲۵ جنوری ۱۹۸۱ء کا ہے۔ دو خطوط مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے جو کہ ایک خط طاہر پیلس پونا سے لکھا گیا ہے جو کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ہے جو کہ دوبار آل انڈیا کانگریس کے صدر اور پارلیمنٹ میں ڈپٹی لیڈر منتخب ہوئے اور بعد میں ہندوستان کے پہلے مسلمان وزیرِ تعلیم رہے۔ اس خط میں جوش نے اپنے دوست حبیب اللہ رشدی کی سفارش کی ہے کہ انہوں نے نستعلیق ٹائپ مشین ایجاد کی ہے۔ اگر ان کیا سرپرستی ہو جائے تو اردو زبان کی خدمت ہو گی۔ یہ سفارشی خط ۱۹۴۷ء کا تحریر کردہ ہے۔ ایک اور سفارشی خط ہے جو کہ ۱۷ اگست ۱۹۴۷ء کا تحریر کردہ ہے۔ اس میں اپنے دوستِ قدیم اسرائیل احمد خان کے لیے چند سطریں وکٹر ہیوگو کے ناول ''Laughing Man'' کے اردو ترجمے کے لیے تحریر کرنے کی درخواست کی ہے۔ ساتھ ہی آزادی کی صبح کاذب کی مبارک باد دی ہے اور مولانا کو اطلاع دی ہے کہ وہ آج کل ممبئی میں مقیم ہیں۔ ایک خط سید علی اختر کے نام ہے جو کہ جوش کے ہم عمر اور صف اول کے نظم گو شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ خط ۲۲ مئی ۱۹۵۱ء کا مرقومہ ہے۔ اختر صاحب کی ایک طویل نظم ''قولِ فیصل'' کے نام سے منظر عام پر آئی تھی جس میں ان کے عقائد و تصدیقات کے اختلاف کی بات تھی۔ جوش نے وضاحت کی ہے کہ میں پہلے سے آپ کے عقائد و تصدیقات کو جانتا ہوں اور قول فیصل میں وہی کچھ ہے جو میرے علم میں ہے۔ اس بنا پر ہماری آپس کی محبت ختم نہیں ہو سکتی۔ یہاں جوش اختر صاحب کو چھیڑ رہے ہیں کہ آپ ابھی تک ذہنی طور پر لونڈے ہو۔ میاں تمہاری کبھی مسیں بھی بھیگیں گی کہ نہیں۔

ایک خط محسن بھوپالی کے نام ہے جو کہ ۲۸ اگست ۱۹۲۸ء کا تحریر کردہ ہے۔ اس میں محسن بھوپالی سے معذرت کی ہے کہ وہ اپنی شدید ترین مصروفیات میں سے محسن بھوپالی کی فرمائش پر عمل کے لیے وقت نہیں نکال سکتے۔

اس خط میں جوش نے محسن بھوپالی کی لسانی اغلاط کی نشاندہی کی ہے اور افسوس کا اظہار کیا ہے کہ پاکستان کے ارباب جب اس قدر غلط بولیں گے تو عوام کی صحتِ زباں کا کیا عالم ہو گا۔

ایک خط رئیس امروہوی کے نام ہے۔ جوش نے یہ خط لکھتے ہوئے رئیس امروہوی کے لقب ''رئیس الشعراء'' سے انہیں پکارا ہے اور خود کو ''گدائے راہ نشیں'' قرار دیا ہے اور دونوں مجموعہ ہائے شاعری کے ملنے پر شکریہ ادا کیا ہے۔

دو خطوط منور شہاب ایڈووکیٹ کے نام ہیں۔ منظر نگاری بہت خوب کی ہے۔ اسلام آباد کی تنہائی اور بے قدریٔ زمانہ ہے کہ داد کے طور پر بڑے بڑے سنجیدہ لوگ بھی قہقہے برسانے لگتے ہیں۔ یہاں جوش فتنۂ آخر الزماں کی محبت کو زوال ناپذیر کہہ رہے ہیں۔ بقول جوش

''اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کی محبت جمال کی بنا پر نہیں ''میرے اس کمال'' پر مبنی ہے جس کو وہ مجھ ناقص کی ذات سے وابستہ کیے ہوئے ہے... دل کی محبت ناپائے دار اور دماغ کی محبت غیر قانونی ہوتی ہے۔''(۲۱)

ایک رسیدی خط تابش دہلوی کے نام ہے جس میں ان کے محبت نامے کے ملنے اور اپنی بیماری کی وجہ سے زیادہ نہ لکھنے کی وضاحت ہے۔ یہ خط 24 جنوری ۱۹۸۱ء کا مرقومہ ہے۔ ایک خط ۱۷ مارچ ۱۹۵۵ء کو میاں ممتاز دولتانہ جو کہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ بھی رہے ہیں، کے نام ہے۔ یہ ایک سفارشی خط ہے۔ ایک خط جوش نے اپنے بیٹے سجاد، بیٹی سعیدہ، نواسہ بہو شہناز اور بیگم جوش اشرف جہاں کے نام مشترکہ تحریر کیا ہے۔ پہلے اپنی بیٹی سعیدہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایک طرف سجاد کی بے اصول زندگی و بیماری، دوسری طرف تمہاری ماں کی ناتوانی اور دماغی بیماری ہے تیسری طرف تمہاری صحت کا تزلزل ہے اور چوتھی طرف میری آمدنی اس قدر کم ہے کہ میں حسب دلخواہ تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔

''میری بشاشتوں اور سرور طلبیوں اور میرے قہقہوں سے دھوکا نہ کھاؤ بیٹی۔ میں اندر سے اس قدر زخمی ہوں جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔''(۲۲)

اسی طرح بیٹے کو بھی پکارا ہے کہ وہ اپنے باپ کے پاس آکر رہے۔ کراچی میں خود کو گھلانے سے بہتر ہے کہ باپ کی آغوش میں آجائے۔ نواسی بہو کو کہا کہ اپنے میاں کے واپس آنے تک اپنی والدہ کے پاس پنڈی رہے تو بہتر ہے۔ پھر بیوی سے مخاطب ہوئے ہیں کہ میری باوفا بیوی میرے انتقال کے بعد تم عزت و آرام سے رہنا۔ (افسوس جوش کو اپنی بیوی کی المناک موت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا) یہ خط ۳۱ اکتوبر ۱۹۷۳ کا مرقومہ ہے۔ ایک اور خط بیٹی کے نام ہے جس میں اسے اپنی والدہ کا خیال رکھنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ایک خط نواسے سراج انور کے نام ہے جو کہ ۲۴ دسمبر ۱۹۷۲ء کا تحریر کردہ ہے۔ اس میں اپنی نانی کا خیال رکھنے کی تلقین کی ہے۔

ڈاکٹر ہلال نقوی کے نام پانچ خطوط اس مجموعے میں شامل ہیں۔ پہلا خط آٹھ اگست ۱۹۷۷ء کا ہے۔ جوش نے ہلال نقوی کی طرف سے کیے جانے والے سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ

''میں آج تک خود استاد نہیں بن سکا ہوں۔ پھر شاگرد کس کو بناؤں، میں نے غالباً ۱۹۶۹ء میں ہلال کے ایک مرثیے پر کہیں کہیں اصلاح کی ہے۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہلال جو کل ماشاء اللہ بدرِ کامل بننے والا ہے میرا اولین شاگرد ہے۔ دوران اصلاح میں نے ہلال کی فکر پر اپنی فکر کے پہرے بٹھانے کی قطعی کوشش نہیں کی۔ جہاں بہت ضروری خیال کیا اور زبان میں کوئی نقص دیکھا، اصلاح کی اور فکری رُخ میں کبھی دیوار نہیں بنا۔(۲۳)

ایک خط ہلال نقوی کی شادی کے موقع پر کہا گیا ہے۔ خط میں ہلال کی طرف سے سہرا کہنے کی فرمائش کے جواب میں جوش نے لکھا کہ وہ بیمار ہیں، بینائی کی کمزوری کی وجہ سے خط بد خط ہو گیا ہے۔ سہرا کہنا تو بڑی بات ہے وہ تو خط بھی نہیں لکھ سکتے۔ شادی کے بعد صورت حال تبدیل ہو جاتی ہے۔

''جب تک شادی نہ ہو، معشوقہ محمل نشیں سی لیلیٰ ہوتی ہے۔ شادی کے بعد وہ انگنائی میں بندھی ہوئی گائے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔''(۲۴)

جوش نے ہلال نقوی کے شکوے کے جواب میں اگلے خط میں وضاحت کی ہے کہ پہلے چشمہ استعمال کرتا تھا اب آلۂ سماعت کا بھی سہارا لینا پڑا ہے، ''یادوں کی برات'' کے حوالے سے ہلال نقوی کے ایک استفسار کے جواب میں لکھتے ہیں کہ

"تم نے جمیل مظہری کا شکایتی قطعہ بھیجا تھا۔ یادوں کی برات میں نہ صرف جمیل مظہری بلکہ دوسرے دوستوں کا بھی ذکر تھا مگر نہ جانے کیا گڑبڑ ہوئی، کتاب چھپنے لگی تو اس کے اصل مسودات میں سے بعض تذکرے کوئی لے اُڑا۔"(۲۵)

دوستوں کی جدائی جوش کو نہایت گراں گزرتی ہے اور جب کوئی دوست ہمیشہ کے لیے بچھڑ جاتا ہے تو جوش تڑپ اٹھتے ہیں۔ جمیل مظہری کے انتقال کی خبر نے بھی جوش کے تصورات کے محل کو ڈھا دیا۔ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے عظیم امروہوی کے مراثی پر کام (تبصرہ) نہیں کر سکتا۔ جوش نے ہلال نقوی کی اہلیہ کو بخوشی پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی مقالہ اپنی شاعری پر کرنے کی اجازت دے دی۔

ایک اور خط میں نسیم امروہوی کی لفظ پر علمی گرفت کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے کہ ایسے محنتی اور مشقتی لوگ اب نہیں ملتے۔

۱۷ جون ۱۹۸۱ء کے ایک خط میں جوش لکھتے ہیں۔

تحقیقی نوعیت کے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے مجھے اپنی طبیعت پر بہت جبر کرنا پڑتا ہے۔ یہ معاملات میرے مزاج کے بالکل برعکس ہیں... میں نے اس پر کبھی اصرار نہیں کیا کہ میرے مسدسوں کو مرثیہ کہا جائے۔ مجھے اس سے سروکار نہیں ہے کہ انہیں آپ مرثیے کا نام دیں یا نہ دیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ میرے پیش نظر اس قسم کے مسدس لکھتے وقت مرثیے ہی کا تصور رہتا ہے۔ میرا موضوع ان مرثیوں میں حُبِ کربلا، حسینیت، عزمِ شہیدانِ کربلا، بے باکی اور حق گوئی ہے تو پھر "نقادوں" کی یہ رٹ کہ جوش کے مسدس جدید مرثیے نہیں ہیں، میری سمجھ میں نہیں آئی۔"(۲۶)

جوش نے اس خط کے ذریعے سے اردو نقادوں کے ایک گروہ کو اپنا مطمعٔ نظر واضح کیا ہے جو کہ جوش کے مراثی کو اردو مرثیہ نگاری میں کوئی مقام دینے سے قاصر ہیں کیونکہ ان کے خیال میں جوش مرثیے کے مروجہ اصول وضوابط کو پورا کیے بغیر مرثیہ نہیں کہہ سکتے جبکہ جوش مرثیے کے ذریعے کربلا کے مصائب، حسینیت، عزم شہیدانِ کربلا، اہل بیت کی استقامت، پامردی اور حق گوئی و بیباکی کو بیان کر کے مسلمانوں کو ایک ولولۂ تازہ دینا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے قوم کو نالۂ وشیون کی بجائے عزم وحوصلہ دے کر اسے مضبوط اور طاقتور قوم کے روپ میں نمودار دیکھنا چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ آخری عمر میں قویٰ جواب دے چکے تھے۔ تحقیقی نوعیت کے کاموں کے لیے حافظہ بھی بلا کا ہونا چاہیے اور جسم میں محنت کرنے کی قوت بھی۔ جوش کا حافظہ بھی کمزور ہو چکا تھا اور بیماری کی وجہ سے جوش کی طبیعت بھی اس طرف نہیں آتی تھی۔

اگلے دو خطوط حکیم محمد نصیر الدین ندوی مالک نظامی دواخانہ کراچی کے نام ہیں۔ ایک میں نے اپنے دوست بدر الہٰ آبادی کو بغرض علاج حکیم صاحب کے پاس بھیجا ہے اور سفارشی رقعہ تحریر کیا ہے۔ دوسرے میں اپنی علامات بتا کر علاج کی استدعا کی گئی ہے۔ چار خطوط حسین انجم مدیر ماہنامہ طلوع افکار، کراچی کے نام ہیں۔ پہلا خط ۱۲ نومبر ۱۹۷۶ء کا مرقومہ ہے اس میں جوش نے حسین انجم کا غم گساری پر شکریہ ادا کیا ہے۔ (بیگم کی وفات پر تعزیت کے لیے) ایک خط آغا حسن عابدی کے نام ہے۔

ایک خط سر کیلاس نرائن ہکسر کے نام ہے۔ اس خط میں جوش نے اپنے رسالے کارِ خ بلند (بعد ازاں کلیم) کی اشاعت کے لیے قدیم ایوان کی نقاشیوں کی تصاویر کے بلاک بنوا کر دینے کی استدعا اور رسالے کے واسطے پیغام کے لیے کہا گیا ہے۔ سر کیلاس نرائن ہکسر، وائسرائے ہند کی ریاستوں کے امور کی کونسل کے ممبر اور وزیر اعظم ہند کے ایڈوائزر پی کے این ہکسر کے والد تھے۔ بہت علم دوست اور بااختیار شخصیت کے مالک تھے۔ ایک خط سید مقبول حسین سیفی نوگانوی کے نام ہے جس میں انہوں نے حکومت کی طرف سے جوش کے اظہار تحریر و تقریر پر پابندی کی وجہ سے دلدہی کی ہے اور اس موقع پر جوش نے یہ شعر تحریر کیا ہے۔

میرے غرور کے ماتھے پہ آ چکی ہے شکن
بدل رہی ہے ، تو ، بدلے ہوا زمانے کی

خطوط جوش ملیح آبادی۔ ص ۱۳۶

ایک خط مولوی عبدالحق کے نام ہے جو کہ انجمن ترقیٔ اردو بورڈ کے چیف ایڈیٹر مقرر کیے گئے تھے یہ ایک سفارشی رقعہ ہے جس پر تاریخ درج نہیں ہے۔ایک خط شیخ عنایت اللہ مالک تاج کمپنی، کراچی کے نام ہے۔ جس میں کسی معاہدے پر ثالثی کے لیے آپ درمیان میں ہیں۔ جوش بعد کی صورت حال جاننا چاہتے ہیں۔ یہ ۱۶اگست ۱۹۵۵ء کا تحریر کردہ خط ہے۔ تین خطوط نسیم احمد نسیم کے نام ہیں۔ان خطوط میں جوش نے اپنی نئی دوستیاں اور اپنے حالات کو کھل کر مکتوب الیہ کو بیان کیا ہے۔ دوستانہ بے تکلفی کے باعث عورت کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر کر رہے ہیں۔ دوست کا بچھڑ جانا اور آنکھوں سے اوجھل ہو جانا جوش جیسے حساس شخص کے لیے بہت تکلیف دہ ہے۔دو خطوط پیار علی الاناصاحب کے نام ہیں۔ آپ صوبائی وزیر تعلیم سندھ رہے ہیں۔ایک سفارشی رقعہ ہے فرحت یاسمین صبا ایم اے ایل ایل بی کے لیے۔ دوسرے میں خط کی رسید ہے اور ریاض صاحب کے بے مروت ہونے کی شکایت ہے۔دو خطوط جمیل نشتر ابن سردار عبدالرب نشتر کے نام ہیں جو کہ نیشنل بینک آف پاکستان کے سربراہ ہیں، پہلا خط فراست نامی شخص کے لیے سفارشی ہے اور دوسرا رسمی خط ہے جس میں خط لکھنے کی درخواست کی گئی ہے۔"ایک خط ساحل بلگرامی کے نام ہے جس میں خط کا جواب نہ دینے کی معذرت کی گئی اور دیگر دوستوں کا احوال پوچھا گیا ہے۔ایک خط نصیر اے شیخ کے نام ہے جو کہ کالونی ٹیکسٹائل ملز ملتان کے مالک اور پی آئی ڈی سی کے سب سینئر ڈائریکٹر تھے۔اور اکابر شعراء کو سالانہ انڈو پاک مشاعرے میں مدعو کیا کرتے تھے۔اس خط میں جوش نے نصیر اے شیخ سے راغب مراد آبادی کے بہنوئی رعنا ظفر کے لیے سفارشی خط تحریر کیا ہے۔ایک خط نصر اللہ خان، کالم نگار روزنامہ حریت کراچی کے نام ہے جس نے شان الحق حقّی کے مخالفانہ مضمون پر جوش سے اظہار ہمدردی کیا ہے اور مولوی مائل اور مولوی قدوسی کے بھی حوصلوں کو مضبوط کیا ہے، اپنے کالم کے ذریعے سے۔چار خطوط غلام محمد صاحب کے نام ہیں جو کہ پاکستان کے پہلے وزیر خزانہ تھے اور بعد میں گورنر جنرل کے عہدے پر فائز ہوئے۔جوش کے مداحوں میں شامل تھے۔پہلا خط سفارشی ہے جو کہ رشدی صاحب کی اردو نستعلیق ٹائپ کی سرپرستی کے لیے تحریر کیا گیا ہے۔دوسرا خط بھی اسی حوالے سے ہے، تیسرے خط میں بھی رشدی صاحب کی سفارش ہے کہ وہ اپنا مدعا دلکش پیرائے میں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ چوتھا خط بھی اسی حوالے سے ہے۔ایک خط ایڈیٹر "حالات" کراچی کے نام ہے جنہوں نے سرورق پر نگران کے طور پر جوش کا نام تحریر کیا۔ وہ بھی بغیر اجازت کے۔ جوش نے اخبار سے نام خارج کرنے کی گزارش کی ہے۔ایک خط سرور اقبال کے نام ہے جس کے کام کے لیے درخواست دوبارہ منگوائی ہے۔دو خطوط وفا براہی کے نام ہیں۔ایک میں مشاعرے کے لیے وقت پر حاضر ہو جانے کا ذکر ہے اور ساتھ مجاز کو بھی لانا کے لیے سفر خرچ کا پوچھا ہے۔ نیز اپنے قیام کے لیے انتظامات کا بتایا ہے۔اگلے خط میں قلق کا اظہار کر رہے کہ آپ سے ملنے تو آرہا ہوں لیکن خود کا کرایہ خرچ کے نہیں، بلکہ آپ سے کرایہ منگوا کر۔ایک پروفیسر حمید الدین شاہد کے نام ہے۔ یہ اردو ترقیٔ بورڈ کی طرف سے بھیجا جانے والا خط ہے جس میں سوا لیسی کتابوں کی فہرست تیار کرنے کا کہا گیا ہے جو بیرونی ممالک بھیجی جا سکیں۔ایک خط شہزادہ مرزا عالمگیر قدر کے نام ہے جس میں انہیں اوج سوئے ظن کے بدر کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور صرف ایک شعر درج کیا گیا ہے۔

دفعتاً ترکِ تعلق میں بھی رسوائی ہے
اُلجھے دامن کو چھڑاتے نہیں جھٹکا دے کر

(خطوطِ جوش ملیح آبادی، ص ۱۴۰)

ایک خط آغا ساحل بلگرامی کے نام ہے۔

بیگم کی وفات پر کی جانے والی تعزیت کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ سید عین الدین کو بھی رُشدی صاحب کی سرپرستی کا کہا ہے۔

ایک خط وفاقی سیکرٹری تعلیمات، حکومت پاکستان کے نام لکھا ہے، اس میں انہوں نے خواہش کی ہے کہ جس طرح ہندوستان میں مجھے ایک خطاب اور ایک بڑا بنگلہ رہنے کو ملا ہے اسی طرح مجھے پاکستان میں بھی تاحیات ایک شائستہ بنگلہ بغرض رہائش عنایت کیا جائے۔ صدر پاکستان نے مجھے آپ سے ملنے کا کہا ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ملکی اور غیر ملکی ملاقاتیوں سے یہاں پر ملاقات کر سکوں۔ ایک خط انگریزی میں عبدالمطلب گورنر مشرقی پاکستان کے نام لکھا گیا ہے۔ یہ ۲۵ ستمبر ۱۹۷۱ء کا مرقومہ ہے۔ جوش نے چار عدد خطوط فتنۂ آخرالزماں کے نام تحریر کیے ہیں۔

فتنۂ آخرالزمان محبوبۂ جوش، جوش کی انیسویں محبوبہ تھیں۔ مری میں ان کی ملاقات ہوئی اور پھر ملاقاتیں بڑھتی چلی گئیں۔ جوش اُس وقت عمر کی آخری منزل میں تھے لیکن عشق کی وارفتگیوں نے جوش پر غالب آ کر بتادیا ہے کہ سچے عشق کے لیے عمر کی قید بے معنی ہے۔ جوش کی نواسیاں اور پوتیاں بھی فتنۂ آخرالزماں کی عمر کی تھیں لیکن اس عشق نے جوش کو ہر رنگ دکھایا۔ عاشق بامراد، ہزار بدگماں عاشق، حاسد، عشق کے لیے جاںنثار کرنے والا، کوچۂ محبوب میں سر کے بل جانے والا۔ گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہونے والا۔ ان خطوط میں جوش ہزار رنگ میں جلوہ فرما ہے۔ تقریباً ۱۹۷۳ء سے ۱۹۸۰ء تک جوش فتنۂ آخرالزماں کے عشق میں گرفتار رہے۔ ۱۹۸۱ء جوش کی بیماریوں کے غالب آجانے کا سال ہے اور ۱۹۸۲ء میں جوش کا انتقال ہوا۔ ان خطوط میں جوش کی شخصیت کھل کر سامنے آئی ہے۔ عمر کے اس قدر بُعد کے باوجود جب دوسرا فریق برابر اپنی محبت والفت کی یقین دہانی کرانے پر مُصر ہو تو جوش جیسا جہاں دیدہ بھی زیر دام آہی جاتا ہے۔

بعض لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ فرضی عشق ہے اور یہ انیسواں معاشقہ فرضی داستان ہے لیکن راغب مرادآبادی، منور عباس اور خورشید علی خاں اس وارداتِ قلبی کے گواہ ہیں۔ پہلا خط ۹ دسمبر ۱۹۷۶ء کا تحریر کردہ ہے۔ ابتداء میں راغب علی خاں کا ایک نوٹ اور رباعی ہے جس میں جوش کے دل میں پیدا ہونے والی بدگمانی کی وضاحت ہے جو فراصت رضوی اور راغب علی خاں کے ساتھ سمن (فتنۂ آخرالزماں) کو دیکھ کر پیدا ہوئی تھی۔ عید کے روز بھی فتنۂ آخرالزماں سے نہ ملنے کا گلہ ہے اور سبب اس کا راغب و فراست سے دوستی سمجھا گیا ہے۔ جوش خود کو لعن طعن کرتے ہیں کہ تم دھوکا کھانے کے باوجود وہاں جاؤ گے۔ اگلا خط ۱۴ دسمبر ۱۹۷۹ء کا تحریر کردہ ہے جس میں جوش نے اپنی محبوبہ کے کراچی سے رخصت ہونے کے تصور کو باندھا ہے۔ جب وہ اپنی چچازاد بہن کے ساتھ آئے گی تو جوش کس والہانہ انداز سے اس سے ملیں گے۔ جوش کہتے ہیں کہ ماں باپ کو حیلہ بنا کر مجھ پر ظلم نہ ڈھانا۔ ایک خط ۲۳ دسمبر ۱۹۷۶ء کا مرقومہ ہے۔ اس میں جوش کی محبوبہ کا خط ملنے پر خوشی وراحت کا اظہار ہے اور محبوبہ کو تسلی دی ہے کہ وہ اسی کے کام کی وجہ سے کراچی رکے ہیں۔ جتوئی صاحب کے آستانے پر حاضری بھی دی ہے لیکن وہ اسلام آباد گئے ہوئے تھے۔ آج پھر جاؤں گا۔ پیاری سمن تمہیں صرف میری کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ مجھے قتل کرنے کے سال دو سال بعد میری قبر پر آؤ گی پھول چڑھاؤ گی۔ آنسو بہاؤ گی۔ پھر تم کسی کی دُلھن بن کر رخصت ہو جاؤ گی اور مجھ بدنصیب کو بھول جاؤ گی۔ اور جب تمہاری جوانی ڈھل جائے گی تو تم کو میرا خیال آئے گا اور تم اپنی سفید زلفوں کی چھاؤں میں تمام عمر سرخ آنسو بہاؤ گی۔ جوش نے یہ خیالی داستان سنانے کے بعد اپنی محبوبہ کو یقین دلایا ہے کہ اُس کا یہ خیال غلط ہے کہ ہر شہر میں اس کی ایک ڈپلی کیٹ محبوبہ ہے۔ آخر میں اُس کے پیار کے نام چنٹو پر ایک نظم بھی لکھی ہے۔

دل پر چلتی آری چنٹو
چانڑ، الہڑ، پیاری چنٹو
پیاری، پیاری، پیاری چنٹو

(خطوطِ جوش ملیح آبادی۔ ص ۱۵۰)

آخری خط جس میں جوش نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے۔ اس میں جوش نے اپنی محبوبہ کو ڈپلومیٹ چنٹو صاحبہ کے نام سے یاد کیا ہے۔ جوش کہتے ہیں مجھے آپ کا خط ملا۔ یہ زحمت کیوں گوارا کی آپ نے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ مرضِ محبت سے کلیتاً شفایاب ہو کر غسل صحت فرما چکی ہیں۔ اور مجھے علم ہو گیا ہے کہ معاش کے فکر کے علاوہ آپ کے دل میں اور کوئی خیال نہیں ہے۔ آپ نے مجھ سے کام نکالنے کے لیے مجھ سے مصنوعی درد دل کا اظہار فرمایا ہے۔ میں نے جس وقت آپ کو بینک کی ملازمت دلائی تھی مجھے آپ کی توبہ کا علم ہو چکا تھا۔ اب بھی میں آپ کی خدمت گزاری سے دستبردار نہیں ہوں گا۔ میرا یہ مطالبہ نہیں ہے کہ آپ مجھے چاہیں۔ آپ کے بدل جانے کے تمام آثار نے مجھ پر حقیقت منکشف کر دی۔ آپ نے مجھے اپنی ملازمت کی اطلاع نہیں دی۔ مجھ سے میری بیوی کے انتقال پر تعزیت نہیں کی اور جب میں فون کرتا ہوں تو لوگوں کے اعتراض کا سوال اٹھاتی ہو۔ محبوبہ کے بدل جانے کے کچھ اور اشارے جوش نے بتائے ہیں۔ ایک سال سے خط نہیں لکھا، میں نے آپ کا خط نہیں کھولا۔ آپ خود اسے پھاڑ دیں۔ آخر میں ایک شعر لکھا ہے۔

قالبِ سنگ میں ڈھل جاؤں گی معلوم نہ تھا
اس قدر جلد بدل جاؤ گی معلوم نہ تھا

(خطوطِ جوش ملیح آبادی۔ ص۱۵۰)

آخر میں جوش اختتام یوں کرتے ہیں۔

راقم، ایک در ماندہ و چاک گریباں
راندۂ بارگاہِ فتنۂ آخر الزماں

(خطوطِ جوش ملیح آبادی۔ ص۱۵۰)

آخر میں راغب مراد آبادی نے جوش ملیح آبادی کی ڈائری کے چند اوراق سے اقتباس دیئے ہیں۔ خطوط جوش مراد آبادی کی اشاعت نومبر ۱۹۹۳ء مطبوعہ ویلکم بک پورٹ میں پانچ یوم کی روداد سے اقتباس درج کیے گئے ہیں جبکہ ستمبر ۱۹۹۸ء کی اشاعت ہیں۔ چار یوم کی روداد سے اقتباس درج کیے گئے ہیں۔ فحش حصے حذف کیے گئے ہیں اور ۹ دسمبر ۱۹۷۶ء کی صبح ۳ بجے درج کی جانے والی روداد حذف کر دی گئی ہے جس میں جوش اور فتنۂ آخر الزماں کے درمیان پیش آنے والی رنگین واردات کو بیان کیا گیا ہے۔ جب عاشق و معشوق کو تنہائی میسر آئی اور پھر دونوں کے درمیان شیطان کے سوا اور کچھ نہ رہا۔

۱۳ دسمبر ۱۹۷۶ء کے ایک خط کا اقتباس محبوبہ کے دل میں غلط فہمی پیدا ہونے پر جوش کی وضاحت اور تمام واقعہ کا بیان ہے کہ دونوں کے مابین کیا کیا باتیں ہوئیں اور جوش کس طرح اس کی ناراضی ختم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ جوش کی پیش دستی اور اس کی پسپائی سب کا بیان ہے۔ آخر میں چھ رباعیاں اور ایک غزل تحریر کی ہے جس کا مقطع حسب ذیل ہے۔

جوش نے جب تک تجھے دیکھا نہ تھا بنتِ سمن
ایسی مکھڑے کی پرستاری کبھی پہلے نہ تھی

(خطوطِ جوش ملیح آبادی۔ ص۱۵۷)

اس کے بعد راغب مراد آبادی نے فتنۂ آخر الزماں کا خط دیا ہے جو کہ ۱۷ دسمبر ۱۹۷۶ء کا تحریر کردہ ہے۔ اس میں جب کراچی سے واپسی ہوئی فتنۂ آخر الزماں کی تو اس پر کیا بیتی اور پھر اس نے اپنے کام کے بارے میں پوچھا ہے اور صرف غلام مصطفی جتوئی سے کام لینے کی ہدایت

کی ہے اور آرڈر صرف اپنے ڈیپارٹمنٹ کے پتے پر منگوانے کا لکھا ہے اور ہدایت کی ہے کہ اگر میرے خطوط پھاڑ نہ سکیں تو پھر خورشید صاحب یا راغب صاحب کے پاس رکھوائے جائیں۔ گوگے (بہن) کے کام کے لیے زور دیا ہے۔ فتنۂ آخر الزماں نے لکھا کہ مجھے غمِ جاناں، غمِ ہجراں، غمِ دوراں، غمِ زندگی، غمِ روزگار، غمِ ماں اور غمِ باپ لاحق ہے۔ کاش آپ میرے پاس ہوتے۔ مجھے خط جلد بھیجئے ورنہ میرا Heart Fail نہ ہو جائے۔

۲۹ مارچ ۱۹۷۶ء کا تحریر کردہ جوش کا ایک خط بنام وزیرِ اعظم اندرا گاندھی (بھارت) بھی اس مجموعے میں شامل ہے۔ اس کا مسودۂ خط پروفیسر حمید الدین شاہد نے راغب صاحب کو دیا تھا۔ اس خط میں جوش کی حیدر آباد اور پٹیالے کی پینشنوں کے معاملے کے بارے میں استفسار ہے جو کہ چھ سات برس سے متنازعہ ہیں۔ حیدر آباد کی پینشن ملازمت کی۔ پٹیالے کی پینشن ادبی پینشن ہے اور جو قرض لیا گیا تھا بیباق ہو چکا ہے۔ ساتھ پریم چند کے بارے میں تاثرات کا بیان ہے کہ اس سے جوش کے دیرینہ تعلقات تھے۔ میری طرح وہ بھی اوطان، لسان، ادیان کی بنا پر انسانوں میں تفریق کے قائل نہیں تھے۔ آخری ملاقات پر میں نے ایک رباعی ان کو سنائی تھی اور اس ملاقات کے تیسرے چوتھے روز ان کے دنیا سے کوچ کر جانے کی خبر آئی تھی۔ ایک خط کنور مہندر سنگھ بیدی کے نام ہے۔ اس خط میں جوش لکھتے ہیں کہ بیدی ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں "انسان" کہا جا سکتا ہے۔ وہ دوستوں سے ہی نہیں بلکہ اجنبیوں تک سے محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ وہ تو فرشتے سے بھی بمراحل بہتر ہیں۔ یہ خط ۲۸ دسمبر ۱۹۷۹ء کا تحریر کردہ ہے۔ اس کے بعد دو غزلیات اور ایک رباعی دی گئی ہے۔ آخر میں ایک خط فرزندِ جوش سجاد کے نام ہے۔ یہ جوش کی صاحبزادی سعیدہ کا تحریر کردہ ہے۔ اس میں گھریلو جھگڑوں کی کھنک ہے۔ یہ خط ۱۸ دسمبر ۱۹۷۳ء کا تحریر کردہ ہے۔ اور جوش کی بیٹی نے اپنے بھائی سے خفگی کا اظہار کیا ہے کہ ان لوگوں کا خیال ہے کہ جوش اپنی بیٹی سے بدظن ہو جائیں۔ گھریلو سیاستیں ہر گھر میں پنپتی ہیں جوش کا گھرانہ بھی ان سے مبرا نہیں۔ سعیدہ نے قطع تعلقی کا اعلان کیا ہے۔

راغب مراد آبادی نے خطوط کی عکسی نقول کا بھی اہتمام کیا ہے اور ڈاک کے لفافے کی بھی عکسی نقول دی ہیں تاکہ جوش کے مکتوب الیہ کے پتے لکھنے کے طرز کو بھی دیکھا جا سکے۔

اس کے علاوہ مکتوب الیہم کا تعارف بھی کروایا ہے اور آخر میں اشاریہ دیا ہے۔

۴۔ جوش ملیح آبادی کے خطوط، مرتبہ، خلیق انجم ۱۹۹۸ء

یہ مجموعہ ۱۹۹۸ء میں ثمر آفسٹ پرنٹرز، نئی دہلی سے طبع ہوا، اس کے تقسیم کار انجمن ترقیٔ اردو (ہند)، اردو گھر مارگ، راؤز ایونیو، نئی دہلی ہیں۔ صفحات کی کل تعداد ۲۷۴ ہے۔

حرفِ آغاز میں مرتب نے وضاحت کی ہے کہ اُس نے کس طرح ان خطوط کو مرتب کرنا شروع کیا۔ جوش کی پاکستان ہجرت، لوگوں کی مخالفت، جوش کی قسمت کی خرابی، وسائل کم اخراجات زیادہ کا ذکر کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے یہ واضح کیا ہے کہ ہندوستان جیسے سیکولر ملک کے ساتھ جوش کی وفاداریاں تھیں، پاکستانیوں سے یہ برداشت نہ ہو سکا۔ ۱۹۶۷ء میں جب وہ ہندوستان گئے تو توط انصاری نے ان سے انٹرویو لیا۔ ممبئی میں اس انٹرویو کی بنیاد پر یہ کہا گیا کہ جوش نے ہندوستان کی تعریف کی لیکن پاکستان اور اس کے رہنماؤں کو بُرا بھلا کہا۔ لیکن کنور مہندر سنگھ بیدی نے اپنی کتاب "یادوں کا جشن" میں لکھا ہے کہ "اس سارے انٹرویو کے دوران میں جوش صاحب نے ہندوستان سے محبت کا تو اظہار ضرور کیا لیکن پاکستان اور پاکستان کی حکومت کے خلاف ایک لفظ بھی نہ کہا۔"(۲۷)

خلیق انجم نے جوش کی مکتوب نگاری کی خصوصیات مختلف ذیلی عنوانات قائم کر کے دی ہے مثلاً عورتوں کی زبان، سفارش، آوازیں، ترانۂ شکر وغیرہ۔

جوش ملیح آبادی نے جو خطوط تحریر کیے ہیں ان میں سے ۳۲ خطوط مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے نام ہیں۔ پہلا خط ۱۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کا تحریر کردہ ہے اور آخری خط ۸ ستمبر ۱۹۶۷ء کا مرقومہ ہے۔ پہلا خط اکبر الہٰ آبادی کی وفات کے بعد تعزیتی اجلاس کے بارے میں رائے کے لیے لکھا گیا ہے۔ دوسرے خط میں قرض کی ادائیگی کے لیے مشورہ طلب کیا ہے۔ شانتی نکتین میں روانگی کا تذکرہ ہے۔ اقبال کی کتاب "پیامِ مشرق" کا کوئی شعر ابھی تک جوش کی نظر سے نہیں گزر سکا ہے۔ اس کے بعد برن صاحب کے نام تعارفی خط منگوایا ہے۔ اقبال کی نظم کے دستیاب نہ ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ ۷ دسمبر ۱۹۲۳ء کے ایک خط میں اقبال کے خط کا تذکرہ کیا ہے کہ انہوں نے لکھا ہے کہ وہ مہاراجہ کشن پرشاد، مسٹر حیدری اور راس مسعود کو سفارشی خطوط لکھ سکتے ہیں۔ ۲۰ جنوری ۱۹۲۴ء کے خط میں اطلاع دی ہے کہ اقبال نے ایک خط کشن پرشاد اور ایک مسٹر حیدری صاحب کے نام لکھ دیا ہے اور میں پندرہ روز تک حیدر آباد چلا جاؤں گا۔ ۱۲ مارچ کے تحریر کردہ خط میں اطلاع دی ہے کہ مجھے یہاں آئے ہوئے ایک ہفتے سے زیادہ ہو گیا ہے۔ حیدری صاحب نے مشورہ دیا ہے کہ دکن کے دو صد سالہ واقعات شاہنامے کے طرز پر نظم کیے جائیں۔ سرِدست کسی ایک واقعہ کو نمونتاً نظام کو سنانے کے لیے منظوم صورت میں منتخب کیا جائے۔ بہر دست مرزا محمد ہاری رسوا کے پڑوس میں مکان کرایہ پر لینے کی اطلاع ہے اور ایک گاری بھی کرایے پر لے لی ہے۔ حبیب الرحمن خان شیروانی سے بھی ملاقات ہوئی۔

اس کے مختلف خطوط میں مولانا کو سفارشی خط کے لیے کہا ہے۔ ۲۳ جون ۱۹۲۴ء کے ایک خط میں لکھا ہے کہ اگر آپ مجھے جامعہ عثمانیہ میں اردو پروفیسری کے لیے اہل سمجھتے ہیں تو ایک خط چند سطور پر مشتمل لکھ ڈالئے۔ ایک خط شعبۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد، دکن سے بھیجا گیا ہے۔ تاریخ فارسی میں ڈالی گئی ہے۔ ۵ اردی بہشت ۱۳۴۲ف یعنی اپریل کے آخری دن ہیں۔ اس خط میں نیاز فتح پوری کے بارے میں بات کی گئی ہے کہ انہوں نے پہلے عبدالماجد دریا آبادی پر قلم اٹھایا اور اب ملیح آبادی (جوش) کو بے نقاب کر رہے ہیں۔ اس کی پرواہ نہ کیجئے۔ کیونکہ دنیا کی رونق ایسے ہی ہنگاموں پر موقوف ہے۔ بدمعاش کا وجود اس کرۂ ارض کی تابانی اور گرمیٔ بازار کے لیے اشد ضروری ہے۔ اگر دنیا میں بدمعاش ہی نہ رہے تو اس محفل کا سناٹا ناقابل برداشت ہو جائے۔" (۲۸)

اگلے دو خطوط ریاست دھول پور سے تحریر کیے گئے ہیں۔ جب جوش کا اخراج حیدر آباد دکن سے ہو چکا تھا۔ دوسرے خط میں جوش نے حیدر آباد سے نکالے جانے کی داستان مختصراً تحریر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میں نے ایک نظم "غزل گوئی" لکھی تھی جس میں شاعر کی تعریف یوں کی تھی۔ جس کا موضوع سخن ہو، کل نظام کائنات (جوش ملیح آبادی کے خطوط۔ ص ۶۲)

"نظام کائنات" کو "نظام دکن" سمجھا گیا اور ظاہر ہے نظام دکن کو موضوع سخن بنانا کس قدر گستاخی ہے اور یہی وہ گستاخی تھی جس نے سلسلۂ ملازمت قطع کر دیا۔ اس کے بعد دریا آبادی صاحب سے کچھ استفسارات کیے ہیں کہ آپ کے کتنے مرید ہیں۔ آپ کے خیالات میں انقلاب کیوں کر آیا۔ "ملفوظات حضرت رومی" کا ماخذ کیا ہے اور "تصوفِ اسلام" نامی کتاب میں آپ نے تصوف کی حمایت کی ہے یا اسے جھٹلایا ہے۔ ۱۰ اگست ۱۹۳۵ء کے تحریر کردہ خط میں جوش نے اپنے رسالے کا نام "کاخ بلند" رکھنے کی وجہ اور رسالے کی عرض و غایت بیان کی ہے۔ جوش لکھتے ہیں۔

> "مجھ سے زیادہ آپ کو علم ہو گا کہ ہندوستانی زبان و ادب ہندوستانی ادبیات، ہندوستانی تہذیب و تمدن اور ہندوستانی ذہنیت یوں کہہ لیجئے کہ ہندوستانی روح کو اس وقت صحیح رہنمائی اور زبردست انقلاب کی اتنی شدید ضرورت لاحق ہے کہ ملک کے ہر حساس صاحب قلم پر یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے وقت کا ایک معقول حصہ رسائل و اخبارات کے لیے وقف کر دے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس وقت تک کسی

قوم میں کوئی زندگی و بیداری پیدا نہیں ہوتی جب تک اس کے ادبیات میں عظیم انقلاب رونما نہیں ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ انقلاب کہیں باہر سے نہیں آتا۔ اس ملک کے مشاہیر ہی اسے پیدا کرتے ہیں۔"(۲۹)

آخر میں جوش نے ماجد صاحب سے ان کے مقالات کے لیے استدعا کی ہے۔ جوش نے ابواب کی فہرست بھی تحریر کی ہے اور ابواب کے نام بھی دیئے گئے ہیں جن کے تحت رسالے میں مضامین دیئے جائیں گے۔

ا۔ اشارات ۲۔ افکار ۳۔ مقالات ۴۔ منتخبات ۵۔ ادبیات ۶۔ حیات ونشاط ۷۔ لسانیات ۸۔ نسانیات ۹۔ انتقادیات ۱۰۔ رفتار وقت

۵ اکتوبر ۱۹۳۵ کے خط میں مولانا کو کاخ بلند کا نام "کلیم" کرنے کی اطلاع دی ہے۔ اگلے تین خطوط میں مقالے کے لیے تقاضا ہے۔ ۱۸ مارچ ۱۹۳۶ء کے خط میں جوش نے عبدالماجد دریا آبادی کے کلیم پر شائع ہونے والے تنقیدی مقالے کے بعد لکھا ہے۔ جوش لکھتے ہیں۔

"آپ کے انتقاد کالب ولہجہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ آپ کا تصوف مجھ سے نہایت برافروختہ ہے اور آپ کی قدامت پسندی کے ماتھے پر شکنیں پڑی ہوئی ہیں۔ جی ہاں، میں ایک اچھا ادیب بن سکتا ہوں۔ اگر "راہ نجات" کی تفسیر شائع کروں اور "نورناموں" پر مضامین لکھوں۔(۳۰)

۶ اپریل ۱۹۳۷ کے ایک خط میں مولانا کو اس طرح مخاطب کیا ہے۔

یگانۂ بے گانہ نُما۔ میں نظیر نمبر نکالنے والا ہوں۔ کیا آپ مراسم قدیم پر نگاہ کر کے میاں نظیر پر کوئی مقالہ تحریر کر سکیں گے۔(۳۱)

۲۴ اگست ۱۹۴۳ء کے خط میں قرآن کے تراجم اور تفاسیر کے بارے میں استفسارات ہیں کہ کہاں سے بہتر کتب نیز اردو، فارسی اور انگریزی کی اُن کتب کی فہرست مانگی ہے جن میں خدا کے وجود پر عقلی دلائل موجود ہوں۔ نیز مسئلہ جبر و قدر پر کتب کے نام بھی مانگے ہیں۔ پبلی کیشنز ڈویژن انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ ڈیپارٹمنٹ، اولڈ سیکرٹریٹ، دہلی کے پتے سے لکھے گئے خط میں مولانا کو اطلاع دی گئی ہے کہ "آج کل" کی ادارت کے فرائض جوش کو تفویض کیے گئے ہیں اور اس کے لیے ایک مقالے کی درخواست کی گئی ہے۔ تاریخ تحریر موجود نہیں ہے۔ اگلے دو خطوط میں بھی مقالے کا تقاضا ہے۔ ایک خط میں اپنا نام اس طرح تحریر کیا ہے۔

نیاز مند قدیم۔ ہرچند لئیم

جوش۔ احسن التقویم

(جوش ملیح آبادی کے خطوط ص ۷۱)

اور پھر مختلف عنوانات دیئے گئے ہیں جن پر مضامین لکھنے کی استدعا ہے۔ ۲۳ جون ۱۹۵۰ء کے ایک خط میں مقالے کا شکریہ ادا کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"آپ کی زندگی جو کچھ ہو، سو ہو، لیکن آپ کا قلم ایک رندِ خراباتی ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ آپ کے طرز نگارش کے پودے اور آپ کے ادبی بانکپن کے سبزے کو آپ کی مولویت کے تناور درخت کے سائے نے پنپنے کی اجازت کیوں کر دے دی۔ یہ اگر فرقِ عادت نہیں تو اور کیا ہے؟ آپ کی سخن سنجی اور ادب نوازی کی کھیتی تفتیش و تورع کے زبردست پالا گر جانے کے باوصف اب تک لہلہا رہی ہے۔ اگر آپ کے گلستان وجود کو اتنے شدید پالے سے پالا نہ پڑا ہوتا تو نہ جانے آپ کیا ہوتے اور کیا کچھ نہ کرتے۔(۳۲)

مزید لکھتے ہیں۔ یہاں ماجد صاحب کے مولانا بن جانے کی طرف خفیف سا طنز ہے۔

"جوہری جو گیا چادر میں اس بُری طرح دل موہے لے رہی ہے۔ اگر وہ نام خدا بن ٹھن کے چوتھی کا جوڑا پہن کے سامنے آتی ہے تو اللہ ہی بہتر اندازہ کر سکتا ہے کہ کتنے اربابِ نظر خاک وخوں میں غلطیدہ نظر آتے۔"(۳۳)

ساتھ ہی چھ بند پر مشتمل ایک نظم بھی لکھ بھیجی ہے۔

۲۸ جولائی ۱۹۵۰ء کا ایک خط ماہنامہ شعلہ و شبنم کے پتے سے ارسال کیا گیا ہے جس میں اسلامک لٹریچر نہ ملنے کا لکھا ہے۔
۵ اگست ۱۹۶۳ء کے خط میں اپنے سچ بولنے اور حق بات کہنے کی بنا پر ہندوستان و پاکستان میں مردود ٹھہرانے جانے کا ذکر ہے۔ لکھتے ہیں۔

> "میری یہ بڑی بد بختی ہے اور اس بد بختی کی بنا پر میں اپنے عناصر ترکیبی کا شکر گزار ہوں کہ جس بات کو اپنے نزدیک حق سمجھتا ہوں اس کا دھڑلے کے ساتھ، زبان و قلم سے اعلان کر دیتا ہوں اور اسی پیدائشی عادت کی بنا پر ہند و پاک، دونوں ملکوں میں وہ ہوں جسکو مغضوب، مبغوض، مقہور، معتوب اور مردود گردانا گیا"۔(۳۴)

جوش نے بارہا اس امر کا اعلان کیا ہے کہ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ جو کچھ وہ سوچ رہے ہیں یا کہہ رہے ہیں وہی حق ہے اور اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا لیکن ہاں یہ ضرور ہے کہ انہیں اپنی نیت پر کوئی شبہ نہیں ہے۔ وہ شوخیٔ گفتار میں جو کچھ کہتے ہیں لوگ اسی کو درست مان کر ان پر لعن طعن کرتے ہیں۔

مجھ کو انعامِ حق پناہی دے گا ۔ میری نیت کو تاجِ شاہی دے گا
میرے سینے میں انبیاء کا دل ہے۔ اللہ سے پوچھو وہ گواہی دے گا
(جوش ملیح آبادی کے خطوط ص ۸۰)

۸ ستمبر ۱۹۶۷ء کو بھیجا جانے والا خط لکھنؤ سے لکھا گیا ہے۔ اس خط میں جوش نے لکھنؤ کے اجڑ جانے اور حسینوں کے گلی کوچوں کے ویران پڑے ہونے کا ذکر کیا ہے۔ ملیح آباد بھی یہی اداسی چھائی ہوئی ہے۔ باپ کا گھر بھی بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ جوش کہتے ہیں کہ آپ اور شمس الدین حکیم کم از کم میرے مر جانے تک تو زندہ رہیں۔ خاتمہ اس طرح کیا ہے کہ آپ کو دل سے چاہنے اور آپ پر دل سے ترس کھانے والا جوش مرحوم و مغفور۔ دو خطوط شیخ منظور الٰہی کے نام ہیں جو پاکستان سول سروس سے متعلق ہیں اور کئی اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ خط ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۶ء کا تحریر کردہ ہے۔ جوش سے سہواً ۱۹۴۶ء تحریر ہوا ہے۔ جوش نے اکادمی آف لیٹرز کے نام سے ایک ادارے کی تجویز گورنمنٹ آف پاکستان کو پیش کی تھی۔ فنانس سیکرٹری ممتاز حسن صاحب کو یہ تجویز اچھی لگی اور ترقیٔ اردو بورڈ کے نام سے کراچی میں یہ ادارہ قائم کر دیا گیا۔ مولوی عبدالحق چیف ایڈیٹر مقرر کیے گئے اور لغت کی تیاری کا کام جوش کو سونپا گیا تھا۔ ترقیٔ اردو بورڈ کے سیکرٹری شان الحق تھی اور جوش میں اختلافات ہو گئے۔ پاکستانی حکومت نے ہندوستان میں جوش کے ایک انٹرویو کو بنیاد بنا کر یہ ملازمت ختم کر دی گئی۔ اس خط میں جوش نے ترقیٔ اردو بورڈ کراچی کی ابتر حالت کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے کہ تدوین لُغت کا کام غلط راستے کی طرف مڑ چکا ہے، اور حالات کے سنورنے کی کوئی تدبیر نہیں ہے۔ میں نے تین چار برس کی عرق ریزی کے بعد اس دفتر کی بنیاد ڈالی تھی اس لیے مجھے اس کی تباہی کا دُکھ ہے۔ چونکہ مجھے اس بورڈ سے علیحدہ کر دیا گیا ہے تو آپ کے دل میں بدگمانی پیدا ہو سکتی ہے کہ میں اپنے ذاتی جذبات سے مغلوب ہو کر لکھ رہا ہوں تاکہ مجھے دوبارہ ملازمت مل جائے۔ ایسا نہیں ہے کیونکہ میں عمر کی اس منزل میں آ چکا ہوں کہ مجھے کسی ملازمت، عہدے اور آسائش کی تمنا نہیں ہے۔ میں تو صرف بورڈ کی حالت درست دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگلے خط میں مسودات کے سلسلے میں شیخ صاحب کی کرم فرمائی کا شکریہ ادا کیا ہے کہ اس زمانے کی ناقدردانی، اپنے دور کی سوختہ سامانی نے انہیں مسودات فروخت کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب آپ نے جو سہارا دیا ہے وہ غنیمت ہے۔ اگر آپ میرا کام نہ بھی کرتے تو میں اسے حالات کی خرابی سمجھ کر خاموش ہو جاتا۔ میں اپنے آپ کو جیتے جی مرحوم کیوں لکھتا ہوں۔ یہ داستان بہت طویل ہے۔

گفتگو آئینِ درویشی نہ بود
ورنہ، باتو، ماجرا ہا، داشیتم

(جوش ملیح آبادی کے خطوط ص ۸۵)

ایک خط سجاد ظہیر عرف "بنے میاں" کے نام ہے۔ یہ 28 اپریل 1946ء کا مرقومہ ہے اور طاہر پیلس پونا سے لکھا گیا ہے۔ یہ ایک سفارشی خط ہے جو کہ نادم سیتاپوری کے لیے لکھا گیا ہے۔ خواجہ احمد عباس سے بھی حامل رقعہ کی سفارش کا کہا گیا ہے۔ اختر حسین آئی سی ایس تھے، بعد میں سی ایس پی ہو گئے۔ مرکزی حکومت میں وزیر تعلیم رہے۔ جب پاکستان کے چاروں صوبے مغربی پاکستان کہلاتے تھے۔ اس وقت اختر صاحب مغربی پاکستان کے گورنر تھے۔ مولوی عبدالحق کی وفات کے بعد ۱۹۶۱ء میں انجمن ترقئ اردو کے صدر منتخب ہوئے۔ ایک خط میں سخاوت میرزا اور دوسرے خط میں خاور نگرانی کی سفارش کی گئی ہے۔

دو خط مشفق خواجہ کے نام ہیں، ایک خط میں خط کا جواب دیر سے لکھنے کی معذرت ہے اور دوسرے خط میں گلہ ہے کہ خواجہ صاحب دو خطوط ظفر ادیب کے نام ہیں جن کا اصل نام بھیم سین تھا۔ ملتان چھاؤنی میں پیدا ہوئے۔ تقسیم کے بعد ہندوستان چلے گئے اور سخت غربت میں زندگی گزاری۔ "آج کل" ماہنامہ کے دفتر میں ملازمت کے حوالے سے عرش ملیسانی سے ملنے کا مشورہ دے رہے ہیں اور ریڈیو میں بھی ملازمت کے لیے کوشش کرنے کا کہا ہے۔ ایک خط "جدن بائی" کے نام ہے جو کہ مشہور مغنیّہ تھیں اس میں حسن جعفر نامی شخص کی سفارش کی ہے اور خدا کا شکر ادا کیا ہے کہ وہ اس نگری سے نکل بھاگے۔ تاریخ تحریر پر موجود نہ ہے۔ ایک خط جمیل مظہری کے نام ہے جو کہ ۲۷ اپریل ۱۹۵۱ء کا تحریر کردہ ہے جس میں خط کے جواب نہ دینے کا گلہ ہے اور کہا ہے کہ چونکہ میں آپ کا سچا عاشق ہوں اس لیے کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل جاؤں گا۔ پٹنے کے مشاعرے والوں نے اگر میری شرائط مانیں تو مشاعرے میں جاؤں گا ورنہ نہیں۔ اور کلکتہ سے دہلی جاتے ہوئے دو ایک دن کے لیے پٹنے میں قیام کروں گا۔ ابھی کسی نے یہ خبر سنائی ہے کہ آپ نے داڑھی رکھ لی ہے۔ غم والم کو جوتی کی نوک پر رکھو۔ یہاں جوش کا انداز فحش گوئی کی طرف ہو گیا ہے۔

چھ عدد خط کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے نام ہیں جو کہ جوش کے بہت اچھے دوست ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں روہتک میں مجسٹریٹ درجہ اول مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۷ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اچھے شاعر تھے۔ پہلے خط میں جو کہ ۶ اپریل ۱۹۵۱ء کا تحریر کردہ ہے مکھن لال کا ذکر ہے جو کہ پہلے چاندی کا سٹّہ کرتے تھے بعد میں مہندر سنگھ بیدی کے کہنے پر ممبئی چلے گئے اور فلمیں بنانے لگے۔ انہوں نے جوش کو یہ اقرار اپنے ہاں ٹھہرایا۔ سات آٹھ گیت لکھوائے۔ گیتوں میں بار بار ترامیم کروائیں میوزک ڈائریکٹر کے ساتھ مل کر ان گیتوں کو منظور کیا اور پھر کہا کہ دہلی آکر معاوضہ ادا کریں گے اور بعد میں آپ کو لکھ دیا کہ وہ گیت استعمال نہیں کر رہے۔ اگر یہ بات انصاف اور ایمان کی ہے تو میں معاوضہ نہیں مانگتا۔ دوسرے خط میں غازی آباد جانے اور نہ جانے کا فیصلہ بیدی پر چھوڑا ہے۔ یہ ایک بیانیہ خط ہے۔ سکھ اور پٹھان کی لڑائی ہو گی اور برے مزے کی ہو گی۔ خون خچڑ ہو گا لیکن یہ کیا سکھ کے منہ سے کف اور دھواں نکل رہا ہے اور پٹھان دم دبائے کھڑا ہے۔ جیسے نانی مر گئی ہے بد معاش کی۔ اور پٹھان پیشاب کیے ہوئے اور گالی دیئے ہوئے بچے کو گود میں اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔

۱۰ جون ۱۹۵۴ء کے خط میں بیدی پر ایک نظم تحریر کی گئی ہے۔ ۳مارچ ۱۹۶۲ء کے خط میں مشاعرہ میں شرکت کو بچھڑے ہوئے دوستوں سے ملنے کا بہانہ قرار دیا ہے۔ ساتھ ہی سری رام والے مشاعرے میں شرکت کے لیے کرائے کے علاوہ ایک ہزار روپے اور عیش صاحب ٹونکی کے کرائے کے علاوہ ڈھائی صدر روپے طلب کیے ہیں۔ ۲۳ خطوط شنکر پرشاد کے نام ہیں۔ جو کہ آئی سی ایس آفیسر تھے۔ بعد میں گونڈہ اور امروہہ کے جوائنٹ مجسٹریٹ کے طور پر ان کا تقرر ہوا۔ دہلی کے چیف کمشنر مقرر ہوئے۔ بعد ازاں دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر بنے۔ پھر انڈین ایئر لائنز کارپوریشن کے چیئرمین مقرر ہوئے اور امور کشمیر کے اسپیشل سیکرٹری بھی آٹھ سال تک رہے۔ پہلا خط ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۸ء کا ہے جو بجلی کے کنکشن کٹوا دینے کی دھمکی کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ جو شخص نصف صدی سے اپنے قلم سے ملک میں روشنی پھیلانے کی سعی کر رہا ہے

اس کے گھر کی بجلی کٹوانے کی بات کی جارہی ہے۔ دوسرا خط ۱۰ مارچ ۱۹۴۹ء کا ہے جس میں جوش کے بھائی رئیس کے لیے لائسنس کی منظوری پر شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ ۱۱ جولائی ۱۹۴۹ء کو لکھے جانے والے خط میں کالٹن ہوٹل کو بجلی دینے، جوش اور ان کے بھائی کو پستول کا لائسنس دینے کا شکریہ ادا کیا ہے۔

۲۷ جولائی ۱۹۵۰ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ ایک ٹرک کا پرمٹ کل پرسوں تک مل جائے گا لیکن ایک پرمٹ سے کام نہیں بنے گا۔ کیونکہ روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے کسی کو شریک کیے بغیر کام نہیں چل سکتا اور ظاہر ہے کہ شرکت کی صورت میں آمدنی بٹ جائے گی۔ اس لیے دو پرمٹ اور دلا دیں تاکہ میرے بیٹے اور میری بیٹی دونوں زندگی بسر کر سکیں۔

۱۲ جون ۱۹۵۱ء کے خط میں شنکر پرشاد صاحب کے کشمیر چلے جانے اور جوش کے دہلی میں دن گزارنے کا تذکرہ ہے۔ ایک خط میں گلہ کیا ہے کہ بار کا لائسنس میرے بیٹے کی بجائے کسی اور کو عطا کر دیا گیا ہے اور میرے انتقال کرنے کے بعد بیٹا بے یار و مددگار ہو گا۔
دو خطوط میں ہری چند اختر کی سفارش کی گئی ہے جو کہ گورنمنٹ آف انڈیا میں انفارمیشن افسر رہ چکے ہیں اور مختلف گزیٹڈ عہدوں پر بھی سات آٹھ سال بتائے ہیں۔ اگلے خط میں بھی بیٹے کے پرمٹ کا یاد دلایا ہے۔ اور ہری چند اختر کے کام نہ ہونے کا ذکر بھی کیا ہے۔

۱۹۵۴ء کے مرقومہ ایک خط میں ریڈیو کے مشاعرے میں شرکت سے انکار کر کے جوش کے دل کو ٹھیس لگانے کا ذکر کیا گیا ہے اور سجاد کے لیے پٹرول پمپ کے ساتھ ہی سروس اسٹیشن قائم کرنے کے اجازت نامے کی بھی درخواست کی گئی ہے۔ ۹ فروری ۱۹۵۴ء کو لکھے جانے والے خط میں رئیس احمد کے لیے دو عدد تعارفی خطوط بنام بھاٹیاں صاحب کمشنر لکھنؤ اور ڈپٹی کمشنر سیتاپور منگوائے ہیں۔ ۲۶ جون ۱۹۵۴ء کے خط میں اپنے بھانجے اور داماد التفات احمد کے لیے سفارش کی ہے جو کہ دہلی کالج میں تین سو روپے پر ملازم ہے۔ ۲ جولائی ۱۹۵۴ء کے خط میں شملہ میں جانے اور نہرو سے ملاقات نہ ہونے کے ماجرے کو بیان کیا ہے۔ پنڈت کا سیکرٹری راہ میں مزاحم ہو گیا۔ بعد میں جوش نے ایک خط جواہر لال نہرو کو لکھا کہ آپ مجھے اپنا بزرگ کہتے ہیں۔ کیا ہندوستان میں بزرگوں کے ساتھ اب یہی سلوک رکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد اندرا نے فون کر کے پانچ بجے شام چائے ساتھ پینے کا کہا ہے۔ جب میں وہاں پہنچا تو پنڈت جی سامنے کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر مسکرا دیئے اور کہنے لگے کہ چائے پی لیجئے۔ انہوں نے کہا کہ آپ کو ایسا شدید خط نہ لکھنا چاہیے تھا۔ میں نے کہا کہ ہم لوگ شیشہ گری کی دکان ہیں اس دکان میں آہستہ قدم رکھنا چاہیے اور تمام ماجرا لکھنے کے بعد لکھتے ہیں۔

> "واقعی یہ نازک اندام آدمی" جسے جواہر لال نہرو کہتے ہیں، ہر حیثیت سے اس قابل ہے کہ اس سے شدت کے ساتھ محبت کی جائے اور خوب بھینچ بھینچ کر اس کا منہ چوما جائے۔" (۳۵)

اگلے دو خطوط میں تاریخ تحریر ندارد ہے اور مقام روانگی بھی نہیں ہے۔ یہ خطوط بھی داماد کی نوکری کے لیے لکھے گئے ہیں۔ دوسرے خط میں سجاد کو ٹرک کا پرمٹ دلانے اور شعلہ و شبنم کے واسطے اشتہارات اور مالی امداد کی درخواست ہے۔ جوش نے شنکر پرشاد سے کام نکلوانے کے لیے خود کو شنکر پرشاد کے عاشق زار سے تعبیر کیا ہے اور انہیں اپنی سچی محبت و وفاداری کا یقین دلایا ہے۔

اگلے چار خطوط سندھ مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی پاکستان سے روانہ کیے گئے ہیں۔ جوش نے ان خطوط میں اپنے اہل خانہ کے بارے میں کچھ ہدایات دی ہیں۔ نیز حبیب اللہ رشدی کی ڈیلر شپ کے واسطے سفارش کی ہے۔ ایک خط میں اپنے بھتیجے افتخار علی کی سفارش کی ہے اور شکوہ کیا ہے کہ آپ نے میرے داماد کے لیے کچھ نہیں کیا لیکن اگر میرے بھتیجے کے لیے بھی کچھ نہیں کریں گے تو میں اپنا سا منہ لے کے رہ جاؤں گا لیکن آپ کی محبت سے دستبردار نہ ہوں گا۔ اگلے آٹھ خط رام پرکاش ساحر ہوشیار پوری کے نام ہیں جو کہ اردو کے مشہور شاعروں میں سے ہیں۔ جوش ملیسانی کے شاگرد ہیں اور اسی حوالے سے جوش ملیح آبادی سے قریبی تعلقات تھے۔ جوش کی کتاب چھاپنا چاہتے تھے لیکن کسی وجہ سے شائع

نہ ہو سکی۔ تین ہزار روپے جوش کو پیشگی ادا کر دیئے گئے تھے اور اقرار نامہ لکھا گیا تھا۔ پہلے دو خطوط میں مشاعرے میں شرکت کے بارے میں لکھا ہے کہ حالات کی ابتری اجازت نہیں دیتی کہ میں ذاتی مصارف سے مشاعرے میں شرکت کروں۔ اگر میری کتابوں کی رائلٹی یا پنشن کا روپیہ بروقت مل گیا تو میں ذاتی خرچ پر چلا جاؤں گا۔ پہلا خط ۴ مارچ ۱۹۴۸ء کا تحریر کردہ ہے۔ ۱۹ مارچ کے خط میں شرکت سے معذرت کی ہے۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۴۸ء کے خط میں لکھا ہے کہ آپ کا خط اور تین ہزار روپے کا ڈرافٹ مل گئے۔ مسودہ ایک ہفتے تک روانہ کردوں گا۔

ایک مشاعرے میں جوش کے بیٹے کو موسیقی کا انچارج بنایا گیا تھا لیکن منتظم مشاعرہ کے ساتھ جھگڑے کی وجہ سے انہیں مشاعرے سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اسی واقعے کو جوش بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جانے کو دل نہیں چاہتا لیکن کنور مہندر سنگھ بیدی کی وجہ سے جانا پڑے گا۔ ۲۸ جولائی ۱۹۵۰ء کے خط میں ساحر کو تلقین کر رہے ہیں کہ کلکتہ چھوڑ کر نہ آؤ، جوان آدمی ناخوشگوار حالات میں بخوبی بسر کر سکتا ہے، لکھتے ہیں:

''ساز گار و خوشگوار حالات میں تو ہر شخص بسر کر لیتا ہے لیکن جوان مرد ہیں وہ لوگ جو ناخوشگوار حالات میں سر جھکا کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس لیے میری نصیحت کان کھول کر سنئے اور انہیں تلخیوں میں زبردستی شیرینی پیدا کر کے زندگی کا جہاز چلایئے۔'' (۳۶)

جوش نے زندگی میں اداس رہنے والوں کو ''اس کرۂ ارض کے امام باڑے کے تعزیے'' قرار دیا ہے۔ یہاں بسمل سعیدی مراد ہیں جو اپنی محبوبہ کی بارگاہ تک رسائی کے باوجود آہیں بھرتے رہتے ہیں۔ ایک خط ۲ نومبر ۱۹۷۶ء کا تحریر کردہ ہے جس میں کاغذوں میں ساحر کا خط گم ہو جانے کا تذکرہ کیا ہے کہ اس کی وجہ سے میں وقت پر کنور بیدی کے بارے میں بھٹو صاحب سے تذکرہ نہ کر سکا۔ ۱۳ فروری ۱۹۵۵ء کا خط ترتیب کے لحاظ سے آخری ہے۔ ۱۹۷۶ء والے خط کو آخر میں دینے سے تاریخی ترتیب درست ہو سکتی تھی۔ اس خط میں جوش نے بتایا ہے کہ میں زیادہ دیر تک کسی سے ناراض نہیں رہ سکتا لیکن بشری کمزوری کی وجہ سے ناراض ہو جاؤں تو دیر تک اس کو (ناخوشی) اپنے دل میں جگہ نہیں دے سکتا، لکھتے ہیں:

> ''برادر عزیز، میرا سینہ آپ ہی کی مانند بے کینہ ہے'' میں کسی سے مستقلاً عداوت نہیں پال سکتا۔ تھوڑی دیر کے واسطے بشری کمزوری کی بنا پر میں کسی شخص سے اس کی بے وفائی یا کمینگی کے باعث ناخوش تو ضرور ہو سکتا یا ہو جاتا ہوں، مگر اس ناخوشی کو اپنے دل میں پرورش دینے کی تاب نہیں لا سکتا۔'' (جوش ملیح آبادی کے خطوط ص ۱۲۲)

یہاں جوش کا اشارہ شاہجہان پوری بسمل کی طرف ہے جو کٹر مذہبی آدمی تھے اور جوش کی شراب نوشی کی وجہ سے مشاعروں میں جوش کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر شعر پڑھتے تھے۔ جوش وضاحت کرتے ہیں کہ آپ کو معلوم ہے کہ میں پیئے ہوئے ہوتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ میری طبیعت قابو سے باہر ہو جائے اور لوگ تماشا دیکھیں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ یا تو آپ مجھے ان کی طرف سے ضمانت دیں یا میں ان کے ساتھ مشاعرہ نہ پڑھوں گا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ایک رقعہ ہے جس میں جوش اور ساغر کی طرف سے شرفِ نیاز کے بارے میں پوچھا گیا ہے کہ کب اور کس وقت حاضر ہوں۔ ۶ نومبر ۱۹۶۴ء کا تحریر کردہ مراسلہ ہے۔ مقام روانگی ندارد ہے۔ جمیل صاحب جالبی سے پوچھا گیا ہے کہ آپ نے آنے کا وعدہ کیا لیکن نہیں آئے۔ سرٹیفکیٹ پر دستخط کروانے کے لیے خط لکھا گیا ہے۔ پانچ خطوط مکیش اکبر آبادی کے نام ہیں۔ پہلا خط لکھنؤ سے تحریر کردہ ہے اور ۷ مئی ۱۹۴۱ء کا مرقومہ ہے۔ اس میں جوش نے لکھا ہے کہ اگرچہ ہمارے راستے الگ ہیں لیکن ہم ایک دوسرے کی محبت میں خود کو مجبور پاتے ہیں۔ اس خط میں جوش نے خوب منظر نگاری کے جوہر دکھائے ہیں لکھتے ہیں۔

> ''گرمی یہاں شدت سے پڑ رہی ہے۔ اس وقت بھی جبکہ شام کا وقت قریب ہے، پسینے میں نہایا ہوا بیٹھا ہوں اور سخت بے کیفی کے عالم میں خط لکھ رہا ہوں۔'' (۳۷)

۱۱ نومبر ۱۹۲۸ء کا ایک خط ہے جس میں محبت کے موضوع پر مکیش اکبر آبادی کے خیالات جان کر جوش کو بے حد حیرت و مسرت ہوئی، لکھتے ہیں۔

...''یہ باتیں آپ کو کہاں سے معلوم ہوئیں؟ بسم اللہ کے گنبد کے اندر یہ رباب بجانا کس سے سیکھا ہے۔ یہ تو ''کرتے کی رویا'' ہے۔ آپ نے نظری طور پر محبت کے بھید کیونکر معلوم کر لیے۔ ممکن ہے اس پردۂ زہد وورع کے پیچھے کوئی کافر ادا تبسم ریز رہا کرتی ہو، کسے معلوم، آپ ہی روشنی ڈالیں۔(۳۸)

۱۵ جون ۱۹۵۴ء کے خط میں اکادمی میں مکیش کے لیے خدمات کے لیے گوشے ڈھونڈنے کے بارے میں بتا رہے ہیں کہ اکادمی کے چالو ہونے کے بعد آپ کے حساب سے کام ڈھونڈوں گا۔ شملہ میں حسینوں کی چہل قدمی سے عاشقوں کے دل میں اُٹھنے والے ہنگاموں کا تذکرہ ہے۔ درپردہ جوش مکیش کے دل میں اشتیاق پیدا کر کے انہیں لذتِ گناہ سے ہمکنار کر رہے ہیں۔ ایک خط جو کہ ۴ ستمبر ۱۹۵۳ء کا تحریر کردہ ہے۔ اعجاز صدیقی کو بھیجا گیا جو کہ علامہ سیماب اکبر آبادی کے صاحبزادے ہیں اور ایک ماہنامہ ''شاعر'' کے نام سے نکالا کرتے ہیں۔ یہ ایک رسمی خط ہے جس میں جواب نہ لکھنے کی کوتاہی ہے۔ رسالے کے لیے نظم بھیجی ہے اس کا ذکر ہے۔ سعیدہ خاتون کے نام تین خطوط ہیں جو کہ جوش کی صاحبزادی ہیں۔ ۲۸ جون ۱۹۲۳ کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''تمہاری والدہ نے بتایا کہ تمہارے پاس اب گرمیوں کے کپڑے نہیں رہے اور موٹے کپڑے پہنتے وقت تم روتی ہو، اس خط میں جوش نے ایک باپ کے سارے جذبات سمو دیئے ہیں جو چاہتے ہوئے بھی اپنے بچوں کو ان کی پسند اور آسائش کی اشیاء خرید کر نہیں دے سکتا۔ وہ جذبات کی اس انتہا تک پہنچے ہیں کہ میں وصیت کرتا ہوں کہ مرنے کے بعد مجھے ایسے ہی کپڑوں کا کفن دیا جائے۔ تیری اس خراب پوشاک کی یاد میں۔ شاعر کی بے بسی ہے جو صفحۂ قرطاس پر آہ بن کر دکھائی دے رہی ہے۔

دوسرا خط ۲۳۔۱۔۱۹۷۳ کا تحریر کردہ ہے جب جوش اسلام آباد میں تھے اور ان کی بیٹی اور بیٹا کراچی میں زندگی گزار رہے تھے۔ بیوی کو بھی بیماری کی حالت میں بیٹی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ اس میں اہل خانہ کی فرداً فرداً خیریت معلوم کی ہے اور اپنی خیریت کی اطلاع دی ہے۔
۳۱ اکتوبر ۱۹۷۳ء کی رات لکھا جانے والا خط جوش کے دلی جذبات کو عیاں کرنے والا خط ہے۔ ایک طرف بیٹے کی فکر ہے دوسری طرف بیوی کی صحت کی پریشانی، تیسری طرف بیٹی کی صحت کی پروا اور چوتھے یہ کہ آمدنی قلیل ہونے کی وجہ سے جوش اپنی من مرضی سے اپنے بیٹے اور بیٹی کی کھل کر مدد نہیں کر سکتے۔ مستزاد یہ ہے کہ بھائی کی موت کا صدمہ لاحق ہے۔ یہ خط خطوطِ راغب مراد آبادی میں بھی موجود ہے۔

ایک خط دیوان سنگھ مفتون کے نام ہے جو کہ جوش کے دوست اور مشہور صحافی تھے۔ ''رعیت'' اور ''ریاست'' نامی دو رسالے بھی جاری کیے۔ جوش کہتے ہیں کہ تقسیم سے پہلے مسز سروجنی نائڈو نے جو کچھ مجھ سے کہا تھا، آج حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوا ہے۔ ہندوستانی ہندو مجھے مسلمان سمجھ کر مجھ سے نفرت کر رہے ہیں اور پاکستانی مسلمان کافر سمجھ کر قابلِ قتل خیال کر رہے ہیں اور اپنا تو یہ حال کہ

کہاں لے جاؤں دل، دونوں جہاں میں سخت مشکل ہے
ادھر پریوں کا مجمع ہے، اُدھر حوروں کی محفل ہے

جوش لکھتے ہیں

میرا قصور صرف کیا ہے، صرف اس قدر کہ میرے دل میں یہ خیال کیوں آیا کہ میرے انتقال فرما جانے کے بعد میری بیوہ اور میرے بچوں کا کیا حشر ہو گا اور یہ سب ہندوستان ہی میں رہیں گے تو ان کی زبان اور ان کی کلچر کیوں کر باقی رہ سکے گی۔ بس لے کے میرا ایک جرم ہے۔(جوش ملیح آبادی کے خطوط ص ۱۳۰)

اگلا خط تعزیتی خط ہے جو کہ ۲ دسمبر ۱۹۵۱ء کا تحریر کردہ ہے۔ یہ ملک کے گراں قدر شاعر علامہ سیماب اکبر آبادی کے بڑے صاحبزادے کے نام ہے۔ موت کی حقیقت اور دوستوں کے کوچ کر جانے کی دلدوز صدا جوش کے اس خط سے آ رہی ہے۔ جوش کہتے ہیں شائد ان ارواح کی آوازوں کے تعاقب میں میری روح بھی لبیک کہہ دے۔

یاں چمپتی دھوپ ہے ، گلابی سایا
رہتا ہے سحاب ابدیت چھایا
جوش آؤ کہ منتظر ہے بزمِ ارواح
آیا ، یارانِ رفتہ آیا ، آیا

(جوش ملیح آبادی کے خطوط ص ۱۳۲)

چار مختصر خطوط ڈاکٹر سید مسعود حسن، رضوی ادیب کے نام ہیں۔ پہلا خط ۱۷ ستمبر ۱۹۳۵ء کا تحریر کردہ ہے۔ چاروں خطوط رسمی خطوط ہیں جن میں جوش کے ماہنامے ''کلیم'' کے لیے مقالات کے تقاضے اور مقالہ ملنے پر شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ شیخ غلام قادر گرامی کو ۹ مارچ ۱۹۲۵ء کو خط تحریر کیا گیا ہے۔ اس میں معذرت کی گئی ہے ان کا خط دیر سے جوش ملا ہے۔ اقبال و گرامی سے عقیدت کا اظہار ہے۔ نیز گرامی کی رباعیوں کے بارے میں کچھ لکھنا چھوٹا منہ بڑی بات ہو گی۔ راس مسعود کے نام جوش کے چھ عدد خطوط موجود ہیں۔ آپ سر سید کے پوتے اور سید محمود کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ۱۹۳۴ء میں ریاست بھوپال میں وزیر تعلیم کے عہدے پر متمکن تھے۔ پہلا خط حیدر آباد سے اخراج کے بعد باڑہ نواب صاحب، دھول پور سے ۴ مارچ ۱۹۳۵ء کو تحریر کیا گیا ہے۔ اپنی حالت کی طرف توجہ دلا کر مدد کی درخواست کی گئی ہے۔

اگست ۱۹۳۵ء کے خط میں رسالہ ''کاخ بلند'' کے لیے مقالہ تحریر کرنے کی درخواست کی گئی ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ ''تاریخ شاہد ہے کہ اس وقت تک کسی قوم میں بیداری و زندگی پیدا نہیں ہوئی ہے جب تک اُس کے ادبیات میں عظیم انقلاب نہیں پیدا کیا گیا ہے اور ظاہر ہے یہ انقلاب کہیں باہر سے نہیں آتا، اسی ملک کے مشاہیر اسے پیدا کرتے ہیں۔ اسی نقطہ نگاہ سے ''کاخِ بلند'' کا یہ ایک غیر متزلزل اصول رہے گا کہ اس کے صفحات صرف اکابر و مشاہیر کے لیے مختص رہیں گے یا اس جوان قلم طبقے کو شریک کیا جائے گا جس کے تیوری تافت ستارۂ بلندی کے مصداق ہوں گے''۔ (۳۹)

اسی قسم کا خط جوش عبدالماجد دریا آبادی کو روانہ کر چکے ہیں۔

جوش نے اپنی امداد کے لیے سر تیج بہادر سپرو، سروجنی نائڈو، سر اکبر حیدری اور سر محمد سلیمان کو بھی لکھا ہے۔

۸ اکتوبر ۱۹۳۵ء کے مکتوب میں صرف ایک رباعی بطور مدعا درج ہے۔

آمدِ سحر ند از میخانۂ ما
کای رندِ خر اباتی و دیوانۂ ما
بر خیز، کہ پر کینم پیمانے زمی
راں پیش کہ پُر کنند پیمانۂ ما

(جوش ملیح آبادی کے خطوط۔ ص ۱۵۰)

۱۶ اکتوبر ۱۹۳۵ء کے خط میں ''کلیم'' کا نسخہ بھیجنے اور کم از کم بیس پرچوں کی خریداری کر کے امداد کی درخواست کی گئی ہے تا کہ کتب خانوں کو مفت پرچے بھیجے جا سکیں۔ خورشید علی خاں کے نام جوش کے بیس عدد خطوط ہیں۔ ان میں سے اکثر خطوط راغب مراد آبادی کے مرتب

کردہ مجموعۂ خطوط ''خطوطِ جوش ملیح آبادی'' میں بھی موجود ہیں۔ پہلا خط ۳۱ جولائی ۱۹۷۲ء کی تاریخ میں درج ہے جبکہ یہاں پر خط تین جولائی ۱۹۷۲ء کا تحریر کردہ ہے۔ القاب خط کے آخر میں دیا گیا ہے۔ اسلام آباد سے جانے کے بعد خورشید عی خاں کے خط نہ لکھنے کا گلہ ہے۔ آخر میں لکھا ہے۔ خورشید کی ظلمت فشانیوں کا صیدِ زبوں۔ جوش

دوسرا خط ۲۳ ستمبر ۱۹۷۲ سہ پہر کا مرقومہ ہے۔ راغب مراد آبادی نے خطوط جوش ملیح آبادی میں ۲۱ ستمبر ۱۹۷۱ء کی تاریخ درج کی ہے اور کتاب کے دونوں ایڈیشنوں میں یہی تاریخ درج کی ہے۔ پہلے ایڈیشن میں خط کا فحش حصہ دیا گیا ہے جبکہ دوسرے ایڈیشن میں حذف کر دیا گیا ہے۔ خلیق انجم نے خطوط کے فحش حصے حدف نہیں کیے ہیں۔ تیسرا خط بھی خطوطِ راغب مراد آبادی میں موجود ہے۔ یکم اگست ۱۹۷۳ء کا خط انتہائی مختصر رقعے کی صورت میں ہے۔ خاموشی سے جگانے کی سعی ہے۔ ۱۷ اگست ۱۹۷۳ کے خط میں فتنۂ آخر الزماں کا تذکرہ ہے جو اپنی بہن کے ہمراہ جوش صاحب سے ملنے آئی تھی۔ جوش لکھتے ہیں۔

> ''روزگار نے مجھ پر، اس خبیث عمر میں دو کٹیلی چھوکریوں کو مسلط کر دیا ہے۔ ہر چند میرے چہرے پر ماہ و سال کی شکنیں دوڑ چکی ہیں، اور میرے خط و خال کی کمر ٹوٹ چکی ہے لیکن روح کائنات نے خدا جانے ان لونڈیوں پر کیا جادو کر دیا ہے کہ وہ میری دلداری پر کمر باندھے رہتی ہیں۔ وہ میرے چہرے کے بھیانک پن کو دیکھتی ہی نہیں، وہ کہتی ہیں، ہم کو حسین چہرے کی نہیں حسین ذہن کی ضرورت ہے۔ ارے کروڑوں کم سنوں میں ایک آدھ چھوکری اس مزاج کی بھی نکل آتی ہے جو شاعر کے غروب کی تیرگی کو طلوع کی جگمگاہٹ میں تبدیل کر دیتی ہے۔''(۴۰)

جوش اپنی عمر کی وجہ سے ان لڑکیوں سے کتراتے رہے لیکن جب محبوب مائل بہ کرم ہو تو عاشق بیچارہ کیا کرے۔

۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کے خط میں خط نہ لکھے اور چُپ سادھ لینے کا گلہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

آپ نے پھر چپ سادھ لی، سورج گرہن پھر پڑ گیا، ہوا پھر بند ہو گئی، پھر شدید حبس ہو گیا۔''(۴۱)

سلامت علی خان کے ساتھ ایک ''بُقّہ'' آیا تھا جس کو دیکھ کر خورشید علی خاں کی یاد آنا نا قابل فہم ہے۔

یکم اکتوبر ۱۹۷۴ء کے خط میں خورشید علی خاں کے اچانک یورپ چلے جانے پر دل چاک چاک ہو جانے کا تذکرہ کیا ہے۔ کہا ہے کہ جب آپ واپس آئیں گے تو شاید آپ کا وسیلہ معاش ختم ہو جائے اور دکان کی اینٹ سے اینٹ بج چکی ہو۔

۲۳ دسمبر ۱۹۷۴ء کے خط میں لاہور میں قیام کے بارے میں بتایا ہے۔ محبوب کے کوچے میں زندگی بہت حسین ہو گئی ہے۔ ہر صبح صبحِ بنارس اور ہر شام، شام اودھ کو شرما رہی ہے۔ خورشید علی خان کو کہتے ہیں کہ آپ میرا دل دکھا کر تنہا لندن چلے گئے۔ میری ہائے آپ پر ایسی پڑی کہ دل کا دورہ پڑ گیا۔ آپ نے بترس از راہِ مظلوماں سنا ہو گا۔ اب آنکھ سے دیکھ لیا۔

اور کہتے ہیں کہ صرف میں ہی نہیں کوئی اور بھی آپ کو یاد کرتا ہے۔ یہاں اپنا نام نئی طرز میں لکھا ہے لکھتے ہیں۔

آپ کا شیدائی
جوش مینائی

چار جنوری ۱۹۷۵ء کے خط میں چار رباعیات اور ایک مطلع تحریر کیا ہے۔

ہلال نقوی کے نام ۵ خطوط ہیں اور یہ خطوط مجموعہ راغب مراد آبادی میں بھی موجود ہیں۔ ان کا ہم جائزہ لے چکے ہیں۔

سیدہ اختر کا اصل نام سرداری بیگم اور اختر تخلص تھا۔ شاعروں کی سرپرست تھیں اور خود بھی شاعرہ تھیں۔ جوش نے انہیں ''ناہید سُخن'' کا لقب دیا تھا جس کا انہیں ایک ہزار روپے معاوضہ ملا تھا۔ انہوں نے ۱۹۴۲ء میں بنگلور میں ایک تاریخی مشاعرہ کیا تھا جس کا ذکر اکثر کتابوں میں ملتا ہے۔

جوش کے آٹھ خطوط سیدہ اختر کے نام ہیں۔ ان خطوط میں تاریخ تحریر درج نہیں ہے۔ پہلے خط میں جوش نے اپنے چھوٹے بھائی رئیس احمد کی جائیداد (جو کہ رہن رکھی گئی تھی۔ عدالت نے مہاجن کے حق میں فیصلہ دے دیا) کے لیے پندرہ ہزار روپے قرض کا تقاضا کیا ہے اور جوش کی دھول پور کی جائیداد کا فیصلہ ہونے پر قرض کی ادائیگی کا کہا ہے۔ (بعد میں یہ قرض سیدہ اختر نے تیس ہزار روپیہ دے کر ادا کر دیا تھا) ایک خط میں اپنے چچازاد بھائی کی ملازمت کے لیے درخواست کی ہے اور اگلے خط میں شکریہ ادا کیا ہے۔ ایک خط میں چار کتابیں شائع کرنے پر کتابیں وی پی منگوانے کا کہا ہے اور ممبئی میں جو پبلشنگ ہاؤس کھولنا چاہتے ہیں اس کے سرپرستوں میں سیدہ اختر کے نام کو شامل کرنے کا کہا ہے۔ ایک خط میں جوش نے فلم سازی کی دعوت دی ہے ایک یہ کہ سرمائے سے اپنی فلم بنائی جائے۔ دوسری یہ کہ فلم ساز کمپنی کو سرمایہ بطور قرض دے دیا جائے۔ دس فیصد سود کے حساب سے۔ ایک خط میں برسات کے مہینے میں دہلی آنے کی دعوت دی ہے۔ ایک خط میں خط نہ لکھنے کا گلہ ہے۔ حضرت دل شاہجہاں پوری کے نام جوش کے تین عدد خطوط موجود ہیں۔ دل شاہجہاں پوری اچھے شاعر اور حکیم تھے اور امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ ایک خط میں حضرتِ دل کا مجموعہ شاعری ملنے پر شکریہ ادا کیا گیا ہے اور ''نگار'' میں شائع ہونے والی اپنی تحریر کی وضاحت کی ہے۔ ایک خط میں ماہنامہ ''کلیم'' کی اشاعت کے باب میں لکھا ہے کہ ہفتے عشرے میں شائع ہو جائے گا۔

ڈاکٹر صفدر آہ سیتاپوری عربی، فارسی، اردو، ہندی اور انگریزی میں ماہر تھے۔ اردو میں رسالہ ''حاطف'' اور ہندی میں ''جنتا'' کے نام سے رسالہ نکالتے تھے۔ جوش نے آہ سیتاپوری کو ان کے خط کی رسید دی ہے اور نظم کے مطالعے کے لیے وقت نہ ہونے کا کہا ہے۔ حکیم جمیل خاں کو جوش نے حکیم محمد امام امامی کے لیے سفارشی خط تحریر کیا ہے۔ یہ مولوی عبدالحق کے قریبی دوست تھے۔ انہوں نے میسور میں انجمن ترقی اردو قائم کی تھی۔

تمکین کاظمی حیدر آباد کے مشہور شاعر اور ادیب تھے۔ کلام مومن پر جوش کی رائے کے لیے خط لکھا تو جوش نے گلہ کیا کہ آپ نے اس کو یاد کیا جسے آپ بھلا بیٹھے ہیں۔ لیکن مومن کے بارے میں جوش نے اس رائے کا اظہار کیا کہ

> ''غزل گوئی محض ایک رسمی اور غلط چیز ہے اور مومن کا بڑا کمال یہ ہے کہ اُس نے رسمی اور غلط چیز میں ایک بڑی حد تک رنگینی اور دلکشی پیدا کر دی ہے۔'' (۴۲)

اس مجموعہ خطوط کی اہمیت و وقعت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں فاضل مرتب نے حیدر آباد میں جوش کی ملازمت اور وہاں سے اخراج کے بارے میں دستاویزات بھی فراہم کر دی ہیں۔ سب سے پہلے علامہ محمد اقبال کا مہاراجہ کشن پرشاد والئی حیدر آباد کے نام خط ہے جو انہوں نے جوش کی سفارش کے لیے تحریر کیا۔ اقبال لکھتے ہیں۔

> ''یہ خط شبیر حسن صاحب جوش ملیح آبادی لکھنوی کی معرفی لکھتا ہوں۔ یہ نوجوان نہایت قابل اور ہونہار شاعر ہیں۔ میں نے ان کی تصانیف کو ہمیشہ دلچسپی سے پڑھا ہے۔ اس خداداد قابلیت کے علاوہ لکھنؤ کے ایک معزز خاندان سے ہیں جو اثر و رسوخ کے ساتھ لٹریری شہرت بھی رکھتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ سرکار ان کے حال پر نظر عنایت فرمائیں گے اور اگر ان کو کسی امر میں سرکار عالی کے مشورے کی ضرورت ہو گی تو اس سے دریغ نہ فرمائیں گے۔ (۴۳)

خلیق انجم نے ڈاکٹر سید داؤد اشرف کی کتاب ''بیرونی مشاہیر ادب'' سے کچھ دستاویز نقل کی ہیں جو کہ جوش کی خودداری، انا، عزت اور آبرو کی حفاظت جیسی باتوں کو باطل ثابت کرتی ہیں جو کہ انہوں نے حیدر آباد میں ملازمت حاصل کرنے اور وہاں سے اخراج کے حوالے سے ''یادوں کی برات'' میں کہی ہیں۔

جوش جب حیدر آباد گئے تو ان کے پاس ڈاکٹر محمد علامہ اقبال، اکبر الٰہ آبادی، عبدالماجد دریا آبادی اور سید سلیمان ندوی کے خطوط تھے وہاں انہوں نے ایک نظم ''فقیر کی صدا'' نواب میر عثمان کے دربار میں پڑھنے کے لیے تیار کی۔ پہلی بار مائل ملیح آبادی نے ''جوش اور دیارِ دکن'' میں اس کا ذکر کیا ہے۔

قریب ہے کہ ڈبو دے مجھے ہوائے فساد
سنبھال جلد سفینہ، دکن کی بادِ مراد
مجھے فلک نے دیا ٹھیکرا گدائی کا
کبھی تھے صاحبِ جاہ و حشم مرے اجداد
مگر یہ بات نرالی نہیں ہے، دنیا میں
ہمیشہ فقر پہ رہتی ہے فضل کی بنیاد
بہا وہ فضل کا دریا جو اپنی رو میں چلے
اچھالتا ہوا موتی سوئے ملیح آباد

اس کے ساتھ جوش نے نمونہ شوکتِ عثمانی یعنی تاریخ دکن شاہنامہ کے طرز پر بھی اپنی نظم کے ہمراہ نواب کی خدمت میں پیش کی۔ انہوں نے نمونہ کے طور پر آصف جاہ اول اور مرہٹہ باجی راؤ کی جنگ کے منظر کو نظم کر کے شوکت عثمانی میں شامل کیا ہے۔

ایک خط انگریزی میں سر اکبر حیدری کا ہے جو انہوں نے ۱۲ مئی ۱۹۲۴ء کو جوش کی سفارش کے سلسلے میں نواب امین جنگ کو لکھا تھا۔ ایک درخواست نواب عماد الملک کی ہے جس میں نواب میر عثمان علی سے جوش کی سفارش کی گئی ہے۔ یہ درخواست ۳۱ مئی ۱۹۲۴ء کو لکھی گئی تھی۔ تیسرا سر اکبر حیدری کے نام مہاراجہ کشن پرشاد کا سفارشی خط ہے۔ جس میں انہوں نے جوش کا تعارف کرایا ہے۔

چوتھا میر عثمان علی کا فرمان ہے جو ۲ جون ۱۹۲۴ء کو جاری کیا گیا جس میں پوچھا گیا ہے کہ جوش کیا چاہتے ہیں اور کیا شبیر حسن کو عثمانیہ یونیورسٹی میں جگہ مل سکتی ہے۔ جوش نے نواب میر عثمان علی کی خدمت میں جو درخواست پیش کی تھی۔ خلیق انجم نے بعینہٖ نقل پیش کی ہے۔ جوش نے اس درخواست میں یہ امر پیش کیا ہے کہ مشرقی تہذیب و تمدن میں یہ امر اچھا نہیں سمجھا جاتا کہ اپنی تعریف خود کی جائے اور میں یہ بیان کرنے سے قاصر ہوں کہ جامعہ عثمانیہ کی مستقل خدمت کے لیے خود کو قابل انتخاب ثابت کروں۔ اگر قسمت نے ساتھ دیا تو میں بیان کر دوں گا کہ اس جامعہ عثمانیہ سے کس غیر معمولی لیاقت کے طالب علم بر آمد کیے جاسکتے ہیں۔ میں نہ صرف تاریخ دکن کو نظم کا جامہ پہناؤں گا بلکہ دکن کے موسموں کی تصاویر، یہاں کی قابل ذکر ہستیوں کے فوٹو، دکن کے قدیم وجدید رسم ورواج اور عمارات کے نقشوں کو بھی اس کے اوراق کی زینت بناؤں گا۔ میں غریب شاعر جب ایوان شاہی میں داخل ہوا ہوں تو میرے ایک ہاتھ میں میری ناچیز تصانیف ہیں جن پر ملک کے مستند اہل قلم نے تنقیدی آراء پیش کی ہیں اور دوسرے ہاتھ میں وہ نظمیں ہیں جنہیں تاریخ دکن کے موضوع پر بطور نمونہ اس مختصر قیام حیدر آباد کے دوران تحریر کیا ہے۔ یہاں اس فرمان کی نقل پیش کی گئی ہے جس میں جوش کو انگلش لٹریچر کے کتب کا ترجمہ کرنے کے لیے امتحاناً دو سال کے لیے ڈھائی سو روپے ماہوار پر تقرر کی اطلاع دی گئی ہے۔ یہ ۲۵ دسمبر ۱۹۲۴ء کا مرقومہ ہے۔ میر عثمان علی خاں کی سالگرہ کے موقع پر رسالہ ''منشور'' میں جوش کی ایک نظم شائع ہوئی جس کا مقطع تھا۔

کبھی جوش کے جوش کی مدح فرما
کبھی گل رخوں کی ثنا خوانیاں کر

اس نظم پر جوش درباری سازشوں کا شکار ہو گئے اور نواب صاحب سے قریب رہنے والوں نے انہیں بہکایا کہ جوش کا روئے سخن آپ کی جانب ہے۔ نواب صاحب کی طرف سے جوش کو تنبیہہ کی گئی جس پر جوش نے خاصی طویل نظم لکھ کر معافی مانگی۔ جوش کو معاف کر دیا گیا لیکن پھر جوش کو ملازمت سے نکال دیا گیا اور حیدر آباد چھوڑنے کا حکم دے دیا گیا۔ مجبوراً جوش کو جانا پڑا۔ انہوں نے کوشش کی کہ انہیں حیدر آباد میں داخلے کی اجازت مل جائے لیکن نواب حیدر آباد میر عثمان علی خاں نے جوش کی درخواست قبول نہیں کی۔

خلیق انجم نے میر عثمان علی کے نام جوش کے معافی نامہ کو بھی نقل کیا ہے جس میں جوش نے لکھا ہے کہ اب جب کہ عالم اسلام پر نکبت و ادبار کے بادل چھائے ہوئے ہیں ایسے میں دکن کی روشنی تمام ہندوستان کو منور کیے ہوئے ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی حضور عالی کی خدمت میں سوئے ادب کا مرتکب ہو۔ مجھے وہ زمانہ یاد ہے جب مجھ پر عرصۂ حیات تنگ تھا۔ اس وقت آپ نے کمالِ خسروانہ مجھے اپنے سائے میں جگہ دی اور میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ میں ایک شریف خاندان کا فرد ہوں اور سوئے ادب کا تصور بھی اپنے ذہن میں لانا گناہ سمجھتا ہوں۔ حقیقت حال یہ ہے کہ ''صبح دکن'' کے واسطے ''مدیر صبح دکن'' فدوی سے ایک نظم لکھوا چکے تھے۔ اس کے بعد ''مدیر نظام گزٹ و منشور'' نے اصرار شروع کیا۔ اسی اثناء میں فدوی اتنا بیمار پڑ گیا کہ اس مرتبہ سالگرۂ ہمایونی کے ڈنر میں بھی شرکت نہ کر سکا۔ اسی حالت میں مدیرِ منشور کے تقاضوں سے شرما کر بخار کی کیفیت میں اپنی ایک بہاریہ غزل انہیں دے دی جس میں محض اپنی ذات سے تخاطب ہے جیسا کہ اکثر شعراء کیا کرتے ہیں۔ فدوی کی یہ مجال کہاں ہے کہ وہ حضورِ اقدس و اعلیٰ سے مخاطب ہو کر یہ کہے کہ ''کبھی جوش کے جوش کی مدح فرما'' فدوی نے جب کبھی بادشاہِ وقت کے متعلق کچھ لکھا ہے اس کا لب و لہجہ کس قدر مودبانہ رہا ہے۔ پھر بھی فدوی کو بے پایاں پشیمانی کے ساتھ اپنی اس غلطی کا اعتراف ہے کہ اس نے اس غزل پر ''بہ تقریب سالگرہ'' کی سرخی کیوں دی۔ فدوی کو اپنی اس غلطی پر پشیمانی ہے اور معافی کا خواستگار ہے۔ اگر حضور درگزر سے کام لیں تو ذات ہمایونی کی ذرہ نوازی سے بعید نہیں ہے۔ یہ معافی نامہ 15 اکتوبر 1933ء کا تحریر کردہ ہے۔ 3 نومبر 1933ء کو نظام کے آفس سے مولوی سید مہدی معتمد حکومت کو ایک مراسلہ بھیجا گیا کہ مہاراجہ کے ممبئی سے آنے کے بعد جوش سے جواب طلب کیا جائے کہ انہوں نے ''اخبار' منشور' کے سالگرہ نمبر جو نظم لکھی ہے اور جس کا عنوان ''نعرۂ جشن'' قرار دیا ہے اس کے مقطع کے الفاظ سراسر رئیس کی سوءادبی پر محمول ہوتے ہیں۔ پس ان کو چاہیے کہ آئندہ سے ایسی حرکات سے باز رہیں ورنہ سخت بازپرس کی جائے گی۔ اگر دوبارہ ایسی غلطی ہوئی تو 5 دسمبر 1933ء کو حکومت کی طرف سے ایک فرمان جاری ہوا کہ جوش نے اپنی دیدہ و دانستہ گستاخی کو ایک عذر لنگ کے ساتھ پیش کیا ہے وہ ہرگز قابلِ درگزر نہیں ہے۔ تاہم میں اس شرط کے ساتھ اس کو معافی دیتا ہوں کہ اگر پھر اس سے ایسی حرکت ہوئی تو چوبیس گھنٹہ کے اندر اس کو حکومت سے علیحدہ کر دیا جائے گا کیونکہ مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اس کی پرائیویٹ لائف ہرگز قابل اطمینان نہیں ہے۔ ایسے کیریئر کے شخص کو سرکاری محکمہ میں جگہ دینا گویا محکمہ کی توہین کرنا ہے۔ 13 اگست 1934ء کو نواب مہدی یار جنگ کے نام نواب صاحب کا فرمان جاری ہوا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ کے ملازم شبیر حسین خان جوش ملیح آبادی کے متعلق آپ کو تحریر کرنے کے لیے جو سرکار کا حکم ہے وہ حسب ذیل ہے۔

اس شخص کو اگرچہ پہلے تنبیہہ کی گئی تھی کہ وہ اپنے اعمال کو درست کر لے ورنہ اس کی علیحدگی عمل میں آئے گی مگر افسوس کہ اس کا نتیجہ کچھ اچھا نہیں نکلا بلکہ سابقہ حالات ایک حد تک ابھی باقی ہیں لہٰذا مناسب ہو گا کہ جس مدت کے لیے وہ یہاں ملازم ہوا تھا اس حساب سے کچھ ماہوار بطور رعایت اس کے نام جاری کر کے (جس کی مقدار سے پہلے یہاں اطلاع دی جائے) اس کو کہہ دیا جائے کہ وہ دو ہفتہ میں یہاں سے خاموشی سے وطن چلا جائے اور بغیر اجازت یہاں پھر آنے کا قصد نہ کرے۔ 27 اگست 1934ء کو نواب مہدی یار جنگ کے نام نواب صاحب کا ایک اور فرمان جاری ہوا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ جوش ملیح آبادی کل یوم سہ شنبہ یہاں سے اپنے وطن جا رہا ہے (جس کو حال میں حکومت کی

خدمت سے وظیفہ پر الگ کیا گیا تھا) اس کو یہ حکم سنایا جائے کہ جو کچھ وظیفہ ازروئے سروس اس کو ملے گا وہ اس شرط پر کہ وہ بیرونی ممالک محروسہ خاموشی سے زندگی بسر کرے گا۔ وہاں اگر پھر سے اپنے خبث باطن کا اظہار کرے گا (جیسا کہ اُس کی عادت رہی ہے) تو بعد تصدیق کے وظیفۂ بادشاہ مسدود ہو جائے گا۔ 23 جنوری 1935ء کو ایک اور فرمان نواب کی طرف سے جاری ہوا۔ کہ شبیر حسین جوش کے نام ماہوار وظیفہ جاری کیا جائے مگر اس شرط سے کہ اگر وہ پھر کسی قسم کی نازیبا حرکت کرے گا تو وظیفہ روک دیا جائے گا۔ انہوں نے موٹر کار اور مکان کے سلسلے میں جو قرضہ حاصل کیا تھا اس کے معاوضہ میں جو موٹر کار اور مکان وغیرہ مکفول ہیں ان پر منجانب سرکار قبضہ کیا جائے اس کے بعد اگر کوئی قرضہ باقی رہے تو ان کے وظیفے سے بحساب فی ماہ 25 حاصل کر لیا جائے۔ 17 نومبر 1947ء کو جوش نے نواب مہدی یار جنگ کو خط لکھا کہ حیدر آباد میں میرے داخلے کے امتناع کو اجازت میں بدل دیجئے تاکہ میں ان گلیوں میں ایک بار پھر لوں جہاں میں نے اپنی زندگی کے بہترین ایام گزارے اور اپنے دوستوں سے مل لوں۔ 24 جنوری 1947ء کا ایک فرمان حسب ذیل تھا۔

کہ زمانہ پر آشوب ہے اور اس شخص کا رویہ گزشتہ زمانہ میں کیا تھا وہ بھی روشن ہے لہٰذا سابقہ حکم پر نظر ثانی نہیں ہو سکی یعنی اس کو ممالکِ محروسہ میں آنے کی اجازت نہیں ہے۔ 31 دسمبر 1947ء کو جوش نے معتمد حکومت حیدر آباد کو لکھا۔ مراسلہ پہنچا معلوم ہو کہ فرمان خسروی کی روشنی میں دفتر ھذا مزید کارروائی کرنے سے قاصر ہے۔ چلیے بہت اچھا ہوا انقلاب سے پیشتر حیدر آباد کی سیر میں لطف بھی نہ آتا۔ اس مراسلے میں جوش نے ایک فارسی اور ایک اردو کا شعر بھی لکھا۔

پیچ و تاب اس قدر اے موج عبث ہے تجھ کو
رول دیوے گا نہ موتی مجھے دریا تیرا

خطوط جوش ملیح آبادی کا تجزیاتی مطالعہ

جوش ملیح آبادی نے اپنے طویل العمری میں سینکڑوں خطوط لکھے ہیں جن میں کئی طرح کے خطوط ہیں۔ کچھ خطوط رسمی نوعیت کے ہیں، کچھ سفارشی ہیں، کچھ تشریحی خطوط ہیں، کچھ استفساراتی ہیں۔ کچھ معذرتی خطوط ہیں، کچھ سرکاری خطوط ہیں اور چند خطوط ایسے ہیں جو عاشقانہ خطوط کے زمرے میں آتے ہیں۔ زیادہ تعداد میں خطوط دوستوں کو لکھے گئے ہیں اور کچھ اہل خانہ کے نام ہیں۔

ان خطوط میں انتہائی نجی خطوط بھی شامل ہیں (جن کا اشاعت پذیر ہونا یا نہ ہونا ایک الگ بحث کا متقاضی ہے)

ان خطوط کے ذریعے سے جوش ملیح آبادی کی انشائی، ادبی اور علمی حیثیت پر بخوبی نظر دوڑائی جا سکتی ہے۔ جوش پر کام کرنے والے محققین اور شارحین کے لیے یہ خطوط دستاویزات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان خطوط کے ذریعے جوش کے مزاج کی ارتقاء پذیری اور ان کی طبیعت کی رنگارنگی کو جانا جا سکتا ہے۔ یہ جوش کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے کے لیے مدو معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ جوش کے خطوط کو پڑھنے سے پہلے اگر ہم جوش کے بارے میں کوئی تاثر قائم نہ کریں تو خطوط پڑھنے کے بعد ہمارے ذہن میں ایک خاکہ بن جائے گا جس میں کبھی بے تکلفی سے احباب کے ساتھ گفتگو کرتا، کبھی صاف گوئی اور بے ریائی سے دوسروں کے بارے میں اپنے مؤقف کی وضاحت کرتا، کبھی کسی دوست کی سفارش کرتا، کبھی اپنے بچوں کے مستقبل کو محفوظ بنانے کی تگ و دو کرتا اور کبھی کسی محبوبۂ دلنواز یعنی فتنۂ آخر الزماں کے عشق میں ''گوڈے گوڈے ڈوبا ہوا'' ضعیف جوش رنگ بھرتا دکھائی دے گا۔

ان خطوط کے ذریعے سے جوش کے معروف خیالات کی توثیق ہوتے بھی دیکھتے ہیں۔ وہ خیالات جو ان کے مقالات اور ان کی آپ بیتی ''یادوں کی برات'' میں بکھرے پڑے ہیں۔ جوش نے بعض خطوط میں اپنے جوانی کے زمانے کے خیالات کا اعادہ کیا ہے جب جوش اپنی بے خوفی،

اور جذباتیت کی وجہ سے علمائے سو کی مخالفت اور نام نہاد علماء کے جہل ہمہ دانی کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ جوش اُس مذہبی منافرت کے خلاف تھے جو انسانوں کو خانوں میں باٹتی ہے۔ یہ شیعہ ہے یہ سُنی ہے۔ وہ دیوبندی ہے۔ وہ اونچی ذات سے ہے یہ کمتر ہے۔ وہ انسانوں کو انسان ہونے کے ناطے اہمیت دیتے تھے۔ جوش تنگ نظر مذہبیت کی بجائے وسیع المشرب اور کشادہ دلی روحانیت کے قائل تھے۔ جوش ہندوستان میں رہ کر بھی شیعہ سنی اختلافات اور علاقائی عصبیت کا شکار رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے اہل خانہ کی بھلائی انہیں اسی میں نظر آئی کہ وہ پاکستان ہجرت کر جائیں اور پاکستان آ کر بھی وہ اس عصبیت، مذہبی منافرت اور تنگ نظری سے دامن نہ چھڑا سکے۔ اور یہاں بھی لوگوں کی نظر میں معطون و معتوب ہی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جوش کے خطوط میں ہمیں مختلف ادوار میں لوگوں کے رویوں کی وجہ سے پیدا ہونے والی کڑواہٹوں کا احساس بھی ہوتا ہے۔ جوش اپنے بچوں کے مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے پاکستان چلے آئے تھے لیکن ان سے بد ظن اور بد گمان لوگوں نے ان سے وہ تمام مواقع چھین لیے جن سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنے مستقبل اور حال کو خوش رنگ اور خوشحال بنا سکتے تھے۔

جوش کے خطوط سے ہمیں جوش کے باطنی افکار، خیالات، مسائل، اطوار اور ذاتی حالات کی آگاہی کے ساتھ ساتھ نجی و ازدواجی زندگی کے تلخ و شیریں لمحات بھی دکھائی دیتے ہیں۔ بعض خطوط ایسے سربستہ راز عیاں کرتے ہیں جن کا کسی اور ذریعے سے پردہ اٹھنا ممکن نہیں ہوتا مثلاً فتنۂ آخر الزماں کے نام لکھے گئے ایک خط سے پتہ چلتا ہے کہ جوش سے ان کی اس نو عمر محبوبہ نے نہ صرف اپنے بلکہ اپنے گھر والوں کے بھی کئی کام کروائے بلکہ جوش کے توسط سے ایک بینک میں ملازم ہو جانے کے بعد کس طرح جوش سے بے اعتنائی برتنی شروع کر دی۔

یا جوش کی ڈائری کا ایک ورق جس میں جوش اور فتنۂ آخر الزماں کے مابین راز و نیاز کا بیان ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ خطوط میں اپنی نجی زندگی اور خیالاتِ نازک کو پر تکلف اسلوب یا کسی اور طریقے سے چھپانے والا مکتوب نگار بلند مقام و مرتبہ کا حامل نہیں سمجھا جا سکتا۔ وہ جس قدر بے باکی سے اپنا دردِ دل صفحۂ قرطاس پر بکھیرتا ہے یا اپنا جگر چاک کرتا ہے اسی قدر قابل وقعت قرار پاتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے اپنے خطوط میں اپنے جذبات کے اظہار میں کسی قسم کی پردہ پوشی کی شعوری کوشش نہیں کی ان کی فہرست ڈاکٹر آصف حمید اپنے مضمون ''اردو مکتوب نگاری... قیام پاکستان کے بعد'' میں یوں پیش کرتے ہیں:

> اپنے خطوط میں بے باکانہ انداز اختیار کرنے والوں میں محمد علی رودلوی، جگر مراد آبادی، حامد حسن قادری، ن م راشد، رشید احمد صدیقی، صوفی غلام مصطفی تبسم، فراق گورکھپوری، پروین شاکر، علی سردار جعفری، ابن فرید، مشفق خواجہ، ڈاکٹر سید معین الرحمن، رشید حسن خاں، ڈاکٹر وزیر آغا، داؤد رہبر، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور شمس الرحمن فاروقی شامل ہیں۔ اگرچہ یہ مکتوب نگار اپنی ذات پر چھلکے چپکانے کے فن سے ناآشنا ہیں مگر بے ساختہ پن میں اس درجے کو نہیں چھوتے، جہاں صفیہ اختر، جاں نثار اختر، ابن انشاء، جوش ملیح آبادی، ممتاز مفتی اور احمد بشیر پہنچے ہوئے ہیں۔(۴۴)

جوش ملیح آبادی کا جو پہلا خط ہمیں دستیاب ہے وہ 19 ستمبر 1921ء کا مرقومہ ہے اس خط کو ہم قیام پاکستان سے قبل کی ذیل میں رکھیں گے یہ خط عبد الماجد دریا آبادی کے نام ہے۔

قیام پاکستان کے بعد خط لکھنے والوں میں جوش ملیح آبادی کا اولین نام ہے۔ جوش نے 17 اگست 1947ء کو مولانا ابوالکلام آزاد کے نام جو مراسلہ بھیجا ہے اس نے جوش کو اردو مکتوب نگاری قیام پاکستان کے بعد میں اول درجہ عطا کیا ہے۔

خط نہ صرف لکھنے والے کے نجی حالات کی عکاسی کرتا ہے بلکہ اپنے عہد اور معاشرت پر بھی روشنی ڈالتا ہے اس کے ساتھ ساتھ تاریخی و سماجی حالات کا عکاس بھی بن جاتا ہے۔ غالب کے خطوط اس کی مثال ہیں کہ غالب کے خطوط سے نہ صرف غالب کی معاشی، معاشرتی، سیاسی اور ادبی زندگی مرتب صورت میں قاری کے سامنے آتی ہے بلکہ اس دور کی تاریخ بھی مرتب ہوتی ہے۔ جبکہ جوش کے خطوط ہمیں جوش کی ذاتی اور

نجی زندگی کا احوال سناتے ہیں۔ ان میں کچھ دوستوں کے سرسری حالات سے تو واقفیت ہوتی ہے جو کہ دگرگوں معاشی صورت حال سے پریشان پھر رہے تھے لیکن اس زمانے کی سیاست اور تاریخ کو سراسر نظر انداز کیا گیا ہے۔ ادبی منظر نامے کا بھی نام ونشان نہیں ملتا۔ جبکہ جوش کی معاشی زندگی اور متعلقین جوش کی معاشرتی زندگی پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ سرسید نے اپنے خطوط میں قوم وملک کے مسائل پر قلم اٹھایا۔ اخلاق، طرزِ معاشرت، سیاست اور قومی درد ان کے خطوط کی جان ہے۔ جوش کے ہاں غم دوراں بہت کم حد تک ہے، غم جاناں بہت ہے، ایک فنکار اور درد مند فنکار جس ذہنی کرب واذیت سے اس معاشرے میں گزرتا ہے، جوش کے ہاں اس کا اظہار ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی لفظوں کی تصویر میں ڈھال کر ہمارے سامنے پیش کر دی ہے۔ اب اس میں رنگ بھرنا قاری کا کام ہے۔

جوش ساری زندگی اپنے اجداد کی معاشی برتری کے گن گاتے رہے اور مشقت کی چکی میں پستے رہے۔ اپنے گھر والوں کو حسب منشا آسائشیں مہیا کرنا ان کے لیے خوشحال مستقبل کی تعمیر نے ہولناک قسم کی مشغولیتوں میں مبتلا رکھا اسی لیے وہ اپنے ملنے والوں اور دوستوں کو اکثر یہ لکھتے دکھائی دیتے ہیں کہ میں شدید مصروف ہوں اور ابتداء ہی سے یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ حصول رزق کے لیے تگ ودو میں لگ گئے تھے۔ غروب آفتاب کے ساتھ جوش طلوع ہو جاتے تھے یعنی دورے نوشی شروع ہو جاتا تھا اور ایک مقررہ وقت جوش بستر پر چلے جاتے تھے اور ہمیشہ صبح کاذب بیدار ہو کر سحر خرامی کے لیے نکل جایا کرتے تھے۔ اس لیے جوش کا دن تو ہمیشہ تین یا چار بجے صبح چڑھ جایا کرتا تھا۔ تمکین کاظمی کو 29 جنوری 1928ء کے خط میں لکھتے ہیں:

۔۔۔اس قدر ہولناک صورت میں مشغول رہتا ہوں کہ خود سے بھی اب گاہے ماہے کی ملاقات رہ گئی ہے۔"(۴۵)

میر عترت حسین کے نام 20 دسمبر 1966ء کے خط میں لکھتے ہیں۔

"میر صاحب شرمندہ ہوں، آپ کے خطوط کے جواب میں بے حد تاخیر ہو گئی۔ میری مشغولیت مجھے مارے ڈال رہی ہے۔(۴۶) ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔

کہا کہوں میر صاحب میں کس قدر مصروف رہتا ہوں۔ صبح کے چار بجے سے رات کے 9 بجے تک زندگی کی مشین چلاتا رہتا ہوں۔
19-06-1960

ساری عمر جوش مالی اعتبار سے پریشان رہے۔ اگرچہ ان کی آمدنی ٹھیک ٹھاک تھی لیکن تین گھرانوں کا خرچ پورا کرنا جوش ہی کا کام تھا۔ اس کے صاحبزادے سجاد حیدر کے پانچ بچے تھے اور بیٹی کے نو بچے تھے۔ سجاد معاش کے لحاظ سے خاصے کمزور تھے اور بیٹی کے شوہر التفات احمد نکھٹو تھے۔ کام کرتے تھے لیکن آمدنی کم تھی اور کنبہ بڑا تھا۔ جوش کو یہ اخراجات بھی اٹھانے پڑتے تھے۔ جب جوش اسلام آباد میں تھے تو اپنے دوستوں کے نام منی آرڈر روانہ کیا کرتے تھے کہ خود جا کر میری بیٹی اور بیٹے کو پہنچا آؤ اگر ان کے بچوں کے ہاتھ لگ گیا تو ڈاکے کی نذر ہو جائے گا۔ اسی پے جوش ایسے وسائل کی تلاش میں رہتے تھے جن سے زیادہ سے زیادہ آمدنی ہو سکے۔ دلی کے چیف کمشنر شنکر پرشاد کے نام خط اس حقیقت کے غماز ہیں۔ جن میں جوش نے کوئی نہ کوئی مطالبہ ضرور کیا ہے۔ کاروبار جوش کے بس کا نہیں تھا۔ انہوں نے کئی کام شراکت داری میں کیے اور پھر آخر میں علمی وادبی کام ڈھونڈنے پر توجہ مرکوز کر دی جس کی بنا پر انہیں اعلیٰ ملازمتیں حکومت پاکستان کی طرف سے ملیں۔ جوش نے مالی وظائف کے لیے سر راس مسعود کو بھی کئی خطوط لکھے۔ ابو طالب نقوی سے بھی جوش نے رہائشی کوٹھی اور سینما کے لیے پلاٹ و پرمٹ کا وعدہ لیا تھا۔

جوش ملیح آبادی خطوط پر تاریخ لکھنے کی پابندی کو لازم سمجھتے تھے لیکن کچھ خطوط ایسے بھی ہیں جہاں جوش سے چوک ہو گئی۔ تاریخ کبھی خط کی ابتداء میں اور کبھی اختتام پر درج کرتے تھے کبھی ابتداء میں دائیں طرف اور انتہا میں بائیں طرف لکھا کرتے تھے۔ کبھی ایسے لکھا کرتے

تھے۔8/4/73 کبھی 73-8/4/8، کبھی 8-4-73 کبھی آٹھویں اپریل انیس سو تہتر اور کبھی 8 اپریل 1973ء لکھا کرتے تھے۔ کبھی پتا اردو میں اور کبھی انگریزی میں تحریر کرتے تھے۔

کبھی الفاظ ملا کر لکھا کرتے تھے۔ مثلاً کبھی ہو سکے گا (کبھی ہو سکے گا) دیجیگا (دیجیئے گا) آہندہ (آئندہ) کبھی الیکشن (الیکشن) سپرن ٹین ڈینٹ (سپرنٹنڈنٹ) ٹے لی فون (ٹیلی فون) گھانس (گھاس) اسٹے شن (اسٹیشن)

اکثر اوقات مقام روانگی تحریر کیا کرتے تھے بہت کم خطوط ایسے ہیں جہاں جوش نے مقام روانگی تحریر کرنے کا التزام نہیں کیا ہے۔ تعارفی اور رسمی خطوط جو کہ جلدی میں تحریر کیے گئے اس سے محروم ہیں۔

عام طور پر جوش خیال رکھتے تھے کہ مکتوب الیہ کو مختلف اور حسب حال القاب سے پکاریں۔ اس سلسلے میں انہوں نے ساغر مراد آبادی کو مختلف القاب سے پکارا ہے۔ مثلاً ''نظامی و سیمابی ساغر صاحب'' ''بخدمت عارف معائبِ جوش'' اپنی آخری محبوبہ کا نام ''فتنۂ آخر الزماں'' رکھا۔ کبھی اس کے نفسیات پڑھنے کی وجہ سے اسے اس کے پیار کے نام کے ساتھ پکارا۔ ''ماہر نفسیات و دانائے روز گار چنٹو'' کو تاہ عمر و دراز عقل چنٹو راغب مراد آبادی کو اس طرح مخاطب کیا ہے۔ پیارے، راج دلارے، مراد آبادی''، مرغوبِ جوش راغب، محبوب جوش راغب، اختتام پر اپنا نام مختلف طرح سے تحریر کیا ہے۔ راغب مراد آبادی کو لکھتے ہیں ''تمہارا امرد پرست جوش، شیخ الکفار از اسلام آباد''، ''تمہارا طالب وصل جوش، منور عباس کو لکھتے ہیں۔ ''آپ کا بیمار محبت، جوش'' اپنے نواسے قلندر عرف قلن کو لکھتے ہیں۔ ''تمہارا پڑھوک'' فتنۂ آخر الزماں کو لکھتے ہیں ''تمہارا گدائے راہ نشین''، ''ایک درماندہ و چاک گریباں، راندۂ بارگاہِ فتنۂ آخر الزمان''

ساغر نظامی کو لکھتے ہیں ''تمہارا ہدف ناوکِ بد ظنی، جوش نادار و غنی'' ایک جگہ لکھتے ہیں ''منم جوشِ اعظم، عقل درخشندہ باد۔ تفکر رخشندہ باد۔ بابا ذھین شاہ تاجی کو لکھتے ہیں۔ ''آپ کا، اپنی فکر کے علی الرغم، چاہنے والا، جوش''

خورشید علی خان کو لکھتے ہیں ''خورشید کی ظلمت فشانیوں کا صیّدِ زبوں'' اسلام آباد میں الحادستان کا سفیر، جوش۔ ''قابل صد ہزار نفرین، جوش ناعاقبت بیں'' غرض القابات کا ایک بحر بیکراں ہے جہاں سے مختلف اشخاص کی خصوصیات کے پیش نظر ان کے موافق القاب گہر بے بہا کی مانند بر آمد کیے ہیں۔

جوش ملیح آبادی نے اپنے تمام خطوط میں مدعا نگاری کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ چند خطوط کے استثناء کے سوا جو اُن کے دوستوں اور فتنۂ آخر الزماں کو تحریر کیے گئے ہیں جوش نے اختصار اور جامعیت کے ساتھ اپنا منتہائے نظر بیان کیا ہے۔ کسی خط میں کسی کتاب کی رسید دینی ہو، کوئی تعارفی رقعہ ہو، کوئی رسمی خط ہو، جوش نے مقصدیت کو غالب رکھا اور انتہائی مختصر طور پر اپنا مافی الضمیر پیش کر دیا ہے لیکن شنکر پرشاد کو لکھے جانے والے خطوط میں جوش نے ممدوح کی تعریف میں زور بیاں صرف کر دیا ہے۔ ساغر نظامی کو لکھے جانے والے ایک خط میں جوش نے ان کے دل کے غبار کو دور کرنے کی غرض سے اپنی صفائی تفصیل سے پیش کی ہے۔

بعض اوقات جوش مکتوب الیہ کو اپنے ساتھ شریک کرنا چاہتے ہیں اور اس لیے وہ منظر نگاری کا اہتمام کرتے ہیں، ایک خط میں خورشید علی خاں کو لکھتے ہیں۔

> ''ابھی ابھی وہاں سے اپنی سکونت گاہ یعنی سید شوکت حسین صاحب کے مکان پر آیا ہوں۔ آفتاب کے غروب اور میرے طلوع ہونے میں صرف پندرہ منٹ باقی ہیں۔ تنہائی کا عالم ہے اور آپ کی یاد ستا رہی ہے۔ کاش اس وقت آپ بھی ہوتے، ہائے، ایسے میں ان کو ڈھونڈ کے لائیں کہاں سے ہم'' (۴۷)

ساغر نظامی کو ''چیل'' دامن ہمالہ سے 28 جولائی 1942ء کو جو خط بھیجا اُس میں خوب منظر نگاری کی گئی ہے، لکھتے ہیں:

"میرے بنگلے میں میرے سوا کوئی نہیں ہے، میں ہوں اور میرے تصورات۔ پانی مزے لے لے کر برس رہا ہے۔ تمام پہاڑیاں بادلوں کے بھورے لکّوں میں چھپی ہوئی ہیں۔ ابر پاروں کا ہلکا ہلکا دھواں کھڑکیوں کے شیشوں کو چھو چھو کر فضا میں رقص کر رہا ہے، سردی سموئی ہوئی ہے۔ جلد کو نرمی کے ساتھ مس کر رہی ہے لیکن ہڈیوں تک پہنچ رہی ہے۔ ہوا میں زندگی اور تازگی ہے اور فضا میں رنگین اور پر اسرار افسانے رقص کر رہے ہیں اور میرا ابر رونگٹا چیخ رہا ہے۔ ساغر، ساغر، ساغر۔(ص ۶۵)

راغب مراد آبادی کو خط میں اپنی تنہائی، موسم کی سختی اور فتنۂ آخر الزماں کی یاد اور اس کے تصور میں بار بار آنے کو کس خوبصورتی سے بیان کر رہے ہیں، لکھتے ہیں۔

"راغب دل دار، اس وقت ساڑھے چار بجے ہیں۔ دن ڈھل رہا ہے۔ موسم کے تانے بانے میں گرمی کے دورے شامل ہیں۔ ہوا گرم ہے نہ سرد۔ دو بار بستر پر دراز ہوا۔ بار بار کروٹیں بدلیں، دماغ گھڑی کی سوئی کی مانند چلتا رہا، پل بھر بھی آرام نہ آیا، کسی کا مکھڑا افق تصور پر برابر طالع رہا اور دل میں ایسی دھڑکن رہی کہ کم بخت کے دھڑ دھڑانے کی آواز کانوں میں گونجتی رہی۔ گھبرا کر منہ دھویا، ناک میں پانی سڑکا، ہاتھ تر کر کے وضو کی طرح گُدّی پر پھیرے مگر چہرہ کھلا نہ جی بشاش ہوا۔(۴۸)

مکتوب نگاری کا تعلق انسانی زندگی اور اُس کے تمدن سے متعلق ہے اور تمدن انسانی خیالات و اعمالات کی ہر جہت کا احاطہ کرتا ہے جس میں معاشرتی اصول وضوابط ادبی قدریں اور تہذیبی رکھ رکھاؤ سب کچھ شامل ہے۔ اس لیے مکتوب نگاری کا جو تعلق تمدن سے ہے وہی ادب سے بھی ہے۔ جیسے جیسے تہذیب و تمدن میں ارتقاء ہوا ویسے ویسے مکتوب نگاری میں بھی بہتری آئی۔ خط چونکہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے مل کر تشکیل پاتے ہیں اُن میں حالات و واقعات کا ایک ریلا ہوتا ہے جو کہ قاری کو زندگی کی جزئیات، تفصیلات اور رنگا رنگی میں بہا کر لے جاتا ہے۔ انسان کے متضاد جذبات، تشنہ تمنائیں اور جاں گُسل لمحوں کی پرچھائیاں ان میں جھلک دکھلاتی ہیں۔ علاوہ ازیں نشاطیہ کیفیت سے لبریز خط مکتوب الیہ کو زندگی کے حسن اور اس کی رعنائیوں اور لطافتوں سے آشنا کرتے ہیں۔ خطوط جہاں حقیقت کی تلخیوں سے آشنا کرواتے ہیں وہاں خوابوں کی لطافت اور نرم و نازک جذبوں کا احساس بھی دلاتے ہیں۔ لکھنے والے کی شخصیت کھل کر سامنے آجاتی ہے اس کے عہد، خاندان اور ماحول کی عکاسی ہوتی ہے۔ لکھنے والا اگر کسی ہمدم دیرینہ کو خط لکھتا ہے تو وہ اپنا دل کھول کر صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتا ہے۔ لفظوں کی صورت اس کے دل کی واردات زیادہ اثر انگیزی سے مکتوب الیہ تک پہنچتی ہے۔ خط لکھنا درحقیقت ایک فن ہے اس فن کو چابکدستی اور خوبصورتی سے استعمال کرنے والا ہی کامیاب ہے۔ اس فن میں مہارت حاصل کرنے والا کسی تصنع اور تکلف کے بغیر اپنی بات مکتوب الیہ تک پہنچاتا ہے۔ سادگیٔ بیان، دردمندی، بے ریائی اور خلوص مکتوب نگاری کی جان ہے۔ خطوط میں جو جادو ہے وہ دیگر اصناف اردو کی نسبت زیادہ پُر تاثیر ہے۔ جوش کی خطوط نگاری میں بھی ہم جوش کی نجی زندگی کی رعنائیاں اور دلکشیاں جلوہ کناں دیکھتے ہیں۔ جب وہ اپنے کسی یار غار سے مخاطب ہوتے ہیں تو سادگی، سچائی، جامعیت، اعتماد، خلوص اور ذہنی قربت و تسکین کا احساس موجزن ہوتا ہے۔ جوش ایک جہانِ خلوص و شوق کی دنیا آباد کیے دکھائی دیتے ہیں۔ روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے حالات و واقعات کو کس سادگی اور بھولپن کے ساتھ اپنے دوست کے سامنے بیان کر دیتے ہیں جیسے کسی غمگسار کے کاندھے پر سر رکھ کر آدمی دل کا بوجھ ہلکا کر لیتا ہے ویسے ہی جوش منور عباس، میرزا عالمگیر قدر، خورشید علی خاں اور راغب مراد آبادی سے اپنے دل کی ہر بات بلا کسی جھجک اور ڈر کے کہہ دیا کرتے تھے۔ یہ اصحاب جوش کے یارِ غار اور ہم دم و دمساز تھے، جوش نے کبھی ان سے کسی قسم کا پردہ نہیں رکھا۔ ان کے سامنے دل کے راز عیاں کرنے میں کوئی چیز مانع محسوس نہیں کی۔ جن باتوں کو کسی اور کے سامنے بیان کرنے کا ہم سوچ بھی نہیں سکتے، جوش نے دلوں کے راز عیاں کر دیئے۔ حقیقت نگاری اور واقعہ نگاری نے بعض اوقات فحاشی اور عریاں نگاری کا روپ ڈھال لیا ہے۔ بے تکلف دوستوں کی محفلوں میں جوش ہر طرح کی گفتگو کو جائز تصور کرتے تھے۔ فحش لطیفے اور فحش اشعار سناتے اور گفتگو میں گالیوں کا استعمال کرتے اور دوستوں سے فحش مذاق کو عار نہ سمجھتے۔(۴۹)

جوش نے اپنے خطوط میں جو فحش زبان استعمال کی ہے اور کسی لگی لپٹی کے بغیر بلا کم و کاست اپنے دوستوں کو تمام ماجرا بیان کیا ہے۔ وہ اس لیے کہ انہیں معلوم تھا کہ جن لوگوں کو وہ خط لکھ رہے ہیں وہ اسے اپنا اخلاقی فرض تصور کریں گے کہ ان خطوط کو ضائع کر دیں اور انہیں طشت از بام نہ کریں لیکن جوش کے مکتوب الیہم نے ان خطوط کو شائع کروا دیا اور نجی راز کی پردہ دری کی۔

ڈاکٹر خلیق انجم کی تحقیق کے مطابق مکیش اکبر آبادی کے خطوط میں بھی بہت زیادہ فحش زبان استعمال کی گئی لیکن مکیش مرحوم کے بیٹے نے ان خطوط کو دینے سے انکار کر دیا۔

ساغر نظامی کے نام جو خطوط ہیں ان میں بھی فحش عبارتیں موجود ہیں مگر ساغر نظامی کی وفات کے بعد ذکیہ ساغر نے ان خطوط کو شائع کرنے کی اجازت دے دی اور یوں ''جوش بنام ساغر'' نامی کتاب میں طبع ہونے سے قبل یہ خطوط ''ساغر نظامی فن اور شخصیت'' میں طبع ہوئے۔

جوش کو ساگر نظامی نے ایک خط میں لکھا کہ ''آپ دھوکا نہیں دیتے، دھوکا کھاتے ہیں'' جوش نے 8 نومبر 1948ء کو خط کے جواب میں لکھا۔

''آپ دھوکا نہیں دیتے، دھوکا کھاتے ہیں یہ ''دینے'' اور ''کھانے'' کی بات بھی بڑے مزے کی ہے''

جوش نے جنسی ہیجان اور ولولہ انگریزی سے بھرپور خط لکھے ہیں۔ کبھی کبھی خطوط میں ایسی زبان استعمال کی ہے کہ قاری پسینے پسینے ہو جائے اور گھبرا کو ادھر اُدھر دیکھے کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ ساغر نظامی کو اپنے ایک خط میں جو کہ 17 نومبر 1967ء کا مرقومہ ہے، لکھتے ہیں۔

''میاں ساغر، بعد اظہارِ ''مالغا'' معلوم ہو... کل صبح کو رام پور یعنی ''دارالخلافت لوطیان'' جا رہا ہوں۔

یہاں ''مالغا'' سے جوش کی مراد اغلام ہے اور دارالخلافت لوطیان سے مراد ہم جنس پرستوں کا نگر ہے۔

خورشید علی خان کو ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''پرسوں سلامت علی خان آئے تھے اور ایک بَقَہ کو بھی ساتھ لائے تھے۔ ان کو دیکھ کر آپ کی یاد ستانے اور کراچی کی ہوا آنے لگی۔(۵۰)

راغب مراد آبادی نے اپنے مرتب کردہ ''خطوط جوش ملیح آبادی'' کے مجموعے میں جوش کے کچھ ایسے خطوط بھی شامل اشاعت کیے ہیں جو کہ جوش کی شاعرانہ عظمت کو مسخ کرتے ہیں اور انہیں ایک عیاش شاعر اور امرد پرست ثابت کرتے ہیں۔ ان خطوط میں جوش بے محابہ گالیوں اور فحش اشارات سے اپنے دوستوں کو اپنے احوال سے باخبر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ نیز ایک عاشق وہ بھی پچھتر چھہتر سال کا بوڑھا آدمی ایک جوان عاشق کی طرح عشق کے جنسی لمحات کو چٹخارہ لے لے کر بیان کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر علی رضا نے اپنے مقالے میں راغب مراد آبادی کو اس کا ذمہ دار قرار دیا ہے جو کہ جوش کو شراب پلا پلا کر اکسایا کرتے تھے اور اپنی من پسند باتیں لکھوایا کرتے تھے۔(۵۱) پہلے ایڈیشن میں یہ فقرات من و عن موجود ہیں لیکن دوسرے ایڈیشن میں راغب مراد آبادی نے ان خطوط کو سنسر کر دیا ہے اور فحش فقروں میں یا تو خدف کی علامت لگا دی گئی ہے یا پھر پہلا لفظ لکھ دیا گیا ہے۔

نیز جوش لکھنوی تہذیب و ثقافت کے زیر اثر پروان چڑھے تھے جہاں ادب آداب کو تو ملحوظ رکھا جاتا ہے لیکن عشق و عاشق میں بے محابا اظہار کے جذبات کو چھپایا بھی نہیں جاتا۔ جہاں طوائفیت عام تھی۔ عیش پرستی، رندی و سرمستی کی اس فضا سے جوش ساری عمر دامن نہ چھڑا پائے۔ امرد پرستی، جنس پرستی، شراب نوشی اور عیش طلبی نے جوش جیسے شاعر کی شخصی خوبیاں کو پس پردہ کر دیا۔ معاشرہ کسی شخص کے ظاہر کو دیکھتا ہے اس کے باطن میں کیا گزرتی ہے اس سے اسے سروکار نہیں ہے۔ مذہب کے بارے میں جوش کا رویہ ہو یا عشق کے بارے میں آخری عمر کے تجربات کا بیان ہو، جوش اپنے قاری کو چونکاتے ہیں۔ جوش نے اپنی ذہنی تسکین کے لیے اپنی خوبیوں اور خامیوں کو اپنے عزیز و اقارب کو بتا کر دل ہلکا کرنے کے لیے ان خطوں کو تحریر کیا ہے اور جوش کی مکمل شخصیت ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ خطوط کے ذریعے ہم جوش کی شخصیت زیادہ

بہتر طور پر جان سکتے ہیں۔ جوش کی خامیاں، کمزوریاں، خوشیاں، ناپسندیدگی اور پسند کے جذبات ان خطوط کے ذریعے عیاں ہیں۔ جلیل قدوائی لکھتے ہیں۔

> "خطوط عام طور پر اپنے لکھنے والے کے خیالات اور متعقدات کا آئینہ اور اس کی شخصیت کے کمزور اور مضبوط ہر دو پہلوؤں کا عکس ہوتے ہیں۔ خطوط میں انسان اپنے دوستوں کو اپنی دلچسپیاں، خوشیاں، مصیبتیں، اپنے دل کے ذرا ذرا سے بھید اور ہر قسم کی تمنائیں اور آرزوئیں لکھ دیتا ہے اور چونکہ لکھتے وقت خطوط کے شائع ہونے یا کسی غیر متعلق شخص کے دیکھنے کا دور دور گمان نہیں ہوتا، اس لیے لکھنے والا ان کے بیان میں پوری آزادی اور بے تکلفی سے کام لیتا ہے۔ خط پہلے سے تیار ہو کر نہیں لکھے جاتے نہ ان کے مسودے پہلے سے مرتب کیے جاتے ہیں۔ ان میں کوئی مصنوعی نقطہ نظر نہیں پیش کیا جاتا۔ اس لیے ان کی صداقت ہر طرح مسلم ہوتی ہے۔"(۵۲)

جوش کی شخصیت کا تضاد ان کی تحریروں سے بھی عیاں ہے۔ شبیر حسن خاں اور جوش ملیح آبادی کے مابین امتیاز کے بغیر جوش کے بارے میں کوئی رائے دینا ممکن نہیں۔ جوش کی شخصیت میں دو مرکز ہیں۔ ایک پر تہذیبی اثرات غالب ہیں دوسرے پر حیاتیاتی اثرات غالب ہیں۔ شبیر حسن خاں حیاتیاتی اثرات کا مرکز ہے۔ عام زندگی کے تجربے اس کی ضرورتیں، مصلحتیں، قوتیں اور کمزوریاں ایک طرح کی فکری صلاحیتوں سمیت اس مرکز میں جمع ہو گئے ہیں۔ جوش جب فکری اعتبار سے دیکھتے ہیں تو اسے "حکمت و تفکر" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اور جب ضرورتوں، مصلحتیں اور کمزوریوں کو دیکھتے ہیں تو خود کو "عام آدمی" تصور کرتے ہیں۔ جبکہ جوش ملیح آبادی تہذیبی اثرات کا مرکز ہے۔ جوش نے اپنے خاندان کی روایات، تعلیم و تربیت اور اپنی شعری تہذیب سے جو کچھ سیکھا ہے ایک جذباتی شدت کے ساتھ وہ اس مرکز میں سمٹ آیا ہے۔ اسی وجہ سے جوش اس مرکز پر تنقیدی نظر نہیں ڈال سکتے۔ جوش نے اسے جوں کا توں قبول کر لیا ہے۔ جوش کی شخصیت کے یہ دونوں پہلو متصادم ہیں یا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شخصیت کا یہ تضاد ان کی تحریروں میں بھی نمایاں ہے۔ شعوری طور پر جوش اس تضاد کے حق میں دکھائی دیتے ہیں جبکہ لاشعوری طور پر وہ اس تضاد سے فرار حاصل کرنا چاہتے ہیں اور خائف دکھائی دیتے ہیں۔ جوش زندگی بھر کام کرتے رہے اور عشق پیشہ رہے۔ انہوں نے دونوں کو حفظِ مراتب پر رکھا نہ کام کو عشق کے آڑے آنے دیا نہ عشق کی بدولت نکّمے ہو کر بیٹھ رہے۔ بلکہ ان کی رومانی دلچسپیاں ان کی تخلیقی دلچسپیوں کو جاری رکھنے کا سبب بن گئیں۔ ایک خط میں عبادت بریلوی کو لکھتے ہیں۔

> "میری راتیں خالی خولی اور کھوکھلی "عیاشیاں" نہیں ہوتی تھیں بلکہ میں ان راتوں کے بینکوں سے وہ تمام و کمال وقت اور روپیہ مع سود وصول فرما کر اس روپیہ کو تعمیراتِ ادب کی تزئین و توسیع میں لگا دیا کرتا تھا۔(۵۳)

جوش اپنی رومانی دلچسپیوں کے ذریعے تخلیقی سرگرمیوں کے لیے مواد حاصل کرتے ہیں یا ان سے مہمیز ہو کر تخلیقی عمل سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ سلیم احمد جوش کی تہذیبی اور رومانی زندگی کے علاوہ ایک تیسری وابستگی کا بھی ذکر کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

> ..."ایک تیسرا چھوٹا مرکز ہے جو رومانی اور تخلیقی مرکز کے ساتھ مل کر ایک مثلث بناتا ہے۔ یہ مرکز خاندانی روایات اور بچپن کی یادوں سے گہری وابستگی کے سبب پیدا ہوا ہے۔ پھر ان خاندانی روایات اور بچپن کی یادوں کا بھی تجزیہ کیا جائے تو اس میں بھی دو الگ الگ عناصر نظر آتے ہیں (i) نسلی تفاخر اور (2) مذہب۔ جوش نے جس طرح اپنی رومانی اور تخلیقی دلچسپیوں میں ایک ربط پیدا کیا ہے اسی طرح کا ایک ربط مذہب اور خاندانی تفاخر میں بھی پیدا ہو گیا ہے... اسی طرح رومانی اور تخلیقی مرکزوں کے بھی دو حصے ہیں۔ رومانی مرکز کے دو حصے (1) جنسی (2) غیر جنسی ہیں اور تخلیقی مرکز کے دو حصے (1) فکری (2) جذباتی ہیں"۔(۵۴)

آخری عمر میں جوش نے جو عشق کیا اُس سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن بالآخر گرفتار ہو گئے۔ اس بارے میں راغب مراد آبادی کو لکھتے ہیں۔

"راغب میاں، تم جانتے ہو کہ میں عشق سے ناقابل پیمائش فاصلے کی حد تک بہت بہت دور، بہت دور چلا جا چکا تھا۔ میں نے سقراط کے مکتب میں داخلہ بھی لیا تھا، تفکر میں ہر آن ڈوبا رہتا تھا۔ حقائق کی گرہ کشائی میں دن کٹتے تھے...تُف ہے تجھ پر اے گیدی خر، پھٹکار تجھ پر اے اودبلاؤ، لعنت تجھ پر اے گاودیوں کے مہاتما، لاکھوں گالیاں اپنے کو دیتا ہوں مگر اس کی کالی زلفوں کی چھاؤں میں، جھکے ہوئے سفید سر میں عقل کی کرن پھوٹتی ہی نہیں... میری ذات اب وہ غبار ہے جس کو گدھوں کے لوٹنے کے مشغلے نے اڑایا ہے۔"(۵۵)

اسی طرح اپنے دوست خورشید علی خاں کو اپنی بپتا کچھ یوں سنائی ہے۔

"میں تو بڑے لفڑے میں پڑا ہوا ہوں، خورشید صاحب، خوب جانتا ہوں یہ موسم ان لغویات کا نہیں ہے، لیکن کیا کروں۔ میری عقل گدھوں کی کھائی ہوئی جھوٹی گھاس چر رہی ہے اور میرے سینے کا لونڈا، عقل کو ٹھینگا دکھا دکھا کر سیٹیاں بجا اور "ہپ ہپ ہرا" کر رہا ہے۔

تھوک میری اوقات پر لعنت میری ذات پر
بڑا مفکر بنا پھرتا ہے سالا اور اندر اتنا گڑ بڑ جھالا"

اگر غیرت ہوتی تو ڈوب مرتا چلّو بھر پانی میں، لیکن میں تو منہ پر پھیری لوئی تو کیا کرے گا کوئی، حد تک بے حیا ہو چکا ہوں"(۵٦)

جوش ملیح آبادی نے اپنے خطوط میں معاملاتِ عشق و محبت کو مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔

جوش ملیح آبادی ایک طرف شاعرانہ نثر کے کمالات دکھاتے ہیں دوسری طرف سوقیانہ اور مبتذل الفاظ سے بھی نہیں چوکتے۔ انتہائی فحش اور لغو جملے بھی جوش کے خطوط میں ملتے ہیں۔ یہاں تک کہ جوش کارکنان قضا و قدر کو بھی نہیں بخشتے۔ یہ معیوب اور غیر شائستہ زبان جوش کی اخلاقیات اور علمی و ادبی شخصیت کے لیے نہایت غلط تاثر قاری کو ترسیل کرتے ہیں اور وہ جوش جس کے بارے میں ڈاکٹر سید عبد اللہ کا یہ کہنا تھا کہ

"جوش، اقبال اور اکبر کی شخصیتیں خطوط میں نہیں کُھلتیں"(۵۷)

اس جوش کی شخصیت اتنی کھل کر قاری کے سامنے آتی ہے کہ وہ اُس جوش سے نظر چرانے لگتا ہے جس کو اُس نے سچائی کا دیوتا اور شاعرانہ نثر کا اوتار بنا رکھا تھا۔ اس جوش کی شخصیت پر چڑھے ہوئے ملمع کاری کے خول چیخ جاتے ہیں۔ جب مکھوٹے کے نیچے سے اصل چہرہ برآمد ہوتا ہے تو قاری حیران و ششدر رہ جاتا ہے۔ جوش نے جہاں جنسی معاملات کو کھل کر بیان کیا ہے وہاں گالیاں لکھنے میں بھی کسی ہچکچاہٹ معاملات کو کھل کر بیان کیا ہے وہاں گالیاں لکھنے میں بھی کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ سالا، مالزادی، حرامزادگی زندگی، ان کے ہاں یہ الفاظ بہت زیادہ استعمال ہوئے ہیں۔ آدم کا لونڈا۔ دنیا ایک بوچڑ خانہ ہے۔ غرض اخلاقی اعتبار سے بعض خطوط غیر شائستہ حرکات کے موجب نظر آتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"پتھر سے پھول، انگاروں سے شبنم اور مشیت سے رحم و کرم کی توقع کی جا سکتی ہے۔ مگر آدم کے لونڈے سے شرافت، خلوص، ہمدردی اور محبت کی آرزو کسی حالت میں اور کسی شرط کے ساتھ بھی تا قیامت نہیں کی جا سکتی۔"(۵۸)

میکش اکبر آبادی کے نام 15 جون 1954ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"یہاں شملے میں آج کل بڑی بہار ہے۔ حسینوں کا ہجوم قطار در قطار ہے۔ مال روڈ کی مال زادیوں نے ایک آگ لگا رکھی ہے... شانوں سے شانے چھلتے ہیں۔ نیم ہم آغوشی کے مزے ملتے ہیں۔ کاش آپ بھی یہاں ہوتے۔ مگر آپ!! زمہریری انسان، آپ تو برف ہیں برف۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ لوگ جو صرف شرعی اور حلالی بچے پیدا کرتے ہیں فلسفیانہ نقطہ نظر سے قطعی نامرد ہوتے ہیں۔

بارادتِ فراواں

جوش نور اللہ مجلسہ

بخدمت گرامی یکے از مردانِ یک زنیٔ و محروم الزنا حضرت میکش مرشدنا(۵۹)

جوش کے خطوط ان کی عادات، کیفیات، حرکات و سکنات کو جاننے اور پرکھنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ خطوط کی جادوئی دنیا میں مکتوب نگار کی شخصیت کا جو ہیولہ نمودار ہوتا ہے اس میں کہیں ہم اسے ہنستے مسکراتے محسوس کرتے ہیں، کہیں وہ ہمیں غموں سے نڈھال اور افسردہ دکھائی دیتا ہے، کہیں غموں کے مدوجزر میں اُبھرتا ہوا مسکراتا محسوس ہوتا ہے۔ کہیں وہ زمانے کی شقاوت کا گلہ کرتا اور کہیں دوستوں کو دیکھ کر ہنستا مسکراتا محسوس ہوتا ہے۔ ان تمام حالتوں میں اس کے جذبات شدت کی کس نہج پر ہوتے ہیں اور ان میں کس حد تک پیچیدگی اور تہہ داری ہوتی ہے۔ یہ سب خطوط کی عبارت اور اس کے اندازِ تحریر سے عیاں ہوتا ہے۔ باقر مہدی اپنے ایک مضمون میں مشہور امریکی مورخ کارل بیکر کے حوالے سے خطوط نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انسانوں نے کیا کیا کارنامے انجام دیئے ہیں ان واقعات کا ریکارڈ تو ہر صورت میں مل جاتا ہے لیکن ان واقعات کو رونما کرنے میں دلی جذبات اور دماغی کیفیات کا کتنا حصہ ہے اس کا علم صرف خطوط سے ہو سکتا ہے۔ جذبات اور جبلتوں کے پیچیدہ اور پوشیدہ رازوں کو خطوط ہی میں کھلنے کا موقع ملتا ہے۔''(۶۰)

جوش ملیح آبادی کی زندگی کے نشیب و فراز، ان کے سُکھ، دُکھ، ہنسی مذاق، روٹھنا، مان جانا، محبت، نفرت سب ان کے خطوط سے عیاں ہے۔ ان کی ذہنی کیفیات، جذباتی تموّج اور ان کی نجی زندگی کی متحرک اور واضح تصویریں خطوط میں نظر آتی ہیں۔ ان کے خطوط میں ہمیں جوش کی زندگی کا سادہ اور بھرپور عکس دکھائی دیتا ہے۔ سادگی، سچائی، بے ریائی، اختصار اور زبان کی لطافت نے ان کے خطوط کو ادبی مقام عطا کیا ہے۔

جوش کے خطوط میں ہمیں تاریخ کی صداقت، سوانح نگاری کی واقعیت، ادبی لطافت کے ساتھ ساتھ نثری دلکشی اور قطعیت ملتی ہے۔ جوش نے مکتوب الیہ کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے۔ جوش کے خطوط نے ایسے آئینوں کی صورت اختیار کر لی ہے جہاں ان کی شخصیت کی خوبیاں اور خامیوں پر سب کی نظر جا سکتی ہے اور ہر کوئی ان خطوط کی روشنی میں جوش کی نفسیات کا تجزیہ کر سکتا ہے۔ جوش کے خطوط میں سوانح نگاری سے زیادہ سچائی، خلوص اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ یہاں کسی شعوری مصلحت کے تحت خود کو چھپایا نہیں گیا بلکہ اپنا دل نکال کر خطوط میں الفاظ کی صورت رکھ دیا گیا ہے۔ جوش اپنے وقت کے بہترین شاعر اور نثر نگار تھے۔ شاعری کی وجہ سے ان کی نثر میں بھی شعری رنگ نمایاں ہے۔ آباؤ اجداد کی شاعری کے وراثتی اثر نے ان کو بھی بچپن ہی سے شعر گوئی کی طرف مائل کر دیا تھا۔ روحِ ادب اپنے پہلے مجموعہ نظم و نثر کے ذریعے جوش کا شمار انشائے لطیف پر قدرت رکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ اسی لیے جوش کے خطوط میں بھی ہمیں انشاء پردازی کے بہترین نمونے نظر آتے ہیں۔ ساغر نظامی کو خط لکھ کر ان کی صحت یابی کے بارے میں استفسار کر رہے ہیں لیکن کیا خوبصورت انداز ہے، لکھتے ہیں۔ ''خدا کرے اب آپ چوکڑیاں بھر رہے ہوں''(بتاریخ 16 اکتوبر 1935ء)

''میاں صاحبزادے، بس اب اچھے ہو جاؤ، تمہاری بیماری سے دل کڑھتا ہے''(2 دسمبر 1935ء)

بابا ذہین شاہ تاجی کو کس طرح اپنی کم مائیگی اور ان کی برتری کا احساس کروا رہے ہیں لکھتے ہیں۔

''بابا صاحب، حقائق بے نہایت تلخ ہیں۔ کون ان سے منہ موڑ سکتا ہے۔ اقوال و اساطیر سے ہم تابہ کے فریب کھائیں اور تاچند اوہام آبائی کے سامنے سر جھکائیں۔ قبلہ و کعبہ آپ بڑے مزے میں ہیں۔ رومی و غزالی آپ کے سامنے بانسری بجا رہے ہیں۔ تخیلات اور تاویلات کی وجدانی دیواریں آپ کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ آبائے ذوالاحترام پھولوں کی چادر، آپ کے سر پر تانے ہوئے ہیں اور اولیائے کرام آپ کو لوریاں دے رہے ہیں اور اس بنا پر آپ اس دوزخ زندگی میں بیٹھے، جنت کی ہوا کھا رہے ہیں، لیکن میں نامراد منطق کے تپتے سورج اور دلائل کے چمکتے نیزوں کے سامنے، سینہ عریاں کیے کھڑا ہوں۔ مجھ سے ہاں مجھ سے پوچھیے کہ یہ کارخانۂ عالم کیا ہے اور اس کارخانے کا جنرل منیجر کیا ہے۔

ایں می پرسید کہ برغالبِ ناکام، چہ رفت

می تو اں گفت کہ ایں بندہ، خداوند نہ داشت

محررہ 22 جولائی (1972)

جملوں کی ترتیب اور صوتی آہنگ قاری کو مسحور کر دیتا ہے۔ شاعرانہ نثر قدیم تہذیبی نثر کی یاد دلاتی ہے۔ خاص طور پر مقفیٰ و مسجع انداز اور رمز و ایماء جوش کی قدرتِ کلام کی دلیل ہیں۔ نسیم احمد نسیم کو لکھتے ہیں۔ ''خط ملا، نسیم کا جھونکا آیا، ذہن کی شاخوں کو لچکایا اور غنچۂ خاطر کو چٹکایا''

اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں۔

''آپ کوئٹے سے ہرے ہو کر آگئے ہیں۔ میں کراچی سے تر و تازہ ہو کر یہاں پہنچ چکا ہوں۔ تر و تازہ دونوں ہوئے ہیں مگر میری شادابی سے لہو ٹپک رہا ہے''

جوش ملیح آباد سنجیدہ و مزاحیہ نثر لکھنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ بعض اوقات وہ واقعہ نما لطیفہ بھی بیان کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات اپنی طباعی کے جوہر دکھاتے ہیں۔ خورشید علی خاں کو 23 ستمبر 1972ء کے خط میں لکھتے ہیں۔

''کل فلیش مین ہوٹل کی طرف سے گزرتے ہوئے، آپ کی معشوقہ کو دیکھا، بڑی لٹک کے ساتھ ٹھمک ٹھمک کر قدم اٹھاتی چلی آرہی تھی، بے ساختہ جی چاہا کہ اس کو، جھٹ سے اٹھا کر، اپنی موٹر میں ڈال لوں اور عمر و عیار کی مانند اس کو زنبیل میں ڈال کر اور اس کی زبان میں 'سوزن'' لگا کر آپ کے نام پارسل کر دوں اور جب وہ چھم سے آپ کے خلوت کدے میں قدم رکھے، اسی آن، آپ کی بیگم دھم سے کود پڑیں، چھت سے، اور عاشق و معشوق دونوں کی پشت پر دھما دھم مکے پڑنے لگیں اور پھر آپ کی چیخ اور اُس کا پیشاب نکل جائے۔''

جوش ملیح آبادی کے ہاں تشبیہات و استعارات بھی ملتے ہیں۔ خورشید علی خاں کے نام خط میں اس کی مثال ملاحظہ کریں۔

''ایک بجے رات سے جاگ رہا ہوں۔ کچی نیند سے بیدار ہو جانے کے باعث دماغ سالا او نگھا ہوا ہے اور ایسا محسوس ہو رہا ہے گویا کسی بوڑھی عورت کے آغوش میں بھنچا ہوا، او بھی او بھی سانسیں لے رہا ہوں۔ (مرقومہ 3 نومبر 1973ء)

ساغر نظامی کو لکھتے ہیں۔

حضرت آیا ہوں تکمیلِ ''حرفِ آخر'' کے لیے اور موڈ و مزاج کی یہ کیفیت ہے جیسے رنگ خوردہ پھپایا چکٹا ہوا ٹاٹ کا ٹکڑا'' مرقومہ: 12 جون 1954ء

بعض اوقات جوش عورتوں کی زبان میں اظہار خیال کرتے تھے جس سے جوش کے اسلوب کی صورت حال بہتر ہو جاتی ہے کیونکہ جوش کی حویلی میں مامائیں، نوکرانیاں اور کھلائیاں اسی قسم کی زبان بولتی تھیں اس لیے جوش لاشعوری طور پر اس طرز تکلم کے عادی ہو گئے تھے۔ ساغر نظامی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''خدا مارے اس سردی کو، پاجی قلم قابو میں نہیں آرہا۔'' المرقوم 22 مارچ 1937

جوش ملیح آبادی کے ہاں عبارت میں شوخی اور لطافت کا خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے اور زندگی اپنے پورے جلال و کمال کے ساتھ جلوہ فگن نظر آتی ہے۔ ان خطوط میں زندگی کی ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ملتی ہیں جن میں عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اسی بدولت ان کی نثر میں اسلوب کی دلکشی اور زندگی کی جاذبیت پورے طور پر جھلک دکھلاتی ہے۔ لہجہ میں ایک لچک ہے اور شیریں بیانی نے تحریر میں ادبی جان پیدا کر دی ہے۔ انداز بیاں سادہ، سلیس اور رواں ہے۔ فصاحت، اختصار اور مضامین کے تنوع نے دل پر اثر کرنے والا تاثر مرتب کیا ہے۔ جوش کے

ہاں اپنے دور کے مروجہ انداز کے ساتھ ساتھ جدید انداز یا جدید اسلوب کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ جو غالب اور سر سید تحریک کی دین ہے۔ ان کی آواز میں وہ توانائی اور طاقت ہے جو وقت کی پکار ہے۔ زندگی کے جذبے اور حرارت سے جوش کے خط لبریز ہیں۔ جوش کے خطوط اپنے اختصار اور ایجاز کے زندہ نثر کے نمونے ہیں۔

جوش کے ہاں گہرائی اور سنجیدگی بھی موجود ہے۔ سادہ اور سُبک الفاظ جملوں کو طوالت اور پیچیدگی سے آلودہ نہیں کیا۔ مدعا نگاری جوش کی تحریر کی جان ہے۔ مکتوب الیہ کو الفاظ کے گورکھ دھندے میں الجھانے کی بجائے سیدھے سبھاؤ اپنا مطمعٔ نظر بیان کر دیتے ہیں۔ فصاحت و بلاغت ہے۔ عبارت میں جامعیت ہے۔ الفاظ کی ترتیب میں حسن بیاں ہے۔

مکتوب الیہ کے ساتھ بے تکلفی اور غم خواری نے جوش کے مکاتیب میں ایک ایسی فضا پیدا کی ہے جس میں دوسرے کا غم اپنا اور اپنی خوشی دوسرے کی معلوم ہوتی ہے۔ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان رازداری اور پردہ داری کی گنجائش نہیں۔ دل کھول کر رکھ دیا گیا ہے۔ میر عترت حسین کے نام خطوط میں، خورشید علی خان، بٹی سعیدہ بیگم اور بیٹے سجاد حیدر کے نام خطوط میں تو دل نکال کر رکھ دیا گیا ہے۔ جوش جب فتنۂ آخر الزماں کو خط لکھتے ہیں یا راغب مراد آبادی کو یا ساغر نظامی کو خط لکھتے ہیں تو اپنے جذبات بغیر کسی لگی لپٹی کے بلا کم و کاست بیان کر دیتے ہیں۔

جوش کو نئے نئے القاب اور نام لکھنے میں جو ملکہ حاصل تھا اس سے ان کے ادبی ذوق پر نظر جاتی ہے۔ یہ انداز بیاں اس وقت کی تہذیبی ندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ لکھنؤ کی پر تکلف زندگی میں اس وقت دو دھارے ملتے ہیں ایک سادہ اسلوب اور دوسرا پر تکلف، رنگین اور مقفیٰ انداز بیاں اور پیچیدہ اسلوب۔ جس میں صنعت گری اور رعایتِ لفظی کا اہتمام ہوتا تھا۔ جوش کے ہاں سرکاری مکاتیب میں یہ پر تکلف اور مقفیٰ اسلوب ملتا ہے۔ واجد علی شاہ نے بھی اپنے خطوط میں لکھنؤ کی زبان اور ماحول و معاشرت بخوبی پیش کی ہے۔ اسی طرح جوش نے بھی واجد علی شاہ کے تتبع میں اپنے دوستوں اور پیاروں کو نئے نئے الفاظ تراش کر ان کی شخصیت کی عکاسی کرتے القاب عطا کیے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنے نواسوں، نواسیوں اور پوتے پوتیوں کو پیار سے طرح طرح کی عرفیت سے پکارا ہے۔ نواسی صبوحی خاتون کو "وبئ"، فرخ ملیح آبادی کو "قندرا" اور نواسے انور خان کو "کپی" کی عرفیت سے پکارا ہے۔ یہاں تک کہ خود کو بھی "پڑھوک" کا نام دیا ہے۔ اسرار الحق مجاز کو "مجروا" اور ساغر نظامی کو "ساغروا" کا نام دیا ہے اور اپنی آخری محبوبہ کو "فتنۂ آخر الزماں" کے اسم باسمیٰ سے پکارا ہے۔ جوش نے اپنی بیگم کو "ام الشعراء" کا نام دیا ہوا تھا۔ جوش کے خطوط سے قاری کو جوش کی خودداری کا بھی پتہ چلتا ہے وہ اپنے اُن دوستوں سے تحائف بھی لینا پسند نہیں کرتے تھے جن کو واپسی میں تحائف دے نہیں سکتے تھے۔ ساغر نظامی کے نام خط اس کا گواہ ہے لکھتے ہیں۔

> "جب تک میری دولت اور ریاست باقی تھی اس وقت تک احباب کو تحفے دیتا تھا اور احباب کے تحفے قبول کرتا تھا مگر اب جبکہ میں کوئی معاوضہ پیش نہیں کر سکتا۔ میرے لیے یہ مناسب نہیں کہ میں تحائف قبول کروں"۔(۶۱)

نیز جوش اپنی جاگیر کے ختم ہو جانے کے بعد زمانے کے سرد گرم کو بھی سہتے رہے اور حسب ضرورت دوستوں سے رقم بھی بطور قرض حاصل کرتے رہے لیکن اس قرض کی واپسی ضرور کرتے تھے۔ "مالِ دوستاں در دلِ دوست" نہیں کرتے تھے۔ میر عترت حسین کے ہاتھ کئی دوستوں کو رقم واپس بھجوائی۔ بابا ذہین شاہ کو قرض کی رقم واپس کرنے گئے تو انہوں نے انکار کر دیا۔ حساب کسی قسم کا بھی ہو جوش فوراً بے باق کر دیا کرتے تھے چاہے طنز و ملامت کی صورت ہو یا رقم کی صورت۔ جوش ملیح آبادی لوگوں کی مدد کے لیے ہر طرح سے تیار ہو جاتے تھے۔ سفارشی خطوط کے لکھنے میں کوئی پس و پیش نہ کرتے تھے بلکہ ایک ایک سیٹ کے لیے بعض اوقات کئی کئی لوگوں کو سفارشی خطوط تحریر کر دیا کرتے تھے۔ آخری عمر میں جوش کو اسلام آباد رہنا پڑا۔ دوستوں کی محفلوں سے دور، عزیز و اقارب اور اہل خانہ سے بھی دور اسلام آباد کی پر سکوں تنہائی

میں جوش جیسے مجلسی آدمی کا رہنا، جوش کے لیے سخت مشکل اور سنگین و کڑا وقت تھا ایک امتحان کی صورت۔ اس تنہائی کا حل جوش نے خطوط کی صورت نکالا۔ خط یوں لکھتے گویا دوستوں کی محفل سجی ہے اور تمام احباب بیٹھے ہیں اور جوش تمام لوگوں کی کیفیات بچشم خود ملاحظہ کر رہے ہیں۔ اسی لیے مرزا منور راغب مراد آبادی اور خورشید علی خاں کے علاوہ میر عترت حسین، کے نام خطوط میں بے تکلفی کی فضا بنانے کی کوشش دکھائی دیتی ہے۔ کہیں کہیں فحش اور مبتذل ہو گئی ہے۔

لیکن جوش کے خطوط میں غیر ضروری مبالغہ آرائی اور تصنع نظر نہیں آتا۔ ان کے خطوط میں زندگی اپنے پورے تنوع اور شدت کے ساتھ نظر آتی ہے۔ جس طرح غالب اپنے دوستوں کے دنیا سے رخصت ہو جانے پر غم سے بے حال ہو جاتے تھے، جوش کا کوئی دوست جب دنیا سے گزر تا تھا تو جوش کرب و اذیت سے ٹوٹ ٹوٹ جاتے تھے۔ یہاں تک کہ اپنے مرنے کی باتیں کرنے لگے کہ ایسا لگتا ہے یہ میرا آخری سال ہو گا یا قرائن بتاتے ہیں، اب میں نہیں رہوں گا۔ جوش بھی خود کو مرحوم لکھنے لگے اور روز بروز ان کی یہ کیفیت ان میں مایوسی اور بد دلی کے جذبات پیدا کرنے لگی۔ بیوی کی بیماری، ان کی کراچی روانگی پھر موت نے جوش کو توڑ کر رکھ دیا۔ ایسے میں اگر دوستوں کا سہارا نہ ہوتا۔ فتنۂ روز گار کا خیال دامن گیر نہ ہوتا تو جوش کب کے اس جان سے گزر جاتے۔

مذہب کے معاملے میں جوش خاصے آزاد خیال تھے۔ اور اس امر کا اظہار انہوں نے اپنی تحریر و تقریر دونوں ذریعوں سے کیا ہے۔ دل کے معاملے میں دماغ کو ترجیح دینا، مذہبی اعتقادات کو عقل کی کسوٹی سے جانچنا، مسلمات سے انکار یا ان کا مذاق اڑانا، خدا سے بھی شکوہ کرنا تشکک کا اظہار کرنا ان سب نے جوش کی زندگی کو لوگوں کے لیے مخالفت کا ہدف بنا دیا۔ اگرچہ وہ اپنی تحریر و تقریر سے مذہب سے دوری کا اظہار اور انسانیت پر یقین کا اعلان کرتے رہے لیکن دل سے اللہ تعالیٰ، محمدؐ اور آپؐ کی آل پر ایمان لاتے رہے۔ آپؐ اور آپؐ کے آل کے بارے میں کبھی کوئی گستاخانہ کلمہ یا بات تحریر و تقریر میں ادا نہ کی بلکہ ''پیغمبر اسلام'' لکھ کر آپؐ سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کیا۔ علاوہ ازیں 9 مرثیے لکھ کر اسلام کی شان سب پر عیاں کی۔ خلیق انجم نے لکھا ہے کہ جوش کا مذہب کے بارے میں جو بھی رویہ ہو لیکن وہ دہریے بالکل بھی نہ تھے اور اس کی وضاحت جوش کی اس بیان سے کی ہے جب انہوں نے دہلی یونیورسٹی کے کروڑی مل کالج میں مشاعرے کے بعد خلیق انجم کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔

> ''بھئی میں اس بات کو جانتا ہوں کہ یہ تمام نظام کائنات کسی طاقت کے بل پر چل رہا ہے، خود کار نہیں ہے۔ آپ اس طاقت کو جو چاہے، نام دے لیجئے۔ خدا کہہ لیجئے، انرجی کہہ لیجئے یا کچھ اور۔''(۶۲)

جوش ملیح آبادی کے اس رویے نے ان کے دشمنوں میں بہت اضافہ کیا۔ ہندوستان جیسے سیکولر ملک میں تو اس کی گنجائش تھی لیکن پاکستان میں لوگ جوش کو ملحد اور دہریہ کے الزام عائد کرنے لگے۔ خورشید علی خاں نے اپنی کتاب ہمارے جوش صاحب میں اس کی مدلل وضاحت کی ہے کہ جوش ملحد اور دہریے نہ تھے۔ بابا ذہن شاہ تاجی، پیر صاحب پگاڑا، ابوالاثر مودودی، میاں محمد صادق، عبد الماجد دریا آبادی، ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، جیسے مشاہیر سے تعلق تھا۔ جوش ان کا احترام کرتے تھے۔ یہ لوگ بھی اپنے دل میں جوش کے لیے جگہ رکھتے تھے۔ ''ابتدائے کائنات'' یا ''آفرنیشِ حیات'' کو ایک طویل نظم ''حرفِ آخر'' میں منظوم کر رہے تھے۔ سورہ رحمن کا تاثراتی ترجمہ بھی جوش نے بہت خوبصورتی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ جوش انسانوں کی تفریق کے قائل نہیں تھے۔ وہ سب کو مساوی درجے تک پہنچا ہوا دیکھنا چاہتے تھے، ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ''میری طرح وہ بھی اوطان، ادیان، لسان اور زبان کی بنا پر تفریق کے قائل نہیں تھے بلکہ وہ پوری نوع انسانی سے محبت کرتے تھے۔ یہ اتنا بڑا اشرف ہے جس کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔''

جوش کے مذہب میں انسانیت کا شرف سب سے بڑا ہے۔ وہ مذہب اور مذہبی امتیازات کے خلاف نہیں تھے بلکہ جو مذہب انسان کا رشتہ انسان سے توڑتا ہے جس میں کوئی انسان دوسرے کو کمتر اور ذلیل تصور کرتا ہے جوش اس مذہب یا عقیدے کے طریقے پر کاربند رہنا انسانیت کے لیے زہر قاتل سمجھتے تھے۔ خورشید علی خاں کو لکھتے ہیں

"اقوال واساطیر نے ہماری عقل کا گلا گھونٹ رکھا ہے اور ہمارے دماغ کو ایک ایسے دھڑے پر ڈال رکھا ہے کہ ہم بے بنیاد ایقان کو اوڑھنا بچھونا بنا چکے اور عقائد کا دودھ پی پی کر تجسس و تحقیق کو ایک شیطانی عمل سمجھنے لگے ہیں۔ ان خرافات کے جادو گھر سے انسان کا نکلنا سب سے بڑا اشرف و مجد ہے"(۶۳)

جوش نے اپنے دوستوں سے نہ صرف دل کی باتیں کہی ہیں بلکہ ان سے اپنے گھریلو کام بھی نکلوائے ہیں۔ میر عترت حسین کی بارہا ذمہ داری لگائی کہ ان کی بیگم اور بیٹی کو لاہور میں وصول کر کے ہندوستان جانے والی گاڑی میں بٹھائیں اور ان کے آرام دہ سفر کا اہتمام کریں نیز واپسی میں بھی ان کا خیال کریں۔ خورشید علی خاں اور راغب مراد آبادی جوش کے مہمانوں کے لیے قیام وطعام کا بندوبست کرنے کے علاوہ ان کے لیے کراچی کی سیر کا اہتمام بھی کرائیں۔ نیز میر عترت حسین لاہور میں جوش کی رہائش کے انتظامات دیکھنے کے علاوہ ان کے لیے شراب کے پرمٹ کا بندوبست بھی کریں۔

جوش کے خطوط نہ صرف ہمیں ان کی زندگی بلکہ ان کے معمولات کے بارے میں ذرا ذرا اطلاع فراہم کرتے ہیں۔ ان کے فکر کی گہرائی و گیرائی، ان کی طبع کی رنگینی و رعنائی، قدرت کے حسن سے محبت، انسانیت سے پیار، مشاہدہ و تجزیہ بطور نباضِ فطرت جوش کا ادبی رنگ ان کے خطوط کی جان ہے۔ انہوں نے جس بے باکی سے اپنی کمزوریوں کا برملا اعتراف کیا ہے۔ مکتوب نگاری میں ایسی جرأتِ رندانہ کم لوگ دکھا سکے ہیں۔ ان خطوط کے ذریعے ہم جوش کی داخلی و خارجی زندگی کی مکمل تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ جہاں وہ علم بغاوت بلند کیے نظر آتے ہیں وہیں وہ محبت کی زنجیر میں پابند سلاسل بھی دکھائی دیتے ہیں۔ جوش کی زبان اور قلم میں کوئی تفریق نہیں ہے جو کچھ ان کے دل میں تھا اسی کو خطوط میں زبان دے دی گئی پنکی جسٹس "خطوط جوش ایک تجزیہ" میں لکھتی ہیں۔

"۔ لکھتے وقت دل کے بطون کھل جاتے اور سیرت بھی عریاں ہو جاتی ہے۔ جوش نے اپنے اسرارِ حیات سے پہلے "یادوں کی برات" میں اور پھر خطوط میں جس طرح پردے اٹھائے ہیں وہ ان کی جرأت رندانہ ہے۔ یہ جرأت اور بے باکی ان کے خمیر میں شامل تھی۔ جوش انسان تھے اور انہیں اپنی انسانیت پر فخر و اعتقاد تھا۔ یہ انسانیت حسین بھی تھی اور بدصورت بھی۔ اس تضاد کو وہ انسانیت کا ورثہ اور اس کے ارتقاء کی بنیاد خیال کرتے تھے۔ آدمی کی طرح رہنا اور غلطیاں کرنا اور آدمیت کی سطح پر رہنا شاید انہیں پسند تھا اس لیے ان کے فن کا انگ انگ اسی کا مجسم پیکر ہے۔"(۶۴)

باب چہارم: خطوط نویسی، حوالے و حواشی

۱۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو نثر کا فنی ارتقاء، الوقار، پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۷ء ص ۳۹۷

۲۔ بحوالہ شہناز انجم، ڈاکٹر، ادبی نثر کا ارتقاء (شمالی ہند میں ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک) لاہور پروگریسو بکس، ۱۹۸۹ء ص ۲۵۹۔

۳۔ مکاتیب مہدی، مرتبہ، بیگم مہدی، گورکھپور، ۱۹۳۸، ص ۲

۴۔ محمد طفیل، ایڈیٹر، اردو خطوط، سید عبداللہ، نقوش کا مکاتیب نمبر ۱۹۵۷ء لاہور ص ۱۸۔۱۹

۵۔ طیبہ خاتون، ڈاکٹر، اردو میں ادبی نثر کی تاریخ ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء لاہور، خان بک کمپنی، لاہور، ۲۰۱۳، ص ۱۰۳

۶۔ سید صفدر حسین، ڈاکٹر، مرتب، نقدِ اخلاص، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۶ء ص ۱۳

۷۔ سید صفدر حسین، ڈاکٹر، مرتب، نقدِ اخلاص، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۶ء ص ۴۲

۸۔ سید صفدر حسین، ڈاکٹر، مرتب، نقدِ اخلاص، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۶ء ص ۱۰۶

۹۔ سید صفدر حسین، ڈاکٹر، مرتب، نقدِ اخلاص، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۶ء ص ۱۱۰

۱۰۔ بحوالہ خلیق انجم مرتبہ جوش بنام ساغر، نئی دلّی مونو مینٹل پبلشرز، ۱۹۹۱ء ص ۴۵

۱۱۔ خلیق انجم، مرتبہ، جوش بنام ساغر، نئی دہلی، مونو مینٹل پبلشرز، ۱۹۹۱، ص ۶۲

۱۲۔ خلیق انجم، مرتبہ، جوش بنام ساغر، نئی دلّی، مونو مینٹل پبلشرز، ۱۹۹۱، ص ۹۲

۱۳۔ خطوط جوش ملیح آبادی، جامع و مرتب راغب مراد آبادی، کراچی ویلکم بک پورٹ، ۱۹۹۸، ص ۲۳

۱۴۔ خطوط جوش ملیح بادی، جامع و مرتب راغب مراد آبادی، کراچی ویلکم بک پورٹ، ۱۹۹۸، ص ۳۰

۱۵۔ خطوط جوش ملیح آبادی، جامع و مرتب راغب مراد آبادی، کراچی ویلکم بک پورٹ، ۱۹۹۸، ص ۳۱

۱۶۔ خطوط جوش ملیح آبادی، جامع و مرتب راغب مراد آبادی، کراچی ویلکم بک پورٹ، ۱۹۹۸، ص ۶۱۔ ۶۲

۱۷۔ خطوط جوش ملیح آبادی، جامع و مرتب راغب مراد آبادی، کراچی ویلکم بک پورٹ، ۱۹۹۸، ص ۷۷

۱۸۔ خطوط جوش ملیح آبادی، جامع و مرتب راغب مراد آبادی، کراچی ویلکم بک پورٹ، ۱۹۹۸، ص ۸۱

۱۹۔ خطوط جوش ملیح آبادی، جامع و مرتب راغب مراد آبادی، کراچی ویلکم بک پورٹ، ۱۹۹۸، ص ۱۰۱

۲۰۔ خطوط جوش ملیح آبادی، جامع و مرتب راغب مراد آبادی، کراچی ویلکم بک پورٹ، ۱۹۹۸، ص ۱۰۲

۲۱۔ خطوط جوش ملیح آبادی، جامع و مرتب راغب مراد آبادی، کراچی ویلکم بک پورٹ، ۱۹۹۸، ص ۱۲۲

۲۲۔ خطوط جوش ملیح آبادی، جامع و مرتب راغب مراد آبادی، کراچی ویلکم بک پورٹ، ۱۹۹۸، ص ۱۲۵

۲۳۔ خطوط جوش ملیح آبادی، جامع و مرتب راغب مراد آبادی، کراچی ویلکم بک پورٹ، ۱۹۹۸، ص ۱۲۹۔ ۱۳۰

۲۴۔ خطوط جوش ملیح آبادی، جامع و مرتب راغب مراد آبادی، کراچی ویلکم بک پورٹ، ۱۹۹۸، ص ۱۳۱

۲۵۔ خطوط جوش ملیح آبادی، جامع و مرتب راغب مراد آبادی، کراچی ویلکم بک پورٹ، ۱۹۹۸، ص ۱۳۲۔ ۱۳۱

۲۶۔ خطوط جوش ملیح آبادی، جامع و مرتب راغب مراد آبادی، کراچی ویلکم بک پورٹ، ۱۹۹۸، ص ۱۳۴

۲۷۔ جوش ملیح آبادی کے خطوط، مرتبہ، خلیق انجم، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، 1998، ص 21

۲۸۔ جوش ملیح آبادی کے خطوط، مرتبہ، خلیق انجم، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، 1998، ص60-61

۲۹۔ جوش ملیح آبادی کے خطوط، مرتبہ، خلیق انجم، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، 1998، ص63

۳۰۔ جوش ملیح آبادی کے خطوط، مرتبہ، خلیق انجم، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، 1998، ص68

۳۱۔ جوش ملیح آبادی کے خطوط، مرتبہ، خلیق انجم، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، 1998، ص68

۳۲۔ جوش ملیح آبادی کے خطوط، مرتبہ، خلیق انجم، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، 1998، ص73-72

۳۳۔ جوش ملیح آبادی کے خطوط، مرتبہ، خلیق انجم، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، 1998، ص73

۳۴۔ جوش ملیح آبادی کے خطوط، مرتبہ، خلیق انجم، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، 1998، ص75

۳۵۔ جوش ملیح آبادی کے خطوط، مرتبہ، خلیق انجم، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، 1998، ص109

۳۶۔ جوش ملیح آبادی کے خطوط، مرتبہ، خلیق انجم، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، 1998، ص120-119

۳۷۔ جوش ملیح آبادی کے خطوط، مرتبہ، خلیق انجم، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، 1998، ص 126-125

۳۸۔ جوش ملیح آبادی کے خطوط، مرتبہ، خلیق انجم، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، 1998، ص 126

۳۹۔ جوش ملیح آبادی کے خطوط، مرتبہ، خلیق انجم، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، 1998، ص 144

۴۰۔ جوش ملیح آبادی کے خطوط، مرتبہ، خلیق انجم، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، 1998، ص 155-154

۴۱۔ جوش ملیح آبادی کے خطوط، مرتبہ، خلیق انجم، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، 1998، ص 156

۴۲۔ جوش ملیح آبادی کے خطوط، مرتبہ، خلیق انجم، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، 1998، ص 187

۴۳۔ جوش ملیح آبادی کے خطوط، مرتبہ، خلیق انجم، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، 1998، ص 188

۴۴۔ ڈاکٹر آصف حمید، اردو مکتوب نگاری... قیام پاکستان کے بعد، مشمولہ بازیافت، 26، ششماہی مجلہ شعبہ اردو، لاہور، اورنٹیل کالج، پنجاب یونیورسٹی، جنوری۔ جون 2015، ص ۲۰۶۔۲۰۵

۴۵۔ جوش ملیح آبادی کے خطوط مرتب خلیق انجم، ص 187

۴۶۔ نقد اخلاص، مرتبہ ڈاکٹر سید صفدر حسین، ص 89

۴۷۔ جوش ملیح آبادی کے خطوط مرتبہ خلیق انجم، ص 163

۴۸۔ خطوط جوش ملیح آبادی مرتبہ راغب مراد آبادی، ص 86

۴۹۔ جوش ملیح آبادی کے خطوط مرتب خلیق انجم۔ ص 32

۵۰۔ جوش ملیح آبادی کے خطوط مرتب خلیق انجم۔ ص

۵۱۔ بحوالہ ڈاکٹر ہلال نقوی، وشہناز اختر، ٹیلی فونک گفتگو بتاریخ 18 جولائی 2015، بوقت 3.05 منٹ پر

۵۲۔ جلیل قدوائی، مقدمہ، مشمولہ مکتوبات عبد الحق، ص 162

۵۳۔ خطوط جوش ملیح آبادی، ص ۹۱

۵۴۔ سلیم احمد ادھوری جدیدیت، کراچی، ایجوکیشنل پریس، فروری 1977ء ص 164

۵۵۔ خطوطِ راغب مراد آبادی، مرتبہ راغب مراد آبادی، ص 87

۵۶۔ جوش ملیح آبادی کے خطوط مرتبہ خلیق انجم، ص 61

۵۷۔ نقوش، مکاتیب نمبر، سید عبد اللہ، ص 29

۵۸۔ جوش بنام ساغر، مرتبہ، خلیق انجم، ص 59

۵۹۔ جوش ملیح آبادی کے خطوط مرتب خلیق انجم، ص 139

۶۰۔ باقر مہدی، آگہی وبے باکی، گوشۂ ادب، ممبئی 1965، ص 212

۶۱۔ جوش بنام ساغر مرتبہ خلیق انجم، ص 83

۶۲۔ جوش ملیح آبادی کے خطوط مرتبہ خلیق انجم، ص 23

۶۳۔ جوش ملیح آبادی کے خطوط مرتبہ خلیق انجم، ص 158

۶۴۔ پنکی جسٹن، خطوط جوش ایک تجزیہ مشمولہ جوش شناسی چوتھا شمارہ، کراچی، ص 276

باب پنجم

خاکہ نگاری

اردو میں خاکہ نگاری کی عمر زیادہ نہیں ہے یہ وہ صنف ادب ہے جو اپنے ارتقاء کی منازل طے کر رہی ہے۔ خاکہ نگاری کی ابتدائی شکلیں ہمیں مختلف تذکروں اور روزناموں میں ملتی ہیں مگر انہیں باقاعدہ خاکہ نگاری کے حوالے سے نہیں دیکھا جا سکتا۔

''جامع اردو لغت'' میں خاکے کی تعریف یوں ہے:

''خاکہ: (ف)(مذ)(۱) وہ نقشہ جو صرف حدود کی لکیریں کھینچ کر بنایا جائے، کسی چیز کا ابتدائی نقشہ (۲) وہ مضمون جس میں کسی شخص کے جُستہ جُستہ حالات لکھے جائیں (۳) ڈھانچہ، چربہ (۴) وہ مسودہ یا منصوبہ جو ذہن میں بنایا جائے'' (۱)

''سیلی دیمئیر آکسفورڈ ایڈوانس لیشنرز ڈکشنری'' میں اس کی تعریف یوں ہے:

"Sketch-n-a simple picture that drawn quickly and does not have many details. (۲)

''آکسفورڈ انسائیکلوپیڈیا ڈکشنری'' میں اس کی تعریف یوں ہے:

"Sketch-n-Preliminary right slight merely out lined or unifinished drawing or painting; brief account or narrative without lined." (۳)

مختلف ناقدین کے نزدیک خاکہ کی تعریف درج ذیل ہے۔

رفیع الدین ہاشمی ''اصنافِ ادب'' میں لکھتے ہیں:

خاکہ کے لغوی معنی ''ابتدائی نقشہ'' ڈھانچہ' اور چربہ'' کے ہیں۔ خاکہ کھینچنا کے معنی ہیں کسی کی تصویر لفظوں میں ادا کر دینا، ادبی اصطلاح میں خاکہ وہ تحریر یا مضمون ہے جو کسی شخصیت کا بھرپور تاثر پیش کرے۔ اس کو کسی شخص کی قلمی تصویر بھی کہہ سکتے ہیں۔ خاکہ ''Sketch'' کو مرقع یا شخصیہ بھی کہتے ہیں اور خاکہ نویسی کو شخصیت نگاری کا نام بھی دیا گیا ہے'' (۴)

کشاف تنقیدی اصطلاحات میں ابوالاعجاز صدیقی لکھتے ہیں:

''ادب کی جس صنف کے لیے انگریزی میں سکیچ یا پن پورٹریٹ (Skecth or Pen Portrait) کا لفظ استعمال ہوتا ہے اردو میں اسے خاکہ کہتے ہیں'' (۵)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے شاہد احمد دہلوی کی تصنیف گنجینۂ گوہر کے مقدمے میں خاکہ کی یوں تعریف کی ہے۔

''خاکہ ایک ایسی صنف ادب قرار پائی جس میں کسی انسان کے خدوخال پیش کیے جائیں، کسی ایسی شخصیت کے نقوش ابھارے جائیں، جس سے لکھنے والا جلوت اور خلوت میں ملا ہو۔ اس کی عظمتوں اور لغزشوں سے واقف ہو اور تمام تاثرات کو ایسے شگفتہ انداز میں پیش کرے کہ پڑھنے والا بھی اس شخص کی عظمت سے واقف ہو کے اسے کردار کے طور پر قبول کرے۔''(۶) تنویر حسین خاکہ کی ان الفاظ میں تعریف کرتے ہیں۔

''ادبی اصطلاح میں خاکہ ایسی تحریر یا مضمون کو کہتے ہیں جس میں کسی شخص کی زندگی کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا جائے۔ اس میں اس کی شخصیت کے نقوش مع خامیوں اور خوبیوں کے اُبھر آئیں... خاکہ دوسرے لفظوں میں کسی شخص کا ہلکا سا ادبی تعارف ہوتا ہے۔(۷)

ڈاکٹر انور سدید خاکے کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ:

''خاکہ نگاری میں مصنف شخصیتوں کے بطون میں جھانکتا اور نادر عجائب گوشے تلاش کرتا ہے۔ اس لحاظ سے خاکہ نگاری شخصیتوں کی سیاحت ہے اور اس میں شخصیت کو اس کی عادات و خصائل، حرکات و سکنات اور اعمال و اقوال سے دریافت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے''۔(۸)

ڈاکٹر گیان چند جین اپنے مضمون ''اردو کی ادبی نثر کی اصناف'' میں خاکہ کی تعریف کچھ یوں بیان کرتے ہیں کہ:

''یہ کسی شخصیت کی قلمی تصویر ہوتی ہے۔ اس میں خارجی شخصیت کا بیان بھی ہوتا ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ اہم داخلی شخصیت یعنی عادات، اطوار، مزاج، نفسیات، پسند و ناپسند وغیرہ کی تفصیل ہوتی ہے۔'' (۹)

ڈاکٹر سلیم اختر سکیچ اور پورٹریٹ ان دونوں اصطلاحات میں موجود فرق کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں کہ:

''مصوری کی اصطلاح میں بات کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ سوانحی مضمون رنگین پورٹریٹ ہے جس میں مصور پس منظر اور پیش منظر کو اجاگر کرتے ہوئے شبیہہ سے وابستہ تمام جزئیات نمایاں کرتا ہے جبکہ خاکہ پینسل سکیچ ہے جس میں کم سے کم لائنوں میں چہرہ کا تاثر واضح کیا جاتا ہے۔ اب یہ مصور کا اپنا وجدان اور فنی شعور ہے کہ وہ تاثر کو ابھارنے کے لیے چہرہ کے کن خطوط کو نمایاں کرتا ہے۔ (۱۰)

گویا سکیچ مصوری کی اصطلاح ہے جس میں چند لکیروں کی مدد سے کسی بھی شخص کے خد و خال بیان کیے جاتے ہیں دراصل خاکہ لفظوں سے بنائی گئی شخصی تصویر ہوتا ہے جس طرح ایک مصور رنگ استعمال کرتا ہے چاہے وہ Water colours ہوں یا Oil colours ہوں مصور کے لیے بہت گنجائش ہوتی ہے مگر خاکہ نگار اپنے پاس صرف لفظ رکھتا ہے اور لفظ کی تخلیقی قوت کو متحرک کر کے شخصیت کی تصویر بناتا ہے۔ شخصیت کی تصویر جتنی پر لطف ہو گی ہم اتنے ہی اس تصویر سے مانوس ہوں سکتے ہیں۔

خاکہ نگاری حقیقت نگاری ہی کا دوسرا عکس ہے۔ مصنف کا کام شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں دونوں پر روشنی ڈالنا ہے۔ غیر ضروری تفصیلات اور واقعات کی بھرمار سے خاکہ اپنا تاثر کھو دیتا ہے۔ خاکہ نگار کو کم سے کم لفظوں میں موضوع کے نمایاں اوصاف و نقائص کو ایک خاص سلیقے اور ترتیب سے پیش کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ہمیں کن باتوں کو چھوڑنا ہے اور کن کو ملحوظ رکھنا ہے اس کے بارے میں حفیظ صدیقی تین درجے متعین کرتے ہیں۔ جبکہ پروفیسر شمیم حنفی کہتے ہیں :

''کامیاب خاکہ نگار وہ ہے جس کی آستین میں روشنی کا سیلاب چھپا ہوا ہو اور جو واقعات کی اوپری پرت کے نیچے معمولات کے ہجوم میں کھوئی ہوئی ایسی حقیقتوں کو کو بھی اپنی گرفت میں لے سکے جن تک عام لکھنے والوں کی نگاہ پہنچتی ہی نہیں۔''(۱۱)

خاکہ ایک ایسی صنف ادب ہے جس کے لیے کسی خاص ذہنی منصوبہ بندی یا تیاری کی ضرورت نہیں ہوتی۔ محض ذاتی تعلق یا عمیق مشاہدہ ضروری ہے کیونکہ خاکہ ذاتی تعلق کے بغیر لکھا ہی نہیں جا سکتا اور نہ ہی گہری نظر اور وسیع مشاہدے کے بغیر وجود میں آسکتا ہے۔ خاکہ نگار اپنے موضوع کی شخصیت میں ایک خاص قسم کی مقناطیسی کشش محسوس کرتا ہے اور یہی کوشش اسے قلم اٹھانے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ فن سریع الفہمی کا متقاضی ہے خاکہ نگار زیر موضوع شخصیت کی ایک ایک پرت کو ذہنی طور پر قبول کرتا ہے اور پھر کسی خاص خوبی یا خامی کو زیادہ اُبھار کر پیش کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خاکہ ایک مشکل تخلیقی صنف ہے۔ کسی شخصیت کی انفرادیت کو کمال اجمال کے ساتھ بیان کر دینے کا فن خاکہ نگاری ہے۔ اس بارے میں محمد طفیل لکھتے ہیں کہ:

''خاکہ نگاری خدائی حدود میں قدم رکھنے کے مترادف ہے یعنی جو کچھ آپ کو خدا نے بنایا ہو اس کے عین مین اظہار کا نام خاکہ نگاری ہے۔''(۱۲)

خاکہ نگار اپنے پاس سے زیب داستان کے لیے کچھ بڑھا کر پیش نہیں کر سکتا۔ موضوع شخصیت جیسی ہے اسے ویسا ہی پیش کرنا پڑتا ہے۔ کسی شخصیت کی عیب جوئی خاکہ نگاری نہیں اور نہ ہی جانتے بوجھتے کسی کی عیب پوشی شخصیت نگاری ہے۔ تصنع اور مبالغہ آرائی کی بجائے حقیقت کا اظہار خاکہ نگاری ہے۔ خاکہ نگار کو لفظوں کی کدال سے شخصیت کو کھود کر اس کا سراغ لگانا پڑتا ہے اور یہ کام زبان و بیان پر قدرت رکھے بغیر ناممکن ہے۔

خاکہ نگاری کا فن بہت زیادہ وسعت رکھتا ہے۔ فرد محض ایک اکائی نہیں ہے بلکہ وہ ایک عہد ایک سماج اور ایک نظامِ فکر سے متعلق ہوتا ہے۔ اس میں جن خوبیوں کا ہونا ضروری ہے اس بارے میں ڈاکٹر تحسین فراقی لکھتے ہیں کہ:

"لکھنے والا حکیمانہ نظر رکھتا ہو، مسلسل اور دقیق مشاہدے، کی ہمت اور حوصلہ رکھتا ہو۔ بات اختصار سے اور شگفتہ اسلوب میں کہنے پر قادر ہو، شخصیتوں کے انسانی پہلوؤں کو نمایاں کرنے میں کوئی عیب نہ سمجھتا ہو پھر سب سے اہم بات یہ کہ صداقت نگاری اور سراپا نگاری کا سلیقہ اور حوصلہ رکھتا ہو"۔(۱۳)

عام طور پر حلیہ نگاری خاکے کا جزو سمجھی جاتی ہے لیکن ظاہری شکل وصورت کردار کو سمجھنے میں زیادہ معاون ثابت نہیں ہوتی۔ اس لیے موجودہ دور میں حلیہ نگاری خاکے کا اہم جزو نہیں ہے۔ کیونکہ بعض اوقات معصوم صورتیں انتہائی گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کر بیٹھتی ہیں خاکہ میں باطنی کردار اہمیت رکھتا ہے۔

کردار نگاری بھی خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ مصنف جتنا زیادہ موضوع سے قریب ہو گا اس کا مشاہدہ اسی قدر عمیق ہو گا۔ اسی لیے اس کا موضوع اپنے کردار کے لحاظ سے بھی بہترین ہو گا۔ اور وہ جو کچھ تحریر کرے گا بعینہ اس کے مطابق اس کا موضوع عمل کرتا ہو گا۔ حقیقت نگاری جتنی عمدگی سے کی جائے گی کردار نگاری اسی کے حساب سے مضبوط یا کمزور ہو گی۔

اردو ادب میں سب سے پہلے انشاء اللہ خان انشاء کی کتاب "دریائے لطافت" میں میر ظفر، عینی، بی نورن، بھاڑاملی، مرزا صدر الدین اصفہانی اور عبد الفرقان کے مرقعے ملتے ہیں جو ظاہری شخصیت کی تفصیلات تک محدود ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی تصنیف "آبِ حیات" میں مختلف شخصیات کے مرقعے پیش کیے ہیں لیکن اسے باقاعدہ خاکہ نگاری کی بجائے ایک لاشعوری اُمنگ یا ترنگ کہا جا سکتا ہے جس کی تخلیق کے وقت ان کے سامنے خاکے کی کوئی تعریف یا کوئی مثال موجود نہ تھی۔ یہ ان کی اپنی کوشش تھی کہ اس انداز سے بعض شخصیات کی چلتی پھرتی تصویریں اور ان کی زندگی کے بہت سے گوشے لفظوں کی صورت (تحریر میں) محفوظ ہو جائیں۔ ڈاکٹر محمد عباس لکھتے ہیں کہ:

"یہ حقیقت ہے کہ "آب حیات" ہی وہ پہلی کتاب ہے جس نے باقاعدہ خاکہ نگاری کا شعور دلایا اور اس صنف کے لیے مستقبل کا راستہ ہموار کیا۔"(۱۴)

فرحت اللہ بیگ نے اپنے استاد ڈپٹی نذیر احمد کا خاکہ لکھ کر اسے اس مقام تک پہنچا دیا کہ جس پر اردو خاکہ نگاری فخر کر سکتی ہے۔

فرحت اللہ بیگ کے خاکوں "نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی"، "دلی کا ایک یادگار مشاعرہ" اور "ایک وصیت کی تکمیل" نے بہت شہرت پائی۔ بابائے اردو مولوی عبد الحق نے بھی "چند ہم عصر" کے نام سے اپنے ہم عصروں سے متعلق رائے کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے بعض ایسی شخصیات منتخب کی ہیں جن کی دنیاوی حیثیت کوئی نہیں۔ نہ مال وزر ہے نہ طبل و علم ہے نہ سیاسی و سماجی رتبہ ہے نہ مذہبی مصلح و ملاہیں پھر بھی ان کی مخلصانہ جذبات، شرافتِ نفس، مقصد کی لگن اور بیکراں خلوص و مروت انہیں عبد الحق کی نظروں میں پسندیدہ اور عظیم المرتبت بنا دیتا ہے۔ عبد الحق کے بعد چراغ حسن حسرت نے "مردم دیدہ" لکھ کر مرقع نگاری میں اضافہ کیا۔ رشید احمد صدیقی کی تصانیف "گنج ہائے گراں مایہ"، "ہم نفسان رفتہ" اور "ذاکر صاحب" نے خاکہ نگاری میں قابل قدر اضافہ کیا۔ گنج ہائے گراں مایہ میں ۱۶ خاکے شامل ہیں جن میں اصغر

حسین گونڈوی، ڈاکٹر سر علامہ محمد اقبال، سجاد حیدر یلدرم، جگر مراد آبادی اور مولوی عبدالحق نمایاں ہیں۔ ہم نفسانِ رفتہ میں چھ خاکے ہیں۔ شوکت علی تھانوی کی کتاب ''شیش محل'' کو خاکوں کی کتاب کے ذیل میں رکھا جاتا ہے لیکن اس کے ذریعے شخصیت کی ہلکی پھلکی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ مکمل طور پر اسے خاکوں کا مجموعہ نہیں کہہ سکتے۔ قیام پاکستان سے قبل اردو خاکہ نگاری میں اہم اضافہ عصمت چغتائی کا خاکہ ''دوزخی'' ہے۔ قیام پاکستان کے بعد رئیس احمد جعفری کے مضامین کا مجموعہ ''دید و شنید'' ۱۹۴۸ء میں منظر عام پر آیا۔ اس میں بھی فنی لحاظ سے کچھ خامیاں موجود ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد اہم اور نمایاں نام سعادت حسن منٹو ہے۔ ۱۹۵۲ء میں منٹو کی شخصی خاکوں پر مشتمل کتاب ''گنجے فرشتے'' کے نام سے منظر عام پر آئی۔ اس میں بارہ خاکے ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں ''لاؤڈ سپیکر'' کے نام سے ایک اور کتاب طبع ہوئی۔ ان خاکوں میں بھی منٹو کی بے باکی نظر آتی ہے۔ جنوری ۱۹۵۵ء میں رسالہ نقوش کے شخصیات نمبر میں ۸۲ ادباء و شعراء کی شخصیت پر ان کے احباب سے خاکے لکھوائے گئے۔ ۱۹۵۷ء میں ''اخلاق دہلوی'' کے چند مضامین کا مجموعہ ''اور پھر بیان اپنا'' شائع ہوا۔ اس میں بھی چند خاکے موجود ہیں۔ ۱۹۶۱ء میں مدیر نقوش محمد طفیل کی کتاب ''جناب'' شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ۲۲ شخصیات پر خاکے موجود ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں شاہد احمد دہلوی کے خاکوں کی ایک کتاب ''گنجینۂ گوہر'' منظر عام پر آئی جس میں ۱۶ شخصیات پر خاکے لکھے گئے ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں خاکہ نگاری کے حوالے سے اشرف صبوحی کی کتاب ''دہلی کی چند ہستیاں'' شائع ہوئی۔ اس میں ۱۵ خاکے موجود ہیں جن کے ذریعے دلی کی تہذیب کے اتار چڑھاؤ کو دکھایا گیا ہے۔ ۱۹۶۵ء میں محمد طفیل کی دوسری کتاب ''صاحب'' طبع ہوئی اس میں سات اشخاص پر خاکے ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں ''محمد طفیل'' کی ایک اور اہم کتاب ''آپ'' کے عنوان سے چھپی جو چار شخصیات کے خاکوں پر مشتمل ہے۔ ۱۹۶۸ء میں ممتاز مفتی کی کتاب ''پیاز کے چھلکے'' کے نام سے طبع ہوئی۔ اس میں ۹ خاکے ہیں مگر ان میں سے ایک خاکے کو ''آپ بیتی'' کہا جاسکتا ہے۔ اس کا عنوان ''پاکستان'' ہے اس کو اصطلاحی طور پر خاکہ نہیں کہا جاسکتا۔ ۱۹۷۰ء میں محمد طفیل کی ''مکرم'' اور معظم ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئی۔

جوش ملیح آبادی کی خاکہ نگاری

جوش ملیح آبادی نے اپنے دوستوں، عزیز و اقارب اپنے دور کی عجیب ہستیوں، معشوقوں اور اپنے خاندان کے لوگوں کے جو خاکے تحریر کیے انہوں نے نہ صرف ان کی سوانح ''یادوں کی برات'' کی دلکشی و مقبولیت میں اضافہ کیا بلکہ جوش کی دوست نوازی، وفاداری، باریک بینی، مشاہدے کی وسعت، الفاظ و بیان پر قدرت اور عیش و عشق طلبی کو ظاہر کیا ہے۔ جوش کی آپ بیتی ''یادوں کی برات'' پہلی بار کراچی سے ۱۹۷۰ء میں منظر عام پر آئی جس میں جوش نے اپنے خاندان، دوستوں اور ملنے والوں کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے اور اپنی سوانح حیات مرتب کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی ادبی اور تہذیبی فضا کو بھی بیان کیا ہے۔ کچھ ناقدین اس بات پر معترض ہوئے کہ جوش نے اپنی یادوں کی برات سے اپنے بہت سے کرم فرماؤں اور دوستوں کو خارج کر دیا۔ سخت ناقدری، ناسپاس گذاری اور معاصرین سے صرفِ نظر کر کے ادبی خیانت کا ارتکاب کیا ہے۔ غرض مخالفت اور پراپیگنڈے کا ایک طوفان تھا جس نے ''یادوں کی برات'' کے منظر عام پر آتے ہی جوش ملیح آبادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ڈاکٹر ہلال نقوی اس بارے میں رقمطراز ہیں۔

> ''کچھ لکھنے والے نالاں رہے کہ جوش صاحب نے مبالغہ آمیز واقعاتی روش اور اپنی برہنہ گفتاری سے غیر ضروری مواد کو ہوا دے کر معاشرے میں رائج حدود و قیود کو بیک جنبشِ قلم مسترد کر دیا لیکن جس بات کا ناقدین نے سب سے زیادہ گلہ کیا وہ یہ ہے کہ زندگی بھر زندگی کے میلوں ٹھیلوں کی لطافتوں کا تذکرہ کرنے والے اور یادوں کی برات سجانے والے نے اپنی یادوں کے نہاں خانوں سے اپنے کتنے قریبی احباب کو خارج کر دیا۔''(۱۵)

پروفیسر سحر انصاری نے اپنے مضمون ''یادوں کی برات محض دلچسپ واقعات'' میں ان لوگوں کا ذکر کیا جن کے بارے میں جوش نے ''یادوں کی برات'' میں کچھ نہیں تحریر کیا وہ لکھتے ہیں کہ:

> مجنوں گورکھپوری، سجاد ظہیر، علی سردار جعفری، سید احتشام حسین، فیض احمد فیض، ممتاز حسین اور ترقی پسند تحریک کے دوسرے ایسے مقتدر علمبرداروں کا تذکرہ نہیں ملتا جن سے جوش صاحب بہت اچھی طرح واقف ہیں۔''(۱۶)

علی عباس جلالپوری نے اپنا شکوہ کچھ انداز میں تحریر کیا ہے کہ:

> ...''اس میں غیر معروف احباب اور اعزہ کا ذکر نہایت شرح وبسیط سے کیا گیا ہے لیکن سیاسی، فکری اور ادبی اکابر کا ذکر جن سے جوش صاحب کی صحبت رہی اوّل تو آیا ہی نہیں اور اگر آیا ہے تو سرسری طریقے سے آیا ہے۔''(۱۷)

یادوں کی برات ابھی کتابوں کی دکانوں تک پہنچی بھی نہیں تھی کہ اس کے پہلے ایڈیشن میں ہی ''ردوبدل کی ضرورت پیش آگئی۔ ڈاکٹر ہلال نقوی نے جوش صاحب کے قریبی دوست منور عباس کے حوالے سے بتایا ہے کہ

> ابتداء میں میرے چند قابل ذکر احباب کے ضمن میں جوش صاحب نے تقریباً ۱۳۵ احباب کا تذکرہ کیا تھا لیکن آخری تین نام شمس زبیری، سید سبطِ حسن اور منور عباس طباعتی مجبوریوں کے باعث نکال کر ان کی جگہ مجاز کا تذکرہ شامل کر دیا گیا ہے۔ منور عباس کے خیال میں انہوں نے جوش صاحب کو مشورہ دیا تھا کہ ان کا ذکر نکال کر اے ٹی نقوی (ابو طالب نقوی) سابق کمشنر، کراچی؛ جو جوش صاحب کے مہربان تھے اور جوش کو پاکستان بلانے والوں میں سے ایک تھے) کا ذکر شامل کر دیں، لیکن جب کتاب بازار میں آئی تو اے ٹی نقوی کی بجائے مجاز کا ذکر شامل تھا۔''(۱۸)

مئی ۱۹۷۵ء میں ''یادوں کی برات'' کا لاہور ایڈیشن اضافہ شدہ، شائع ہوا اس ایڈیشن میں ''یادوں کی برات'' کے صفحات میں اضافہ کیا گیا۔ اس حصے میں جوش نے اپنی زندگی پر افسوس کا اظہار کیا ہے اور گئے وقتوں کو آواز دی ہے۔ جب اپنے پیارے دوستوں کا قرب انہیں حاصل تھا انہوں نے یاران ہند کو دشمنوں کی پرچھائیاں دکھانے والی تاریکیوں میں گھبرا گھبرا کر پکارا ہے۔ ملک میں سیاست کی کروٹوں میں تھپیڑے کھاتے ہوئے کس طرح سے وہ زندہ ہیں تنہائی کے عذاب میں صدائیں ہیں اور وہ ہیں ایسے میں چند احباب ہیں جو گاہ گاہ اس تنہائی کے عذاب سے نجات دلاتے ہیں۔ جوش نے یہاں ۱۲۹ احباب، اپنی بیوی اور فتنۂ آخر الزماں کا تذکرہ کیا ہے۔

اس کے بعد جوش کی ''یادوں کی برات'' کے مختلف ایڈیشن شائع ہوتے رہے لیکن لاہور ایڈیشن کے بعینہ ۱۹۹۶ء میں جوش کی نواسی صبوحی خاتون نے ڈاکٹر ہلال نقوی کو ایک قلمی مسودہ دیا جو کہ ''یادوں کی برات'' کا اصل مسودہ تھا۔ سترہ سو پچاس صفحات پر مشتمل ''یادوں کی برات'' کے قلمی نسخے کے ابھی بھی چھ سو صفحات گمشدہ تھے ان صفحات کی تلاش کارِ دارد تھا۔ اسی اثناء میں ادبی کتابی سلسلے ''تحریر'' کے مدیر رفیق احمد نقش نے ۲۴۳ صفحات پر مشتمل جوش کی ایک کاپی ڈاکٹر ہلال نقوی کو دی جن میں ایک سو ایک معاصر و احباب کے تذکرے ہیں جو یادوں کی برات میں شامل نہ ہو سکے تھے۔ ابھی بھی تین سو پینسٹھ صفحات ایسے ہیں جن کے بارے میں علم نہیں ہے کہ کہاں ہیں۔

ستمبر ۲۰۱۳ء میں ڈاکٹر ہلال نقوی نے ''یادوں کی برات'' قلمی نسخہ اور اس کے گمشدہ اوراق جہلم سے طبع کرائی۔ اس کتاب کے سامنے آنے سے جوش کے ان احباب کے بارے میں تاثرات منظر عام پر آئے جن کے بارے میں وقتاً فوقتاً اہل علم و فن سوال اٹھاتے رہے کہ جوش نے اپنے محسن اور معاصرین کو فراموش کر کے اُن لوگوں کا تذکرہ کیا جن سے وہ فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ قلمی نسخہ نے ان سب لوگوں کے سوالوں کو جواب دے دیا ہے۔

اب ہم ''یادوں کی برات'' کے مطبوعہ نسخے اور قلمی نسخے میں ان لوگوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں جن کے بارے میں جوش نے لکھا۔ سب سے پہلے مطبوعہ نسخہ دیکھتے ہیں۔

"میر اخاندان" کے عنوان سے جوش نے اپنے پر دادا، دادا، باپ، ماں، چچا، بیوی، بیٹی اور بیٹا کی شخصیت پر قلم اٹھایا ہے۔

"میرے چند قابل ذکر احباب" کے عنوان سے پینتیس (۳۵) جمع ایک احباب پر مختصر اظہار خیال کیا ہے۔ ابرار حسن خاں ملیح آبادی، مختار احمد خاں، قاضی خورشید احمد، حکیم صاحب عالم، رفیع احمد خاں، پرنس مرزا عالمگیر قدر، مولانا سہا بھوپالی، ڈاکٹر ایس، کے، سکسینہ، مانی جائسی، منے میر زاشر ر لکھنوی، شاہ دل گیر اکبر آبادی، نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی، حکیم آزاد انصاری، فانی بدایونی، آغا شاعر قزلباش، سر دار روپ سنگھ، وصل بلگرامی، ڈاکٹر کرنل اشرف الحق، کنور مہند سنگھ بیدی، پنڈت جواہر لال نہرو، سروجنی نائیڈو، میاں محمد صادق، علامہ حیرت، سر دار دیوان سنگھ مفتون، مولانا عبدالسلام، مولانا عبد اللہ عمادی، فراق گورکھپوری، وحید الدین سلیم، سید جالب دہلوی، روشن علی بھیم جی، آغا حسن عابدی، مصطفیٰ زیدی اور مجاز پر لکھا ہے۔ ایک کردار نور الحسن خاں عرف چھوٹے دادا کا تذکرہ تو موجود ہے لیکن اسے کسی ذیلی عنوان کے بغیر دیا ہے۔

"میرے دور کی چند عجیب ہستیاں" اس عنوان کے تحت میر سخاوت حسین، ناظم الدین حسن، علی گڑھ کے ایک گمنام پٹھان شاعر، نبی شیر خاں، محمد شیر خاں، کنجو خاں، امیر احمد خاں، ہدایت اللہ خاں، محبوب شاہ مجذوب، الویرو، مشیر احمد خاں رامپوری، مولوی احمد حسین، نواب زادہ مصطفیٰ علی خاں، زاہد علی خاں، میر بارق لکھنوی، منشی واحد علی ابر قدوائی، حکیم دانش لکھنوی، نواب رستم علی خاں مہر، اور چھدّو خاں نامی کرداروں پر خاکے تحریر کیے ہیں۔ ان کی تعداد انیس ہے۔ "میرے معاشقے" کے عنوان سے س۔ ح، ع۔ ج، مس میری رومالڈ، مس گلینسی، م۔ بیگم، ر۔ کماری، ط۔ ج اور ج۔ ب۔ ع۔ خ کے ذیلی عنوان پر نو شخصیات پر خاکے تحریر کیے گئے ہیں۔

لاہور ایڈیشن میں "تنہائی سے نجات دلانے والے چند احباب و اقارب کے عنوان سے ۳۱ شخصیات کا تذکرہ کیا ہے۔ جن میں کلام خاں، جمال خاں، عزیز ہاشمی، سید عزادار حسین کاظمی، سید ارتضیٰ حسین زیدی، عون محمد رضوی، محمد رمضان، ڈاکٹر صفدر حسین، سیفی نوگانوی، ڈاکٹر سبطِ حسن، سید محمد واقف، نظم اکبر آبادی، سید اولاد باقر رضوی، کوثر نیازی، صفیہ شمیم، حفیظ الرحمن، فیض احمد فیض، فیضی، اعظمی، دانش، محمد عظیم ارزش، یونس منصور، علی اختر زیدی، اظہار حیدر زیدی، شیخ منظور الٰہی، مختار مسعود، سید مہدی نواب، راز مراد آبادی اور اختر و منظور کے توام کردار شامل ہیں۔ میری بیوی اور فتنۂ آخر الزماں کے کردار بھی جوش کے قریبی کردار ہیں جو ان کی خلوت کے رفیق ہیں۔ قلمی نسخے میں "میرے چند قابل ذکر احباب" کے حوالے سے اور غیر مطبوعہ اور گمشدہ تحریروں کے حوالے سے مندرجہ ذیل افراد پر تاثرات تحریر کیے گئے ہیں۔

حکیم مخمور، میر زا جعفر حسین، جگر مراد آبادی، مولوی سمیع اللہ، شنکر پرشاد، آئی، سی، ایس، سید محمد عسکری، سید ابوالخیر مودودی، وڈیا شنکر آئی، سی، ایس، کشن لال، اعجاز الحق قدوسی، محمد زکریا۔ مائل، امجد حیدر آبادی، عارف و قریشی، ڈاکٹر عبد الطیف، حبیب اللہ رشدی، بسمل ٹونکی، مولانا ابوالکلام آزاد، لطیف الدین احمد، مے کش اکبر آبادی، مخمور اکبر آبادی، اسرائیل احمد خاں، آغا حشر کاشمیری، سیماب اکبر آبادی، ساعر نظامی، جمیل مظہری، مولوی غیاث الدین، حکیم خواجہ شمس الدین، مولوی سید اختر علی تاہری، سید علی عباس حسینی، سید احتشام حسین، یونس سلیم، مولوی محمد رضا فرنگی محلی، اجمل خاں، احسان دانش، پنڈت کیلاش نرائن، ہاکسر، حکیم۔ اشعر دہلوی، شیوراج بہادر، اسلم خاں، گوپی ناتھ امن لکھنوی، بشیور پرشاد، منور لکھنوی، آنند نرائن ملا، سراج و قدیر، ہوش بلگرامی، ساحل بلگرامی، سید آلِ رضا، سید محمد مہدی عرف میاں، خورشید فرید آبادی، پنڈت بدری ناتھ، شنگلو، دریا نرائن نگم، امید، امیٹھوی، کرشن چندر، مالک رام، ڈاکٹر صفدر آہ سیتاپوری، آغا جانی کاشمیری، پنڈت ہری چند اختر، سید علی اختر اور رزی جے پوری پر خاکے موجود ہیں۔

جوش نے سراج و قدیر کے توام کرداروں پر اپنے تاثر کا اظہار کیا ہے، اسی طرح عارف و قریشی بھی دو توام کردار ہیں۔

''میرے خورد احباب'' کے حوالے سے جوش نے اختر شیرانی، جاں نثار اختر، جگن ناتھ آزاد، جذبی، حکیم محمد نبی خاں جمال، رعنا جگی، سید سبط حسن، سجاد ظہیر، علی سردار جعفری، نریش کمار شاد، شکیل بدایونی، بال مکند عرش ملیسانی، فیض احمد فیض، کیفی اعظمٰی، گلزار دہلوی، مجروح سلطان پوری، مجاز، مجتبیٰ حسین اور احمد ندیم قاسمی پر لکھا ہے۔ سید سبطِ حسن، فیض احمد فیض اور مجاز پر مطبوعہ ایڈیشن میں بھی تحریر موجود تھی اور قلمی نسخے میں موجود ہے۔ لیکن دونوں کا اندازِ تحریر الگ ہے۔ ۱۹ افراد پر خیالات موجود ہیں۔ ''میرے پاکستانی دوست'' کے عنوان سے ۱۳۱ افراد پر جوش کی تحریریں موجود ہیں۔ ان افراد کے نام درج ذیل ہیں۔

نواب ابوالحسن بلگرامی، بدر اللہ آبادی، پیر حسام الدین راشدی، سید محمد تقی، جمیل نشتر، علامہ محمد مصطفیٰ جوہر، حکیم نصیر الدین، راغب مراد آبادی، رعنا اکبر آبادی، روشن علی بھیم جی، رئیس امروہوی، زیبا ردولوی، ذہین شاہ تاجی، سرور بارہ بنکوی، سلامت علی خاں، سلیم اللہ فہمی، حمایت علی شاعر، شمس زبیری، صبا اکبر آبادی، آغا حسن عابدی، سراج الدین ظفر، عبدالحسین صابر تھاریانی، فضل احمد کریم فضلی، نظیر حسین قیصر، مبین الحق صدیقی، محمد طفیل، منور عباس، میرزا ابو جعفر کشفی، میر عترت حسین، میر علی احمد خاں تالپور، اور سید ہاشم رضا کا ذکر کیا ہے۔ روشن علی بھیم جی اور آغا حسن عابدی پر اس قلمی نسخے میں بھی لکھا ہے یعنی ان شخصیات پر دو الگ الگ مضامین دونوں نسخوں میں موجود ہیں۔ کل ۱۳۱ شخصیات کا تذکرہ موجود ہے۔

''میرے دور کی چند عجیب ہستیاں'' اس حوالے سے بُتان الدین خاں، عبدالرؤف خاں اور ظہور احمد خاں کا ذکر کیا گیا ہے۔

''میرا خاندان'' کے عنوان سے ماں، بڑے بھائی، چھوٹے بھائی، بہن، بیوی، بیٹی اور بیٹے پر جوش نے لکھا ہے۔

''یادوں کی برات کے منتشر اوراق'' کے عنوان سے حضرت آزاد انصاری مرحوم، رابندر ناتھ ٹیگور اور میرزا محمد ہادی رسوا کا ذکر کیا گیا ہے۔ جوش ملیح آبادی کے حالات زندگی (یعنی آباد و اجداد، پیدائش، ملازمین، بچپن، جوانی، ملازمت، سیاست میں شرکت، ہجرت) سے قطع نظر جوش نے ''یادوں کی برات'' میں تقریباً دو سو دس افراد کا تذکرہ کیا ہے جن میں سے اکثر کا تعارفی خاکہ کھینچا ہے پھر بھی بہت سے خاکے ایسے ہیں جو ایک مبسوط خاکے کے تقاضے پر پورے اترتے ہیں۔ ''یادوں کی برات'' میں جتنی دلچسپ داستانِ حیات۔ جوش ہے اتنے ہی دلچسپ جوش کے خاکے ہیں۔

خاکہ نگاری کے بنیادی لوازم میں سے ایک یہ بھی ہے کہ متعلقہ شخصیت کا حلیہ بیان کیا جائے۔ انہوں نے جس طرح مختلف اشخاص کا حلیہ بیان کیا ہے وہ اپنی مثال ہے۔ جوش کے سب خاکوں میں حُلیے بیان نہیں ہوئے ہیں لیکن وہ اشخاص کے خصائص کو اس طرح اُبھار کر پیش کرتے ہیں کہ قاری بھول جاتا ہے کہ وہ بے چہرہ شخصیت کو دیکھ رہا ہے۔ جہاں جہاں انہوں نے خد و خال اور چہرہ مہرہ بیان کیا ہے۔ الفاظ میں تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔

جوش نے حکیم صاحبِ عالم کی سیرت اور ان کا حُلیہ اس خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔

''لکھنؤ کے حاذق و ممتاز طبیب، عربی و فارسی کے منتہی، مذہبی قصائد کے عدیم النظیر شاعر، یتیموں اور بیواؤں کے سرپرست، مملکت شرافت کے تاجدار، اقلیم خلوص کے شہریار، اور کاروان زہد و اتقا کے سالار صاحب عالم۔ کیا بتاؤں کہ کس قدر خوش رو، خوش وضع، خوش طبع، خوش فکر، خوش اخلاق، خوش پوشاک، خوش گفتار، خوش تبسم، خوش اوقات، خوش مدارات، خوش میزبان اور خوش مطبخ تھے۔ (۱۹)

نہایت گورے رنگ، بڑی بڑی بھوری مونچھوں، کرنجی آنکھوں، اور سجل ناک نقشے کے اس قدر شگفتہ مزاج، اور مخلص انسان تھے کہ ان سے مل کر دل باغ باغ ہو جاتا تھا اور اُسی کے ساتھ ساتھ، وہ ایسے خوش فکر مرثیہ و غزل گو شاعر بھی تھے کہ اگر شدید قسم کی سَنک، ان کا راستہ نہ روک لیتی تو، اساتذۂ لکھنؤ میں وہ نہایت نمایاں مقام حاصل کر لیتے۔''

جوش نے جگر مراد آبادی کا حلیہ اس طرح بیان کیا ہے کہ گویا جگر کو ہماری آنکھوں کے سامنے لا بٹھایا ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

ان کا دہانہ بڑا تھا، داڑھی گھنی تھی، سر پر بڑے بڑے پٹے تھے، قد اوسط درجے کا تھا، آنکھوں سے دہانت و ثقاہت کے بجائے وحشت ٹپکتی تھی اور معاش کی خاطر، وہ بے چارے، پھیری والوں کی طرح، عینک فروشی کیا کرتے تھے۔" (۲۰)

جوش نے خاکے میں حلیہ بیان کرتے ہوئے کہیں کہیں نظم کا سہارا بھی لیا ہے اور اس کامیابی سے اپنے ممدوح کا خلیہ بیان کیا ہے کہ اُسے قاری کے سامنے جیتی جاگتی صورت میں پیش کر دیا ہے۔ ساغر نظامی کے بارے میں لکھا ہے کہ

اُن کا مکھڑا تھا، ہر رشکِ ماہِ تمام۔ یا مئے ناب کا چھلکتا جام

سر پہ، راتوں کے شامیانے تھے۔ انکھڑیوں میں شراب خانے تھے

لب تھے، پچھلے پہر کی شہنائی۔ لوچ میں، بھیرویں کی انگڑائی

جب صبا عارضوں کو دھوتی تھی۔ صبح سرما، طلوع ہوتی تھی

ان کے چہرے پر ایسی مقناطیسی جاذبیت تھی کہ۔ جس نے نظر اٹھائی، نظر، رخ پہ گڑ گئی

گویا، ہر اک نگاہ میں زنجیر پڑ گئی" (۲۱)

جوش ملیح آبادی غضب کے شخصیت شناس ہیں اور چند لفظوں یا چند فقروں میں ایسی مرقع کشی کرتے ہیں کہ جس شخص کا خاکہ کھینچتے ہیں اس کی ظاہری خوبیوں کے ساتھ ساتھ باطنی اوصاف و نقائص بھی سامنے لے آتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک ماہر نفسیات کا کردار بھی ادا کرتے ہیں اور ہر شخص کے ذوق اور خیال خاطر احباب کے لیے انہی کے لہجے کے مطابق گفتگو کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں وہ کسی کی شخصی کمزوریوں کو بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں کہیں کسی کی سخاوت کو، کہیں کسی کے بُخل کو کہیں کسی کی تنک مزاجی اور سنکی پن کا بیان ہے۔ کہیں کسی کی غم پسندی اور کہیں کسی کے پھکڑ پن کا بیان ہے۔ ابر ابر کی بات بات پر جھوٹی قسم کھانے کی عادت۔ ڈاکٹر کرنل اشرف کی فحش گفتاری، بارہ خواری اور پھکڑ پن کا بیان۔ فراق گورکھپوری کا اپنی شریک حیات سے برتاؤ، مولوی وحید الدین سلیم اور چھوٹے دادا کا بُخل، نہرو کی دلربا شخصیت کا فسوں غرض جوش نے داخل و خارج کا امتزاج پیش کر کے مختلف افراد کے خاکوں میں اس خوبصورتی سے رنگ آمیزی کی ہے کہ ہمیں یہ شخصیات اپنے معاشرے میں اپنی آنکھوں کے سامنے چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ڈاکٹر جعفر عسکری لکھتے ہیں:

"جوش کے شخصی خاکوں کے مطالعے سے یہ حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے کہ وہ ایک کامیاب ماہر نفسیات ہونے کے ساتھ ساتھ ایک زبردست مردم شناس بھی ہیں۔ کسی شخصیت کی ظاہری جبلتوں، خوبیوں اور خامیوں کا مشاہدہ تو عام خاکہ نگار بھی کر لیتا ہے لیکن جوش نے اپنے بیش تر خاکوں میں حفظ مراتب کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے پوشیدہ فضائل کو بھی کامیابی اور خوش اسلوبی سے پیش کر دیا ہے۔" (۲۲)

"یادوں کی برات" اور مختلف ادبی رسائل و کتب میں جوش کے جو خاکے ملتے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جوش کا عمیق مطالبہ انہیں لوگوں کے باطن میں پوشیدہ خواہشات کی جھلک دکھا دیتا ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ ٹیگور کی نمود و نمائش کی عادت ان کے دل میں کھٹکتی ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

بس ایک چیز تھی ان کی سیرت میں جو ہمیشہ میرے دل کو کھٹکا کرتی تھی اور وہ تھی ان کی نمود و نمائش کی عادت یوں تو وہ بے حد سادہ، بے حد بے تکلیف اور بے حد کھلنڈرے تھے، لیکن اس کے باوجود جب کبھی اُن کا سیکرٹری آ کر یہ اطلاع دیتا کہ فلاں اخبار کے نمائندے یا ملک کے کسی ڈپوٹیشن کی ملاقات کے وقت میں اب صرف پندرہ منٹ باقی رہ گئے ہیں تو وہ ایک دم چونکنا ہو کر کھڑے ہو جاتے۔ سیکرٹری کو حکم دیتے کہ فلاں فلاں لڑکیوں کو (ہمیشہ حسین ہوتی تھیں) مطلع کر دو کہ وہ جلد کپڑے پہن کر آ جائیں اور کمرے میں بُخور

جلا دیں۔ یہ حکم دے کر وہ غسل خانے میں داخل ہو جاتے، اور تھوڑی دیر میں وہاں سے آراستہ ہو کر، ایک بڑا سا چوغا پہنے بر آمد ہوتے، اور ایک اونچی جگہ بیٹھ کر، پاؤں پر ایک خوبصورت سی چادر ڈال کر لڑکیوں کو اپنے گرد و پیش کھڑے ہو جانے کا اشارہ کر دیا کرتے تھے۔"(۲۳)

اور اس تمام سوانگ بھرنے کا مدّعا فقط یہ ہوتا تھا کہ انٹرویو لینے والا مرعوب ہو جائے اور اس کو ایسا محسوس ہونے لگے گویا وہ کسی مافوق البشر انسان، یا کسی پُراسرار دیوتا کے مندر میں باریاب ہو گیا ہے۔"

جوش شخصیت کی جزئیات کو اس مکمل انداز سے بیان کرتے ہیں کہ ہر شے واضح ہو جاتی ہے۔ فرد اپنے مزاج و اطوار سمیت ہمارے روبرو آکھڑا ہوتا ہے۔

جوش نے شاہ دلگیر اکبر آبادی کا خاکہ اس خوبصورتی سے تحریر کیا ہے کہ قاری جب پڑھتا ہے محظوظ ہوتا ہے۔

"رسالہ نقاد کے مدیر، خاندانِ مشائخ کے چشم و چراغ، دراز قامت، دراز ریش، دراز دست، کوتاہ ہمت، بخل پسند، پُر کیسہ تہی دست، کثیر السّواد، قلیل الرّماد، بخوشی میہماں، بکراہت میزباں، عقاب پنجہ، کبوتر مزاج، خانقاہ کی محراب میں قطب الاقطاب، حسینوں کی جناب میں پارۂ سیماب۔ ماہ جبینوں کو دیکھ کر ان کے حواس بجا نہیں رہتے تھے۔ راہ، گلی میں ان کے ساتھ چلنا پھرنا بے حد خطرناک تھا اس لیے کہ جب کسی حسین چہرے پر ان کی نگاہ پڑ جاتی تھی، وہ اپنے ساتھی کی پسلیوں پر اس قدر زور سے کُہنی مارتے تھے کہ اس بے چارے کے منہ سے چیخ نکل جاتی تھی۔ اسی طرح جب وہ جھوم جھوم کر دیوانہ وار اپنا کلام سناتے تھے تو داد دینے والے کی ران پر اپنا پہاڑ سا ہاتھ اس قدر زور سے مارے تھے کہ وہ غریب اچھل جایا کرتا تھا۔"(۲۴)

جوش جب واقعات کے ذریعے کسی شخص کی تصویر بناتے ہیں یا اپنے مخصوص جذباتی انداز میں کسی شخص کا تجزیہ کرتے ہیں تو ان کی خاکہ نگاری کا کمال دکھائی دیتا ہے۔ مولانا عبدالکلام آزاد کی تصویر کشی اس طرح کی گئی ہے کہ ان کی شخصیت کا مختصر ترین لفظوں میں تجزیہ پیش کر دیا گیا ہے۔

"گورا رنگ، فرنچ داڑھی، بلند قامت، کشادہ پیشانی، درخشاں چشم، شاعر مزاج، عاشق طبع، شعر نباض، ادب نقاد، سیاست مولا، علم امام، دجلہ تقریر، ملزم تحریر، ارسطو چہرہ، سقراط لہجہ، آزادی کے طلبگار، چشمۂ برجستہ اشعار، جلوت میں شراب بیزار، خلوت میں شراب پرستار، قبل وزارت شیفتۂ انکسار، بعد وزارت مائل باستکبار، آغاز میں، تیقن مدار، انجام کار تشکک شعار، جوانی میں، وجود باری کے مجسم اقرار، بڑھاپے میں از سر تاپا، انکار"(۲۵)

ساحل بلگرامی کے بارے میں لکھتے ہیں:

جوش نے جہاں جہاں کسی شخص کا حلیہ بیان کیا ہے کمال کر دیا ہے لیکن ان کے سب خاکوں میں حُلیے بیان نہیں ہوئے ہیں بلکہ وہ ذات کے بیان میں صفات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ایک مکمل تصویر وجود میں آ جاتی ہے۔

"۔ اردو زبان کے مزاج دان و قوام، وضع اصطلاحات کے مصنف، غیر معمولی دراک و ذہین، بے حد بذلہ سنج، نیچریوں کے استاد، مبلغ الحاد، بڑے جاندار متشاعر، اور کنجوسی میں قارون کے قبلہ والا گرامی لیکن جسم اس قدر بھدّا اور صورت ایسی ناقابلِ برداشت کہ الامان و الحفیظ۔ ان کے چہرے کا رنگ اس قدر کٹھنا اور لبدھڑ تھا، گویا بہت پرانا، چکٹا ہوا کڑوا تیل جما ہوا ہے ان کے رخساروں پر ایسی بے آبرو کر دینے والی داڑھی لٹکی ہوئی تھی کہ جب نگاہ اس کی جانب اُٹھتی تھی تو ہزاروں گدھ دیکھنے والوں کے پپوٹوں پر آکر بیٹھ جاتے تھے اور بیٹ کرنے لگتے تھے اور ان کے وزن سے آنکھیں جھک جاتی تھیں۔"(۲۶)

ہمارے ہاں ابھی تک خاکے اور سوانحی و تعارفی مضامین میں زیادہ فرق نہیں برتا جاتا اور شخصیات کے حوالے سے لکھے جانے والے ہر قسم کے سوانحی، تعارفی اور تاثراتی مضامین خاکے کی ذیل میں شامل کیے جاتے ہیں۔ جوش اس بات سے آگاہ ہیں کہ سوانح نگاری اور خاکہ نگاری

میں فرق ہے۔ خاکہ نگار کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ سوانحی حالات کو تاریخی ترتیب سے بیان کرے۔ جوش کے خاکوں میں سوانحی عنصر برائے نام ہوتا ہے۔ جوش نے کسی فرد کے افکار و کردار کے حوالے سے اس کی شخصیت کی انفرادیت کو بحیثیت انسان نمایاں کیا ہے۔ وہ اپنے خاکوں کو کسی منطقی آغاز و انجام کا پابند نہیں رکھتے اور نہ یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ متعلقہ شخصیت سے ان کی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی نہ اس کی پیدائش اور وفات کا تذکرہ ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ فرد کی سیرت سے بحث کرتے ہیں، وہ صرف ایسے سوانحی حالات و واقعات کے بیان کی گنجائش رکھتے ہیں جن کا شخصیت کے افکار و کردار پر مثبت یا منفی اثر پڑا ہو، چند خاکوں کے خاتمے اس طرح ہیں۔

''مولانا پر بجلی سی گر گئی اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں... اور وہ اسلام علیکم کہہ کر فوراً چلے گئے''(۲۷)

(ڈاکٹر کرنل اشرف الحق)

حضرت نیاز فتح پوری پر لکھے گئے خاکے کا اختتام اس طرح کیا گیا ہے۔

''جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ ان کی ایک ذات کے احاطے میں اتنے خلاّقی کے شہر آباد ہیں، اتنے شعور کے لشکر پڑاوٗ ڈالے ہوئے ہیں اور رامش و رنگ کی اتنی بے شمار براتیں اُتری ہوئی ہیں تو بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ ان کو کلیجے سے لگالوں۔ کاش نیاز فتح پوری کا سا خالقِ طرزِ انشاء پرداز کسی زندہ قوم میں پیدا ہوتا لیکن کیا کیا جائے۔''ہائے وہ عقل جو نرغے میں ہو دیوانوں کے''(۲۸)

جوش ملیح آبادی نے ''یادوں کی برات'' میں جن اشخاص کے خاکے تحریر کیے، ان کی گفتگو انہی کے لب و لہجے اور انداز میں تحریر کی ہے یعنی انہوں نے نہ صرف اس علاقے کا اس طبقے کا لب و لہجہ بیان کیا ہے بلکہ وہاں کی ثقافتی اور تہذیبی فضا کو بھی موضوعِ سخن بنایا ہے، جن لوگوں کا خاکہ انہوں نے تحریر کیا ہے ان سے ان کی خلوت و جلوت کی ملاقاتیں رہی ہیں ان کی عظمتوں اور لغزشوں کے واقفِ حال رہے ہیں۔ اگر کسی رندِ شاہد باز کا تذکرہ کر رہے ہیں تو انہوں نے اس کو مینارۂ عظمت پر بٹھانے کی سعی نہیں کی بلکہ جو ہے اور جیسا ہے، کی بنیاد پر ہر کردار کو پیش کیا ہے۔ انہوں نے شخصیت کا نقش اس کے مخصوص اندازِ گفتگو اور مکالموں کی مدد سے ابھارا ہے اور اگر کردار اپنی گفتگو میں فحش اور عریاں لفظ استعمال کرتا ہے تو انہوں نے اسی لب و لہجے کو نقل کیا ہے اور بعض اوقات صرف ایک لفظ یا دو تین لفظوں سے کام چلایا ہے یا اشارۃً اپنا ماضیٔ الضمیر بیان کیا ہے۔ لیکن انہوں نے اپنی آپ بیتی میں اس بات پر تاسف کا اظہار کیا ہے کہ ان کی شرمیلی قوم اصل لفظوں کی تاب نہیں لاسکتی۔ مختلف شخصیتوں کا اندازِ گفتگو ان امثال سے واضح ہو سکتا ہے:

ابھی تو ان باتن کا بے وقوفی کہت ہو، جب ہم تم کا مکّے مدینے اڑائے کے لے بھیجے تب تم کا پتا چلیے گا۔ ابھی تو خوب مجے کرو۔ کھوب کوٹھن پر چڑھو، کھوب گنے کھاؤ''(۲۹)

(محبوب شاہ مجذوب)

ایک روز انہوں نے مجھ سے پوچھا: صاحب زادے، آپ کہاں رہتے ہیں؟ میں نے کہا لاٹوش روڈ کی گلی میں; انہوں نے لاٹوش روڈ سُن کر منہ پھیر لیا، کہنے لگے، 'میاں آپ کا سا شریں مقال اور رہے ان ثقیل حروف کے اندر جہاں خیر سے 'ٹ' بھی ہے، 'ڑ' بھی ہے اور 'ڈ' بھی۔ 'لا ٹھونش ڑوڈ' جب تک آپ ان حروفِ ثقیل کے اندر رہیں گے میں آپ کے پاس ہر گز ہر گز نہیں آؤں گا۔ لا ٹھونش ڑوڈ،! معاذ اللہ! 'لا ٹھونش ڑوڈ، توبہ، توبہ! استغفر اللہ!(۳۰)

(حکیم دانش لکھنوی)

مہاراجہ کا سامنا ہوتے ہی انہوں نے اسلام علیکم کا پتھر کھینچ مارا۔ تمام دربار میں حیرت کی لہر دوڑ گئی اور میں نے دل ہی دل میں کہا''وہ مارا''

..."اور جب آزاد صاحب نے پھر یہی جواب دیا کہ چھوٹے دادا اپنے دیوان کا مقدمہ لکھ رہا ہوں تو انہوں نے ایسا خارا شگاف قہقہہ لگایا کہ آزاد اُچھل پڑے، اور کہا آزاد صاحب، اللہ اللہ یہ مقدمہ ہے کہ بالے میاں کی چَھڑ۔ ہم تو سینکڑوں مقدمہ بازیاں دیکھ چکے ہیں، مگر آپ کی مقدمہ بازی اس قدر طویل القامت ہے کہ قطب مینار اس کے سامنے چِرگٹے کالونڈا معلوم ہو رہا ہے۔ ارے یہ پاتابہ سقر لاتی، اور قنتورہَ زر بَفتی والا، لمبا چوڑا، جَھبَڑ جھاڑ، جھاڑ جھنکار، شتر خوار مقدمہ، مقدمے ہے یا صدر پور کے بنی شیر خاں کے تاڑوں کا سُرو، رو، رو، سُرو، رو، سرو، روٗ، قاہ، قاہ، قاہ، قاہ، آزاد کے ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا اور لوٹنے لگے۔"(۳۱)

اچھے خاکے کی یہ خوبی بتائی گئی ہے کہ اس میں شخصیت کے روشن پہلوؤں کے ساتھ ساتھ تاریک پہلو کی عکاسی بھی کی گئی ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو پیش کی گئی تصویر یک رخی قرار پائے گی۔ ناقدین نے جوش پر یہ الزام لگایا ہے ان کے خاکے یک رخی ہوتے ہیں۔ جوش خود کو خوبیوں کا مرقع اور دوسروں کو برائیوں کا مجموعہ قرار دیتے ہیں اور جوش نے جن لوگوں کا خاکہ کھینچا ہے ان کی خامیوں کو زیادہ اچھالا ہے۔ حالانکہ جوش نے اپنے دوستوں کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کو بیان کیا ہے اور شخصیت کے غالب پہلو کی عکاسی کی ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے خود کو ڈرائی کلین کروانے کی کوشش نہیں کی ہے اور ویسے بھی یہ خاکہ نگار کا کام نہیں ہے کہ وہ دوسروں کی خوبیوں کو خامیوں اور خامیوں کو خوبیوں میں تبدیل کرتا پھرے۔ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

..."کسی شخصیت کو مسخ کرنا یا اُسے اس طرح پیش کرنا کہ اس کی برائیاں ہی زیادہ سامنے آئیں یا اس کے برعکس انسان کو فرشتے کی شکل میں پیش کرنا۔ خاکہ نگاری کی شریعت میں کسی بھی طرح جائز نہیں۔ بعض خاکہ نگار یہ بھی کرتے ہیں کہ خاکے میں اپنی شخصیت کو نمایاں کرتے ہیں۔ یہ بھی خاکہ نگاری کا ایک بڑا عیب ہے۔ اردو کے بیشتر خاکوں کا یہی حال ہے۔ منٹو نے اپنے لکھے ہوئے خاکوں کے متعلق جو کچھ اظہار خیال کیا ہے اُسے خاکہ نگاری کا معیار قرار دیا جاسکتا ہے :

میں ایسی دنیا پر، ایسے مہذب ملک پر ایسے مہذب سماج پر ہزار لعنت بھیجتا ہوں جہاں پر یہ اصول مروج ہو کہ مرنے کے بعد ہر شخص کا کردار اور تشخص لانڈری میں بھیج دیا جائے، جہاں سے وہ دُھل دُھلا کر آئے اور رحمۃ اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکا دیا جائے۔ میرے اصلاح خانے میں کوئی شانہ نہیں، کوئی شیمپو نہیں، کوئی گھنگھر پیدا کرنے والی مشین نہیں، میں بناؤ سنگھار کرنا نہیں جانتا۔ آغا حشر کی بھینگی آنکھ مجھ سے سیدھی نہیں ہو سکی... میرا جی کی ضلالت پر مجھ سے استری نہیں ہو سکی۔"(۳۲)

جوش ملیح آبادی نے اشخاص کو جلوت و خلوت میں جیسا پایا ویسا ہی تحریر کیا۔ انہوں نے اختصار سے کام لیتے ہوئے کم سے کم الفاظ میں شخصیت کے نمایاں اوصاف و خد و خال کو قاری کے سامنے اس طرح پیش کیا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس کے بارے میں پڑھ نہیں رہا ہے بلکہ اس کو اپنی آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا دیکھ رہا ہے۔ انہوں نے ایک خاص ترتیب اور سلیقے سے اس کی زندگی کے لامحدود واقعات میں سے چند کا انتخاب کیا ہے جن کے آئینے میں پوری شخصیت کا عکس نمایاں کر دیا اور غیر ضروری واقعات اور تفصیلات سے خاکے کے تاثر کو مجروح ہونے سے بچایا ہے۔ جوش نے شخصیت زیر بحث کی انفرادی تصویر نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ اخلاقیات اور مذہبی و سماجی رویوں کے بارے میں اس کے نمایاں رجحان کو بھی مد نظر رکھتے ہوئے خاکہ نگاری کی ہے۔ انہوں نے شخصیت کے باطن کی گہرائیوں میں اتر کر ایک کامیاب نفسیات دان کی طرح اس کی زندگی کے اہم پہلوؤں کو بیان کیا ہے۔ اگر ایک شخص معاشرے میں نیک نام ہے نماز بھی پڑھتا ہے اور دنیا دکھاوے کو نیکی کا پرچار بھی کرتا ہے لیکن شراب خوری بھی کرتا ہے جوش نے اس کی اس عادتِ بد پر روشنی بھی ڈالی ہے کہ وہ ریاکار ہے دنیا میں اس کی علمیت اور ادبیت کی دھاک ہے۔ لیکن وہ نہ صرف دخترِ رز کا شیدائی ہے بلکہ مذہب سے بھی کوئی خاص رغبت نہیں رکھتا لیکن جوش نے کسی فرد کی کمزوریوں اور خامیوں کا ذکر اتنی ہنر مندی اور فنکاری سے کیا ہے کہ شخصیت کی تعمیراتی اٹھان میں تحقیر و تذلیل کی بجائے دلآویزی کا عنصر شامل ہو جاتا ہے جو صاحبِ خاکہ کی اصل فطرت سے مطابقت رکھتا ہے۔

جوش نہ صرف کمال درجے کے شاعرانہ ذوق سے متمیّز تھے بلکہ عمدہ ادیبانہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انہوں نے محض وضعداری اور مروت کے باعث خوبیوں کے اظہار کو کافی نہیں سمجھا بلکہ فرد کی خامیوں کو بھی فنکارانہ مہارت سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے شاعروں اور ادیبوں پر لکھتے ہوئے ان کے فنی مقام و مرتبے کو متعین کرنے کی بجائے اس کے اندر چھپے ہوئے انسان کو تلاشنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے اگر تنقید کی ہے تو مثبت تنقید کی ہے۔ جوش نے نہ صرف ان لوگوں کو اپنے خاکوں کا موضوع بنایا ہے جنھوں نے ان سے قلبی تعلق کی استواری میں اہم کردار ادا کیا بلکہ انہوں نے تو ان کو بھی اچھے لفظوں میں یاد کیا ہے جنھوں نے اُن سے دشمنی کی اور ان کے خلاف اخبارات میں لکھتے رہے۔

ماہر القادری، محمد طفیل، حفیظ، شاہد احمد دہلوی، شمس زبیری (جنھوں نے ساقی جوش نمبر کی ترتیب میں شاہد احمد دہلوی کا ہاتھ بٹایا تھا) ساغر صدیقی، عبدالماجد دریا آبادی، جوش نے سب کی علمیت و ادبیت کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

جوش ملیح آبادی پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ان کے خاکوں میں موضوع شخصیت کی بجائے خود جوش کی شخصیت دکھائی دیتی ہے اور یہ بات خاکے کی فنی کمزوری پر دلیل ہے کیونکہ خاکہ نگار کو اپنی شخصیت کی نمائش کی بجائے موضوع شخصیت کو ابھارنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جوش جن واقعات کے خود شاہد رہے ہیں اُن کے بیان میں ان کی اپنی شخصیت بھی ہر واقعہ میں موجود رہی ہے۔ نیز یہ واضح رہے کہ جو تحریریں جوش کسی شخصیت پر آپ بیتی کے طبع ہونے سے قبل سامنے لائے تھے وہ اپنی جگہ مربوط اور مکمل تھیں کیونکہ وہاں انہوں نے ان پر مفصل مضامین قلمبند کیے ہیں۔ نیز جوش نے خاکہ نگاری کا سلسلہ ۱۹۴۰ء سے قبل ہی شروع کر رکھا تھا۔ رشید حسن خان لکھتے ہیں۔

> ''یادوں کی برات'' میں ابرار حسن خان، چھوٹے دادا قاضی خورشید احمد، بیگم جوش، سید محمد عسکری، شنکر پرشاد، آئی، سی، ایس، جگر مراد آبادی، مجاز کی شخصیت کے بیشتر پہلو سامنے آئے ہیں۔ ان کے خاکے اس معیار پر پورے اترتے ہیں جو کہ اردو ادب میں معیاری خاکہ نگاری کے لیے مخصوص ہے۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ بہت سے خاکوں میں جوش نے شخصیت کے ایک دو پہلو پر روشنی ڈالی ہے مثلاً ڈاکٹر ایس اے سکسینہ کی بزدلی اور کاہلی، مانی جائسی کی عاشق مزاجی اور بے مروتی، فانی کی غم پسندی اور نظام الدین حسن کی اصول پرستی کو جوش نے نمایاں کیا ہے لیکن ان کی دوسری خصوصیات سے صرفِ نظر کیا ہے۔ (۳۳)

تو عرض ہے کہ جوش نے ''یادوں کی برات'' میں جو خاکہ پیش کیے ہیں وہ خاکوں کی کتاب مرتب کرنے کی غرض سے نہیں دیئے بلکہ اپنی وارداتِ حیات کو مرتب کرتے ہوئے انہوں نے بعض احباب اور اشخاص کا تذکرہ بھی کیا ہے کیونکہ وہ ''یادوں کی برات'' لکھ رہے تھے۔ خاکہ نگاری یا مرقع نگاری ان کے پیش نظر نہیں تھی اس لیے ہر واقعے اور واردات میں جوش کا حوالہ موجود ہے اور اسی لیے انہوں نے صیغہ واحد متکلّم ''میں'' کا استعمال بہت زیادہ استعمال کیا ہے۔ انہوں نے تعارف یا حلیہ بیان کرتے ہوئے آغاز میں مختصراً یا چند لفظوں میں کسی فرد کی جو صفات بیان کی ہیں وہ اس کی شخصیت کا بھرپور تعارف کراتی ہیں۔ اکثر خاکوں کی ابتداء اسی قسم کے الفاظ، جملوں اور تراکیب سے کی ہے جن میں وہ ان شخصیات کا مکمل تعارف کراتے ہیں جب ان کے بقول انہوں نے خود کشائی کی ہے تو جگ کشائی میں کیا حرج ہے۔ انہوں نے اختصار کے باوجود مولوی وحید الدین کی جو مکمل تصویر پیش کی ہے وہ فرحت اللہ بیگ نہ پیش کر سکے۔ مولانا عبداللہ عمادی کا تعارف دیکھئے ایک نامکمل اسکیچ کی جگہ ایک بھرپور تصویر ہمارے سامنے لے آتا ہے۔

> ''قد بوٹا سا، دماغ باون گز کا، چہرہ کتابی، داڑھی گھنی، عربی و فارسی کے ہفت قلزم، دارالترجمہ، عثمانیہ یونیورسٹی کے ناظرِ امور مذہبی، فحش پسند، غیر متقی، بردباری کے ساتھ ظریف، منہ پر لوگوں کی تعریف کرنے میں بلند آہنگ، ان کے پیٹھ پیچھے ان کے جہل کے اعلان کرنے میں بیباک مزاح کے مواقع پر بے ساختہ قہقہے مارنے پر مجبور، عقل'' معاش سے بہرہ مند، نظامِ دکن کے تصور سے بھی لرزاں و ترساں اور عمل پر اکسانے والے شاعر (۳۴)

جوش کے آباؤ اجداد آفریدی پٹھان تھے۔ اسی حوالے سے جوش پختون رسم ورواج سے آشنا تھے۔ جوش نے ٹھیٹ پشتون خواہ ہونے کا ثبوت جگہ جگہ پیش کیا ہے۔ ان کے پردادا، دادا اور والد پشتونوں کی غیرت وانانیت کے علمبردار تھے۔ ان کے پردادا کچے گھر میں رہنا پسند کرتے تھے اور طوائف کے کوٹھے سے کُبڑے ہو کر گزرتے تھے۔ ابرار، مختار اور جوش کے چچا محمد اسحاق خان پٹھانوں کے اس قبیلے کی نمائندگی کرتے تھے جو اکھڑ تھا۔ پختون روایت کا نمائندہ کردار چھدّو خان ہے۔ جو پٹھانوں کی روایتی مہمان نوازی، غیرت مندی، بہادری اور انسان دوستی کا منہ بولتا کردار ہے۔ قبائلی رسوم کی پابندی نے چھدّو خان کے خاکے میں جان پیدا کر دی ہے۔

جوش کی والدہ، دادی، مامائیں اور اصیلیں لکھنوی تہذیب کی نمائندہ کردار ہیں۔ ماتم پرستی، عزاداری، ضریح نکالنا، محرم میں مجلسیں پڑھنا، رجب کے کونڈوں کی نیاز، تبرّا پڑھنا، نوحہ خوانی، رندوں کی مستی و دل لگی کی باتیں، کبوتر بازی، بٹیر بازی، میلے ٹھیلے تہواروں کا بیان اور لکھنوی تہذیب کا رکھ رکھاؤ وضع داری نے جوش کے کرداروں میں زندگی کے ان گنت رنگ بھر دیئے ہیں۔ فانی کی غم پرستی، نظام حیدر آباد کی وضع داری، جوش کی عاشقانہ طبیعت، کھانوں کی افراط اور ان کی اقسام، بزرگوں کی شائستگی اور دل گداختگی کو جوش نے لکھنوی تہذیب کا رچاؤ قرار دیا ہے۔ اور اپنی زباندانی کو اہل لکھنؤ کی محبت کا اثر اور اپنے بزرگوں کی جوتیوں کا صدقہ قرار دیا ہے۔ لکھنؤ کی روایت کے مطابق صاحب عالم سے محبت جوش نے اپنے گھر کی خواتین سے سیکھی لکھنؤ کی تہذیبی زندگی میں عیش پرستی کا ایک سمبل طوائفیت ہے۔ طوائف جہاں منچلوں اور رندوں کے دل کا قرار ہے وہاں ادب آداب اور تہذیب پرستی کا ایک ادارہ ہے۔ جوش نے مہدی جان عرف ''گیا'' کا کردار پیش کیا ہے یہ جوش کے بھائی رئیس احمد کی محبوبہ ''ببّن جان'' کی والدہ ہے۔

جوش نے اپنی کتاب ''یادوں کی برات'' میں کچھ لوگوں کو مختلف صفائی نام دیئے ہیں۔ وصل بلگرامی کو فرشتہ صورت موٹی عورت کو مرمرے کے تھیلے کی سی بوڑھی میم صاحب اور تھیلا جان کہا سروجنی نائیڈو کو میدان جنگ میں جھانسی کی رانی، ایوان میں امن کی قرۃ العین ثانی، محبت کی شہنائی، تقریر میں نغمۂ آب حیوان کہا۔ جواہر لال نہرو کو تاج محل اور شرافت کا آفتاب کہا۔ علامہ حیرت کو حضرت مسیح کے حواری کہا، دیوان سنگھ مفتون کو شیر دل۔ سلطان شکار، کنور مہندر سنگھ بیدی کو دشمن نواز، قاضی خورشید احمد کو آداب شکن کہا، ابرار حسن خاں عاشق مزاج کہا۔ مختار احمد خاں کو صوفی منش، مولانا سہا، مولانا تاڑ، شاہ دیگر اکبر آبادی کو خانقاہ کی محراب میں قطب الاقطاب اور حسینوں کی جناب میں پارۂ سیماب، حکیم آزاد انصاری، سہیل ممتنع میں وحدہ لاشریک، آغا شاعر۔ قزلباش رندِ خرابات اور آخر میں مبتلائے صوم و صلوۃ کہا۔ سروجنی نائڈو کو ہی آزادی کی شیدائی اور بلبل ہندوستان کہا۔ سردار مہربان سنگھ دھوپیا کو (His Heavy man) آں جناب فربہی مآب کہا بسمل ٹونکی کو لشکر ناتوانی کے علمدار کہا۔ کرشن چندر کو ہندوستان کے افسانہ نگاروں کے بادشاہ، محبت و اخلاص کے اوتار، قلم کے دھنی کہا۔ جمیل نشتر کو صورۃ جمیل، سیرۃ جبرئیل کہا۔ ڈاکٹر صفدر، آہ سیتاپوری کو جسم کے اعتبار سے بستر حیات کی شکن، آبگینہ اور کوہ ہمالیہ پہاڑ کہا۔

جوش ملیح آبادی نے اپنی سوانح عمری ''یادوں کی برات'' میں شخصیات کا جو تنوع پیش کیا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ انہوں نے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد، ان کی گفتگو، معاشرت، ثقافت اور ظاہری ہیئت کو اپنے مخصوص رواں اور شگفتہ انداز میں بیان کیا۔ جوش نے ان خاکوں میں ایک مستی اور سرشاری کی کیفیت بھر دی ہے لیکن جہاں کہیں کسی کو غم و اندوہ کی بھٹی کا ایندھن بنے دیکھا ہے۔ جوش کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئی ہیں۔ فانی کی زندگی کے غم، دوستوں کی معاشی کمزوریاں، یاروں کا آسمان سے زمین پر آجانا، ہندوستان سے پاکستان کی طرف ہجرت کی وجہ سے یاروں سے جدائی، غرض اک دکھ ہے جو جوش کی درد مند طبیعت کو کرب آشنائی دے جاتا ہے۔ علاوہ ازیں جوش کے تحریر کردہ سارے خاکے دلچسپی اور زبان و بیان کی شیرینی سے مملو ہیں۔ جوش نے مزاح تو کیا ہے لیکن طنز و تمسخر کی بجائے ناصحانہ انداز اختیار کیا ہے جبکہ جوش پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے خاکوں میں طنز و تعریض سے کام لیا ہے۔ جوش نے اپنے خاکوں میں زبان و

بیان کی خوبیاں سمو دی ہیں۔ انہوں نے زیر بحث شخصیت کے لحاظ سے خاکے میں مزاح کا رنگ بھرا ہے۔ جوش کو زبان اور ڈکشن کا ماہر کہا گیا ہے۔ کئی لوگوں نے تو طنزاً انہیں ''ڈکشنری کا شاعر'' کہا ہے لیکن شوکت الفاظ، گھن گرج اور طمطراق کی وجہ سے ''یادوں کی برات'' کو افسانوں کا مجموعہ کہا گیا ہے۔ ڈاکٹر یحییٰ احمد نے ''یادوں کی برات'' کو لفظوں کی برسات کہا ہے کہ جوش نے لفظ سازی کے ذریعے خاکے میں رنگ بھرا ہے۔(۳۵)

مترادفات کی فراوانی، قافیہ بندی، نئی نئی تراکیب وضع کرنا اور صنعت مراعاۃ النظیر، تشبیہ اور محاورات کے استعمال کے ساتھ ساتھ بر محل اردو و فارسی اشعار کے استعمال نے ''یادوں کی برات'' کے خاکوں کو ایک نیا روپ دیا ہے۔ مولانا سُہا بھوپالی، علامہ حیرت الہٰ آبادی ''سید جالب دہلوی'' کے خاکے الفاظ و اصوات کی مترنم لہروں میں قاری کو بہائے جاتے ہیں اور وہ بے ساختہ وبلاتردّد جوش کو ایک بہترین خاکہ نگار کہہ اُٹھتا ہے۔ ڈاکٹر نیر مسعود لکھتے ہیں:

> ''دراصل جوش نے جن شخصیتوں کے خاکے لکھے ہیں وہ جوش کی اپنی زندگی کا جُز اور ان کی روشن اور مدہم یادوں کا حصہ ہیں۔ یادوں کے اس نگار خانے میں جو تصویر اپنے نقوش کے ساتھ سجی ہوئی تھی جوش نے اسے انہیں نقوش کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے اور خود جوش کی شخصیت ان تمام خاکوں میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ اسی شخصیت کے احوال سے جھلملاتے ہوئے چہروں کا ایک جلوس ہمارے سامنے سے گزرتا ہے۔ اگر یہ جلوس نہ ہوتا تو جوش کی خود نوشت کا نام ''یادیں'' کافی تھا، لیکن چہروں کے اس جلوس نے جوش کی خود نوشت کو ''یادوں کی برات'' بنادیا ہے۔(۳۶)

ڈاکٹر ارتضیٰ کریم ''جوش کی خاکہ نگاری'' میں لکھتے ہیں۔

> ''سچ یہی ہے کہ یہ خاکے خواہ کتنے ہی نامکمل کیوں نہ ہوں لیکن ان کو جس شگفتہ انداز میں تحریر کیا گیا ہے وہی بڑا وصف ہے۔ اسی لیے ہم جوش کے ان خاکوں کو ''نیم خاکے'' کا عنوان بلا تکلف دے سکتے ہیں اور یہی جوش کی کامیابی ہے۔''(۳۷)

ڈاکٹر جمال نقوی ''خاکوں کی برات'' میں لکھتے ہیں۔

> ''جوش نے خاکہ نگاری کو ایک فن کی حیثیت سے خصوصی طور پر تحریر نہیں کیا بلکہ یہ خاکے تو ان کی نجی زندگی کی تکمیل میں شامل ان شخصیات کی زندگی کا صرف وہ رُخ پیش کرتے ہیں جس کا تعلق جوش کی سوانح حیات سے ہے۔ اس بنیاد پر ایسے خاکے نامکمل کہے جاسکتے ہیں۔ کاش! کہ وہ اس طرف بھی توجہ دیتے اور ان خاکوں کو مکمل کر دیتے تو یہ ادبی دنیا میں خاکہ نگاری کی بہترین مثال بن سکتے تھے۔''(۳۸)

جوش ملیح آبادی نے اپنے خاکوں میں ہمیں ان اشخاص سے ملایا ہے جن کی شخصیت سب سے چھپ چھپا کے، تصنع اور بناوٹ کے پردوں کے اندر کہیں دُبکی اور چھپی بیٹھی تھی لیکن جوش اپنے لفظوں کے اسم سے ان کے طلسم کو توڑ کر انہیں دنیا کے سامنے جیتی جاگتی صورت میں لے آئے ہیں اور ان کے چہروں پر چڑھائے ہوئے مکھوٹوں کے عقب سے سیدھے سچّے اور کھرے روپ کو سب کو دکھلایا ہے۔ اس حوالے سے کہیں کہیں ان کے قلم نے ہمیں انتہائی نجی محفل کا نقشہ بھی دکھلایا ہے جہاں دوست بغیر کسی خوف کے ایک دوسرے سے کھل کر گفتگو کرتے ہیں بعض اوقات یہ فحش ہوتی ہے۔ اس میں مغلّظات بھی ہوتی ہیں اور ناقابل بیان واقعات بھی مثلاً ڈاکٹر کرنل اشرف، حکیم صاحب عالم اور سُہا بھوپالی کے کرداروں کی آپس کی بات چیت اچھے اچھوں کو پسینہ پسینہ کر دیتی ہے۔

ہر دور کے اپنے تقاضے اور روایات ہوتی ہیں، جس دور میں یہ خاکے منظر عام پر آئے ہمارے سامنے منٹو کی مثال تھی جن کو ان کی حقیقت نگاری اور حقائق کی بے دھڑک عکاسی کی بنا پر مقدمات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ سچائی کی کڑوی گولی نگلنا لوگوں کے لیے آسان نہ تھا لیکن جوش نے بغیر کسی تصنع اور ریاکاری کے مختلف لوگوں کی سچی تصویر قاری کو دکھائی اور معتوب قرار پائے۔ آج وقت کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ میڈیا کی

آزادی نے قارئین کے اندازِ فکر و نظر میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ اب نجی محفلوں میں ہونے والی گفتگو جب لکھی جاتی ہے تو فحاشی کا الزام نہیں لگتا بلکہ حقیقت نگاری کے زمرے میں اُس گفتگو کو شامل کیا جاتا ہے۔

جوش نے جو خاکے تحریر کیے ہیں اس میں انہوں نے اپنے آئیڈیل کی روشنی میں کرداروں کو کندن بنا کر پیش کیا ہے اور مختلف کرداروں کو اپنے نظریے کے مطابق تخیلی روپ سے سروپ تک پہنچایا ہے۔ ان کے تیار کیے خاکے میں بے باکی اور حقائق نویسی کا امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ واقعاتی سچائیاں اور آدرشی نظریے جب کسی دور کے ادب میں شامل ہو جاتے ہیں تو وہ ادب شاہکار ادب بن جاتا ہے۔ جوش کے خاکوں میں جو واقعاتی حقائق ہیں ان کی تفہیم جوش کو ایک دیانتدار خاکہ نگار ثابت کرتی ہے۔ انہوں نے اچھائی یا بڑائی حقائق اور سچائی کے ساتھ پیش کی ہے اور غیر جانبداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے خاکہ تحریر کیا ہے۔

اسلوب خاکہ لکھنے والے کی افتادِ طبع سے عبارت ہوتا ہے اور اس کی تحریر کی پہچان بن جاتا ہے۔ چونکہ اردو کا سب سے پسندیدہ خاکہ "نذیر احمد کی کہانی" شگفتہ اسلوب میں تحریر کیا گیا ہے اس لیے یہ سمجھا گیا کہ خاکے کو شگفتہ اسلوب میں لکھنا ضروری ہے۔ ڈاکٹر بشیر سیفی لکھتے ہیں:

> "یہ کہنا کہ خاکہ میں مزاح کا ہونا لازمی ہے نہ صرف فن خاکہ نگاری کی مبادیات سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے بلکہ مصنف پر ایک غیر ضروری قدغن لگانے کے مترادف بھی ہے۔ خاکہ مزاحیہ مضمون نہیں جس میں مزاح کا ہونا ضروری ہو خاکہ تو ایسی صنف ادب ہے جس کا مقصد شخصیات کا مطالعہ پیش کرنا ہے تاہم اگر لکھنے والا شگفتہ اسلوب کا مالک ہو یا زیر بحث شخصیت کی طبیعت میں ظرافت کا عنصر موجود ہو تو کسی حد تک خاکہ میں مزاح کا رنگ پیدا ہو سکتا ہے مگر طنز و تمسخر کی پھر بھی گنجائش نہیں نکلتی کہ خاکہ کا مقصد مضحکہ اڑانا بھی نہیں۔ لہٰذا مزاح کو خاکہ کے لیے ضروری قرار دینا کسی طور بھی مستحسن نہیں۔" (۳۹)

جوش کا اپنا ایک اسلوب ہے اس میں ان کی دردمندی، خلوص، انسان دوستی، سچائی، حقیقت نگاری اور سچائی کا عنصر بھی شامل ہے۔ انہوں نے ممدوح کی پوری شخصیت نہ سہی علمی، ادبی، سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی کی تصویر کھینچی ہے۔ جس شخصیت کا انہوں نے اپنے موضوع کی شخصیت پیش کی ہے۔ بعض باتیں کھلے ڈُلے انداز میں اور بعض ڈھکے چھپے انداز میں پیش کی ہیں لیکن دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے یہاں تک کہ خود کا مضحکہ بھی اڑایا ہے۔

۱۹۷۶ء میں عبدالسلام خورشید کی کتاب "وے صورتیں الٰہی" طبع ہوئی اسی سال مقصود زاہدی کی "یادوں کے سائے" اور مقبول جہانگیر کی "یارانِ نجد" شائع ہوئیں۔

۱۹۷۸ء میں فارغ بخاری کی کتاب "البم" طبع ہوئی۔ ۱۹۷۹ء میں رحیم گل نے شخصی مضامین کا مجموعہ "پورٹریٹ" کے نام سے پیش کیا اس کے علاوہ ۷۹ میں رام لال نابھوری کی "تبسم" اور نظیر صدیقی کی "جان پہچان" شائع ہوئیں۔

۱۹۸۰ء کی دہائی میں شائع ہونے والے خاکوں کی تفصیل یوں ہے۔ احرار نقوی کے خاکوں پر مشتمل کتاب "راہِ سراب کے تنہا مسافر" شائع ہوئی۔ محمد طفیل کی کتاب "محبتی" ۱۹۸۱ء میں مرزا ادیب کی کتاب "ناخن کا قرض" ۱۹۸۱ء میں اور ۱۹۸۲ء میں عطاالحق قاسمی کی کتاب "عطایئے" شائع ہوئی۔ اسی سال جگن ناتھ آزاد کی کتاب "آنکھیں ترستیاں ہیں" شائع ہوئی۔ ۱۹۸۳ء میں صادق الخیری کی کتاب "نایاب ہیں ہم" اور محمد ایوب قادری کی "کاروانِ رفتہ شائع ہوئیں۔ ۱۹۸۴ء میں اے حمید کی "سنگ دوست" اور نصر اللہ خان کی "کیا قافلہ سو جاتا ہے" شائع ہوئیں۔ "سنگِ دوست" میں خاکے افسانوی اسلوب میں لکھے گئے ہیں "کیا قافلہ سو جاتا ہے؟" میں ۵۲ شخصیات پر مضامین تاثراتی اور تعارفی ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں شاہد احمد دہلوی کی "بزم خوش نفساں" اور لطیف کاشمیری کی "جمال ہمنشیں" ادارہ علم و دانش نے شائع کی۔ ۱۹۸۶ء میں سید

ضمیر جعفری کی ''کتابی چہرے'' ممتاز مفتی کی ''اوکھے لوگ'' اور فارغ بخاری کی دوسرا البم شائع ہوئیں۔ ۱۹۸۸ء میں حمید اختر کی ''احوال دوستاں'' اور انتظار حسین کی ''ملاقاتیں'' شائع ہوئیں۔ ۹۰ کی دہائی میں خاکہ نگاری میں مندرجہ ذیل پیش رفت ہوئی۔ ۱۹۹۱ء میں زبیری رفیع الزمان کی ''میرے بچپن کی دنیا'' ۱۹۹۲ء میں اشفاق احمد ورک کی ''قلمی دشمنی'' لاہور سے طبع ہوئیں۔ ممتاز احمد خان کی ''گلہائے رنگا رنگ'' ۱۹۹۴ء میں چھپی۔ سحاب قزلباش کی میرا کوئی ماضی نہیں، ۱۹۹۵ء میں طبع ہوئی۔ ''احمد بشیر'' کی خاکہ نگاری کے حوالے سے کتاب ''جو ملے تھے راستے میں'' ۱۹۹۶ء میں طبع ہوئی۔ انور ظہیر خان کی ''مت سہل ہمیں جانو'' ۱۹۹۶ء میں طبع ہوئی۔ وحید قریشی کی کتاب ''میری محبتیں'' ۱۹۹۸ء میں طبع ہوئی۔ ۱۹۹۹ء میں ''اکبر حمیدی کی ''چھوٹی دنیا بڑے لوگ'' اعتبار ساجد کی ''میرے اجنبی میرے آشنا'' اور حمیدہ سالم کی ''ہم ساتھ تھے'' طبع ہوئیں۔ ۲۰۰۱ء میں امراؤ طارق کی ''تاروں پر لکھے نام'' اور ڈاکٹر اسلم فرخی کی کتاب ''آنگن میں ستارے'' اور شاہد حنائی کی ''چہرہ نما'' طبع ہوئیں۔ ۲۰۰۲ء میں اشفاق احمد ورک کی خاکہ نگری جمیل نظری کی رفتارِ حیات طبع ہوئیں۔

۲۰۰۳ء میں شان الحق فاروقی کی ''بیدار دل لوگ'' ۲۰۰۴ء میں اسلوب احمد انصاری کی ''آئینہ خانے'' طبع ہوئیں۔ نجمہ سہیل کی کتاب ''لفظ آئینہ بنے'' اور پروفیسر ہارون الرشید تبسم کی کتاب ''میرے عہد ساز لوگ'' ۲۰۰۴ء میں طبع ہوئیں۔ ۲۰۰۵ء میں ڈاکٹر اشفاق ورک کی ''خود ستائیاں'' انور سدید کی ''ادیبانِ رفتہ''، اوصاف علی واحدی کی ''ناقابل فراموش شخصیات'' اور حزیں کاشمیری کی کتاب ''کہاں گئے وہ لوگ'' طبع ہوئیں۔ ۲۰۰۷ء میں نجمہ سہیل کی کتاب ''اور جانے پہچانے لوگ'' طبع ہوئی۔ ۲۰۰۹ء میں اشفاق ورک کی کتاب ''خاکہ مستی، ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی کی ''بے نشانوں کا نشان'' اور ۲۰۱۲ء میں مظہر محمود شیرانی کی ''کہاں سے لاؤں انہیں'' اور ڈاکٹر علی محمد کی ''اب انہیں ڈھونڈ'' شائع ہوئیں۔

چند خاکوں کے علاوہ جوش کے اکثر خاکے ''یادوں کی برات'' کے لیے لکھے گئے ہیں۔ اس بات سے قطع نظر کے جوش کے خاکے اعلیٰ درجے کے ہیں یا بُرے ہیں جوش کے ذکر کے بغیر خاکہ نگاری کی تاریخ مرتب نہیں کی جاسکتی۔ جوش قیامِ پاکستان سے قبل لکھ رہے تھے۔ ہم عصروں کے ساتھ ساتھ بعد میں آنے والوں نے ان کے خاکوں کو سراہا بھی اور خامیاں بھی نکالیں لیکن ان کی مساعی سے انکار نہیں کیا۔ آج ہم جوش کو عصمت چغتائی، منٹو، عظیم بیگ چغتائی، اخلاق احمد دہلوی، محمد طفیل، شاہد احمد دہلوی اور اشرف صبوحی کی صف میں دیکھتے ہیں اور اشفاق احمد، بانو قدسیہ، احمد بشیر، ممتاز مفتی، عکسی مفتی، فارغ بخاری، سحاب قزلباش، ضمیر جعفری، عطاالحق قاسمی اسی روایت کے نمائندے ہیں جو جوش سے شروع ہوئی تھی۔

۲: ترجمہ نگاری

لفظ ترجمہ اردو اور فارسی زبان میں عربی زبان سے اخذ کیا گیا ہے جس کا مادہ ''ج۔م'' ہے جس سے ''ترجمان'' اور ''مترجم'' الفاظ نکلے ہیں۔ مختلف لغات میں اس کے جو معنی درج کیے گئے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

لغاتِ نظامی میں اس کی تعریف یوں درج کی گئی ہے۔

ترجمہ: مذکر، ایک زبان سے دوسری زبان میں ادا کیا ہوا مطلب''(۴۰)

فرہنگ کارواں میں اس کی تعریف یہ ہے۔

ترجمہ: مذکر، ایک زبان سے دوسری زبان میں لانا، جمع تراجم

یہ لفظ عربی میں ''Life Sketch'' کے مضمون میں مستعمل ہے۔(۴۱)

اردو لغت میں ترجمے کا مطلب ہے

ترجمہ: ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا (مطلب و معنی کو) "ترجمہ الفاظ کی یہ صفت بھی خاص کر ایجاد ہے۔ اس میں یہ التزام ہے کہ جو لفظ آتا ہے اس کے بعد کا لفظ دوسری زبان کے لحاظ سے پہلے لفظ کا ترجمہ ہوتا ہے"۔(۴۲)

فرہنگ آصفیہ میں اس کا مفہوم یوں بیان کیا گیا ہے۔

ترجمہ: "اسم مذکر، ایک زبان سے دوسری زبان میں بیان کیا ہوا" عام طور پر اس کے چار معنی درج کیے جاتے ہیں۔ ا۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں نقل کلام ۲۔ تفسیر و تعبیر ۳۔ دیباچہ ۴۔ تذکرۂ شخصی (۴۳)

یعنی کسی تحریر، تصنیف یا تالیف کو کسی دوری زبان میں منتقل کرنا ترجمہ کہلاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ترجمہ کسی زبان کے متن کو دوسری زبان میں منتقل کرتے ہوئے اس کی تعبیر کرتا ہے یعنی ترجمے کا عمل، ایک علمی یا ادبی پیکر کو دوسرے پیکر میں ڈھالنے کا عمل ہے اس طرح ترجمہ دو زبانوں بلکہ دو تہذیبوں کے درمیان پُل بنانے کا کام کرتا ہے۔ ترجمے کے بارے یں مرزا حامد بیگ اپنی تصنیف "مغرب سے نثری تراجم" میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

"متن کا اس کی تمام اسلوبیاتی، موضوعی اور تکنیکی خصوصیات کے ساتھ ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا ہی ترجمے کا اصلی فریضہ ہے"(۴۴)

حاجی فخری احمد اس کی تعریف یوں کرتے ہیں۔

"کسی مصنف کے خیالات کو لیا جائے۔ ان کو اپنی زبان کا لباس پہنایا۔ ان کو اپنے الفاظ و محاورات کے سانچے میں ڈھالا جائے اور اپنی قوم کے سامنے اس انداز سے پیش کیا جائے کہ ترجمہ اور تالیف میں کچھ فرق نہ ہو۔(۴۵)

مظفر علی ترجمے کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

"ٹرانسلیشن کا لفظ مغرب کی جدید بانوں میں لاطینی سے آیا ہے اور اس کے لغوی معنی ہیں "پار لے جانا" اس سے قطع نظر کہ کوئی خاص ترجمہ کسی کو پار اتارتا بھی ہے یا نہیں، یہ مفہوم نقل مکانی سے نقل معانی تک پھیلا ہوا ہے۔ اس طرح اردو اور فارسی میں ترجمے کا لفظ جس کا اشتقاقی رابطہ ترجمان اور مترجم دونوں سے ہے۔ عربی زبان سے آیا ہے۔"(۴۶)

اردو میں ترجمہ کا فن اتنا ہی پرانا ہے جتنی پرانی یہ زبان خود ہے کیونکہ اردو کی ابتداء میں کلاسیکی شعری اور نثری ادب کے تراجم کیے گئے۔ قرآن پاک کے تراجم اور ملفوظات کے تراجم نے بھی اردو کے دامن کو وسیع کیا۔ ترجمے کی اہمیت کے بارے میں ڈاکٹر سہیل احمد خان کہتے ہیں۔

"ترجمہ ہمارے ادب کے خمیر میں شامل ہے۔ تخلیقی ادب کی عظمت کو تسلیم کرنا ضروری مگر یہ کہنے سے تخلیقی ادب کی عظمت کی نفی نہیں ہوتی کہ تخلیقی ادب کی بہت سی اعلیٰ شکلوں کے پیچھے ترجمہ یا اخذ شدہ چیزوں کی چمک بھی موجود ہے۔"(۴۷)

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ترجمہ کی تعریف اس طرح درج ہے۔

Translation is the art of rendering a work of one language into another(۴۸)

اور گوئٹے کا یہ قول تو ضرب المثل ہے کہ:

"جملہ امور عالم میں جو سرگرمیاں سب سے زیادہ اہمیت اور قدر و قیمت رکھتی ہیں ان میں ترجمہ بھی ہے۔"(۴۹)

ترجمہ ہر دور میں زبان کی اہم ترین ضرورت رہا ہے۔ اس سے زبانوں کے درمیان اجنبیت کے پردے چاک ہوتے ہیں۔ وسعت اور کشادگی پیدا ہوتی ہے۔ ترجمہ جمود کا خاتمہ کرتا ہے اور اکتساب علم کا وسیلہ بنتا ہے۔ تراجم تخلیقی عمل کو مہمیز کرتے اور علمی و ادبی سرمائے میں اضافہ کرتے ہیں۔

"Gilbert Hight" نے اپنے ایک مضمون میں اس کا تذکرہ یوں کیا ہے۔

Importance of translated words to any culture, illustrations, translation "does not useally create great words but it after helps great words to be created." (۵۰)

پروفیسر ایلبرٹ گیراڈ کہتے ہیں:

"ترجمہ: نام ہے ایک سفر ناشکور کا جس کے صلے میں شدید مشقت کے بعد صرف حقارت ملتی ہے۔" (۵۱)

لوگ ترجمہ نگار کی کاوش کو کسی طرح بھی تخلیق کے برابر ماننے کو تیار نہیں ہوتے کیونکہ اخذ کردہ ادب میں مصنف کی تخلیقی کاوش تو نہیں ہوتی ان کا خیال ہے کہ اصل کی نقل کسی طرح بھی اصل کے برابر نہیں ہوتی۔ بعض اوقات ان کا یہ خیال خام ثابت ہوتا ہے کیونکہ ایک اچھا مترجم تخلیق کو از سر نو پاتا ہے۔ الفاظ کا چناؤ، جملوں کی تراش خراش، ضرب الامثال، محاورات، مترادفات کا علم مترجم کو اچھا ترجمہ کرنے میں مدد دیتے ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ ترجمہ کرتے وقت اتنی مشکلیں اور دقتیں در پیش ہوتی ہیں کہ صحیح ترجمہ کرنا ممکن ہی نہیں رہتا کیونکہ ترجمے میں صرف خیال ہی نہیں بلکہ تخلیقی تجربہ بھی ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کیا جاتا ہے۔ اگر تخلیقی تجربہ ہو بھی جائے تو پھر بھی اسلوب کا مسئلہ رہے گا۔ اس لیے ترجمہ تین چیزوں کا ہوتا ہے یعنی خیال، تخلیقی تجربہ اور اسلوب۔ ان تینوں چیزوں میں سے عین ممکن ہے کہ کسی ایک یا دو چیزوں کا ترجمہ اچھا تو ہو جائے مگر ایک چیز کا ترجمہ نہ ہو پائے پھر دوسری طرف ایک اور مشکل جو مترجم کو در پیش ہوتی ہے کہ دو زبانوں کے مزاج ایک دوسری سے مختلف ہوتے ہیں اور ہر زبان کی اپنی اصطلاحات بھی ہوتی ہیں۔ اس قسم کی مشکلات کے بارے میں شاہد حمید نے گورنمنٹ کالج میں ایک لیکچر کے دوران روشنی ڈالی کہ زبانوں کی ساخت کا مسئلہ اردو میں جملوں کے چھوٹا ہونے کی رکاوٹ، تلازمہ اور مترادفات وغیرہ کے مسائل ترجمے میں آتے آتے ہیں۔

درحقیقت ترجمے کی اہمیت کسی طرح بھی تخلیق سے کم نہیں ہے۔ اس میں تخلیق کو از سر نو پانا ہوتا ہے اس لیے امریکہ میں ترجمے کے لیے "دوبارہ تخلیق "Recreation" کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔

ترجمے کے ذریعے 'ہم دوسری زبانوں اور قوموں کے مزاج اور افکار و اقدار سے آشنا ہوتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ترجمہ کسی زبان پر کیے گئے ایسے عمل کا نام ہے جس میں کسی اور زبان کے متن کی جگہ دوسری زبان کے متبادل متن پیش کیے جائیں۔ اس تعریف میں معانی، مفہوم، مطالب، اندازِ بیاں اور اظہار بیاں (اسلوب اور انداز) کے تمام پہلو آ جاتے ہیں۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ترجمہ کا عمل دو زبانوں کے درمیان پُل بنانے کا ہے جبکہ متن کا اس کی تمام اسلوبیاتی، موضوعی اور تیکنیکی خصوصیات کے ساتھ کسی دوسری زبان میں منتقل ہو جانا ترجمے کا اصل گُن ہے۔

ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمے کی روایت بہت قدیم ہے۔ دنیائے ادب کی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ تشنگان علم و ادب نے انفرادی اور اجتماعی طور پر ذوقِ علم کی آبیاری کے لیے بے انتہا دولت خرچ کر کے غیر ملکی زبانوں سے معیاری اور اہم کتابوں کو اپنی زبان میں منتقل کیا۔ اگر ہم تاریخی عالم پر نظر دوڑائیں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ دنیا میں بہت سی زبانوں میں تراجم کی ابتداء مذہبی کتب کے تراجم سے ہوئی جنھیں ملکی یا علاقائی ضرورت کے تحت مقامی زبانوں میں ڈھالا گیا۔ اس سلسلے میں ہم آسمانی کتابوں، صحیفوں، ویدوں اور دیگر مذہبی رسالوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ دنیا میں علوم و فنون کی ترقی نے ترجمے کی ضرورت کو اور زیادہ وسیع کیا ہے۔

اردو میں جب علمی اور فنی تراجم کا ذکر آتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اردو میں تراجم کا کام ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں شروع ہوا تھا اور انگریزی نگارشات کو اردو میں منتقل کر کے اس کا آغاز کیا گیا تھا۔ نثار احمد قریشی اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''اردو میں نثری تراجم کا آغاز سترھویں صدی کے آغاز سے ہوتا ہے۔ عام طور پر سترھویں صدی میں ملا وجہی کی ''سب رس'' (۱۶۳۵ء) کو سب سے پہلی ترجمہ شدہ کتاب تصور کیا جاتا ہے مگر تحقیقی اعتبار سے شاہ میراں جی خدا نما (دکن) سب سے پہلے مترجم قرار پائے۔ جن کا تعلق قطب شاہی عہد سے تھا۔ شاہ میراں جی نے عربی زبان کے مشہور مصنف ابو الفناء عبد اللہ بن محمد عین القضاۃ ہمدانی کی تصنیف ''تمہیداتِ ہمدانی'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔(۵۲)

شروع شروع میں فارسی سے اردو ترجموں پر زور دیا۔ مذہبی کتابوں کے تراجم کے تحت بنجمن شُلز اور شاہ عبد القادر کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف اداروں مثلاً دہلی کالج، جامعہ عثمانیہ اور سرسید کی سائنٹیفک سوسائٹی نے اس ضمن میں بے شمار خدمات سرانجام دیں۔ فورٹ ولیم کالج کی طرف سے جو تراجم ہوئے اس کا مقصد کلاسیکی کتابوں کی اردو میں منتقلی اور آسان نثر کا فروغ تھا۔ اس سے اردو زبان نثر، نظم اور سائنس کے حوالے سے تراجم کی ابتدا ہوئی۔

بیسویں صدی کے آغاز کے بعد ترجمہ ایک ادبی تحریک کی صورت میں سامنے آیا اور کثیر تعداد میں نظم و نثر کی نگارشات کے تراجم ہوئے۔ ادبی رسائل میں بھی تراجم ایک حصہ رکھا گیا تھا۔ ''مخزن'' اور ''نیرنگِ خیال'' اس ضمن میں پیش پیش تھے۔ افسانوی ادب کے لحاظ سے دھڑا دھڑ اتراجم کیے گئے اور خاصے تجربات کیے گئے۔ منٹو اس ضمن میں پیش پیش تھے۔ انہوں نے فرانسیسی اور روسی افسانوں کے ترجمے کر کے ناقابل فراموش انصاف کیا۔ اسی دوران نظموں کے تراجم بھی ہونے لگے۔ طباطبائی کی نظم ''گور غریباں'' بڑی مشہور ہوئی جو کہ ''گرے کی ایلجی'' کا ترجمہ ہے۔ بانگِ درا کا پہلا حصہ بھی ''اقبال'' کی ماخوذ نظمیں ہیں۔ ۱۹۲۰ء میں 'پروفیسر محی الدین' نے شعری تراجم کا ایک چھوٹا سا مجموعہ ''دو آتشہ'' کے نام سے شائع کر دیا۔ حیدر آباد دکن سے ''حسن الدین'' نے ''ساز مغرب'' کے نام سے کئی جلدوں میں انگریزی سے تراجم اکٹھے کیے۔ تراجم کی اس کثرت کے باعث بعض لفظوں کے پانچ پانچ چھ، چھ تراجم بھی ہمیں دستیاب ہیں۔ اس سلسلے میں ''اندھی پھول بیچنے والی کا گیت'' کی مثال دی جاسکتی ہے۔

شعری تراجم کے سلسلے میں ایک نمایاں نام ''میراں جی'' کا ہے جنہوں نے تراجم سے اردو زبان کے دامن کو وسیع کیا۔ تراجم کے اس رجحان کے پیچھے دو وجوہات اور تھیں ایک تو یہ کہ زمانے میں ادب کا ایک مقصد تفریحی بھی تھا چنانچہ عوام کی تفریح کی خاطر کمرشل سطح پر تراجم کی مانگ میں اضافہ ہوا۔ دوسری طرف ان دنوں دنیا میں سرمایہ دار اور سوشلسٹ معاشرے کی آویزش نے اہم کردار ادا کیا جس کے تحت اپنے خیالات کی ترویج کے لیے ایک ملک دوسرے ممالک میں پراپیگنڈے کے لیے ترجمے کو فروغ دیتا تھا۔ مثلاً روس نے ''غیر ملکی کتابوں کا اشاعت گھر'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور ہندوستان سے مترجم بلوائے جن میں رصیہ سجاد ظہیر، انور عظیم اور ظ۔ انصاری کے نام اہم ہیں۔ یہ تراجم بہت خوبصورت اور سستی کتابوں کی صورت میں بکتے تھے تاکہ لوگ انہیں آسانی سے خرید سکیں۔ اسی طرح امریکہ نے ''فرینکلن کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ اس دور میں اچھے تراجم بھی ہوئے۔

جب ترجمے کا رجحان بڑھ رہا تھا تو ہر قسم کے تراجم منظر عام پر آرہے تھے۔ سرشار اور آغا حشر نے ڈراموں اور ناولوں کو مقامی رنگ دینے کے لیے ترجمے کے میدان میں ہر اصول کو فراموش کر دیا تھا۔ مرزا حامد بیگ اس بارے میں کہتے ہیں:۔

''ادبی سطح پر ہیئت، تکنیک اور موضوعی کروٹوں سے ناآشنائی اور مغربی ادبیات کا شعور نہ ہونے کی بدولت انتہائی بے سلقگی کا مظاہرہ کیا گیا۔ قاری کی دلچسپی کو مد نظر رکھتے ہوئے کاٹھ کباڑ کے ڈھیر لگا دیئے گئے۔ ایسے ترجموں کا بڑا نقص یہ تھا کہ غلط اور غیر معتبر ہونے کے علاوہ وہ تراجم مستند اور اہم کتب کے نہیں تھے۔ بالخصوص جارج ولیم، ایم رینالڈ کے بیسوں ترجمے ہوئے اور مختلف مترجمین نے کیے اور

اس پر غضب یہ کہ ترجمہ در ترجمہ ہوئے۔ اور مترجمین نے اصل متن دیکھنے کی زحمت تک گوارا نہ کی۔ یہی صورت آزاد ترجمہ میں سامنے آئی اور ہمارے مترجمین نے لندن کے بازاروں میں جمن حلوائی اور لکھنؤ کے بانکوں کو جدی پُشتی وہاں کا ثابت کر دیا۔"(۵۳)

لوگوں نے کرداروں کے نام اور جگہوں کے آثار تو تبدیل کیے ہی تھے۔ ان کے عادات وخصائل تک بدل کر رکھ دیئے۔ مترجمین کی ترجمے کے فن سے ناواقفیت اور تن آسانی نے نیا طرز حربہ بھی ایجاد کیا جسے انگریزی میں (Journalese) کی اصلاح کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یعنی ایک ایسی ناقص زبان لکھی گئی جو نہ تو خیال کے اظہار پر قادر ہے اور نہ ہی معنی کی ترسیل پر۔

ناولوں کے ساتھ ساتھ انگریزی سے سٹیج ڈراموں کو اردو میں منتقل کرنے کا کام شروع ہوا۔ ولیم شیکسپیئر کی عالمگیر شہرت سے باکس آفس پر کامیابی کے تصور نے بہت سے مترجمین کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ لیکن افسوس شیکسپیئر کے بیشتر تراجم ناقص ہیں۔ ان میں پلاٹ کی تبدیلیاں کی گئیں۔ مقامی رنگ اس قدر دے دیا گیا کہ پہچان مشکل ہو گئی۔ یہاں تک کہ تجارتی ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے بڑے پیمانے پر کانٹ چھانٹ کی گئی۔ باکس آفس پر کامیابی کے تصور کی وجہ سے ہم مغربی ڈرامے کی فنی خوبیوں سے دور ہو گئے۔

ان من مانی کارروائیوں کی وجہ سے اور بے پناہ تصرفات کی وجہ سے یہ سوچا جانے لگا کہ آیا ترجمہ کرتے ہوئے کچھ اصولوں کو سامنے رکھنا چاہیے یا نہیں اور مترجم کو کن اوصاف کا حامل ہونا چاہیے کہ ترجمہ بہترین صورت میں سامنے آئے۔ اس فکری موضوع نے زور پکڑا اور مقتدرہ قومی زبان نے نہ صرف ان موضوعات پر سیمینار کروائے بلکہ کتابیں بھی شائع کیں۔

جوش ملیح آبادی کی ترجمہ نگاری

جوش ملیح آبادی نے نظم نگاری کے حوالے سے غزل، نظم، قطعہ پر رباعی، مرثیہ، سلام، قصیدہ اور مثنوی میں تو اپنی قادر الکلامی کے جلوے دکھانے کے ساتھ ساتھ نثر نگاری میں آپ بیتی نگاری، خطوط نگاری، مضمون نگاری، کالم نگاری، اداریہ نگاری کے ساتھ ساتھ ترجمہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔

جوش کی ترجمہ نگاری کا جائزہ لینے سے پہلے ہمیں یہ باور کرنا ہو گا کہ جوش کی زندگی کا طویل سفر ملیح آباد، لکھنؤ سے شروع ہوا پھر دکن، دہلی، ممبئی، پونا، کراچی اور اسلام آباد تک پھیلا ہوا ہے۔ جوش کی ان گنت تحریریں ایسی ہیں جو ابھی پردۂ اخفا ہیں۔

منظوم تراجم کی ذیل میں پہلا قدم انہوں نے ایم اے او کالج علی گڑھ میں اٹھایا۔ 1912 میں جب وہ طالب علم تھے، اپنے ایک استاد واجد علی شیدا کے کہنے پر انہوں نے انگریزی نظم لارڈ یولیسز ڈاٹر کا اردو نظم میں ترجمہ کیا لیکن یہ نظم تلف ہو چکی ہے۔

جی الانا کی ایک انگریزی نظم کو وحدتِ انسان کے عنوان سے نظم کیا

اے دوستو! ساتھیو! رفیقو!
نفرت کی غذا نہ دو بشر کو
مے خانۂ روزگار میں یاں
چھلکاؤ شرابِ حُبِ انسان
بوئے گل کی چلت پھرت لو
باردو کی بُو میں سانس مت لو (۵۴)

جوش نے دارالترجمہ حیدر آباد میں ملازمت کے دوران "حیات بیکن" کا اردو ترجمہ بھی کیا تھا۔ لیکن یہ ترجمہ نایاب ہے اور دیگر گمشدہ ادبی ذخائر کی طرح ہو سکتا ہے کہ جوش کے خاندان کے کسی فرد سے کبھی دستیاب ہو جائے اور زیورِ طبع سے آراستہ ہو جائے۔

ہمارے سامنے جوش کا جو ترجمہ شدہ سرمایہ موجود ہے اس میں ایک مضمون ”مسائل حیات“ کے عنوان سے ہے یہ جوش کے دارالترجمہ حیدر آباد دکن کی یادگار ہے جو کہ ماہنامہ ”کلیم“ دہلی کے جنوری ۱۹۳۶ء کے شمارے میں طبع ہوا اور پھر فروری، مارچ، اپریل، مئی تک لگاتار چھپتا رہا اس کی ایک قسط اکتوبر ۱۹۳۶ء ایک جنوری ۱۹۳۷ء اور آخری قسط فروری ۱۹۳۷ء میں طبع ہوئی۔ جون، جولائی، ۱۹۳۷ء کے شمارے میں جوش نے پنڈت برج موہن و تاتریہ کیفی کی ایک فارسی غزل کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا۔ اور ”غزل مسلسل“ کا عنوان درج کیا۔ مئی کے شمارے میں بھی یہ نظم درج ہے۔ جوش نے سورہ رحمن کا منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔ سب سے پہلے یہ ترجمہ بیگم ثاقبہ رحیم الدین کی کتاب میں طبع ہوا۔ جو کہ ”سورۃ الرحمن“ ایک منظوم تاثر“ کے عنوان سے درج ہے۔

مسائل حیات کے قسط وار مندرجات اس طرح ہیں۔ یعنی جوش نے جو ابواب بندی کی ہے اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

جنوری ۱۹۳۶ء، مسائل حیات، نقاد، کتاب، علم، حق و راستی، فطرت انسانیت

فروری ۱۹۳۶ء: تاریخ، تمدن، محبت، حیات

مارچ ۱۹۳۶ء: حیات، جنس، ازدواج

اپریل ۱۹۳۶ء: سوسائٹی (سماج) اخلاقیات

مئی ۱۹۳۶ء سیاست

اکتوبر ۱۹۳۶ء: مذہب

جنوری ۱۹۳۷ء: دینیات

فروری ۱۹۳۷ء: فنون لطیفہ، عام پسند مغالطے، تجربہ، انجام

اب ہم جوش کی ترجمہ نگاری کا جائزہ ان کے مختلف تراجم کے حوالے سے لیتے ہیں بالخصوص ”مسائل حیات“ کے حوالے سے جائزہ لیا جائے گا۔

اگرچہ نثری ادب کے تراجم کے لیے مترجم کا مصنف ہونا ضروری نہیں مگر منظوم ترجمہ کرنے کے لیے لازمی ہے کہ مترجم ایک اچھا شاعر بھی ہو تاکہ اسے بحور اور اوزان کا مکمل شعور ہو اور وہ متبادل اسلوب تلاش کر سکے مثلاً شان الحق حقّی نے شیکسپیئر کی ”انتھنی اینڈ کلوپیٹرا“ کا ترجمہ ”زہر عشق“ کے عنوان سے کیا اور بلینک ورس کو مثنوی میں تبدیل کر دیا لیکن ترجمہ اصل سے قریب ہے۔ دوسری طرف ایلیٹ کی ”Waste Land“ کے ترجمہ میں نامناسب بحر کے استعمال نے تہذیبی پس منظر بھی بدل دیا ہے۔ شاعری کے خیال کی تاثیر کی منتقلی مترجم سے تخلیقی صلاحیتوں کا تقاضا کرتی ہے یوں ترجمہ شدہ نظم جہاں اصل تخلیق کی نمائندگی کرتی ہے وہاں نئے پیرایۂ اظہار کی وجہ سے اس کی اپنی ایک الگ شناخت بھی بن جاتی ہے کیونکہ اس میں محض شاعر کا پیرایۂ اظہار ہی نہیں بلکہ مترجم کا لہو بھی شامل ہوتا ہے۔ ایسے ہی تخلیقی مترجم کو رچمنڈ لیٹیمور نے ”Auther Plus Translator“ کہا ہے۔ جوش نے جب صابر تھاریانی کے گجراتی قطعات کا منظور اردو ترجمہ کیا تو وہ ایسے ہی تخلیقی مترجم کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ انہوں نے صابر تھاریانی کے سو(100) سے زائد گجراتی زبان میں لکھے ہوئے قطعات کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ صابر تھاریانی نے آسان اردو میں گجراتی سے مفہوم کو منتقل کیا (خود کیا یا کسی سے کرایا اس کا علم نہیں) اور منظوم ترجمے کے لیے جوش کے حوالے کیا لیکن جوش کے رنگ نے ترجمے کو اصل سے بہتر ثابت کر دیا ہے۔ ایک قطعے کو ملاحظہ فرمائیے جس کا عنوان ہے ”چراغ طور“ پہلے ہم گجراتی زبان کا ترجمہ کردہ قطعہ دیکھتے ہیں۔

شعلۂ ہجر سے تو نور ہو جا۔ تو نور ہو جانا

نور بن کر تو بعید از دل نہ ہو جا۔ دل سے دور نہ ہو جانا

تیرے اندر بھی پر تو نور خدا ہے... ہو جا دنیا کے لیے تو چراغ طور ہو جا

(صابر کے موتی ص ۸۶)

اب جوش کا منظوم ترجمہ ملاحظہ فرمائیے۔

چراغ طور

شرابِ عاشقی سے چور ہو جا

جو ممکن ہو سراپا، نور ہو جا

خدا کی شان پیدا کر چلن میں

ارے بندے، چراغِ طور ہو جا

(صابر کے موتی ص ۸۷)

جوش ملیح آبادی نے "یادوں کی برات" میں رابندر ناتھ ٹیگور پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے اظہار خیال کیا تھا کہ شاعری کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا وہ لکھتے ہیں:

> ..."میرا یہ دعویٰ ہے کہ شاعری ایک ایسی انوکھی اور دور از دست چیز ہے کہ اس کا ترجمہ قطعی طور پر ہو ہی نہیں سکتا۔ ترجمہ گُھن ہے اور شاعری آبگینہ، ترجمہ سنداں ہے اور شاعری سُبو، ترجمہ تند ہوا کا تھپیڑا ہے اور شاعری دریائے تخیل کا حباب اور میرے اس دعوے کے ثبوت میں طلب فرمالیجئے شاعری کے ان تمام ترجموں کو، جو اس دنیا میں آج تک ہو چکے ہیں... اگر آپ عمیق نظر سے ان کا مطالعہ فرمائیں گے تو آپ خود دیکھ لیں گے کہ وہ تراجم سونے کی ڈھیریاں نہیں، مٹی کے ڈھیلے اور سچ سچ کے لالہ و گُل نہیں، کاغذ یا پلاسٹک کے پھول ہیں..." میں یہ مان لینے پر اپنے کو آمادہ کر سکتا ہوں کہ شاعری کے ناقابل شمار دھاروں میں سے فقط ایک دھارے کو، کسی حد تک ترجمے کی گرفت میں لایا جا سکتا ہے، جس کو فکری شاعری کہتے ہیں یعنی جہاں تک شاعر کے مرکزی پیام اور اُس کے ٹھوس خیالات، فرمودات اور نظریات اور کا تعلق ہے، اُن کا تقریباً کامیاب ترجمہ ہو سکتا ہے۔" (۵۵)

دراصل جوش کی یہ مراد نہیں کہ ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا بلکہ ان کی مراد ہوتی ہے کہ ترجمہ کرنے والا شاعر کے احساس کی ہر پنکھڑی کے رنگ اور خوشبو کو محسوس ہی نہیں کر سکتا تو دوسروں کو کیا محسوس کرا سکے گا۔ یہاں جوش نے اپنے تراجم کے ذریعے اس بات کو خود ہی باطل کر دیا ہے کیونکہ جوش کے تراجم نے تخلیق کار کے قلم اور اس کے خیال کی ماورائی روش کو مصنف کے اپنے احساس کی درونی کروٹوں تک رسائی کو ممکن بنا کر ترجمہ کو اصل سے زیادہ اجاگر کر دیا ہے۔ اگرچہ کے جوش نے "صابر کے موتی" کے پیش لفظ میں اپنی عدم فرصتی کی وجہ سے ترجمے کے عجلت میں کرنے کا ذکر کیا ہے لیکن جوش کے اس منظوم ترجمے میں شعریت اور ادبیت کے امتزاج کے پہلو بہ پہلو صابر تھاریانی کی تخلیقی تابناکی سے آگے جا کر جوش کی فکر کے دھارے کو چھو لیا ہے اور خیال کی یکسانیت نے گجراتی قطعات کو جوش کی رباعی سے فکری مماثل کر دیا ہے۔ پہلی مرتبہ جب قطعات طبع ہوئے تو نہ اُس میں گجراتی متن موجود تھا نہ اس کا اردو ترجمہ، صرف جوش کا منظوم ترجمہ موجود تھا لیکن کچھ مصرعے ایسے تھے جو کہ بے بحر تھے یا ان میں کوئی جھول تھا لیکن جب ڈاکٹر ہلال نقوی کو ممتاز شاعر نسیم امروہوی سے منظوم ترجمے کا قلمی مسودہ موصول ہوا تو موازنے سے معلوم ہوا کہ کاتب نے کتابت کرتے وقت کتنے مصرعے بے بحر لکھ دیئے تھے۔ صابر تھاریانی نے بھی اس پر غور نہیں کیا تھا۔ مثلاً مطبوعہ میں اور قلمی میں جو تفاوت ہے اس میں سے کچھ بطور امثال درج کرتے ہیں۔

(مطبوعہ) ہم وہ ہیں کہ دشتِ بلا سے گزرے

(قلمی) ہم وہ ہیں کہ جس دشتِ بلا سے گزرے

(مطبوعہ) اے شمع حقیقت ہم تیرے ہیں پروانے

(قلمی) اے شمع حقیقت ہم تیرے ہیں وہ پروانے

(مطبوعہ) جو نور سے جھلکے، وہ مری ذات نہیں ہے

(قلمی) جو نور سے جھلکے وہ مری ذات نہیں ہے

جوش ملیح آبادی نے ترجمہ نگاری میں اس امر کو رکھا ہے کہ الفاظ اور عبارت کا ترجمہ الگ الگ اصول کو ملحوظ خاطر رکھ کر کیا جائے۔ سید باقر حسین لکھتے ہیں کہ

''الفاظ اور عبارت کا ترجمہ کرنے کے علیحدہ علیحدہ اصول ہیں الفاظ کا ترجمہ کرنے میں میری رائے میں مندرجہ ذیل اصولوں کو سامنے رکھنا ہے۔ا۔ترجمہ صحیح ہونا چاہیے۔۲۔ حتی الامکان عام فہم ہونا چاہیے۔۳۔ سبک اور خوبصورت ہونا چاہیے۔''(۵۶)

جوش کی اسی خوبی کی بنا پر ان کا ترجمہ درست، عام فہم، سبک اور خوبصورت ہے۔ درست متن کی تفہیم کی روانی اور تسلسل قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ترجمے کا اصل مقصد عوام کو اُن تصورات سے روشناس کرانا ہے جو اصل متن میں موجود ہوں اگر ترجمے میں نقل بمطابق اصل والی بات نہیں تو ایک معمولی پڑھا لکھا شخص اُن تصورات سے کیسے آشنا ہو سکے گا کیونکہ جو خود پڑھ سکتے ہوں انہیں ترجمہ پڑھنے کی ایسی کوئی خاص ضرورت در پیش نہیں آئی۔ ادب کے قارئین، نقاد یا ترجموں میں دلچسپی رکھنے والے باذوق افراد ان باریکیوں کو جانتے ہیں اور اسی حوالے سے کسی ادب پارے کے ترجمے کو پسندیدگی کی سند عطا کرتے ہیں۔

جوش نے لفظی ترجمہ کرتے ہوئے خیال رکھا ہے کہ بعض اوقات مصنف کتاب نے مترادف الفاظ درج کر دیئے ہیں تو عبارت کے لحاظ سے بر محل اور موزوں الفاظ کو منتخب کر لیا جائے اور جہاں ضرورت محسوس ہوئی ہے، مترادفات کے ترجمے میں کئی کئی مطالب بھی پیش کیے ہیں اور الفاظ کو ان کے خاص ماحول اور پس منظر کے حوالے سے استعمال کیا ہے۔ اگر ترجمے میں آنکھ بند کر کے ان کے مترادف رکھ دیئے جائیں تو بعض اوقات عبارت مضحکہ خیز ہو جاتی ہے۔''مسائل حیات'' کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

> ''اس کائنات کی پہنائیوں اور وسعتوں کے مقابلے میں انسانیت اُس مینڈک یا چیونٹی کی مانند معلوم ہوتی ہے جو دلدل میں پھنسی ہوئی ہو۔ پھر بھی ہم میں سے بعض نہایت ہی شوخ چشمی کے ساتھ یہ دعویٰ کرنے کی جسارت کرتے ہیں کہ انہیں حق وراستی کا علم حاصل ہو گیا ہے جو ایک بے پایاں وسعت ہے اور جس کا صرف ایک رُخ محض اُس مخصوص ذہنیت کے سامنے آسکتا ہے جسے اُس رُخ کے ساتھ طبعی مناسبت ہو۔ مکمل حق ہمیشہ نامعلوم رہے گا تو پھر یہ معلومہ حق وراستی کیا ہے جزو یا کُل''۔(۵۷)

ایک اور لفظی ترجمہ کی مثال ملاحظہ فرمایئے۔

''یا ہمارے اکابر، ظالم، سفاک، شقی، قاتل اور خونی نہیں ہوتے، جو ہر نفس ہزاروں سروں اور لاکھوں دلوں کو توڑا کرتے ہیں۔''(۵۸)

منظوم لفظی ترجمہ کی مثال دیکھیے۔ یہ فارسی سے اردو غزل میں نظم کیا گیا ہے۔

(فارسی)

ہاں بیانا ایں جہاں را عالمِ دیگر کُنم
شش جہت را از طلسم جذب دل ششدر کُنم
قطرہ را آبِ گہر بخشم زنیسانش سرشک
ذرہ راز از سوز دل ہم پر تو خاور کُنم

(پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی)

(اردو ترجمہ)

آہ کہ اس کون و مکاں کو عالم دیگر کروں
شش جہت کو جذب دل کے سحر سے ششدر کروں
قطرے کو نیسان چشم تر سے دوں آب گُہر
ذرے کو سوز جگر سے خسروِ خاور کروں(۵۹)

(جوش ملیح آبادی)

الفاظ کا ترجمہ کرنا تو پھر بھی آسان ہے لیکن عبارت کا ترجمہ کرنا اکثر مشکل ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں دو متضاد تقاضوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ سید باقر حسین لکھتے ہیں۔

ایک طرف تو یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ ترجمہ حتی الامکان تحت اللفظ ہو، اصل عبارت کا محض لب و لہجہ یا تبصرہ نہ ہو، دوسری طرف ترجمے کی زبان کا محاورہ ہاتھ سے نہ اُٹھ جائے۔(۶۰)

جوش جانتے تھے کہ ہر زبان کے مخصوص اسالیب ہوتے ہیں جن کا لفظی ترجمہ دوسری زبان میں نہیں ہو سکتا۔ ایسی صورت میں یا تو ترجمے کی زبان کا کوئی ایسا اسلوب یا محاورہ تلاش کرنا پڑتا ہے جو نا صرف لفظی ترجمہ کرتا ہو بلکہ مرکزی خیال کو بھی ادا کرتا ہو۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر جملے کی ساخت میں حسب ضرورت تبدیلی کرنا پڑتی ہے اور الفاظ گھٹانے یا بڑھانے پڑتے ہیں تا کہ مطلب حتی الامکان صفائی اور محاورے کے ساتھ ادا ہو جائے۔ جوش "مسائل حیات" کی تمہید میں اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں۔

"۔ اثنائے ترجمہ میں ایک ایک خیال سے کئی کئی خیال پیدا ہوتے رہتے ہیں، اور میں نے ہر خیال کو ذہن میں اچھی طرح پختہ کر کے اسی ترجمے میں لکھ دیا ہے، بعض مقامات کی طوالت کو تراش دیا ہے، اور بعض مختصر دامنوں میں کلیوں کا اضافہ کر دیا ہے۔ گھٹایا کم ہے، بڑھایا زیادہ ہے۔

البتہ بڑی حد تک اس کا لحاظ رکھا ہے کہ انگریزی کا طرز بیان ار "شری یوگندرا" مصنف کتاب کا اسلوبِ نگارش اصل سے دور نہ ہونے پائے۔ ممکن ہے اردو کے خالص طرز بیان کی رو سے احباب کو بعض مقامات زیادہ پسند نہ آئیں لیکن میرے خیال میں اگر اردو میں مختلف زبانوں کے اسالیب بیان کی ماہرانہ طور سے آمیزش کر دی جائے تو ایک وسیع اور خوشگوار تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے۔(۶۱)

بعض اوقات کلمے کے ساتھ مہمل الفاظ بھی اضافی وزن کے ساتھ استعمال ہو جاتے ہیں۔ اگر ترجمہ کرنے والا ان باریکیوں سے آگاہ ہو گا تو وہ صرف بامطلب اور بامعنی الفاظ ترجمے کی طرف زور دے گا، باقی نظر انداز کر دے گا۔ جوش نے ترجمہ کرتے وقت لفظوں کے بامعنی استعمال کو ترجیح دی ہے، خواہ مخواہ کی لفاظی سے گریز کیا ہے۔

ترقی یافتہ زبانوں کے اکثر جملے پیچیدہ اور لمبے ہوتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اسالیب مقرر ہیں اور عام فہم ہو چکے ہیں لیکن اردو ابھی تک زیادہ پیچیدہ اور لمبے جملوں کی متحمل نہیں ہو سکی ہے۔ جوش نے اسی بات کو مد نظر رکھتے ہوئے جملوں کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دینا ضروری سمجھا ہے۔ جملوں کی ساخت اور رموزِ او قاف کے علم سے باخبر ہونے کی وجہ سے مناسب مقامات پر علامتوں کے استعمال، چھوٹے جملوں کو حروف عطف کے ذریعے جوڑ کر عبارت کی بہتر تفہیم کو ممکن بنایا ہے۔

"محبت، محبت کو دیکھنا چاہتی تھی، چنانچہ اُس نے کرشن کو پیدا کر دیا۔ شاعری، گنگنانا چاہتی تھی، چنانچہ اُس نے کالیداس کو پیدا کر دیا۔ بطّلیت (Heroism) حرکت پیدا کرنا چاہتی تھی، چنانچہ اُس نے سیزر کو خلق کر دیا اور حکمت غور کرنا چاہتی تھی، چنانچہ اس نے ارسطو کو پیدا کر دیا۔

ان میں ایک فرد بھی اوتار، شاعر، بطل (Hero) اور فلسفی نہ تھا۔ بلکہ دراصل ان کی جگہ محبت، شاعری، بطلیت اور حکمت تھی جس نے اپنے کو ان افراد کی شکلوں میں ظاہر کر کے ہمیں ان کی تکریم پر مجبور کر دیا۔"(٦٢)

کسی بھی کام میں درجہ کمال حاصل کرنے کے لیے محنت بنیادی شرط ہے اور ایک اچھا مترجم اپنے ترجمہ کے لیے وقت، محنت اور روپیہ صرف کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا، بعض اوقات مناسب اسالیب کی تلاش میں مترجم کئی کئی مہینے کام کرتا ہے اور پھر بھی مطمئن نہیں ہوتا۔

جوش باوجود کہ ایک رئیس گھرانے سے تعلق رکھتے تھے لیکن سحر خیزی اور محنت کی عادت (تحریروں کو کئی کئی بار کاٹنا اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہنا) ابتدا ہی سے جوش کا چلن رہا۔ بالخصوص اپنی سوانح حیات "یادوں کی برات" کا مسودہ چار مرتبہ کاٹ چھانٹ کے بعد طبع کروایا۔ ترجمے میں بھی جوش مناسب الفاظ کی تلاش کئی کئی دن لگا دیتے تھے۔ پھر بھی مصنف کی منشا کو پیش کرنے والے الفاظ کے چناؤ میں احتیاط کو ملحوظ رکھتے تھے یعنی منشائے مصنف مترجم کے پیش نظر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جوش کے تراجم کی تعداد انتہائی قلیل ہے کہ کسی کے نظریات کو بعینہ بیان کرنا ایک مشکل امر ہے۔ دارالترجمہ حیدر آباد کی ملازمت کے دوران اگر جوش چاہتے تو تراجم کے ڈھیر لگا سکتے تھے لیکن انہوں نے ان تحریروں کے متن کے تراجم کیے جن سے ان کو فطری میلان یا رغبت محسوس ہوئی یا جو حکیمانہ پہلو لیے ہوئے ہیں بالخصوص "مسائل حیات" اور "صابر کے موتی" وغیرہ۔ جوش ضرورتِ وقت کو مشغلۂ ادبی نہیں سمجھتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"کیونکہ اربابِ علم ہی ہر قوم کے دماغ ہوا کرتے ہیں، اگر دماغ تندرست ہوتا ہے تو تمام اعضا و جوارح بھی درست ہو جاتے ہیں۔ اس لیے میرے نزدیک ایسے مقالات کی بہت ضرورت ہے جو قوم کی بیماریوں کا علاج کر سکیں۔ میں اہل نظر سے عرض کرتا ہوں کہ وہ اس مقالے کو مشغلۂ ادبی کے طور پر نہیں ضرورتِ وقت کے نقطہ نظر سے ملاحظہ فرمائیں۔ ممکن ہے مقلّد و جامد، اور حریت فکر سے ڈرنے والی سوسائٹی میں کچھ روشنی پیدا ہو جائے۔(٦٣)

جوش نے ترجمہ کرنے سے پہلے ان عوامل کا مطالعہ کرنے اور سمجھنے کی کوشش کی جن کے زیر اثر متن تحریر کیا گیا تھا۔ جوش نے اس کتاب میں دلائل و براہن، اور تشریح و تفسیر سے کام نہیں لیا کیونکہ مصنف نے بھی ہلکے پھلکے انداز میں زندگی کے چند اہم مسائل کی طرف، جن سے انسانی زندگی آ:ے دن دوچار ہوا کرتی ہے، چند پر مغز اور حکیمانہ اشارے کر دیئے تھے، جوش اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

"مجھے خوف ہے کہ یہ اشارات ان افراد کے واسطے دلچسپ اور قابل فہم نہ ہوں گے، جن کا مطالعہ محدود اور تفکر نارسیدہ ہے، البتہ وہ حضرات جو حکیمانہ مزاج رکھتے ہیں، جو کارخانۂ عالم میں تدبر و تفکر کیا کرتے ہیں، جو حقائق زندگی اور اشیائے عالم کے مختلف پہلوؤں کے دیکھنے کی سعی کر چکے ہیں اور جو ہر ایک ذرے کو تمام دنیا کے پہاڑوں کے مقابلے میں مساوی اہمیت کے ساتھ تولنے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں، وہ حضرات ان اشارات کو دلچسپ بھی پائیں گے، اور خیال انگیز بھی۔"(٦٤)

ویسے بھی جب آپ کسی چیز کو ہلکے پھلکے انداز میں دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں تو وہ گویا زیادہ اثر انگیز پیرائے میں ان تک پہنچتی ہے کیونکہ بعض اوقات دلیل و منطق کی ثقاہت طبیعت کو بوجھل کر دیتی ہے۔ لیکن دلائل و براہین کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

جدید ذرائع آمد و رفت کی وجہ سے اور میڈیا کی بدولت دنیا کے مختلف ممالک کے لوگ ایک دوسرے کے قریب آ رہے ہیں۔ اس صورت میں ایک بڑی مشکل زبانوں میں فرق کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے لہٰذا یہاں ترجمہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ زبانیں لفظوں سے مل کر بنتی ہیں۔ جب دو زبانیں باہم ملتی ہیں تو نہ صرف ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں منتقل ہوتے ہیں۔ اسی طرح ترجمے کے ساتھ ساتھ قوموں کی عملی تاریخ پھلتی اور بڑھتی ہے۔ ترجمہ گمان کا ممکن ہے اور اسے ممکن بنانے کے لیے مترجم کو اپنی شخصیت و حیثیت بھلا کر صاحب متن کی تخلیق میں انتہائی عاجزی کے ساتھ گھل مل جانا ہوتا ہے لیکن ترجمے میں وہ کلچرل اور لسانی دشواریوں سے دوچار ہوتا ہے۔ جوش نے ان لسانی اور کلچرل دشواریوں کو اپنے لغت پر ماہرانہ عبور اور انگریزی، لکھنوی، دہلوی اور پنجابی معاشرت سے آگاہی کی بنا پر بخوبی قابو پایا۔ چونکہ جوش نواب خاندان سے متعلق تھے۔ امراء و روساء کی محفلوں میں اٹھنا بیٹھنا تھا۔ حیدر آباد کی ریاست میں دس سال گزارے تھے اور انگریزوں سے بھی مراسم تھے۔ اس لیے جوش کے ہاں ثقافتی بُعد نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی جوش کے خالص اردو کے طرز بیان سے ہو سکتا ہے۔ کچھ لوگ بعض مقامات کے ترجمہ کو پسند نہ کریں تو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جوش زبانوں کے اسالیب بیان کی اردو میں آمیزش کو زبان اردو کے لیے ایک وسیع اور خوشگوار تبدیلی سمجھتے تھے جبکہ وہ لوگ ایسا نہ سمجھتے ہوں۔ جوش لکھتے ہیں۔

> ”کیا ہر زبان میں ”الوہیت“، ”نقدی“ اور ”نظم“ کے بے شمار الفاظ موجود نہیں ہیں، جنہیں ریاکار ان کے حقیقی معنوں سے محروم کر کے نوع انسانی کی معصوم اکثریت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں۔ قوانین مذہب و اخلاق کی ترجمانیاں اور تاویلیں، ذہن و ریاکار افراد کے ہاتھوں میں مداریوں کے کرتبوں کی مثل ہوتی ہیں۔ تم واقعات یا اشیا کے تاریک پہلوؤں پر نظر ڈالنے سے اس وقت تک انکار کر سکتے ہو، جب تک کہ مجبور نہ ہو جاؤ، لیکن اگر اس زندگی کے حقیقی امور سے جو قطعی طور پر تاریک ہیں، تم نگاہیں پھیر لو اور زبردستی یہ کہنا شروع کر دو کہ ان میں روشنی کی ایک کثیر مقدار پائی جاتی ہے، تو کیا اس کے یہ معنی نہ ہوں گے کہ تم نے ایک کامل ریاکار کا پارٹ کرنے کی مشق شروع کر دی۔“(٦٥)

افسانوی ادب کے ترجمے میں اصل متن کے ماحول کو مقامی معاشرت سے بدل دینے کی روایت بہت پرانی چیز ہے جس کا سلسلہ میر امن کی ”باغ و بہار“ سے شروع ہو کر موجودہ دور تک پہنچتا ہے۔ اس سے ترجمہ ”تخلیق سے قریب تر ہو جاتا ہے لیکن وہ تخلیق نہیں بن سکتا۔ ترجمہ دوسری تہذیب کو اپنے سانچے میں ڈھالنا نہیں بلکہ ایک نئی تہذیب کو متعارف کرانا ہے جس سے اپنی تہذیب میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور اصل فن پارے کی وحدت برقرار رہتی ہے۔ جوش نے یہی کمال دکھایا ہے کہ اصل متن، اس کے اسالیب، ہیئت اور موضوعات کو اپنے ماحول کے ساتھ اپنی زبان میں منتقل کیا ہے۔ جوش نے دوسری زبان کی نثر (متن) کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے اپنے ماحول اور لسانی ضرورتوں سے اس طرح ہم آہنگ کیا ہے کہ دونوں زبانوں کے اتصال نے ایک خوبصورت سنگم کو جنم دیا ہے۔ دونوں زبانوں پر کامل عبور اور قدرت نے مضمون میں پوشیدہ مفہوم کو قاری تک اس طرح منتقل کیا ہے کہ اس کے مطالعے کے بعد وہ کسی ابہام کا شکار نہیں ہو سکتا اور دونوں زبانوں کے مزاج، لغات، تراکیب، گرائمر اور اسالیب کو مترجم کے وسیلے سے سمجھنے کے قابل ہو سکے۔

جوش کی وسعتِ مطالعہ نے بھی اس کے کام میں عمدگی پیدا کی۔ فنونِ لطیفہ، ادب، فلسفہ، نفسیات، سائنس، مذہب، اقتصادیات اور سیاسیات غرض کہ ہر طرح کے مضامین کے بارے میں جوش کی وسعت مطالعہ نے ان کے تراجم میں مدد دی۔ لغت جوش کی ترجمہ نگاری میں ایک اہم ہتھیار کی صورت میں آئی ہے۔ جوش نے لغت دیکھنے کے سلسلے میں کبھی تساہل پسندی سے کام نہیں لیا۔ دارالترجمہ حیدر آباد اور ترقیٔ

اردو بورڈ کراچی میں کام کے دوران جوش نے لغت کی ترویج کے لیے کام کیا اسی لیے ان کے ہاں نادر مترادفات اور اصطلاحات بھی ملتی ہیں۔ جوش کی ذہنی وسعت نے لغت کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ مختلف علوم وفنون کا مطالعہ متن میں عمدگی لانے کے ساتھ ساتھ اپنے پسندیدہ موضوع پر گرفت اسی صورت برقرار رکھ سکتا ہے جب مترجم اس کی مبادیات سے آگاہ ہو۔ مثلاً معاشیات کی کسی کتاب کا ترجمہ کرنے والا اسی وقت بہتر ترجمہ کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے جب وہ موضوع سے مکمل مناسبت رکھتا ہو۔ جوش نے کتنی خوبی سے صاحبِ مضمون کے منشا کو الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔

> "خوش آوازوں کے گلے سے نکلی ہوئی شاعری ہزاروں سامعین کو دھوکا دے چکی ہے۔ کیا تم نے اچھے گوّیوں کے ترانوں کو کتاب کے اندر دیکھا ہے؟ اگر ان کی شاعری جس طرح انسان کے گلے سے نکلتے وقت وجد آفرین معلوم ہوئی تھی اُسی طرح مطبع کی مشین سے نکل کر بھی کیف انگیز ہے تو اسے ضرور تسلیم کرو۔ ورنہ آگاہ ہو کہ آوازوں کا اتار چڑھاؤ تمہیں دھوکہ دے کر تمہاری ہنسی اڑا رہا ہے۔ اور بزم شعر و سخن میں تمہارا گلا پھاڑ پھاڑ کر تعریف کرنا، اہل نظر کی نگاہ میں تمہیں حقیر و ناقابل فہم ٹھہرا رہا ہے۔ فنونِ لطیفہ کا ہر وہ کارنامہ جو ہمارے تمام وجود کو ہلا اور لرزا دے سکتا ہے۔ اس قابل ہے کہ ہم اس کی پرستش کریں اور اسے لافانی ٹھہرائیں۔ ادب میں دیانت، موسیقی میں الہام، رقص میں وقار، صنم تراشی میں تناسب اور نقاشی میں خواب ہائے بیداری کی نمود، یہ تمام چیزیں انتہا درجے کی نادر اور فنون لطیفہ کے اجزائے لاینفک میں سے ہیں۔" (٦٦)

عمدہ تخلیق کے لیے جس علم، مشاہدے اور فنی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے ترجمے کے لیے بھی انہی کیفیات اور فنی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر مصنف کے تخلیقی عمل کی پیچیدگی تک رسائی حاصل کر کے اس کے نفسیاتی عمل کو بھی سمجھنا ہوتا ہے۔ جوش ادب میں فی زمانہ ہونے والی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ادبی تحریکات سے بھی آگاہ تھے اور مختلف ملکوں میں آنے والے انقلابات کے معاشی، سیاسی اور نفسیاتی عوامل سے آگاہی نے ان کی ترجمہ نگاری میں خوبصورتی پیدا کر دی تھی۔ جوش نے خواہ مخواہ کی عبارت آرائی کی بجائے سادے طریقے سے ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے اور جہاں ضرورت پڑی ہے ترجمہ کو گھٹایا بڑھایا ہے۔ متن کی ضرورت کے پیش نظر بات کو مبسوط طریقے سے پیش کرنے کی کوشش میں جوش کامیاب رہے ہیں۔ جوش نے جس سلیقے سے ذخیرۂ الفاظ کو استعمال کیا ہے اُس نے ان کے ترجمے کے حسن کو دوبالا کیا ہے اور اس بات کی احتیاط کی ہے کہ اگرچہ وہ خود صاحب اسلوب مصنف ہیں لیکن ان کا یکساں اسلوب ترجمہ کو سپاٹ نہ کر دے لیکن ترجمہ کی اوٹ سے جوش کا انداز بیاں پھر بھی اپنا رنگ دکھا دیتا ہے۔ تخلیقی آدمی کے اپنے رجحانات شعوری اور غیر شعوری طور پر ترجمہ کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں۔ "صابر کے موتی" میں جوش کا اسلوب مصنف کے اسلوب پر چھایا ہوا ہے۔

سورۂ رحمٰن کا ایک منظوم تاثر پیش کرتے ہوئے جوش نے عربی کے اردو ترجمے کو منظوم صورت میں پیش کیا ہے۔ جوش نے کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا کہ یہ لفظ بہ لفظ ترجمہ ہے یا بامحاورہ ترجمہ ہے بلکہ انہوں نے "سورہ رحمن ایک منظوم تاثر" کے زیر عنوان ترجمہ پیش کیا ہے۔ اسے ہم ترجمہ کہہ بھی سکتے ہیں اور نہیں بھی کیونکہ مصنف نے تاثراتی ترجمہ پیش کیا ہے۔ سورہ رحمنٰ پڑھ کر جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور انسان کی غفلتوں کا بیان تاثراتی انداز میں ذہن پر ثبت ہوتا ہے اسی کو جوش نے منظوم تاثر کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔ لیکن اس میں خوبصورتی، روانی اور شدتِ تاثر موجود ہے۔ جوش لکھتے ہیں۔

۱۔ اے فنا انجام انساں کب تجھے ہوش آئے گا
تیرگی میں ٹھوکریں آخر کہاں تک کھائے گا
اس تمرّد کی روش سے بھی کبھی شرمائے گا
کیا کرے گا سامنے سے جب حجاب اٹھ جائے گا

کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

۴۔ پھول میں خوشبو بھری، جنگل کی بوٹی میں دوا
بحر سے موتی نکالے صاف، روشن، خوش نما
آگ سے شعلہ نکالا، ابر سے آبِ صفا
کس سے ہو سکتا ہے اس کی بخششوں کا حق ادا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

۵۔ خُلد میں حوریں تیری مشتاق ہیں، آنکھیں اٹھا
نیچی نظریں جن کا زیور، جن کی آرائش حیا
جن و انساں میں کسی نے بھی نہیں، جن کو چھوا
جن کی باتیں عطر میں ڈوبی ہوئی جیسے صبا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا(٦٧)

ڈاکٹر ہلال نقوی جوش کی ترجمہ نگاری کے بارے میں اس طرح اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

''ان کے شعری ترجمے محض ترجمے نہیں ہیں اس میں ان کی تخلیقی انفرادیت نے اپنی ایک شناخت قائم کی ہے۔ سورہ رحمٰن کے عربی اظہار کو انہوں نے اردو میں جو شعری پیکر عطا کیا ہے وہ اس کی بہت زندہ مثال ہے۔ یہ منظوم ترجمہ تو قرآنی حوالے سے ایک عالمانہ و مدبرانہ پیرائے بھی رکھتا ہے۔ جو اہل فکر و نظر اہل نقد اس سورہ کی حکیمانہ تفاسیر سے آگہی رکھتے ہیں۔ وہ جوش کے اس شعری اظہار کی معنویت کو زیادہ محسوس کر سکتے ہیں۔''(٦٨)

اخباری تراجم کے لیے اسلوب کی سادگی اور عام فہم انداز اپنانا ضروری ہے۔ جوش کا مقالہ ''مسائل حیات'' ان کے رسالے ''کلیم'' میں قسط وار طبع ہوتا رہا۔ جو اسلوب کی سادگی اور عام فہم انداز کا مظہر ہے۔ غیر شخصی اسلوب کو نبھانا ایک مشکل امر ہے لیکن جوش اس سے بھی کماحقہ گزرے ہیں۔ مختصر وقت میں ترجمہ کرنے کی مہارت اور ترجمے پر نظر ثانی کی عادت کی وجہ سے جوش کے ترجمے پر طبع زاد ہونے کا گمان ہوا۔

جوش نے ترجمے میں اختلافی امور والے موضوعات کو منتخب کرنے سے گریز کیا ہے۔ انہوں نے موضوعات وہ منتخب کیے ہیں جو عام فہم ہیں۔ مذہبی اور سیاسی امور کے تراجم بعض اوقات کسی فرقے کی دل آزاری کا سبب بن جاتے ہیں اس لیے جوش نے لسانی اور مذہبی منافرت پیدا کرنے والے امور کو نظر انداز کرتے ہوئے ترجمے کے لیے نہیں چُنا۔

ترجمے میں مترجم کی ذات بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ ترجمہ کی تکنیک آسان ہے مگر ترجمہ کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے لیے شوق، صلاحیت، تربیت، ریاضت، سنجیدگی، جگر کاوی، اور مالی منفعت سے قطع نظر کرنا ضروری ہے۔ جوش کے ہاں یہ تمام خصوصیات موجود ہیں۔

اردو ادب میں ترجمہ کی جس روایت سے جوش منسلک رہے اس سے آگے چل کر کئی نامور شخصیات شریک ہوئیں۔ قراۃ العین حیدر نے ہنری جیمز کے ناول ''ہمی چراغ ہمی پروانے'' کے نام سے ترجمہ کیا اور اسی دور میں عنایت اللہ نے رڈیارڈ کپلنگ کے ناول ''Kim'' کا ترجمہ

"زلفی" کے نام سے کیا۔ دانتے کی "جہنم" کا ترجمہ کیا اور اناطول فرانسس کے ناول تائیس کا ترجمہ کیا۔ اس کے بعد محمد حسن عسکری کا نام ابھر کر سامنے آتا ہے جنھوں نے "سرخ فیتہ" "مادم بواری" اور "موبی ڈک" کے نام سے بالترتیب استاں دال، فلوبیئر اور ہرمن میلول کے ناولوں کے ترجمے کیے۔ انتظار حسین نے بھی "ناؤ" اور دوسری کہانیوں کے تحت افسانوی کے تراجم کیے۔ سیدہ نسیم ہمدانی نے محمد حسن عسکری کی زیر نگرانی "سیاہ ویران اندھیرا گھر" اور "بڈھا گوریو" جیسے اچھے تراجم کیے۔ اس کے بعد کے دور میں محمد سلیم الرحمن (جہاں گرد کی واپسی) شاہد حمید (جنگ اور امن) ترجمے کے ضمن میں بڑے نام آتے ہیں۔ کچھ برسوں میں آصف فرخی اور اجمل کمال اچھے مترجم کے روپ میں سامنے آئے ہیں۔

۳: جوش کی تنقید نگاری

جوش ملیح آبادی نے اردو نثر میں تنقید نگاری کے جوہر بھی دکھائے ہیں۔ لیکن ان کا جائزہ لینے سے پہلے ہم دیکھتے ہیں کہ تنقید کیا ہے؟ اپنے ذوق کی تسکین اور دوسروں کے نتائج فکر کی قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے بھی اس فن کا جاننا بے حد ضروری ہے جسے اردو میں تنقید کہتے ہیں اور انگریزی میں (Criticism) اردو میں (Criticism) کا ترجمہ تنقید کیا جاتا ہے لیکن زیادہ صحیح لفظ نقد یا انتقاد ہے جس کا مفہوم پرکھنا یا جانچنا ہے۔ (Criticsim) کا ماخذ یونانی لفظ ہے جس کے معنی فیصلہ کرنے کے ہیں۔ جو شخص یہ خدمت انجام دیتا ہے اسے نقاد کہتے ہیں۔ مختلف ناقدین نے تنقید کے بارے میں مختلف رائے دی ہیں۔ میتھیو آرنلڈ کہتے ہیں۔

> "دنیا میں جو بہترین باتیں سوچی گئی ہیں انہیں غیر جانبدارانہ طور پر جاننے اور عام کرنے کی خواہش کا نام تنقید ہے۔"(۶۹)
>
> آلِ احمد سرور کے خیال میں "تنقید کے لیے پرکھ کا لفظ سب سے موزوں ہے کیونکہ اس میں تعارف، ترجمانی اور فیصلہ سب آ جاتے ہیں"(۷۰)

ڈاکٹر سید عبداللہ تنقید کا مفہوم اس طرح واضح کرتے ہیں "لغت میں تنقید کا لفظ جانچنا اور پرکھنا کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ عربی میں اس مقصد کے لیے نقد اور اہم کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں کھرے درہم کو کھوٹے یا بُرے درہم سے الگ کرنا۔ انگریزی میں تنقید کے لیے (criticism) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو کہ محض عیب چینی سے لے کر ادب پارے کی تحلیل، تشریح، تفسیر اور درجہ شناسی تک ہر معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اور Estimate، Assessment، Apprecia Judgement جیسے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں"(۷۱)

ڈاکٹر محیی الدین قادری زور تنقید کی تعریف یوں کرتے ہیں:

> اس کے لفظی معنی تو یہ ہیں کہ کھرے کھوٹے میں امتیاز پیدا کرنا مگر اصطلاح میں تصنیفات کے (اور بعض جگہ ذاتیات کے بھی) معائب و محاسن کو ایک ایک کر کے دکھانا تنقید ہے۔(۷۲)

تنقید کے لیے موازنہ، محاکمہ، تقریظ اور مکابرہ جیسے الفاظ بھی ملتے ہیں، موازنہ دو یا دو سے زیادہ شاعروں اور ادیبوں کے کام کا تقابلی مطالعہ ہوتا ہے۔ محاکمہ کسی نزاع کی صورت میں شعراء و ادباء کے مابین فیصلے کی ایک صورت ہے۔ تقریظ کسی ادب پارے کی خیالی انداز میں تعریف و تحسین ہے جبکہ مکابرہ کسی ایک شاعر یا ادیب کے کام کو کسی دوسرے پر ترجیح دینا مکابرہ کہلاتا ہے۔

زندگی میں ہر لمحہ ہم تنقید کے عمل سے دوچار رہتے ہیں۔ تنقیدی بصیرت انسانی زندگی کے لیے اسی قدر اہم ہے جس قدر ہوا، پانی اور دیگر اشیائے ضروریہ، ٹی ایس ایلیٹ تنقید کی تعریف یوں کرتا ہے۔ "تنقید ہماری زندگی کے لیے اتنی ہی ناگزیر ہے جتنی کہ سانس"(۷۳)

تخلیق میں بھی تنقید کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ تحقیق میں ضروری ہے۔ کیونکہ جب تک ہم اچھے اور بُرے میں چناؤ نہیں کریں گے ہم ایک شاہکار تخلیق نہ کر سکیں گے۔ حالی نے شاعر ورجل کی مثال دی ہے کہ ''صبح کو اپنے اشعار لکھواتا تھا اور پھر ان پر غور کرتا تھا اور ان کو چھانٹتا تھا اور یہ بات کہتا تھا کہ ریچھنی بھی اسی طرح سے چاٹ چاٹ کر اپنے بچوں کو خوبصورت بناتی ہے

اور ایرسٹوٹل کی مثال ہے کہ

''اس کے مسودے اب تک فریرا (اٹلی) میں محفوظ ہیں۔ ان مسودوں کو دیکھنے والے کہتے ہیں کہ جو اشعار اس کے نہایت صاف اور سادے معلوم ہوتے ہیں وہ آٹھ آٹھ دفعہ کاٹ چھانٹ کے بعد لکھے گئے ہیں۔(۷۴)

تنقید میں تحقیق کی اہمیت کے حوالے سے جمیل جالبی لکھتے ہیں۔ ''بے تحقیقی تنقید وہ کوڑا کرکٹ ہے جسے پہلی فرصت میں دریابُرد کر دینا چاہیے۔''(۷۵)

سکاٹ جیمز نے اپنی کتاب ادب کی تشکیل میں واضح کیا ہے کہ

''نقاد کو اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ شاعر یا ادیب کے کسی کارنامے پر تبصرہ کرتے ہوئے الٹے پاؤں واپس جاسکے تاکہ خود اپنے تخلیقی تخیل سے کام لے کر آغاز سے تکمیل تک اس کارنامے کا تجزیہ کر کے اس کو سمجھ اور سمجھا سکے''(۷۶)

نقاد کو زندگی کے خارجی و داخلی واقعات و واردات کا ویسا ہی حقیقی اور بھرپور شعور ہونا چاہیے جیسا کہ فنکار کے لیے ضروری ہے۔ نقاد کے لیے انسانی زندگی اور کائنات کا مطالعہ و مشاہدہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ خود شاعر یا ادیب کے لیے ورنہ وہ نہ سمجھ سکے گا کہ شاعر و ادیب نے اپنی تخلیق کے لیے مواد کہاں سے حاصل کیا ہے۔ ادب میں تنقید کا مطلب ہے کسی ادبی تخلیق کا ہمہ گیر جائزہ تنقید میں تین ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔ ا۔ اثر قبول کرنا، ۲۔ تشریح و تجزیہ کرنا ۳۔ قدر و قیمت کا تعین کرنا یا فیصلہ دینا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کہتے ہیں کہ:

''تنقید بڑی اہمیت رکھتی ہے اور اس کے بغیر ادب کے بہتے ہوئے چشمے میں روانی پیدا نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے خشک ہو جانے کے امکانات ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہر ملک کے ادب میں ہر دور اور ہر زمانے میں اس کا وجود ملتا ہے۔ چاہے اس کی صورت کچھ بھی رہی ہو۔''(۷۷)

تنقید نگار جہاں ہر زاویے میں فن پارے کو جانچتا پرکھتا ہے، اس پر اظہار رائے کرتا ہے، وہاں دیگر علوم کی شاخوں سے بھی اس کو تشبیہہ دیتا ہے۔ فن پارے کا تجزیہ کرتے ہوئے اور رائے دیتے ہوئے جہاں اس کو نفسیاتی اعتبار سے دیکھتا ہے وہاں عمرانی، جمالیاتی، تاریخی علوم اور دبستانوں سے بھی اس فن پارے اور فنکار کے تعلق کو بیان کرتا ہے۔ مختلف نقادوں کو مختلف دبستانوں سے مخصوص قرار دے کر ان کے تنقیدی مسلک کی وضاحت کی جاتی ہے۔ ان میں رومانی، نفسیاتی، عمرانی، مارکسی، جمالیاتی اور تاثراتی دبستان نمایاں ہیں۔ دبستان، تحریکوں اور مختلف نوع کے نظریات سے قطع نظر تنقید کی دو اقسام کی جاسکتی ہیں۔ ا۔ نظری، ۲۔ عملی

نظری تنقید میں تنقید پر تنقید کی جاتی ہے۔ اس سے ایک طرف تو تخلیقی کاموں کو جانچنے، پرکھنے اور درست رائے قائم کرنے میں زیادہ مدد ملتی ہے اور دوسری طرف یہ تنقیدی نظریات، آرٹ اور ادب کی تخلیق کے لیے ایک ماحول پیدا کرتے ہیں اور خود فنکاروں کو بھی اس سے درست راہوں کا پتا چلتا ہے۔ عملی تنقید میں براہ راست کسی شاعر، ادیب یا فن کار کے تخلیقی کارناموں پر نظر کی جاتی ہے۔ اس میں اصولوں کی بحث ضروری نہیں ہوتی لیکن اصولوں پر بحث کے بغیر تنقیدی نظر ڈالنا مشکل ہوتا ہے۔ اس سے نقاد جب کسی شاعر یا ادیب کا تنقیدی جائزہ لیتا ہے تو اس میں اصولوں کی بحث بھی چھڑ جاتی ہے۔

جوش ملیح آبادی میں تنقیدی جذبات کی فراوانی تھی۔ سب سے پہلے تو اپنے کلام اور نثری تحریروں پر تنقیدی نظر دوڑاتے پھر اسی معیار پر دوسروں کی تحریروں کو پرکھنے لگے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی کتاب ''روح اقبال'' پر جوش کی تنقیدی نظر خاصے کی چیز ہے۔ ایک عرصے

تک گمشدہ رہنے کے بعد اس کتاب کا قلمی نسخہ ڈاکٹر ہلال نقوی کو دستیاب ہوا ہے لیکن ہنوز مارکیٹ میں طبع شدہ صورت میں نہیں پہنچا ہے۔ جوش نے اس کتاب پر حواشی میں اپنے اعتراضات تنقیدی صورت میں رقم کیے ہیں۔ جوش ملیح آبادی نے اپنی آپ بیتی "یادوں کی برات" میں بہت سی شخصیات کے خاکے کھینچے ہیں اُن کے ذریعے بھی جوش کی 'تنقیدی صلاحیت سے آگاہی ہوتی ہے'۔ جوش نے مختصر لفظوں میں ان شخصیات کا تعارف کروا کر ان کا مفصل نقشہ قارئین کے سامنے بیان کر دیا ہے۔ میاں محمد صادق کے بارے میں جوش کا تنقیدی جائزہ ملاحظہ کیجئے۔

"دراز قامت، ژرف نگاہ، شب رنگ، صباح طینت، لاہور کے باشندے، دورِ فرنگی کے پولیس افسر، عقیدے کے لحاظ سے قادیانی، نواہی سے بیزار، اوامر کے پابند، نماز پنجگانہ کے بغیر سانس لینے کو گناہ سمجھنے والے، سخن سنج، شاعر نواز، اخلاص شعار، مردم شناس، عہدے کے اعتبار سے شب یلدا اور پاکیزگی طبع و شرافتِ نفس کے نقطہ نظر سے صبح صادق۔ یہ غالباً ۱۹۳۵ء کی بات ہے، جب میں دہلی سے کلیم نکال رہا تھا، اس وقت وہ دہلی خفیہ پولیس کے سینئر سپرنٹنڈنٹ تھے۔ ہر چند ہمارے مابین بڑا تضاد تھا۔ وہ شدت کے ساتھ دیندار تھے، میں پابندی کے ساتھ بادہ خوار تھا (اور خدا کے فضل و کرم سے اب بھی ہوں) وہ حسینوں کی جانب نگاہ اٹھانے کو گناہ سمجھتے تھے۔ میں ان کی طرف نگاہ اٹھانے کو عبادت سمجھتا تھا۔ وہ کانگریس کے دشمن تھے، میں کانگریس دوست تھا۔ وہ حکومت برطانیہ کے وفادار تھے، میں اس کا زبردست باغی تھا"۔

(یادوں کی برات ص۵۲۶)

درج بالا اقتباس میں جوش ملیح آبادی نے موازنہ یا تقابل کے ذریعے میاں محمد صادق اور خود کے مابین بنیادی خصائص کو واضح کرتے ہوئے دونوں کی شخصیت کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ مصطفیٰ زیدی کے بارے میں جوش کا اقتباس ملاحظہ کیجئے

"یہ ایک انوکھی نوک پلک کا ہونہار شاعر ہے۔ ہر چند قدیم روش کو ترک کر کے یہ جدید ڈھرّے پر آ گیا ہے لیکن اس کے کلام میں آئمۂ ادب کی سی شان پائی جاتی ہے۔ اس کی شاعری، اس قدر بلند تخیل اور اس درجہ نرالے طرز بیاں کی حامل ہے کہ بسا اوقات سر دُھننے اور اس کا منہ چوم لینے کو جی چاہتا ہے اور کبھی کبھی تو یہ تمنا پیدا ہو جاتی ہے کہ کاش میں بھی ایسا کہہ سکتا۔ اللہ نظر بد سے بچائے "

(یادوں کی برات ص۵۵۸)

جوش زندگی کی مختلف میدانوں میں تنقید نگاری سے کام لیتے ہیں۔ کالم نگاری، اداریہ نویسی، خاکہ نگاری، اصلاح نویسی، مقالہ نگاری، خطوط نگاری اور یہاں تک کہ روزمرہ گفتگو میں بھی ان کی تنقید نگاری جاری رہی۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین اپنی کتاب "مختصر تاریخ ادب اردو" میں رقمطراز ہیں۔

دلیل کے ساتھ تنقید اور اثر کے ساتھ زور ہر جگہ نمایاں ہے"(۷۸)

حمید اختر نے اپنی ایک تقریر میں، جو انہوں نے جوش صدی سیمینار میں بسلسلہ صد سالہ یومِ پیدائشِ جوش میں پڑھی، کہا

"جوش میں تنقید کو قبول کرنے کی صلاحیت بھی تھی، جب ان کی طویل نظم "تخلیق کائنات" (حرفِ آخر کا ایک جزو) پر سجاد ظہیر نے ڈرتے ڈرتے کچھ تاریخی غلطیوں کی نشاندہی کی تو جوش نے کسی برہمی کا اظہار نہیں کیا بلکہ نظم پر نظر ثانی کر کے ان غلطیوں کو ٹھیک کر دیا۔ اس محفل میں علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی بھی موجود تھے۔"(۷۹)

ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی کتاب تاریخ ادب اردو، جلد سوم میں جوش کی تنقیدی بصیرت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"خزائن الفصاحت (دیوانِ امانت) کا نسخہ جو میرے مطالعہ میں رہا وہی مطبوعہ نسخہ حضرت جوش ملیح آبادی کے مطالعے میں بھی رہا۔ جسے انہوں نے جستہ جستہ دیکھا اور امانت کے چند اشعار پر اعتراضات حاشیے میں درج کر دیئے جو یہ ہیں: ۱۔ امانت کا شعر ہے۔

گل رخوں کی بزم میں کہنا امانت کا سلام
اے صبا! تیری رسائی گر وہاں ہو جائے گی

جوش ملیح آبادی نے لکھا ہے "ہو جائے" کا موقع ہے یعنی "گی" زائد ہے۔ ۲۔ امانت کا شعر ہے۔

پھول سب توڑ کے اُن کو پنہانا گل چیں
باغ اجڑتا تو وہ کلیوں کو بساتے جاتے

جوش نے لکھا ہے کہ "پہنانا" کہا جاتا ہے اس دور میں یہ اسی طرح استعمال ہوتا تھا۔ ناسخ کے ہاں بھی ہے اور علی اوسط رشک کے ہاں بھی۔ ۳۔ امانت کا شعر ہے

اسی کے دھیان میں دلیل و نہار رہتا ہے۔
اسی کو دل شام و سحر یاد کرتا ہے

جوش نے لکھا ہے کہ "رہتا" اور "کرتا" غلط قافیہ ہے۔ یاد رہے کہ اسی فنی و علمی نوعیت کے اعتراضات نساخ نے انیس و دبیر کے زبان و بیان پر کیے تھے جن سے سارے ہندوستان میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔" (۸۰)

جوش ملیح آبادی ترقیٔ اردو بورڈ کے مشیر تھے تو شاہد احمد دہلوی نے انہیں ڈپٹی نذیر احمد کی کتاب "منتخب الحکایات" کا مسودہ ارسال کیا۔ جوش نے اصل متن میں ترمیم کر دی جس سے بدمزگی پیدا ہوئی۔ شاہد احمد دہلوی اور جوش کے درمیان قلمی معرکہ چل نکلا۔ شان الحق حقی جو کہ جوش کے ساتھ سیکرٹری ترقیٔ اردو بورڈ سندھ تھے، لکھتے ہیں۔

"منتخب الحکایات" شاہد احمد دہلوی سے مرتب کرائی گئی تھی۔ مراۃ العروس کا مقدمہ بیگم شائستہ اکرام اللہ نے لکھا تھا۔ دونوں کتابیں چھپنے کو تیار تھیں۔ میں نے ضروری سمجھا کہ انہیں جوش ملیح آبادی صاحب کے ملاحظے میں پیش کر دیا جائے... میرا خیال تھا کہ وہ ان مرتب شدہ کتابوں کو ایک نظر دیکھ کر واپس کر دیں گے کہ بسم اللہ کر، وہ انہیں لے کر بیٹھ گئے۔ مجھے اس پر تعجب ہوا۔ پوچھا تو کہا ہاں ہم دیکھ رہے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ واقعی بڑی توجہ سے دونوں کتابوں کا اوّل سے آخر تک مطالعہ کیا۔ مقدمے سے لے کر متن اور حواشی تک سرخ روشنائی سے اصلاح کا قلم چلا دیا ہے۔ میں نے کہا کہ حضرت یہ آپ نے کیا کیا؟ کہنے لگے سنوار دیا ہے! میں نے کہا یہ تو مولوی نذیر احمد کی کتابیں ہیں۔ ہم ان میں کیسے ترمیم کر سکتے ہیں۔ ایسے موقع پر ان کا بندھا ٹکا جواب تھا کہ نعوذ باللہ اللہ میاں بھی کہیں یوں نہیں ہونا چاہیے... انہوں نے نذیر احمد کی رواں دواں بول چال کی زباں کو اپنے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ دونوں کتابیں بورڈ میں محفوظ ہوں گی۔" (۸۱)

خلیق انجم نے بتایا کہ:

"جوش نے اتنی زیادہ ترمیمیں کیں کہ اصل متن پڑھنے کے قابل نہیں چھوڑا... ظاہر ہے کہ کسی بھی قدیم متن کو شائع کرنے کا ہرگز یہ طریقہ نہیں ہے کہ اس کی زبان بدل دی جائے۔ جوش کو زبان پر لاکھ قدرت سہی لیکن وہ اس کے اہل نہیں تھے کہ ڈپٹی نذیر جیسے صف اوّل کے ادیب کی زبان میں ترمیم کریں۔" (۸۲)

جوش نے اس تنقیدی رویے کی توجیہہ یوں پیش کی کہ:

"ناملائم مطبوعہ حروف اور نہ رواتی منطوقی الفاظ نے میری آنکھوں اور میرے کانوں کو ہزار بار ڈسا ہے اور بُری طرح ڈسا ہے... مقدمہ اور اصل کتاب میں جو لسانی خامیاں مجھ کو نظر آئیں۔ میں نے ادبی دیانت سے مجبور ہو کر ان پر خط کھینچ دیئے۔ (۸۳)

نقاد کا یہ کام نہیں کہ متن میں ترمیم و تنسیخ کرے۔ البتہ وہ اپنی رائے حاشیے میں درج کر سکتا ہے۔ جوش نے اصول تحقیق کی خلاف ورزی کی کیونکہ تحقیق کے قاعدے سے پرانے مسودات، قلمی نسخوں اور کتابوں میں ترمیم ناجائز کام ہے۔ جوش نے اتنی ترامیم کیں کہ نسخہ ہی یکسر تبدیل کر دیا۔ انہوں نے اپنی تنقیدی بصیرت کو غلط انداز میں پیش کیا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ اصل مسودے کی ایک نقل تیار کرتے اور اس پر اپنے اعتراضات درج کرتے یا نوٹس لیتے جبکہ جوش کی اس سعی نے متن کا جنازہ نکال دیا۔

حکیم آزاد انصاری نے رسالہ جامعہ بابت ماہ جنوری ۱۹۳۷ء میں اپنے مجموعہ کلام کی اشاعت کی تقریب سے ایک مقدمہ نما مضمون ''غزل کی حمایت'' میں شائع کرایا تھا۔ جس پر جوش کی تنقید ''نقاد'' کے نام سے کلیم، دہلی کے مئی ۱۹۳۷ء کی اشاعت میں طبع ہوئی۔ مقالے کا عنوان ''غزل گوئی'' تھا۔ آزاد کے مضمون کی تنقید میں جوش لکھتے ہیں:

''آزاد صاحبِ غزل کی مزعومہ خصوصیت، ایجازِ بیاں پر زور دیتے نہیں تھکتے لیکن حرف و حکایاتِ غزل میں اور اجمال بیان؟ ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ

''افسانہ آں شبے کہ بایار گزشت'' والی حکایت بھی مزید اس قابل نہیں کہ اُس کے بیان میں ''دراز تر گفتن'' سے کام لیا جائے؟! خدا جانے مکالمہ بامعشوقہ و غزل کے راوی اپنی زندگی کی دلچسپ ترین سرگزشت کی تفصیل سے کیوں اس قدر گریز کرتے ہیں! اختصار و ایجاز کا پردہ وہ کس خشک یا ناگفتہ بہ واردات پر ڈالنا چاہتے ہیں؟! کیا ہم فرض کریں کہ اس بے سروپا بیانی کا راز

میں مضطرب ہوں وصل میں خوف رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

تاہم آزاد صاحب فرماتے ہیں کہ ''اگر قافیہ تنگی نہ کرے تو قطعہ کے اشعار کی تعداد مقرر نہیں!

وائے برحالِ شاعری و قادر الکلامی، جو قافیے کے رحم پر ہو، پھر کہنے والے کیا غلط کہتے ہیں کہ غزل میں صرف ردیف و قافیے کے لیے مطالب و مضامین لائے جاتے ہیں۔ نہ کہ مطالب و مضامین کے لیے قافیہ ردیف!''(۸۴)

جوش کے غزل گوئی پر اس مضمون نے خوب شہرت پائی۔ جوش جذبات میں تنقید تک محدود نہیں رہتے بلکہ مضمون نگار کو خوب آڑے ہاتھوں لیتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

مثنوی کی تعریف و تنقیص بیک وقت ملاحظہ فرمایئے۔ فاضل مضمون نگار کا ارشاد ہوتا ہے۔

''مثنوی تو ہماری شاعری میں وہ ہمہ گیر و کارآمد صنف ہے جس میں ہر قسم کے بڑے سے بڑے اور طویل سے طویل خیالات بلکہ افسانوں، داستانوں اور تاریخوں تک کو نظم کا جامہ پہنایا جا سکتا ہے اور ایسی تمام اصناف سخن جن میں طویل یا حقیر خیالات و واقعات تسلسل کے ساتھ منظوم کیے جاتے ہیں یقیناً نظم ہی کہلانے کی مستحق ہیں''

سبحان اللہ! طویل یا حقیر خیالات و واقعات؟! مثنوی سحر البیان، مثنوی گلزار نسیم، مثنوی معنوی، فردوسی کا شاہنامہ، ہومر کی الیڈ حقیر خیالات و واقعات کا پشتارہ ہیں؟! آپ کی خبط و بے ربط غزلیں کوئی ٹکے سیر بھی نہیں پوچھتا۔ دراں حالیکہ مذکورہ بالا مثنویاں بین الاقوامی ادبیات کے شاہکار کہلاتے ہیں اور یہ مثنوی گو شعراء پیغمبرانِ شعر!!(۸۵)

جوش نے تبصرہ نگاری میں بھی تنقیدی نقطہ نظر کو ملحوظ رکھا۔ میر زیدی صاحب کی کتاب ''بادۂ فطرت'' پر جوش کا تبصرہ خاصے کی چیز ہے وہ لکھتے ہیں

''بادۂ فطرت کی ورق گردانی کے بعد ہماری نظر پہلے جس نظم کے عنوان پر جمی وہ ایک ایسا عجیب و غریب عنوان ہے جو مستقلاً اردو ادب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ اضافہ تخریبی ہے یا تعمیری، مگر اضافہ ضرور ہے۔ عنوان نظم ہے ''چار بٹے پانچ'' اب نظم شروع فرماتے ہیں مطلع ارشاد ہے۔

مطلوب میں ہے طالب کی جان چار بٹے پانچ
ہر شعر سے ہے صاف عیاں چار بٹے پانچ

یہ اور اسی قسم کے دوسرے کارنامے اس مجموعے میں کافی پائے جاتے ہیں۔ بہت سے اشعار شرمندۂ وزن و تقطیع ہی نہیں ہیں تفصیلی نظر سے دیکھنے پر بہت ممکن ہے کہ کچھ اچھے شعر بھی نکل آئیں، مگر وہ کندن وکاہ بر آوردن'' کا مصداق ہو گا۔
ہم زندگی صاحب کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ ادب کے خطرناک کوچے میں قدم نہ رکھیں۔ عملی زندگی کیا بُری ہے؟ ناپختہ ادیب سے خام مزدور بہتر ہے''۔(۸۶)

اقبال کے بارے میں جوش جس نظریے کو لے کر ساری عمر چلے درج ذیل تنقیدی رائے اس کی عکاس ہے جو کہ انہوں نے ڈاکٹر تصدق حسین خالد کے انگریزی مضمون کے ترجمے کے بارے میں دی جس کے مترجم میاں محمد رفیق خاور ہیں اور جو لاہور سے طبع ہوا، مضمون کا عنوان ''اقبال اور اس کا پیغام ہے'' جوش کا تنقیدی جائزہ کچھ یوں ہے۔

''پنجاب سے اقبال پر اس وقت تک جتنی کتابیں یا مضمون لکھے گئے ہیں حقیقت یہ ہے کہ کسی میں بھی صحیح معنیٰ میں اقبال پر یہ تبصرہ کرتا تو یقیناً اہلِ پنجاب اخبارات و رسائل کے ذریعے اس کو ایسی مغلظات سناتے کہ وہ جواب بھی نہ دے سکتا۔ ہم ڈاکٹر خالد کے ادبی ذوق اور ان کی صحیح قوت تنقید کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی علمی بے باکی و جرأت کی بھی داد دیتے ہیں۔ ناظرین کلیم کو یہ کتاب ضرور دیکھنی چاہیے۔'اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے(۸۷)

جوش سمجھتے تھے کہ اقبال نے خود کو اسلامی فکر سے مربوط کر کے محدود کر لیا ہے وہ تو اس بات کے لیے پیدا ہوئے تھے کہ پوری دنیا کی رہنمائی کریں جبکہ ابتداء میں جوش کا رجحان مذہب کی طرف زیادہ تھا، اقبال نے انہیں بین الاقوامیت کا درس دیا اور خود اسلامی فکر کے منبعوں کو اپنالیا۔ ایک اور تنقیدی تبصرہ ملاحظہ فرمایئے۔ جس میں جوش نے ''منتخب دیوانِ غالب'' مولفہ نور اللہ محمد نوری کی قدر و قیمت متعین کی ہے، لکھتے ہیں:

''غالب بھی اب ہماری ادبیات کی وہ رومانی ہستی ہو گیا ہے جس کے ساتھ ایک علمی و تنقیدی انتساب ہمارے پیر و جوان مصنفین کا ایک ''فیشن ایبل مذاق'' بن گیا ہے! لوگ غالب پر خامہ فرسائی کر کے خود اس پر اس قدر روشنی نہیں ڈالتے جس قدر کہ خود اپنے سامنے ''شمع مشاعرہ'' لانا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب معاملہ بہر رنگے کہ ہستم خود پرستم'' کی اس زبونی کو پہنچ جائے تو اصل موضوع کی خدمت کا کتنا عنصر باقی رہ سکتا ہے۔ زیر تنقید انتخاب غالب ''شرح'' کو ہم اس علمی جلب منفعت (Literary exploitation) کی اک افسوسناک مثال پاتے ہیں! انہی صاحب نے ''داغ'' لکھی ہے اور خاصی لکھی ہے لیکن منتخب دیوان غالب مع شرح کو جیسا سرسری ٹالا ہے خود غالب کی روح اور جواہر ادبی نے بھی انہیں ایسا ہی ٹالا ہے۔ معلوم ہوتا ہے غالب سے انہیں دلچسپی نہیں، صرف اپنی کلاہِ تصنیفی میں ایک طُرّے کا اضافہ کرنے کے لیے غریب غالب کو موردِ التفات فرمالیا گیا ہے! غالب وہ چیز نہیں کہ اُس کی محراب عظمت اُن لوگوں کا سجدہ قبول کر سکے جن کا منہ بوقت باریابی اُس کے قبلۂ عظمت کی طرف سے پھرا ہوا ہو!''(۸۸)

اپنے ایک مضمون انتقاد و انتخاب میں جوش نے انتقاد کی تین اقسام گنوائی ہیں۔

۱۔ تخیلی انتقاد
۲۔ تخریبی انتقاد
۳۔ تحقیقی انتقاد(۸۹)

انتقاد کی پہلی قسم میں ناقد ادیب و شاعر سے بے نیاز ہو کر صرف اپنی جانب متوجہ رہتا ہے اور اپنے چہرے کے خد و خال کے آئینے میں شاعر یا ادیب کو پیش کرتا ہے۔ یوں حقیقی انتقاد سے اس کا رشتہ چھوٹ جاتا ہے۔ تخریبی انتقاد میں ادبی حاسد یا وہ لوگ میدان میں آتے ہیں جو کسی

اتفاقیہ حادثے، خیالات و عقائد کے تصادم و اختلاف کی بنا پر کسی سے بگڑ جاتے ہیں تو اس میں عیب جوئی شروع کر دیتے ہیں۔ کبھی کوئی عیب منسوب کرتے ہیں کبھی کوئی اور تو اور ملک کے نوجوانوں کو خدا اور مذہب کا باغی تک بنا دیتے ہیں۔ تحقیقی انتقاد میں نقاد بہت صعوبت اٹھاتا ہے۔ جوش نے ایک تحقیقی ناقد کے لیے کچھ شرطوں کا ملحوظ خاطر رکھنا ضروری قرار دیا ہے۔ اگر ایک شرط بھی کم ہو گی تو تحقیقی انتقاد نہیں ہو پائے گا۔ سب سے پہلی شرط ہے کہ:

"ناقد شاعر کی روح کو اپنے میں جذب کر لے اور یہ صورت اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب ناقد: (الف) شاعر کے ماضی و حال اور مستقبل کے میلان، شاعر کے کلیات و نظریات، عقائد و اصول، اقارب و احباب، تعلیم و تربیت، محاسن و معائب، مزاج و ماحول، موروثی خصوصیات اور جغرافیائی اثرات سے کماحقہ واقفیت پیدا کر لے اور یہاں تک کہ خلوت و جلوت کی مسلسل و بے محابا ہم نشینی کی ضرورت شاعر کے مرغوبات و معمولات تک پر کامل طور سے حاوی ہو جائے۔ (ب) شاعر کے زمانے کی خصوصیتوں، تقاضوں اور ادبی معاشری اور سیاسی تحریکوں کو بخوبی ذہن نشین کر لے۔ (ج) تقریباً ان تمام تخیلی و عملی راستوں سے خود بھی گزرے جن سے شاعر گزرا یا گزر رہا ہے۔ (د) اور ہر نظم کے باب میں اسے براہ راست یا کم سے کم معتبر ترین وساطت سے یہ معلوم ہو کہ اس کا پس منظر کیا تھا اور وہ جذبے کے تموج میں کہی گئی یا تمکین میں"۔

رسالہ "کلیم" میں شائع ہونے والے جوش کے اکثر مضامین تنقیدی نوعیت کے مضامین ہیں۔ جوش نے اپنی کتابوں کے دیباچوں میں بھی اپنے تنقیدی نظریات کو بیان کیا ہے اور مختلف شخصیات پر لکھے ہوئے ان کے سوانحی خاکے بھی تنقیدی بصیرت کی عکاسی کرتے ہیں۔

آخر میں ہم جوش کا ایسا تنقیدی تبصرہ پیش کر رہے ہیں جس میں انہوں نے نرجس فاطمہ مدیرہ حجاب لکھنؤ کو مفید مشوروں سے نوازا ہے اور مدیرہ کے مقاصد کو سراہا ہے، لکھتے ہیں:

> "محترم مدیرہ سے ہم متفق ہیں کہ طبقۂ خواتین سویا ہوا طبقہ ہے اور اس طبقے کو چونکانے کی اشد ضرورت ہے۔ بلاشبہ عورت کی زندگی پر بڑی حد تک قومی زندگی کا انحصار ہے اور بلاشبہ عورت کی یہ توہین ہے کہ مردوں کی گرسنہ ہوسناکی کو غذا دینے کے لیے اپنی تخلیقی قوتوں کی شعاعیں صرف کھانے کپڑے کی تاریکی میں دفن کر دے۔
>
> ... ہم بطور مشورہ اتنا ضرور کہیں گے کہ اپنی سوسائٹی کی مذہبی رگ کو ان معصوم ولولوں کے ساتھ نہ چھیڑیں ورنہ خود حجاب کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔
>
> دوسرے شعبوں کی طرح ہمارا مذہب بھی بیمار ہے۔ اس کی تندرستی کے لیے خود اسے چھیڑنا خطرناک ہے، مفید نہیں ہمارے خیال میں مدیرۂ حجاب اپنی توجہ انہیں بھیدوں کی طرف مبذول کریں جن کی طرف طبقۂ خواتین نے مخصوص طریقے سے توجہ فرمائی ہے۔"(۹۰)

جوش نے ان تبصروں میں تنقیدی شعور کی کارفرمائی دکھائی ہے۔ جہاں جہاں غلطیاں ہیں ان کی نشاندہی کی ہے اور جہاں جہاں خوبیاں دکھائی دی ہیں ان کو سراہا ہے۔ ہر نقاد ایک مخصوص فکر کا علمبردار ہوتا ہے۔ جوش نے بھی مولانا آزاد کی غزل گوئی پر تنقید اسی مقصد کو مدنظر رکھ کر کی ہے۔ اور غزل گوئی کی تنقیص میں ان اساتذہ کی خدمات سے صرفِ نظر کیا ہے۔ جنہوں نے غزل گوئی کا نام بلند کیا ہے۔ اگر میر حسن، دیاشنکر نسیم، فردوسی اور ہومر کا نام زندہ ہے تو غزل میں ولی، میر تقی میر، میر درد، غالب، مومن، مصحفی، حیدر علی آتش اور داغ کا نام بھی زندہ ہے۔ اور تصدق حسین خالد کی کتاب "اقبال اور اس کا پیغام" پر تبصرہ کرتے ہوئے بھی اپنے اسی نقطہ نظر کو واضح کیا ہے۔ جس کے تحت اقبال کے ناقدین کو اس وجہ سے پسند کرنا کہ انہوں نے اقبال پر تنقید کرنے کی جرأت کی ہے۔ لیکن نقد و نظر میں جوش نے جن کتابوں پر تبصرہ کیا ہے ان کے محاسن و معائب کو کھل کر بیان کیا ہے۔ گویا تنقید کا حق ادا کر دیا ہے۔ بعض مقامات پر تفسیر، تشریح اور وضاحت سے بھی کام لیا ہے۔ غالب کے شعر کی تشریح کر کے فاضل مصنف کو منشائے مصنف تک پہنچنے کی دعوت دی ہے۔

جوش کی جو تنقیدی کتب ابھی تک سامنے نہیں آ سکی ہیں۔ ان میں سے ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی کتاب ''روح اقبال'' ڈاکٹر ہلال نقوی کو دستیاب ہو چکی ہے۔ دیوان حافظ اور شبلی کی کتاب ''موازنہ انیس و دبیر'' کے کچھ صفحات پر انہوں نے اپنی رائے تحریر کی تھی۔ سید سبط حسن کی ایک تصنیف پر جوش نے حاشیے میں اپنی رائے تحریر کی تھی۔

۴: جوش ملیح آبادی بطور صحافی

(مدیر / اداریہ نویس و کالم نگار)

اردو لفظ صحافت انگریزی لفظ Journalism کا ہم معنی ہے، صحافت لفظ صحیفے سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی کتاب یا رسالہ کے ہیں لیکن ''جنزل'' کے معنی چونکہ حساب یا روزنامچہ کے ہوتے ہیں اس لیے ''جرنلزم'' کا لفظ اُس تمام مواد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو پابندئ وقت کے ساتھ شائع کیا جاتا ہو۔ اخبارات اور رسائل میں شائع ہونے والی تحریریں اسی ذیل میں آتی ہیں۔

''اسائیکلوپیڈیا برٹینکا'' میں اس کے معنی یہ درج ہیں۔

> ''اخبارات اور ماہناموں میں لکھی اور شائع ہونے والی تحریریں جرنلزم ہیں اگرچہ اس کی بنیادی تعریف یہ ہے کہ وہ بے شمار کام جو کسی بھی قسم کی اشاعت سے متعلق ہوں اسی میں شامل کیے جاتے ہیں... اس طرح خبروں کو جمع کرنا، ان کی ترسیل، مختلف روزناموں اور ماہناموں میں شائع ہونے والے اشتہارات اور تجارت سے متعلق تمام چیزیں جرنلزم کے میدان سے تعلق رکھتی ہیں۔(۹۱)

انسائیکلوپیڈیا امریکانو میں درج ہے۔

Journalism, the collection and periodical dissemination of current news and events, or more strictly the business of managing, aditing, or writing for jounrals or news paper. The usage of term has broadened to include news reporting and commenteries on radio and television, and to a lesser extent, motion pictures. Despite of the increasing importance of these new field, the daily newspaper, which uniquely combines the virtues of up-to-dateness with the relative parmanency of the printed page, is still the basic news medium.(92)

دی ورلڈ بک انسائیکلوپیڈیا میں اس کی تعریف یوں درج ہے۔

Journalism is one of the most important professions. It informs citizens abort events in their community, the nation, and the world. The reports of journalists also help peopole from opinions about current affairs. Journalists inform the public through several means of communication, especially news papers, magazines, radio, and television, these means of communication are often referred to as press or the news media.(93)

صحافتی تحریروں میں رسائل جو ہفت روزہ، پندرہ روزہ اور ماہوار ہوتے ہیں بعض سہ ماہی اور شش ماہی بنیادوں پر بھی طبع ہوتے ہیں۔ اخبارات اور رپورٹیں، اداریئے، شامل ہیں۔ فی زمانہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو بھی صحافت کی ذیل میں شامل کیا گیا ہے۔ سماجی زندگی کی ابتداء کے ساتھ لوگوں کے تبادلہ خیال سے صحافت کا آغاز ہوا۔ قاصد، نقیب، شعراء کرام، سماجی اجتماعات، کلیسا کے پادری، مبلغین، ان سب کے ذریعے اطلاعات ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجی گئیں۔ شیلے نے ڈکشنری آف ورلڈ لٹریچر میں سب سے پہلے مطبوعہ خبر نامہ کے چین سے نکلنے کی اطلاع دی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

> ''چین نے سب سے پہلا اخبار چودھویں صدی میں نکالا۔ سولہویں صدی میں اسے ''ایک گزیٹا'' (سکہ) کے عوض فروخت کیا جاتا تھا۔ بعد میں تمام انگلش اخبارات کا نام اسی نام پر رکھا گیا(۹۴)

لیکن یورپ میں قلمی اخبار کا اجراء دو ہزار سال پہلے ۱۵۷ قبل مسیح میں ہوا تھا، ایک قلمی اخبار نکلتا تھا جس کی کتابت پر سرکاری کاتب خصوصی طور پر مامور تھے۔ اس سرکاری اخبار کو الٹاڈیویورنا Acta Diurna کہا جاتا تھا جو کہ لاطینی لفظ Acta (بمعنی کارروائی اور diurna بمعنی روزانہ سے مرکب ہے۔ یعنی روزانہ کارروائی۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں درج ہے۔

When julias ceasar became Roman Consul in 60 BC. He immediate established the acada diurma, a daily bulletin posted in the fourm and devoted chiefly to government announcements"(95)

دنیا کے مختلف ممالک میں اخبار شائع ہونے لگے اور پھر آہستہ آہستہ ان کے ساتھ رسائل بھی شائع ہونے لگے۔ ادب زندگی کا آئینہ ہے اور زندگی کے بطن سے پیدا ہوتا ہے۔ معاشرتی تبدیلیوں کا تخلیقی سطح پر اظہار ادب کی صورت جلوہ گر ہوتا ہے۔ تخلیق کے لیے تحقیق اور تنقید دونوں ضروری ہیں۔ ایک کامیاب ادیب زندگی کے حقائق کو اپنی تحریر میں پیش کرتا ہے۔ وہ نہ صرف داخل کے واقعات کو قلمبند کرتا ہے بلکہ خارج سے بھی روگردانی نہیں کر سکتا۔ ایک اخبار نویس اگر ادبی ذوق سے متمیز ہے تو وہ صحافتی میدان میں بھی کارہائے نمایاں کر سکتا ہے۔

برصغیر پاک وہند میں فارسی اور اردو صحافت کا آغاز شاہی وقائع نگاری سے ہوا۔ مغلیہ دور میں اسے ترقی ملی کیونکہ سلطنت کے طول و عرض میں حکومت کی طرف سے وقائع نگار اور اخبار نویس مقرر تھے جو سیاسی، معاشی، معاشرتی، تجارتی اور زرعی خبروں پر مشتمل خبرنامے مرتب کر کے بادشاہ کے نام بھیجا کرتے تھے۔ ان خبروں کو اخبار کہا جاتا تھا۔ اہم اخبار بادشاہ کے دربار میں پڑھے جاتے تھے۔ برطانوی راج کے آنے سے شاہی اخبار کی جگہ نجی قلمی اخبار نے لے لی۔ جو ۱۸۵۷ء تک مطبوعہ اخباروں کے دوش بدوش چلتے رہے۔ ان اخباروں نے جنگ آزادی کے لیے مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں سے نفرت کے جذبات پیدا کیے۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے ساتھ ہی یہ اخبار بھی ختم ہو گئے۔

۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج نے اردو زبان کو بطور آسان اور رابطے کی زبان کے منتخب کر کے اردو نثر کو فروغ دینا شروع کیا۔ ۱۹۲۲ء میں اردو اخبار نویسی کی ابتداء ہوئی لیکن ابھی فارسی سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے عروج پر تھی۔ ۱۸۳۲ء میں فارسی کی جگہ اردو سرکاری زبان قرار پائی۔ غالب نے بھی اردو کو آسان سمجھ کر اس پر توجہ دینا شروع کی اپنے ایک خط میں اردو نویسی کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ

> "بندہ نواز! فارسی میں خطوط لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سالی وضعف کے صدموں سے محنت پروری و جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔"(۹۶)

اردو کا پہلا مطبوعہ اخبار کب شائع ہوا۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید نے اپنی کتاب "اردو ادب کی مختصر تاریخ" میں محمد سعید عبدالخالق کا ایک بیان نقل کرتے ہیں۔

> "بنگلور کے ایک عمر رسیدہ بزرگ اپنے دادا کی روایت سے بیان کرتے ہیں کہ ٹیپو شہید نے جو سرکاری مطبع قائم کیا تھا۔ اس سے اس کے حکم سے ایک سرکاری ہفتہ وار اخبار شائع ہوتا تھا۔ جس کی تقسیم اُس کی فوج تک محدود تھی۔ اخبار میں فوجی خبروں اور احکام وغیرہ کے علاوہ انگریزوں کی شکایت اور فرانسیسیوں کی تعریف ہوتی تھی۔ یہ مطبع ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد ضبط کر لیا گیا اور جہاں کہیں اس اخبار کے صفحے دستیاب ہوئے، انہیں تلف کر دیا گیا۔(۹۷)

لیکن اس بات کی صداقت میں شک ہے کیونکہ نہ عمر رسیدہ بزرگ کا نام دیا گیا اور نہ ان کے دادا کا دوسرے اس اخبار کی کوئی کاپی بھی دستیاب نہیں۔ تیسرے اورنگ زیب کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کی فوج میں قلمی اخبار تقسیم کیا جاتا تھا۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ جام جہاں نما فارسی کا پہلا اخبار اور مولوی محمد باقر کا "دہلی اردو اخبار" ۱۸۳۶ء اردو کا پہلا اخبار ہے لیکن تحقیق نے ثابت کر دیا کہ جام جہاں نما اردو کا پہلا اخبار تھا۔ انتظامیہ نے جب محسوس کیا کہ اردو اخبار کی طلب کم ہے تو انہوں نے اسے فارسی اخبار میں تبدیل کر دیا۔

نادر علی خان جام جہاں نما کی نوعیت اور ترتیب مذکورہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"لیکن جام جہاں نما کی نوعیت اور ترتیب مذکورہ فارسی جام جہاں نما سے قدرے مختلف تھی۔ اس میں سرکاری گزٹ اور عدالتوں کے فیصلوں کا یکسر فقدان تھا۔ منتخب چیزوں کے علاوہ انگریزی یا فارسی مضامین کے تراجم اور شاذ و نادر اردو غزل بھی اخبار کی زینت ہوتی تھی۔ دیسی ریاستوں کے احوال قلمی اخبارات سے ماخوذ اور باقی خبریں انگریزی اخبار سے ترجمہ ہوتی تھیں۔ چونکہ یورپین اس اخبار کو اردو میں مہارت حاصل کرنے کے لیے خریدتے تھے۔ اس لیے اس کی زبان سادہ، رواں اور عام فہم ہوتی تھی اور حتی الامکان تقثیل اور نامانوس الفاظ پیچیدہ اور مغلّق تراکیب اور گنجلک عبارت سے گریز کیا جاتا تھا۔(۹۸)

پریس کی ترقی نے ہندوستان میں تمدنی بیداری اور سیاسی شعور کو ابھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جس کے نتیجے میں اخبارات کا جال پورے ہندوستان میں پھیل گیا۔ ۱۸۵۷ء تک سو سے زائد اخبارات پورے شمالی ہند کے مختلف شہروں سے شائع ہونے لگے لیکن ان اخبارات کی ترتیب آج کے اخبارات سے قطعاً مختلف تھی۔ اداریے نہیں چھاپے جاتے تھے۔ البتہ اخبار میں اگر کسی خبر پر تبصرہ مقصود ہوتا تھا تو وہیں کر دیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی مدیر اپنی رائے کے اظہار کے لیے مضمون لکھ دیتا تھا۔ تصاویر کا رواج نہیں تھا۔ بڑی سرخیوں کی بجائے چھوٹی سرخیوں سے کام چلایا جاتا تھا۔ عام طور پر ایک کالم کی سرخی ہوتی تھی۔ کیونکہ اس وقت تک صحافت کے باقاعدہ اصول وضع نہیں کیے گئے تھے اور صحافی بھی تربیت یافتہ نہیں تھے۔

اخبار سائنٹیفک سوسائٹی ۱۸۶۶ء میں علی گڑھ سے شائع ہوا۔ تہذیب الاخلاق ۱۸۷۰ء میں شائع ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد لکھنؤ سے اودھ اخبار جاری ہو چکا تھا اس کے مدیر منشی نولکشور تھے۔ ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ جاری ہوا اس کے مدیر منشی سجاد حسین تھے۔ یہ ایک مزاحیہ اخبار تھا۔ پنچ اخباروں نے ادب میں پھکڑ پن کا سلسلہ شروع کیا اور یہ سلسلہ ۳۰۔۳۵ سال تک جاری رہا۔ بیسویں صدی میں زمیندار، الہلال، ہمدرد، مخزن اور ہمایوں نے بہت زیادہ شہرت حاصل کی۔ اس کے بعد انقلاب، احسان، شہباز، اسلام، جنگ، نوائے وقت اور دیگر اخبار شائع ہوئے۔ بیسویں صدی کی پانچویں دہائی ادبی صحافت کا دور زریں شمار کی جاتی ہے، اس دور میں اردو کے جلیل القدر پرچے ادبی دنیا، ساقی، ہمایوں، عالمگیر، نگار اور نیرنگ خیال شائع ہوئے۔ یہ پرچے فکر و نظر کی نئی تحریکوں کے فروغ میں معاون ثابت ہوئے۔ ادب لطیف، سویرا، ماہ نو، نقوش، فنون، سیپ، الفاظ، نیا دور، الحمراء، اوراق، صحیفہ، ادبی دنیا، افکار، دستاویز، سیارہ، قومی زبان، فکر و نظر، پاکستان سے شائع ہونے والے مشہور ادبی مجلّے ہیں۔ صحافت درحقیقت ایک کل وقتی پیشہ ہے۔ شوقیہ صحافت کوئی چیز نہیں۔ صحافت میں چار شعبے ہوتے ہیں۔

۱۔ سب ایڈیٹری یا نیوز ڈیسک ۲۔ رپورٹنگ یا نیوز ڈیسک ۳۔ فیچرز اور مضامین نگاری، کالم نویسی ۴۔ اداریہ نویسی

صحافت میں سب سے اونچا مقام اداریہ نویسی کا ہے اس کے لیے وسیع مطالعہ، عملی پس منظر اور روزانہ ریاضت کی ضرورت ہے۔ خبروں کی طرح تبصروں، اداریوں اور مضامین کا بروقت و برمحل ہونا ضروری ہے۔ ادیب معاشرے کے دوسرے افراد کی نسبت زیادہ حساس ہوتا ہے۔ وہ بڑے واقعے کی نسبت ایک عام واقعے کو بھی اپنے تجربے اور مشاہدے کا مرکز بنا سکتا ہے۔

ادبی اور صحافتی تحریر میں فرق کے لیے اندازِ تحریر پر بحث کی جائے۔ ہر شخص کی سوچ، فکر اور اسلوب دوسروں سے جدا ہوتا ہے کیونکہ اختلاف طبع ایک قدرتی امر ہے اور انسانی طبع کو کسی خاص نقطے پر مرکوز نہیں کیا جاسکتا۔ صحافتی و تنقیدی ادب میں تین طرح کے اسلوب استعمال کیے گئے ہیں۔

۱۔ کسی شخص کا عام طرزِ اظہار ۲۔ کسی عام طرز اظہار سے علیحدہ کسی قدر منفرد انشاء پرداز کا طرز اظہار ۳۔ ایسا اسلوب جو ملک اور زمانے سے بالاتر ہو کر دنیا بھر کے اسالیب کا احاطہ کرے ایسا اسلوب اپنے زمانے اور ماحول کی قید سے آزاد ہوتا ہے ایسے اسلوب کو انگریزی میں Grand Style کہتے ہیں۔

گوپی چند نارنگ "اسلوب اور اسلوبیات" کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"زبان میں اظہار کے امکانات لامحدود ہیں۔ کوئی بھی مصنف ممکنہ امکانات میں سے چند کا انتخاب کرتا ہے۔ یہ انتخاب مصنف کے لسانی عمل کا حصہ ہے اور اس کی اسلوبیاتی شناخت کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اسلوبیاتی تجزیے سے مصنف کی پہچان بعینہ اسی طرح ممکن ہے جس طرح انسان اپنے ہاتھ کی لکیروں سے لے جانا پہچانا جاتا ہے اور اسلوبیات کے ذریعے مصنف کے لسانی اظہار (ہاتھ کی لکیروں کا) پتہ چلایا جاسکتا اور اس کی شناخت حتمی طور پر متعین کی جاسکتی ہے۔ اشخاص کی طرح اصناف کا بھی مزاج ہوتا ہے چنانچہ اسلوبیات کی مدد سے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ باہم دیگر اصناف کا اسلوبیاتی امتیاز کیا ہے اور وہ پیرایۂ بیان کی سطح پر کس طرح ایک دوسرے سے الگ ہیں۔"(۹۹)

صحافتی زبان کی یہ بنیادی خصوصیت ہے کہ اخبار میں تمام فقرے اور واقعات بے لاگ انداز میں بیان ہونے چاہئیں۔ معلومات اعداد و شمار نام سب کچھ صحیح ہونا چاہیے۔ صحافت میں صحت واقعات کی موجودگی ضروری قرار دی جاسکتی ہے۔ صحافی بھی مکمل طور پر غیر جانبدار نہیں ہوتا لیکن اس کی جانبداری اگر حد سے بڑھ جائے تو حقائق کو مسخ کرسکتی ہے اس لیے صحافی کا غیر جانبدار ہونا از حد ضروری ہے۔

ادب صحافت سے الگ صنف ہے۔ ادیب اس واقعاتی سچائی کا دعویٰ نہیں کرسکتا وہ تو معاشرے کا عکاس ہے۔ کسی بھی دور کا ادب اس دور کی معاشی، سیاسی، ثقافتی، مذہبی اور معاشرتی حالت کی بخوبی عکاسی کرتا ہے۔ میر اور غالب کے اشعار اس دور کی حالت کی عکاسی کرتے ہیں۔ آج کا قاری صحافتی دنیا سے یہ توقع رکھتا ہے کہ نئی معلومات کے بہم پہنچانے کے ساتھ ساتھ وہ مواد کے پنہاں مفاہیم تک بھی ان کی رسائی کروائے۔ صحافتی دنیا میں اداریے اور کالم قاری کی اسی طلب کو پورا کرنے کے لیے لکھے جاتے ہیں۔ یہ دونوں اصناف بشمول مدیر کے نام خطوط (جن میں قاری کے جذبات واحساسات کا بیان ہوتا ہے) بے حد اہم ہیں۔ ہر اخبار کی پہچان اُس کے مخصوص کالم نویس ہوتے ہیں جن کے ذریعے اخبار کی قدر و قیمت اور طرزِ فکر واضح ہوتے ہیں۔ جوش ملیح آبادی نے مختلف ادوار میں صحافت سے وابستگی اختیار کی "کلیم" کی اشاعت ۱۹۳۶ء میں دہلی سے شروع ہوئی اور تقریباً چار برس لگاتار شائع ہونے کے بعد ۱۹۳۹ء کے آخر میں یہ رسالہ بند ہوگیا۔ ۱۹۴۰ء میں "کلیم لکھنؤ سے شائع ہونے والے مجاز، علی سردار اور سبط حسن کے مارکسی فکر کے رسالے "نیا ادب" میں ضم ہوگیا اور بقول جوش از روئے قواعد "کلیم و نیا ادب" کے غلط نام کے ساتھ لکھنؤ سے جاری ہونے لگا" (یادوں کی برات ص ۲۵۱)

کلیم کے افتتاحی شمارے میں جوش ملیح آبادی نے ایک تفصیلی اداریے میں "عصر حاضر میں ادبیات میں انقلاب کی ضرورت" بیان کی، وہ لکھتے ہیں:

"تاریخ کے ورق الٹیے وہ بتائے گی کہ اس وقت تک کسی قوم میں بیداری و زندگی پیدا نہیں ہوتی ہے جب تک اس کے ادبیات میں عظیم انقلاب پیدا نہیں کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس نقطہ نگاہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے "کلیم" کی بنیاد ڈالی گئی۔ (جنوری ۱۹۳۶ء)

کلیم کی معرفت جوش نے ہندوستانی شہریوں اور خاص طور پر مسلمانوں میں قومیت کے جذبات بیدار کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ جوش نے اس پرچے کے اجراء کا مقصد ہندوستان کے لوگوں کی خدمت قرار دیا۔ "کلیم" کے ذریعے جوش نے ظالم انگریزوں اور ان کے دیسی آلہ کاروں کے خلاف ایک جنگ چھیڑ رکھی تھی۔ "کلیم" میں انگریز حکومت اور اُس کے کارندوں پر طنز و تشنیع آمیز تبصرہ شائع کیا جاتا تھا۔ سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کو موضوع بنایا جاتا۔ مذہبی جنون اور فرقہ پرستی کی کلیم میں گنجائش نہیں تھی "کلیم" نے جہاں ہندومہاسبھا جیسی تنظیموں کی مخالفت کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ کے رہنما قائد اعظم محمد علی جناح کے سیاسی نظریات کی بھی مخالفت کی لیکن کانگریس سے عقیدت مندی کا جابجا اظہار بھی "کلیم" کے صفحات میں دکھائی دیتا ہے۔ اکثر شدت پسند مسلمان گروہوں کی جانب سے "کلیم" کی ادارت کو دھمکی آمیز خط بھی موصول ہوئے لیکن جوش اپنے اصولوں سے دست کش نہ ہوئے۔ ۱۹۳۸ء میں جب کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈران کے درمیان سمجھوتے کی

بات چیت جاری تھی تو کلیم نے انتہائی مدلل انداز میں گفتگو کی ناکامی کی پیش گوئی کی تھی جو درست ثابت ہوئی۔ جوش فرقہ پرستی کو ملک و قوم کے لیے خطرناک قرار دیتے ہیں اور لوگوں کو اس سے ہوشیار رہنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ کہ فرقہ پرستی کے بڑھتے ہوئے تیور آزادی کے لیے بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔ اگست ۱۹۴۸ء میں جوش ماہنامہ ''آج کل'' دہلی کی ادارت سے وابستہ ہوئے اور بطور مدیر یہاں کام کیا۔ جوش نے ۱۹۵۵ء تک یہاں ادارتی فرائض سنبھالے۔ اگست ۱۹۴۸ء میں جوش ملیح آبادی کی قیادت میں ''آج کل'' کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ اور آج کل کے ساتھ دو مزید رسالے شائع ہوئے۔ رسالہ ''نونہال'' بچوں کے لیے تھا اس لیے اس میں بچوں کے معیار کے مطابق کہانیاں، نظمیں، پہیلیاں، ڈرامے، خبریں، تصویریں اور مختلف مسائل پر دلچسپ مضامین شائع ہوئے۔ ''بساط عالم'' کا مقصد عوام کو سنجیدہ اور درست انداز میں غیر ملکی سیاست اور اُس کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرانا تھا۔ اس میں بین الاقوامی سیاست اور تہذیب و تمدن کے متعلق مضامین ہوتے تھے۔ ۱۹۴۹ء میں حکومت نے یہ دونوں رسالے یعنی ''نونہال اور بساطِ عالم'' بند کر دیئے۔ اور بچوں کے لیے آج کل کے آخر میں آٹھ صفحوں کا ''بچوں کا آج کل'' شائع ہونے لگا۔ اگست ۱۹۴۸ء میں ''آج کل'' کے نئے دور کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ تینوں رسالوں پر ایڈیٹر اور تینوں اسسٹنٹ ایڈیٹروں کے نام بھی شائع ہوئے۔ جوش ملیح آبادی نے اپنے زمانہ ادارت میں آج کل کو خوب سے خوب تر بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ نئے نظام کے تحت اس جریدے کے مقاصد میں یہ بات خاص طور پر شامل تھی کہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور کلچر کو نمایاں کیا جائے۔ غزلیں، افسانے شائع ہونے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب و معاشرت پر مقالے شائع کیے جائیں آج کل کے بارے میں قارئین کو کوئی بڑی امید نہ دلاتے ہوئے پہلے ہی شمارے میں معیاری جریدہ کے عنوان سے انہوں نے ایک وثیقہ لکھا جس کے راقم وہ خود تھے۔ گواہوں میں عرش ملیسانی، آزاد اور بلونت سنگھ کے دستخط ہیں جس میں انہوں نے قحط الرجال کا ذکر کیا ہے کہ درجہ اوّل کے مضامین بہت کم ملتے ہیں پھر بھی کوشش کی جائے گی کہ معیاری مضامین شائع کیے جائیں۔ وثیقہ کچھ اس طرح تھا۔

> ''اگر میں آج کل کے باب میں بڑی امیدیں نہ دلاؤں اور بلند آہنگی کے ساتھ بڑے بڑے دعوے نہ کروں تو معذور سمجھ کر مجھے معاف فرمایا جائے۔ ہر چند جہاں تک انسانی مساعی کا تعلق ہے ہر ممکن سعی کی جائے گی کہ معنوی اور صوری دونوں حیثیتوں سے آج کل کم سے کم ہندوستان کا بہترین جریدہ ثابت ہو لیکن مندرجہ بالا سطریں بہ ثباتِ عقل و ہوش اس لیے لکھ دی ہیں کہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آوے۔ (راقم جوش، گواہان، عرش، آزاد، بلونت سنگھ)
>
> (آج کل، معیاری جریدہ، اگست ۱۹۴۸ء ص ۶)

آج کل کو بہترین بنانے کے لیے جوش نے جو کام کیا اُس کی گواہی جمیل اختر نے ''اشاریہ آج کل'' جلد اوّل میں دی ہے وہ لکھتے ہیں۔

> ''جوش نے معنوی اور صوری دونوں حیثیتوں سے آج کل کو ہندوستان کا بہترین جریدہ بنانے کے جس عزم کا اعلان کیا تھا اس کو بھی کر دکھایا۔ اچھے اور معیاری مضامین آج کل کے اوراق کی زینت بنے۔ نئے اور پرانے ادیب بڑی آن بان سے آئے اور بھرپور تعاون دیا۔ سالنامے اور خاص نمبر اپنی امتیازی شان سے بہت ہی عمدہ اور معیاری نکلے۔ کئی خاص نمبر تو بے حد مقبول ہوئے۔ اس طرح جوش صاحب کی قیادت میں رسالہ مقبولیت کی منزلیں طے کرنے لگا۔ اس میں جوش صاحب کی پُروقار شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کی سعی، لگن اور خلوص کو دخل تھا۔ جوش صاحب نے محنت و مشقت کر کے اس جریدے کو ایک اہم اور مقبول ترین جریدہ بنا دیا۔ معیاری مضامین کے ساتھ ساتھ کتابت وطباعت ے معیار کو بھی وقار بخشا اور اس کے حسن و دلکشی میں بھی اضافہ کیا۔''(۱۰۰)

اگست ۱۹۴۸ تا ۱۹۵۵ء: جوش ملیح آبادی نے کل سات برس تک ''آج کل'' کی ادارت سنبھالی۔ جوش کے پاکستان ہجرت کر جانے کے بعد رسالے کی ادارت کی ذمہ داری عرش ملیسانی کے سپرد ہوئی۔ جوش کی وجہ سے اس ادارے کو جو شہرت و مقبولیت، قدر و منزلت اور اہمیت حاصل ہوئی ان کے جانے کے بعد اس کا احساس شدت سے کیا جانے لگا۔ عرش ملیسانی رقمطراز ہیں:

"جوش صاحب کی قیادت ہی کافی تھی۔ ان کی مسلسل صحبت دل و دماغ کی کم مائیگی دور کر دیتی تھی۔ جوش صاحب کا سایہ ہمارے لیے سایۂ عاطفت تھا۔ جوش صاحب کے جانے کے بعد قرعۂ فال مجھ دیوانے کے نام پر پڑا۔ بوجھ اور ذمہ داری تو پہلے ہی گلے کا ہار تھی لیکن ہر مخالفانہ اور معاندانہ وار کے لیے جوش صاحب ایک مضبوط ڈھال تھے۔ اب یہ ذمہ داری براہ راست میرے کندھوں پر بوجھ بن گئی"۔

(آج کل کے اٹھائیس برس، جون ۱۹۷۰ ص ۷)

(۱) جوش بطور اداریہ نویس

۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۸ تا ۱۹۵۵ء جوش نے بطور مدیر کل گیارہ برس تک ادارت کی اور "کلیم" اور "آج کل" کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھایا۔ جوش کے کلیم اور آج کل میں چھپنے والے مضامین کا جائزہ تو ہم مضمون نگاری کے باب میں لے آئے ہیں یہاں ہم جوش کی اداریہ نویسی کا جائزہ لیتے ہیں۔ سب سے پہلے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اداریہ کسے کہتے ہیں۔ مختلف ماہرین نے اداریے کا مفہوم اس طرح بیان کیا ہے۔

لاؤس ایم لائنز کہتے ہیں۔ روایتی طور پر اداریہ اخبار کے ایڈیٹر کی رائے کا اظہار ہے۔ اخبار کے قارئین اداریے میں خبروں پر ایڈیٹر کی جچی تلی رائے چاہتے ہیں۔ اداریہ اخبار کے ایڈیٹر کی جچی تلی رائے کو ہی کہا جاتا ہے۔

Louis نے "Reporting the news" میں لکھا ہے۔ "اداریہ اخبار کے رویے اور رجحان کا شعوری اور مربوط اظہار ہے۔ اخبار ایک ایسا ماہر شاہد ہے جو رائے عامہ کے کٹہرے میں گواہی دیتا ہے۔"

ایف مریسر بانڈ لکھتے ہیں۔ اداریہ ایک ایسا مختصر مضمون ہے جو ہنگامیت کا مظہر ہوتا ہے۔ اس ہنگامی مضمون کا مقصد اخبار کی رائے کا اظہار ہے۔

ان تعریفوں کو بھی اداریے کی صحیح تعریفیں نہیں کہا جا سکتا۔ ماضی کے اخبارات کے اداریے واقعی مدیر کی رائے یا فیصلے پر مشتمل ہوتے تھے لیکن آج زیادہ تر مدیر انتظامی سربراہ کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور بہت سے اخبارات میں اداریے معاون مدیر یا اداریہ نویس لکھتے ہیں۔ جدید اداریے میں بعض اوقات مسئلے کی تشریح اور وضاحت کو کافی سمجھا جاتا ہے۔ اس میں کسی رائے کا اظہار کافی نہیں ہوتا۔

کارل جی ملر اپنی کتاب "ماڈرن جرنلزم" میں لکھتا ہے۔

اداریہ اس مضمون کو کہتے ہیں جو کسی ہنگامی موضوع پر لکھا ہو۔ اور جس میں قاری کی سوچ ایسی راہ پر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہو جو مضمون نگار کے خیال میں صحیح راہ ہو۔ اداریہ نویس قاری کو ایسے نقطہ نظر سے متفق کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ایسی باتیں لکھتا ہے جس سے قاری قائل ہو جائے اور موافق ردعمل ظاہر کرے۔ اداریہ نویس مختلف ترغیبی طریقوں سے کام لے کر قاری کے جذبات و احساسات کو جائز طور پر متاثر کرتا ہے۔ میکس لرلز لکھتے ہیں۔ اداریہ ان رجحانات پر تبصرے کا نام ہے جو روزمرہ واقعات کی تہہ میں کار فرما ہوتے ہیں۔ نیویارک ورلڈ کے ایڈیٹر فرینک کوب لکھتے ہیں۔ اداریہ نہ تو لچھے دار تقریر ہے نہ ادبی مضمون۔ یہ مطالعہ رپورٹنگ، تجزیے اور تحریر سے عبارت ہے۔ ڈاکٹر ایم لائل سپنسر کہتے ہیں کہ: اداریہ رائے کو متاثر کرنے یا قاری کو محظوظ کرنے کے لیے حقائق اور نکتہ نظر کو مختصر، منطقی اور خوشگوار انداز میں پیش کرنے کا نام ہے۔ اسے خبروں کی ایسی توجیہہ قرار دیا جا سکتا ہے جس سے عام قاری کسی خاص چیز کو واضح طور پر سمجھ سکے۔ ولیم، ایلن وائٹ کہتے ہیں۔ اداریہ وقت کے رجحانات یا خبروں پر ایسا آزادانہ اظہار خیال ہونا چاہیے جسے ایک ہمدرد اور عقلمند شخص نے جرأت کے ساتھ مختصر طور پر قلمبند کیا ہو۔ اداریے میں درشتی، تعصب اور خوف کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ یہ چیزیں خواہ کتنی ہی بے خوفی کی مظہر ہوں، اصل میں کمزوری کی علامت ہیں۔

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اپنی کتاب فن صحافت میں اداریے کی تعریف یوں کرتے ہیں: ادارتی صفحہ پر اخبار کے نام کی تختی کے نیچے جو مضامین درج ہوتے ہیں ان میں مسائل حاضرہ پر اخبار کی آراء پیش کی جاتی ہے۔ چونکہ ان میں ادارہ اپنے نقطہ نظر کے مطابق مسائل کی جانچ پرکھ کر کے قارئین کی راہنمائی کا فرض سرانجام دیتا ہے اس لیے اس قسم کے ہر بڑے اور چھوٹے مضمون کو اداریہ کہتے ہیں۔

مسکین علی حجازی اپنی کتاب ''اداریہ نویسی'' میں اداریہ کی تعریف یوں کرتے ہیں۔ اداریہ نویس کی طرف سے کسی ہنگامی موضوع پر مباحثے میں تحریری طور پر حصہ لینے کا نام اداریہ ہے۔ راحت سہیل کہتی ہیں کہ ''اداریہ وہ صحافتی مقالہ ہوتا ہے جو ہنگامیت کا مظہر ہوتا ہے اور اپنے اخبار کی پالیسی کے مطابق قارئین کی راہنمائی ان کے حقوق کی حفاظت یا مسائل کی وضاحت کے لیے لکھا جاتا ہے۔''(۱۰۱)

صحافت کا ایک اہم اور بنیادی مقصد عوام کی راہنمائی ہوتا ہے۔ اسی مقصد کے تحت اخبارات اور رسائل میں اداریے اور دیگر مضامین طبع کیے جاتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی صحافت علمی اور ادبی تھی اس دور میں ہمیں الگ سے نہ ادارتی صفحات ملتے ہیں نہ ہی باقاعدہ اداریے ملتے ہیں۔ خبر کے ساتھ خبر نویس کی جو رائے ہوتی تھی اسی کو اداریے کی اولین شکل تصور کیا جا سکتا ہے۔ ۱۸۶۰ء کے بعد کے اخبارات میں خبریں اس انداز سے لکھی جاتی تھیں کہ وہ بیک وقت خبریں اور تبصرے دونوں کا حق ادا کرتی تھیں۔ ۱۸۶۶ء میں ''اخبار سائنٹیفک سوسائٹی'' کا اجراء ہوا۔ سرسید احمد خان نے خبروں کی صحت کے اعتبار سے اسے بلند مقام تک پہنچایا۔ انہوں نے اپنے مدلّل، منطقی اور عام فہم اداریوں سے اسے مقبول اور مؤثر بنایا۔ اس اخبار کا تقریباً تیرہ فیصد حصہ اداریے کے لیے وقف ہوتا تھا۔(۱۰۲)

سرسید احمد خاں نے اداریے کو صحیح معنوں میں اخبار کا حصہ بنایا تو کئی اور اخبارات میں بھی اداریے واضح اور الگ صورت میں چھپنے لگے۔ آہستہ آہستہ بہت سے اخبارات کے ادارتی صفحات مرتب ہو گئے اور اداریہ نویسی نے باقاعدہ شکل اختیار کر لی۔ لیکن بعض اخبارات میں ادارتی صفحات مخصوص نہیں تھے اور نہ ہی لفظ اداریہ کے تحت تبصرہ کیا جاتا تھا۔ لیکن ان اخبارات میں کہیں کہیں عنوانات کے تحت یا بغیر عنوان ایسے تبصرہ ملتے ہیں جنہیں ادارتی تبصرے کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس دور کے اخبارات میں اہم ملکی مسائل پر تبصرہ ملتا ہے۔ ۱۸۷۰ء کے بعد سے بہت سے اخبارات میں ملکی مسائل کے علاوہ دیگر مسائل پر تبصرہ ملتا ہے۔ ۱۸۷۰ء کے بعد سے بہت سے اخبارات میں ملکی مسائل کے علاوہ بین الاقوامی مسائل پر تبصرے بھی ملتے ہیں۔ جن میں اپنی رائے کا اظہار کیا گیا ہے۔ ۱۸۸۰ء کے بعض اخبارات میں سیاسی معاملات پر جرأت و بے باکی سے اظہار رائے کیا جانے لگا تھا۔ البرٹ بل کے سوال پر اردو اخبارات نے اپنے اداریوں، مضمونوں، تبصروں اور کارٹونوں کے ذریعے رائے عامہ کی ترجمانی کی۔ انگریز اور انگریزی اخبار اس بل کے سخت مخالف تھے۔ اس دور کے اداریے معاشرتی اداریے ہوتے تھے۔ اس دور کے اداریوں کی زبان بہت آسان، عام فہم اور سلیس ہے۔ اداریہ نویس جس انداز میں سوچتا اسی طرح اظہار خیال کر دیتا تھا۔ اودھ اخبار، مشیر دکن، اخبار عام پیسہ اخبار کے اداریے مشہور ہوئے۔ روزانہ اخبار، سہ روزہ، ہفت روزہ اخبارات میں بھی اداریے مقررہ صفحات پر واضح اور نمایاں طور پر شائع ہوئے۔ بعض جگہ ایڈیٹوریل نمایاں لکھا جاتا تھا اور اداریے باعنوان یا بلا عنوان ہوتے تھے۔ اب اداریہ کی اصطلاح تمام تر مقصدیت اور معنویت حاصل کر لیتی ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں اردو صحافت میں ادبی اسالیب نے جگہ لے لی۔

سیاسی عوامل بھی معاون ہوئے۔ مسلم لیگ کا قیام، تقسیم بنگال اور اس کی تنسیخ نے مسلمانوں کو ذہنی جھٹکوں سے دوچار کیا۔ سانحہ کانپور، سلطنتِ عثمانیہ کی بقا کا سوال، جنگ بلقان، تحریک خلافت اور ترکِ موالات مسلمانوں کے ملی تشخص کو اجاگر کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال، البلاغ، مولانا محمد علی جوہر نے کامریڈ اور ہمدرد اور مولانا ظفر علی خان نے زمیندار کے ذریعے مسلمانوں کی بہتری اور آزادی کے لیے کام کیے۔ اسی دوران ۱۹۰۱ء میں لاہور سے ہفت روزہ ''وطن'' ۱۹۰۲ء میں ''ہندوستان''، ''دیش'' اور ''ہمالیہ'' شائع ہوئے۔ ۱۹۱۲ء میں بجنور سے مدینہ اور لکھنؤ سے ہمدم جاری ہوئے۔ مسلم گزٹ بھی شائع ہو رہا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں روزنامہ سیاست، پرتاب، بندے ماترم اور کیسری میلاپ وغیرہ شائع ہوئے۔ بیسویں صدی کے ربع اول میں اردو صحافت اور مجلہ نگاری سراپا جذبات پر آ کر ٹھہر گئی۔ اس دور کی مؤثر اداریہ نگاری مولانا ظفر علی

خان، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابولکلام آزاد کی اداریہ نگاری ہے۔ جوش نے اسی دور میں اپنا رسالہ "کلیم" جاری کیا۔ جوش کی اداریہ نویسی کی ہم دو دور میں تقسیم کرتے ہیں۔

۱۹۳۶ تا ۱۹۳۹ء "کلیم" کی ادارت کا زمانہ

اگست ۱۹۴۸ تا ۱۹۵۵ "آج کل" کی ادارت کا زمانہ

جوش نے ماہنامہ کلیم دھولپور سے جاری کیا جسے بعد میں وہ دہلی لے گئے لیکن آخر میں اسے ملیح آبادی سے جاری کیا جانے لگا اور اس کی انتظامی باگ دوڑ اپنے بھانجے اور داماد شہاب ملیح آبادی کے ہاتھوں میں سونپ دی۔ کلیم میں جوش کے اداریے "اشارات" کے زیر عنوان شائع ہوتے رہے۔ ان اداریوں میں ذیلی عنوان بھی دیئے جاتے تھے۔ ہر ماہ کوئی مسئلہ پیش کیا جاتا تھا۔ جس پر جوش اپنے انداز میں روشنی ڈال کر اس کا حل قارئین کے سامنے پیش کر دیا کرتے تھے۔ آپ نے عام طور پر ایسے ایشو پر اظہار خیال کیا جو قوم و ملک کے لیے برننگ ایشو تھا۔ کانگریس کہنے کو ہندوستان کے لوگوں کی نمائندہ جماعت تھی لیکن درحقیقت کانگریس ہندوؤں کی نمائندہ جماعت تھی۔ جوش نے اپنے اداریے میں مسلمانوں کے کانگریس پر اعتراضات، کانگریس میں موجود خرابیاں اور قباحتیں اور آخر میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے ایک حل پیش کیا گیا ہے جس کو اپنا کر ہندوستان میں امن و بھائی چارہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے اگرچہ یہ حل ناقابل قبول تھا لیکن جوش نے اپنے جوش و جذبے اور تعقل پسندی کو بروئے کار لا کر جو حل پیش کیا موجودہ حالات کے تحت وہی بہترین حل تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> "رب العزت کی قسم کہ عصر حاضر کی "دینداری" شرارت اور چھچھورا پن ہے۔ وہ شرارت آمیز چھچھورا پن جو غلام قوتوں کے اندر ہمیشہ پایا جاتا ہے اور جو حق کے عوض باطل کے ہات اپنی روح فروخت کر دیتا ہے۔
>
> یہ موجودہ "دین" سرمایہ پرست فتنہ پرداز اور خوں ریز "دین" بیمار، بے مغز، مقلّد اور پابہ زنجیر "دین" جسے دشمن اپنے اغراض کی تکمیل کے واسطے مولویوں اور پنڈتوں کے ذریعے بڑی چالاکی کے ساتھ استعمال کیا کرتے ہیں۔ سوشلسٹ "بے دینی" سے آنکھ ملانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ سوشلسٹ "بیدینی" کا سینہ چوڑا اور نظر وسیع ہے۔"(۱۰۳)

جوش کے اداریوں میں ملکی مسائل پر تبصرہ پایا جاتا ہے۔ ایک اداریے میں علی گڑھ یونیورسٹی کے تاریخ کے پروفیسر کے ایک بیان پر شدید رد عمل کا اظہار کیا ہے جس میں انہوں نے طلباء کو مشورہ دیا تھا کہ وہ سیاسیات اور اقتصادیات سے دور رہیں۔ نیز پروفیسر نے طلبا کو جو مشورہ دیا تھا کہ وہ غیر مسلم طلبا سے دور رہیں جوش کے خیال میں پروفیسر صاحب طلباء میں فرقہ واریت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں باہر کی دنیا سے اپنا رابطہ قطع کرنے کا مشورہ دے رہے تھے۔ جوش نے اپنے اداریے میں پروفیسر صاحب کو آڑے ہاتھوں لیا کہ وہ طلباء کو ملکی مسائل سے دور رکھ کر قوم کو اُن فوائد سے دور رکھ رہے ہیں جو قوم کے نوجوانوں کی وجہ سے ہندوستان کو ملنے والے تھے۔ اگر نوجوانوں کو ملکی سیاست سے ناواقف رکھا جائے گا تو زمانہ آئندہ کی امانت اور مستقبل کی وراثت کیا کسی مسخرے کے سپرد کی جائے گی۔ زندہ ممالک میں طلباء کو ایسی تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ کالج کے اندر ہی اپنے ملک کے تمام سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی مسائل سے آگاہ ہو جاتے ہیں اور کالج سے نکلنے کے بعد اپنے ملک کے حق میں سعادت و برکت بن جاتے ہیں۔

جوش نے اداریہ نویسی کے حوالے سے سرخیوں کو عنوان دے کر اداریے میں مختلف موضوعات پر اظہار خیال کیا۔ چند عنوان ملاحظہ فرمائیے۔ مسلمان، آزاد یا غلام، کچھ کانگریس کے متعلق، ایک خطرناک مشورہ، ایک طالب علم کی خودکشی، شاعری اور مولوی، رومان و افسانہ، بنیادی حقوق اور کانگریس، وغیرہ۔

چونکہ اس دور میں انگریز حکمرانوں سے سخت تعزیری ضابطے لاگو کر رکھے تھے دوسرے وہ حکمرانی کے غرور میں مقامی لوگوں کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرتے تھے۔ اس لیے بہت سے اداریہ نویسی کھل کر اپنی بات کہنے کی بجائے ڈھکے چھپے انداز میں کہنے کی کوشش کرتے تھے مثلاً ایک انگریز کے گھونسہ مار دینے کی وجہ سے ایک مقامی کی موت ہو گئی۔ اس کو اس طرح لکھا گیا کہ ہندوستانی اتنا ناتواں تھا کہ ایک گھونسہ بھی برداشت نہ کر سکا۔ لیکن جوش نے مصلحت وقت کا خیال کیے بغیر اپنی بات علی الاعلان بیان کی اور کسی کی دل شکنی، دل آزاری کا بھی خیال نہ کیا۔ نہ صاحبان وقت کی خوشنودی کو مد نظر رکھا۔ انہوں نے جس طرح مسلم قائدین میں غلطیاں تلاش کیں اُسی طرح ہندو قائدین کو بھی ہدف تنقید بنایا۔ گاندھی کے بارے میں ایک ادارے میں لکھتے ہیں۔

> ''واضح رہے کہ کانگریس کے اندر جو سرمایہ داری اور مہاسبھائی عنصر پایا جاتا ہے اس کے دو اسباب ہیں:
>
> (۱) پہلا سبب تو ہے مہاتما گاندھی کا وجود مبارک جو سرمایہ پرستوں کے مربیّ اور سخت قسم کے کٹر مذہبی آدمی ہیں اور یہ اُنہیں کے نفس قدسی کا نتیجہ ہے کہ ایک طرف تو کانگریس میں سوشلسٹ طبقے کو ابھرنے کا موقع نہیں ملتا، اور دوسری طرف اُن کی مہاتمائیت کے زیر سایہ پست ذہنیت رکھنے والوں کو مذہبی منافرت پھیلانے کے بے شمار مواقع مل رہے ہیں۔
>
> (۲) اور دوسرا سبب ہے مسلمانوں کی کانگریس بیزاری مسلمان ایک شریف اور بھولی ملت ہے۔ اُس کے خود غرض، خود پسند، خود رائے، خود نما اور خود پرست ''قائد اعظم'' نے اُسے ''اللہ اکبر'' کے مصلحت آمیز نعروں سے اس درجہ بوکھلا دیا ہے کہ وہ من حیث القوم کانگریس سے علیحدہ رہنے ہی کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھنے لگی ہے۔''(۱۰۴)

جوش نے اپنے اداریوں میں جرأت و بے باکی سے نہ صرف حکمرانوں کو ہدف تنقید ٹھہرایا بلکہ قوم کے لیڈران کو بھی لتاڑا۔ ان کے اعمال و اقوال پر نکتہ چینی کی اور اپنے ادارتی کالموں میں ان کے خلاف لکھ لکھ کر لوگوں کے دلوں سے ان کا خوف ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جوش نے کالموں کے ساتھ ساتھ اپنی نظموں میں بھی انگریز حکمرانوں کو ان کی غلطیوں کا احساس دلایا ان کی نظمیں ضبط ہوئیں۔ گھر کی تلاشی لی گئی لیکن جوش نہ ٹوٹے نہ جھکے۔

اس دور کے دوسرے اکابر کالم نویسوں کے دوش بدوش جوش نے بھی مسلمانوں کو بیدار کرنے انہیں ایک مرکز پر جمع کرنے اور اپنے حقوق کی جنگ لڑنے کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے انگریزوں، ہندوؤں اور اُن مسلمانوں کے خلاف لکھنے میں عار محسوس نہ کی جو مسلمانوں کو باہمی نفاق، مذہبی منافرت اور جدید طرز زندگی سے دور رکھ کر قدامت پرستی کی طرف لے جا رہے تھے۔ جوش چاہتے تھے کہ مسلمان وقت کی آواز کو پہچان کر آگے بڑھیں اور ان دیواروں کو ڈھا دیں جن کے ایک طرف سُنی مسلمان اور دوسری طرف شیعہ مسلمان ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ مسلمانوں میں من حیث القوم آگے بڑھنے کا جذبہ ہو تاکہ فرقوں میں بٹ کر کچلی ہوئی، ٹھکرائی ہوئی قوم بن جائیں۔ مسلمانوں کو فرقوں اور نسلوں سے بالاتر ہو کر سوچنا پڑے گا ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''کاش ہمارے عوام کو، ہمارے قربانی کے بکروں کو یہ معلوم ہو سکتا کہ اُن کے مولوی اور ان کے لیڈر انہیں اپنی معاش اور اپنی لیڈری کے برقرار رکھنے کی خاطر کس طرح ذبح کرا رہے ہیں اور صرف انہیں کو نہیں اپنی پوری جماعت، اپنی پوری قوم، اپنے پورے ملک اور اپنے اسلام کو اپنی خود غرضیوں کی قربان گاہ پر کس طرح بھینٹ چڑھا رہے ہیں۔ یہ کتنی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ''مدحِ صحابہ'' اور ''تبرّا'' کی شورشیں کسی مذہبی بنیاد پر نہیں برپا کی گئی ہیں بلکہ شہید گنج کی طرح اس فتنے کو محض اس لیے بیدار کیا گیا ہے کہ چند لوگوں کی روٹیاں چلنے لگیں، اور چند عامۃ الناس کے ووٹ حاصل کر کے اسمبلی کے رکن بن جائیں۔ لیکن ہماری پبلک اس قدر اندھی اور بہری ہے کہ وہ اتنی موٹی موٹی باتیں بھی نہیں سمجھتی اور اس فتنہ و فساد کو جو خود غرضی پر مبنی ہے۔ دین و مذہب کا مقدس نام دے بیٹھی ہے۔''(۱۰۵)

جوش مسلمان کو بطور مسلمان ایک اچھے انسان کے روپ میں دیکھنے کے تمنائی تھے وہ اسے فرقوں اور ذاتوں میں بٹا ہوا دیکھنا نہیں چاہتے تھے جو انسان اپنے ہم مذہب کے ساتھ اچھا نہیں وہ کسی اور دھرم کے انسان کو کیونکر برداشت کر سکے گا۔

جوش کے اداریوں کی زبان بحیثیت مجموعی ادبی زبان ہے۔ کیونکہ اس دور کی صحافت ادبی صحافت تھی۔ زبان میں عربی اور فارسی الفاظ کی کثرت ہے۔ فارسی زبان کے اشعار اور مصرعے بھی خوب موقع محل سے استعمال کیے ہیں۔ عربی اقوال اور آیاتِ قرآنی کے مفہوم کو بھی حسب موقع استعمال کیا گیا ہے۔ جوش نے اپنے اداریوں میں اس بات پر بھی اعتراض کیا ہے کہ کانگریس اگرچہ خود کو ہندوستان کی نمائندہ جماعت قرار دیتی ہے لیکن درپردہ ہندوؤں کی جماعت ہے اور درپردہ ہندی زبان کو ''ہندوستانی زبان'' کے نام سے فروغ دے رہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ہرچند کہا جاتا ہے کہ اردو اور ہندی دونوں کو ہندوستانی کے نام سے باقی رکھا جائے گا لیکن عمل کیا جاتا ہے اس کے سراسر خلاف۔ کانگریسی وزراء ہندی کی تبلیغ کرتے ہیں اور جب انہیں ٹوکا جاتا ہے تو وہ بڑے بھولے اور سوندھے پن سے فرماتے ہیں کہ ''ہندی'' سے ان کا مقصد ''ہندوستانی'' ہے۔ ان حضرات کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان طفل تسلیوں سے اب کام نہیں چلنے کا(۱۰۶)

جوش نے کانگریسی وزراء و ارکانِ کانگریس کے زیر استعمال الفاظ اور جملے بھی نقل کیے ہیں جو ان کی ہندو نوازی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ چند جملے ملاحظہ ہوں۔

''وہ دیش کے پرشھد نیتا ہیں۔ بڑی بھاری دنگل کی الوچنا۔ رسم الخط کی اڑچن ملتی ہے۔ ان بیس ورشوں کی اتھاس لکھ دی جائے۔ ہم کچھ گھٹناؤں کی طرف اشارہ کریں گے۔ حکومت کے ادھیکاروں میں حصہ لینا چاہیے وغیرہ'' جوش اصرار کرتے ہیں کہ کہ اگر انگریزی اور ہندی کے دوش بدوش، بیچاری اردو کو بھی جگہ دے دی جاتی تو اچھا تھا۔ کانگریس کی ہندی نوازی دراصل ہندو نوازی ہے۔

جوش کے اس دور کے اداریے جامع مقالات کی حیثیت رکھتے ہیں اور کسی ہیئت کے پابند نہیں ہیں۔ جوش نے اپنا اداریہ موضوع کی مطابقت کے حساب سے لکھا جہاں کم لفظوں میں بات ادا ہو گئی وہاں مختصر اداریہ لکھا اور جہاں زیادہ لکھنے کی ضرورت پڑی وہاں اقساط میں بھی اداریہ پیش کیا۔ یا اداریہ کو کئی جگہوں پر پھیلا دیا گیا۔ اداریے کی طوالت کا انحصار موضوع پر منحصر ہوتا تھا۔ اخبارات کے کالموں کی جگہ اداریوں اور شذروں کے تابع تھی۔

جوش ملیح آبادی کے اداریوں کا اسلوب ملا جلا ہے کہیں کہیں اسلوب پر جذباتیت غالب ہے۔ خصوصاً ابتدائی دور کے اور کلیم کے اداریے خطابت کے زور سے لبریز ہے۔ لیکن ''آج کل'' کے اداریوں میں منطق اور استدلال نے جذباتیت کو کم کر دیا ہے۔ تحریر بھی زیادہ آسان، سلیس اور عام فہم ہے لیکن کہیں کہیں شاذ و نادر مشکل الفاظ اور طویل جملے نظر آتے ہیں۔ اس دور کے اداریوں کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جوش کے قلم کے بجائے جوش کے نائب مدیران کے قلم سے بھی نکلے ہیں اس لیے ہم نے زیادہ تر پہلے دور کے اداریوں کو موضوع بنایا ہے۔ اس کی طرف ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے بھی اشارہ کیا ہے کہ

''جوش کی نثر کا ایک نمونہ تو وہ اداریے ہیں جو انہوں نے ''آج کل' کے مدیر اعلیٰ کے طور پر لکھے (یہ غور طلب بات ہے کہ اداریوں پر کچھ اور سب ایڈیٹر بھی اپنا حق جتاتے ہیں)'' (۱۰۷)

جوش اپنی قوم کی بھلائی چاہتے تھے اور ان کو جس چیز میں بھلائی دکھائی دیتی تھی یا وہ سمجھتے تھے کہ قوم کا بھلا اس چیز میں ہے تو وہ اپنے اداریوں کے ذریعے سے لوگوں کو اس طرف رغبت دلاتے تھے خواہ وہ سیکولرازم ہو خواہ کانگریس سے محبت ہو خواہ ہندو سے مفاہمت ہو، جوش رسم و رواج، دین و مذہب سب کو ترک کر دینے کا مشورہ عوامی مفاد کے پیش نظر نہایت فراخدلی سے دے دیا کرتے تھے۔ فرقہ بازی، نفرت،

بد دیانتی، دھو کہ بازی، اوہام پرستی کی اجازت تو اسلام میں بھی نہیں ہے۔ مسلمان جدید علوم کو اپنا کر اپنا قدامت پرستانہ رویہ ترک کر دیں اسی میں ان کی بھلائی ہے۔ اپنے ایک اداریے "شاعری اور مولوی" میں جوش نے مولوی کے شاعر کے مابین موازنے میں مولوی کے اُن کاموں کو ہدف تنقید بنایا ہے جو لوگوں کو خدا شناس نہیں بلکہ خدا کے تصور کو انسان کے دل سے ہٹا کر وہاں ایک بت بنا دیتے ہیں جو ایک عام انسان کی سطح پر آ جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> "وہ ایک زمانۂ دراز سے عرس کر رہا ہے، نیازوں کے حلوے کھا رہا ہے، سُنت کے نام سے سُرمے لگا لگا کر عقد کر رہا ہے۔ ڈھولوں پر قوالیاں سُن رہا ہے۔ اور حال کے نام پر بڑے بڑے موٹے اور بھدّے داڑھی والے مریدوں کو تھر کوا رہا ہے۔
>
> اُس کا شعار ہے حکام کی خوشامد کرنا، مسلمانوں، ہندوؤں کا لڑانا، مخبری اور غداری کرنا، جھوٹے فتوے لکھنا، خلق اللہ کو اپنے پیٹ کی خاطر بصیرت سے محروم رکھنا، زنانِ بازاری اور امردانِ خوش چشم سے ہاتھ پاؤں دبوانا، اور اُن تمام افعال کا کرنا جن سے دین کی بنیادیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں۔
>
> یہ سچ ہے کہ وہ زبان سے الحاد کی تعلیم نہیں دیتا، کیونکہ اس میں مردانگی کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن وہ تمام حرکات کرتا ہے جو انسان کو مذہبیت سے نافر بنا دیتے ہیں اور خدا سے اُس کا دل ہٹا دیتے ہیں۔"(۱۰۸)

جوش اس بات پر کڑھتے تھے کہ مسلمان ایک غالب اکثریت ہونے کے باوجود سامراجی قوتوں کے غلام ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک اداریے میں تجزیہ کیا ہے کہ مسلمان آزاد... یا غلام ہیں اور کس ملک میں مسلمان کتنی تعداد میں موجود ہیں اور وہ ملک کس ملک کا محکوم ہے۔ یہاں چند ملکوں کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

	ملک	مسلم آباد	نوعیت	ملک
1	ہندوستان	8 کروڑ	محکوم	برطانیہ
2	سعودی عرب	تیس لاکھ	نیم آزاد	برطانیہ
3	یمن	پانچ لاکھ	نیم آزاد	برطانیہ
4	کویت	پچاس ہزار	محکوم	برطانیہ
5	مصر	ایک کروڑ انیس لاکھ تیس ہزار دو سو ساٹھ	نیم آزاد	برطانیہ(۱۰۹)

جوش نے ۴۶ ریاستوں کا حال بیان کیا جن میں مسلمان محکومی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ جوش کو قلق ہے کہ بدنصیب ہندوستان ابھی تک غلامی کی زندگی گزار رہا ہے۔ ساری دنیا کے تیس کروڑ مسلمانوں میں سے صرف ایک چوتھائی آزاد ہیں۔

جوش ملیح آبادی نے کلیم میں فرنگی حکومت کی تہدیم، سرمایہ داری کی تدفین، سوشلزم کی تبلیغ، اقوال و اوہام کی تضحیک، فکر و تامل کی ترغیب، کانگریس کی تحکیم اور مسلم لیگ کی تنقیص کو اپنی پالیسی میں داخل کیا۔ اسی بنا پر فرنگی حکومت اور اہل اقتدار لوگوں کے ساتھ ساتھ کانگریس کے غلام پرست مخالفین، مسلم لیگ کے خطاب یافتہ مجاہدین اور سرکاری وظیفہ خوار اور نام نہاد علمائے کرام جوش کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔

آئے دن جوش کے خلاف کفر کے فتوے نکلا کرتے اور قتل کی دھمکیوں کے گمنام خط آیا کرتے تھے۔ خفیہ پولیس سائے کی طرح تعاقب کرتی، لیکن جوش نے اپنی روش ترک نہ کی۔

(ب) جوش کی کالم نگاری

جوش ملیح آبادی نے اکتوبر ۱۹۶۲ء سے "روزنامہ جنگ" کراچی میں "علم و فکر" کے عنوان سے ہفتہ وار کالم لکھنا شروع کیا تھا۔ یہ سلسلہ ۱۹۶۴ء تک چلتا رہا۔ جوش اس دور میں مدیر اردو لغت اور مشیر ترقی اردو بورڈ کی حیثیت سے اپنے فرائض ادا کر رہے تھے۔

معاشرے میں دولت کی ریل پیل اور سامانِ عیش و عشرت کی فراوانی نے اقدار، روایات اور اخلاقیات کے معیار تبدیل کر دیئے ہیں۔ پہلے معاشرے میں دو طبقات ہوتے تھے۔ امراء و غرباء لیکن اب ان دونوں کے درمیان ایک اور طبقہ پیدا ہو چکا ہے۔ طبقۂ متوسطین۔ جوش معاشرے میں تین طبقات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ۱۔ طبقۂ منعمین ۲۔ طبقۂ متوسطین ۳۔ طبقۂ مساکین اور ان کی بھی دو دو شاخیں مزید ہوتی ہیں۔ منعموں میں امیر ائے خاندانی (جاگیر دار) اور امرائے کسبی (سرمایہ دار) امرائے خاندانی کو "رئیس" اور امرائے کسبی کو "سیٹھ" کہا جاتا ہے۔ متوسطین میں بھی دو طبقے ہوتے ہیں۔ متوسطین اوّل کا عقیدہ ہوتا ہے کہ دولت زندگی کی خادم ہے۔ مخدوم نہیں جبکہ طبقۂ دوم اکتسابی امیروں کی نقالی کرتا ہے۔ وہ اپنی معاش کی تنگی اور امیروں سے مماثلت کی تمنا میں دو پاٹوں کے درمیان پس کر رہ جاتے ہیں۔ طبقۂ مساکین میں ایک طبقہ محنت فروش اور دوسرا طبقہ جرائم کوش ہوتا ہے۔ محنت کوش کے نزدیک زندگی بے معنی چیز ہوتی ہے۔ محنت کوش محنت کرتے کرتے اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ تمام طبقات میں جرائم کوش طبقہ جیب تراشیوں، چوریوں، ڈکیتیوں اور قتل کاریوں میں ملوث ہوتا ہے لیکن معاشرے کی ریڑھ کی ہڈی متوسطین کا طبقہ اوّل ہوتا ہے۔ جوش لکھتے ہیں

> "اس گروہ نے بے شمار سائنس دانوں، صناعوں، سیاست دانوں، معالجوں، منجموں، مدبروں، مجتہدوں، مبصروں، محققوں، مصنفوں، مفکروں، پیغمبروں اور شاعروں کو ہر دور میں جنم دیا ہے اور ان کے وجود سے نوع انسانی کے سر پر علم و آگہی کا تاج رکھا ہے۔"(۱۱۰)

لیکن افسوس پاکستان کی سر زمین پر یہ طبقہ یا تو سرے سے وجود ہی نہیں رکھتا تھا یا حالات کی بے پرواہ رفتار نے اس کے وجود کو ختم کر ڈالا ہے۔ جوش اپنے کالم میں معلوماتی انداز میں قارئین کو اس حقیقت سے باخبر کر رہے ہیں کہ فی زمانہ معاشرے کی جان درمیانی طبقہ اپنا وجود کھوتا جا رہا ہے۔

اردو زبان و ادب کا دنیا کے کلاسیکی ادب و شعر سے آشنائی کا عمل ہنوز ارتقاء پذیر ہے۔ ہمارا ادب ابھی تک جنسی جذبات اور پرانی خیالی کہانیوں سے بھرا پڑا ہے۔ تراجم کے ذریعے کسی زبان کے ادب کو اردو میں منتقل کرنے کا کام بخوبی ہو سکتا ہے لیکن ترجمہ کرتے ہوئے مترجم کو بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے اور شعر حباب کی مانند نازک ہوتا ہے۔ ترجمہ اسے توڑ دیتا ہے۔ یہ کام مرصع کاری کا کام ہے۔ پروفیسر جلیل الرحمان نے "حیاتِ متنبی" میں عربی زبان کے شاعر متنبّی کے حالات، مزاج، ماحول اور شاعرانہ محاسن و مصائب کو بیان ہے۔ جوش نے اپنے کالم میں "حیات متنبّی" پر تفصیلی تنقیدی تجزیہ پیش کیا ہے۔ فاضل مترجم کیونکہ عربی زبان پر عبور رکھتے ہیں اس لیے یہ اغلاط جو اس ترجمے میں موجود ہیں مصنف کی عربی دانی پر حرف ہیں۔ شاعر کے ساتھ ناانصافی عدم آگاہی اور فقدانِ بصیرت کے باعث ہوتی ہے اور منشائے مصنف کو بھی ملحوظ خاطر عدم واقفیت کی بنا پر نہیں رکھا جاتا۔

> ..."ادبی دیانت سے مجبور ہو کر، دبی زبان سے یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ فاضل مولف نے متنبّی کے اشعار کا ترجمہ جی لگا کر نہیں کیا ہے، اور وہ اس قدر سپاٹ اور بجھا ہوا سا ہے کہ قاری کو نہ اُس سے کوئی خاص فیض پہنچ سکتا ہے، نہ وہ اس سے کوئی لطف ہی حاصل کر سکتا ہے... مجھے اس کا یقین ہے کہ فاضل مترجم، اگر عمر خیام کے مترجم "فٹز جیر لڈ" کے مانند متنبّی کی روح میں غوطہ لگا کر اسی چولے میں آجائے تو اس ترجمے میں اس قدر دل لُبھا لینے والی نوک پلک اور لچک ضرور پیدا کر سکتے تھے کہ لوگ جھومنے لگتے۔"(۱۱۱)

جوش نے مترجم کو راستہ بتایا ہے کہ جن امور کو انہوں نے بیان کیا ہے اگلے ایڈیشن میں ان کو ملحوظ رکھ کر ترجمے کی اغلاط کی درستی کر لی جائے تو اچھا ترجمہ وجود میں آ سکتا ہے۔ جوش نے اپنے کالم میں فاضل مترجم پر طنز نہیں کی بلکہ ہمدردانہ انداز میں ان کی کوتاہیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے اپنی علمیّت کے اظہار سے قاری کو مرعوب کرنے کی بجائے انہیں کتاب کی خوبیوں اور خامیوں سے روشناس کروایا ہے۔

''یاَایُّہاَالنَّاس'' کے عنوان سے جوش نے جو کالم تحریر کیا ہے اس میں وہ ان عوامی نمائندگان سے مخاطب ہیں جو الیکشن میں حصہ لے رہے ہیں۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ کیا تم ابنائے روزگار کے حاکم بننا چاہتے ہو یا اللہ کے بندوں کے خادم بننا چاہتے ہو۔ لیکن یاد رکھو کہ اقتدار پائیدار نہیں ہوتا وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''اے دوستو! حاکم بننے کا جذبہ انسانی پستی اور خادم بننے کا جذبہ انسانی بلندی کی علامت ہے۔ جس طرح پہاڑ پر چڑھنا مشکل اور پہاڑ سے اترنا آسان ہوتا ہے، اس طرح حاکم بننا آسان اور خادم بننا دشوار ہوتا ہے۔''(۱۱۲)

جوش دونوں راستے دکھا رہے ہیں کہ حاکم بننے سے بہتر خادم بننا ہے خادم تمام لوگوں کی روح میں خود کو محسوس کرتا ہے جبکہ حاکم دوسروں کی روح قبض کرنے کے درپے رہتا ہے۔ وقت کبھی نہیں رکتا اور اقتدار ایک نہ اک دن ضرور چھن جاتا ہے۔ وہ حباب کی مانند ابھرتا اور ایک لحظے کے بعد ٹوٹ جاتا ہے۔ وقت کی ضرورت کو سمجھتے ہوئے قوم کی ہمدردی اور بھلائی کے پیش نظر جوش نمائندگان کو مفید مشوروں سے نواز کر نیا راستہ دکھلا رہے ہیں جو کہ خیر کا اور انسانیت کی بھلائی کا راستہ ہے۔

۵: جوش بطور تقریظ نویس

جوش ملیح آبادی ہمیشہ دوسروں کی سفارش کرنے اور ان کے کاموں کو سراہنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ صفیہ شمیم جو کہ جوش کی بہن انیس جہاں بیگم کی صاحبزادی ہیں شعر و ادب کا اچھا ذوق رکھتی ہیں ان کی رباعیات کا مجموعہ ''گریہ تبسم'' کی طباعت کا انتظام ہوا تو جوش نے اس کو چار پشتوں کے ادبی ماحول اور پھر شمیم کی فطری شاعرانہ صلاحیتوں کا شاخسانہ قرار دیا۔ ان دونوں باتوں نے مل کر شمیم کی شاعری کو اس طرح نکھارا کہ شمیم نے جس مقام سے ابتدا کی وہاں دوسری شعر گو خواتین کی انتہا ہوتی ہے۔ شمیم کی غیر معمولی حساسیت نے اس کی شاعری کو جلا بخشی۔ یہ احساس کہ خانوادۂ جوش کی ایک خاتون بہترین رباعیاں کہنے پر قدرت رکھتی ہے بہت خوش کن ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''رباعی ایسی زہرہ گداز چیز ہے کہ بڑے بڑوں کے چھکّے چھڑا، اور اچھے سے اچھے شاعروں کے قدم ڈگمگا دیتی ہے۔ یہ کمبخت صفت موزونیء طبع، شعری ذوق، ذہانت اور تخیل کے بل بوتے پر قابو میں آنے والی چیز ہی نہیں، یہ نامراد رباعی تو مطالبہ کرتی ہے۔ ٹھوس تجربات، عمیق خیالات اور حکیمانہ مطالعۂ حیات کا، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ ظالم اس کا بھی حکم دیتی ہے کہ شاعر اپنے افکار کے عطر کو ایسے نوک پلک کے قلیل الفاظ میں ادا کرے جس سے کثیر معنی اجاگر ہو جائیں اور جنونِ شاعرانہ اور عقیل حکیمانہ کو اس انداز سے سمو دیا جائے جس انداز کے ساتھ سنگم میں گنگا اور جمنا کے دھارے ہم آغوش ہو جاتے ہیں۔
>
> شمیم کی عمر، اس کے مشاہدات کی کمی اور (چونکہ وہ چالیس سال سے بہت کم ہے) اس لیے اُس کی چالیس سال سے بیشتر کی مُسلمہ دماغی خامی پر جب نظر ڈالتا ہوں اور اسی کے دوش بدوش جب اپنی عورتوں کی موجودہ عقلی و فکری سطح کو بھی دیکھتا ہوں تو مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے شمیم کی رباعیاں پڑھ کر''(۱۱۳)

جوش نے ۲۳ نومبر ۱۹۵۱ کو دہلی سے شمیم کی رباعی پر اس رائے کا اظہار کیا تھا اور اکبر حمیدی کی کتاب ''آشوبِ صدا'' جو کہ ان کا مجموعہ ہے غزلوں کا یوں خیالات کا اظہار کیا۔

> ''وحدتِ نوعِ انسانی کا میں پرستار ہوں اور اکبر صاحب کا بھی یہی ایمان ہے اور اسی بنا پر ہم دونوں دماغی طور پر ہمسفر ہیں اور کون ایسا بدبخت ہے جو اپنے ہمسفر سے محبت نہیں کرتا''۔(۱۱۴)

جوش نے "آشوبِ صدا" پر یہ رائے دس اکتوبر ۱۹۷۹ کو دی۔

۶: جوش کے تعزیت نامے

تعزیت یعنی کسی کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد اُس کے لواحقین سے اظہار افسوس کرنا، پُرسا دینا، غم گساری کرنا، ماتم پُرسی کرنا ہے۔ تعزیت نامے میں مکتوب الیہ سے اس کے عزیز کی رحلت پر اپنے دلی دُکھ کا اظہار اس طرح کرنا کہ مرحوم کے تمام خصائص کی کھل کر تعریف کرنا ہمارے ہاں مروّج ہے۔ مکتوب نگار اپنی دلی ہمدردی، پیار، محبت، اُنسّیت اور قربت کا اظہار کرتا ہے۔ عام طور پر تعزیت ناموں میں خوبیوں کو بیان کیا جاتا ہے اور خامیوں سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے۔ جوش نے بہت سے لوگوں کی وفات پر تعزیت نامے لکھے جن میں سے کچھ کے اقتباس ہم پیش کریں گے۔

زیر نظر تعزیت نامہ علامہ رشید ترابی کی وفات پر جوش نے اُن کے فرزندِ ارجمند نصیر ترابی کے نام تحریر کیا ہے۔ جوش کا یہ خط ایک نثری مرثیے کے قالب میں ڈھل گیا ہے۔ ڈاکٹر ہلال نقوی اس کے بارے میں رقمطراز ہیں

"جوش صاحب کا یہ خط ایک ایسے تعزیت نامے کی حیثیت رکھتا ہے جس نے اردو ادب میں نثری مرثیے کی صنف کو ایک جداگانہ ادبی وقار عطا کیا۔ اپنے اسلوبِ خاص اور ندرتِ اظہار کے حوالے سے یہ تعزیت نامہ خود جوش صاحب کے لکھے ہوئے تعزیت ناموں میں ایک ایسی ادبی نہج کا حامل ہے جو یکسر ایک علیحدہ مزاج اور ایک منفرد پیرایۂ خیال لیے ہوئے ہے۔"(۱۱۵)

جوش نے یہ تعزیت نامہ یکم جنوری انیس سو چوہتر (۱۹۷۴۔۱۔۱) کو تحریر کیا۔ جوش لکھتے ہیں کہ:

"ایسے قوتِ برداشت کو سلب کر دینے والے سانحے پر جب کہ زندگی کی سانس اکھڑ کر رہ جاتی ہے، صبر کی تلقین کرنا شقاوت نہیں تو اور کیا ہے؟... نظر اٹھا کر دیکھو کہ تمہارے باپ پر...

جو دینِ خوش گفتاری کے پیغمبر تھے۔ موت تاری(۱۱۶) کر کے لیلائے فصاحت پر بیوگی کا عذاب نازل کر دیا گیا۔ عروس بلاغت کی چوڑیاں ٹھنڈی کر دی گئی ہیں۔ شہر ابلاغ کو، پامال کر ڈالا گیا ہے۔ نگارِ حرف و حکایت کی نبضیں ڈبو دی گئی ہیں۔ فضائے سوگ داری سے "واحُسنا" کی صدا چھین لی گئی ہے۔ طلاقت کا جنازہ نکال دیا گیا ہے۔ معانی کی چاندی گہنا دی گئی ہے۔ الفاظ کی پنکھڑیاں توڑ دی گئی ہیں... خطابت کی رگوں کا خون جما دیا گیا ہے۔ جادو بیانی کی رگِ جان تراش دی گئی ہے۔(۱۱۷)

مجاز ایک ایسا شاعر تھا جس کو جوش بہت پسند کرتے تھے۔ مجاز کی جوان مرگی، اس کی ذکاوت، اُس کی یادیں جوش بار بار ماضی کی طرف مراجعت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جوش کو مجاز سے منسوب پر لطف واقعات کی یاد بیقرار کر دیتی تھی جنھوں نے لطائف کی شکل اختیار کر لی تھی۔ مجاز کی وفات پر جوش لکھتے ہیں۔

"صد حیف کہ میں یہ لکھنے کو زندہ ہوں کہ مجاز مر گیا۔ یہ کوئی مجھ سے پوچھے کہ مجاز کیا تھا اور کیا ہو سکتا تھا۔

مرتے وقت تک اُس کا فقط ایک رُبع دماغ کھلنے پایا تھا اور اس کا یہ سارا کلام اُس ایک ربع کھلاوٹ کا کرشمہ تھا، اگر وہ بڑھاپے کی عمر تک آتا تو اپنے عہد کا، سب سے بڑا شاعر ہوتا۔

مگر افسوس کہ پینا اُس کو کھا گیا۔

... مجاز اعتدال برت نہ سکا اور جوانی ہی میں یہ کہتا گزر گیا۔

ہم مے کدے کی راہ سے ہو کر گزر گئے
ورنہ سفر حیات کا بے حد طویل تھا

ایک روز کسی اللہ کے بندے نے اُس کو سمجھایا کہ دیکھو جوش صاحب کی طرح شراب کی ایک معینہ مقدار کو گھڑی سامنے رکھ کر پیا کرو، تو اُس نے جواب دیا تھا کہ جوش صاحب تو گھڑی سامنے رکھ کر پیتے ہیں، مگر میرا بس چلے تو گھڑا سامنے رکھ کر پیا کروں"(۱۱۸)

جوش نے اپنی نواسی کی بیوگی پر جو تعزیت نامہ لکھا ہے اُس میں اپنے دل کا درد بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ اپنی حالتِ زار کے بارے میں بتاتے ہوئے کراچی نہ آنے کی وجہ بتائی ہے۔ جوش جانتے ہیں کہ معاشی ذرائع ختم ہو جاتے ہیں جب کسی کنبے کا سربراہ اس دنیا سے چلا جاتا ہے اس لیے تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جہاں تک بن پڑے گی تمہاری خدمت کرتا رہوں گا۔ جوش لکھتے ہیں۔

"خون کے آنسو رو رہا ہوں، تمہاری بیوگی پر، کیا کروں، کیا نہ کروں۔ میں خود کراچی آتا مگر بیمار ہوں اور نادار بھی... جسم میں دم ہے نہ جیب میں دام ہیں۔ بہر حال جو کچھ بھی مجھ سے بن پڑے گا تمہاری خدمت کرتا رہوں گا۔

بیٹی... اپنا دل ٹھہراؤ، ماں کو بھی ہوش میں لاؤ، بچوں کی طرف دیکھو، مرنے والے کی یاد میں دل نہ پگھلاؤ(۱۱۹)

خورشید علی خاں کے بھائی نعمت علی خاں کا دل کی بیماری کی وجہ سے انتقال ہوا تو اتفاق سے انہی دنوں جوش ملیح آبادی کے چھوٹے بھائی رئیس احمد خاں کا بھی ملیح آباد میں انتقال ہو گیا تھا۔ خورشید علی خاں نے جب اپنے بھائی کے انتقال کی خبر دی تو رئیس احمد خاں کا پُرسہ بھی دیا جس کے جواب نے جوش نے اپنا دل چیر کر رکھ دیا۔ دونوں کا دُکھ مشترکہ تھا دونوں کے لاڈلے اور چھوٹے بھائی دائمی جدائی کا دُکھ دے کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ جذبات کی رو میں جوش اتنے بہہ گئے کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ پر بھی حرف گیری کرنے لگے۔ جوش لکھتے ہیں:

"ہم دونوں کے بھائی ہم دونوں سے منہ موڑ کر چلے گئے اور سب سے بڑا سانحہ یہ ہے کہ ہم جی رہے ہیں۔ میں اپنی زندگی سے پشیمان ہوں۔ خورشید علی خاں، آخر میں کب تک نہیں مروں گا؟

اس ہولناک کرّے میں موت سے زیادہ کوئی چیز یقینی ولازمی نہیں ہے۔ یہ دنیا نہیں بوچڑ خانہ ہے اور اس بوچڑ خانے کو چلانے والا ایک ایسا قصاب ہے کہ اگر اس کو یزید و شمر کہا جائے تو یزید و شمر ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ دائر کر دیں۔

... حیف صد حیف ہماری ساخت پر بہر حال ہم دونوں اس وقت لہولہان ہیں۔ اگر ہم ایک دوسرے کے قریب ہوتے تو شائد کچھ بٹ جاتا ہمارا غم۔ آپ پھر بھی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ہیں جن کی معیّت سے کچھ نہ کچھ غم بٹ ہی جاتا ہو گا۔ میں نامراد یہاں بالکل تنہا ہوں۔ بیوی، بیٹی، بیٹا، کوئی بھی میرے پاس نہیں۔ دن بھر تو لکھنے پڑھنے میں وقت گزر جاتا ہے لیکن غروب کے وقت دل ڈوبنے لگتا ہے۔"(۱۲۰)

اس تعزیت نامے میں جوش نے ایسے کلمات ادا کیے ہیں جو ایک ذی شعور اور راسخ العقیدہ شخص کسی طرح بھی ادا کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ غم اپنی جگہ لیکن کفر کے کلمات استغفر اللہ۔ جوش بہک کر موت کی اٹل حقیقت کو فراموش کر گئے ہیں اور صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے۔

راغب مراد آبادی جوش کے عقیدت مند تھے اور پاکستان میں کراچی میں جوش کے ہمدم و دم ساز بھی تھے۔ ان کا بیٹا نفیس راغب مرچنٹ نیوی میں میرین انجینئر تھا۔ الجزائر کی بندرگاہ عنابہ کے قریب "انجم" جہاز کے انجن میں آگ بھڑک اٹھی اور انجن روم میں دھماکہ ہوا۔ نفیس نے اپنی جان پر کھیل کر جہاز کو تباہی سے بچا لیا لیکن خود زخموں کی تاب نہ لا کر چھ دن بعد راہیِ ملک عدم ہو گیا۔ نفیس کی تعزیت کے لیے جوش ملیح آبادی نے راغب کو دو خطوط روانہ کیے جن میں سے ایک یہ ہے۔

"راغب صاحب! میری طرف سے بے شمار آنسو قبول کیجئے اپنے بیٹے کی موت پر۔

سخت بیمار تھا اس لیے تاخیر سے تعزیت نامہ لکھ رہا ہوں۔

اس وقت بھی فرطِ ضعف سے قلم چلانا مشکل ہے۔ ہائے! آپ کے دل پر کیا بیت رہی ہو گی۔ میرے محبوب دوست

آپ کا پابرکاب

جوش

۲۳/ ۱۲/ ۸۰"(۱۲۱)

۷: جوش کے مصاحبے / انٹرویو

جوش ملیح آبادی ایک ایسے متنازعہ ادیب وشاعر رہے ہیں کہ جن کا ہر مصاحبہ / انٹرویو اپنی جگہ ایک پنڈورا بکس کا دروازہ کھول دیتا تھا۔ اور ہر طرف سے مخالفتوں اور صدائے احتجاج کا غوغا بلند ہوتا شروع ہو جاتا تھا۔ لوگ جوش کو کافر و زندیق قرار دے کر اُس کے خلاف کفر کے فتوے لیناشروع ہو جاتے تھے، وطن پرست جوش کو غدار اور وطن دشمن قرار دے کر ملک بدر کرنے کے مشورے دینے لگتے تھے۔

جوش کے پاکستان جانے اور خود آٹھ ماہ ہندوستان اور چار ماہ پاکستان میں رہنے کی جواہر لال نہرو کی تجویز جوش کے دل کو بھائی کیونکہ وہ پاکستان بھی چلے جاتے اور ہندوستان کی شہرت بھی بدستور ان کے ہاتھ میں رہتی اور سرکارِ ہند بھی پورے سال کی تنخواہ جوش کو دیتی۔ صرف بچوں کو پاکستانی بنادینا پڑتا۔ جوش نے دل وجان سے اس تجویز کو قبول کیا۔

دوسرے دن جوش نے اخبار والوں کو اپنی اور جواہر لال نہرو کی گفتگو کے لب ولباب سے آگاہ کر دیا۔ تیسرے ہی دن جوش کا انٹرویو پاکستان کے تمام انگریزی اور اردو اخبارات میں شائع ہو گیا۔

جب جوش پاکستان گئے تو ابو طالب نقوی نے کہا کہ:

> "یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ آپ پاکستانی باشندے نہ بنیں، اور یہاں کی زمین کا الاٹمنٹ آپ کے نام ہو جائے۔ ہم کو آپ کے بچے آپ کی نسبت سے پیارے ہیں، جب آپ ہی ہمارے نہ بن سکیں گے تو ہمارے واسطے ناممکن ہو جائے گا کہ ہم آپ کے واسطے سینمابنوائیں، یا باغ لگوادیں، اس کے علاوہ یہ صورت حال آپ کو کہیں کا نہ رہنے دے گی، پاکستانی آپ کو ہندوستانی سمجھیں گے اور ہندوستانی آپ سے اس لیے بدگمان ہو جائے گا کہ آپ کا پوراخاندان پاکستانی بن چکا ہے اور خود آپ بھی ہر سال چار ماہ پاکستان رہیں گے۔ جوش صاحب دو کشتیوں میں پاؤں رکھ کر دریاعبور نہیں کیاجاسکتا۔"
>
> (یادوں کی برات ص ۲۸۱)

جوش نے نقوی صاحب کی بات مان لی اور پاکستانی بن گئے۔ جوش کے پاکستانی شہرت اختیار کرتے ہی پاکستان اور بالخصوص کراچی میں اردو اور انگریزی اخبارات میں شور مچ گیا اور ادیب وشاعر اور کارٹونسٹ خم ٹھونک کر میدان میں آگئے۔ جوش نے باغ اور سینما کی زمین حکومت کو واپس کر دی لیکن نقوی کی کمشنری ختم کر دی گئی۔ مصائب کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ جوش کی سفارش سے ترقی اردو بورڈ کا قیام عمل میں آیا تو جوش کو وہاں مشیر ادب کا عہدہ ملا

اگست ۱۹۶۷ء میں جوش رخصت پر ملیح آباد، ہندوستان عازم سفر ہوئے تا کہ اپنے باغوں کے تصفیے کے لیے کچھ کر سکیں۔ وہاں جوش کو چار ماہ قیام کرنا پڑا۔ اسی دوران ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے ممبئی پہنچے وہاں ض۔ انصاری کسی اخباری نمائندے کو لے کر جوش کے انٹرویو کے لیے آئے۔ (۱۲۲)

جوش کے ہمراہ عیش ٹونکی بھی گئے تھے۔ انٹرویو ایک انگریزی اخبار میں طبع ہوا جب جوش واپس آئے تو جوش کے ممبئی کے انٹرویو کو نئے معنی پہنا کر یہاں کے اخباروں نے خوب اچھالا اور پاکستان دشمنی کا الزام عائد کیا۔ اس بارے میں خلیق انجم لکھتے ہیں۔

> ..."پھر جوش کا ایک خاص پس منظر تھا۔ ان کے بارے میں سب جانتے تھے کہ وہ پاکستان صرف دولت حاصل کرنے کے لیے آئے تھے۔ اگست ۱۹۶۷ء میں ہندوستان سے محبت کرنے کی وجہ سے جوش پاکستان کی حکومت اور عوام دونوں کے معتوب ہو گئے اور انہیں اس کی زبردست سزا ملی۔"(۱۲۳)

خلیق انجم نے جوش کی پاکستان آمد کو دولت حاصل کرنے کا بہانہ قرار دیا جبکہ جوش ملیح آباد میں بھی اور ہندوستان میں بھی آسودہ زندگی گزار رہے تھے۔ سرکاری اخبار کے مدیر تھے۔ ریاست حیدر آباد اور پٹیالہ سے پنشن مل رہی تھی۔ جواہر لال نہرو اور دیگر سیاسی شخصیات سے مراسم تھے۔ پدم بھوشن کا ایوارڈ مل چکا تھا۔ لیکن جوش پھر بھی پاکستان اردو کی محبت اور اپنے لواحقین کی آسودگی کا سوچ کر چلے آئے لیکن یہاں لوگوں نے ان کی ٹھیک پذیرائی نہیں کی البتہ پاکستان میں بھی جوش کو ایسے سرپرست مل گئے جو جوش کی نازبرادری کرتے تھے۔ جوش کے مخالفین کو برداشت نہ ہوا۔ عیش ٹونکی کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ جوش کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہنے کی وجہ یہ تھی کہ انہیں حکومت پاکستان نے جاسوسی کے لیے جوش کے ساتھ بھیجا تھا۔ انہوں نے پاکستان واپس آکر جوش کے خلاف زہر اگلا اور حکومت پاکستان کے کچھ افسروں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے جوش سے کچھ ایسی باتیں منسوب کیں جو سراسر غلط تھیں۔ انہوں نے کہا کہ جوش نے ہندوستان کی بہت تعریفیں کیں لیکن پاکستان اور اس کے رہنماؤں کو بہت بُرا بھلا کہا جبکہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے لکھا ہے۔

> ''جہاں تک مجھے علم ہے جوش کے خلاف جو شکایتیں درج کی گئی تھیں اُن میں سے ایک تو یہ تھی کہ انہوں نے ممبئی میں ایک اخباری انٹرویو میں پاکستان کے خلاف زہر اگلا۔ اتفاق سے میں بھی اس وقت موجود تھا۔ اور یہ انٹرویو ظ انصاری نے سید وبھائی کے گھر لیا تھا۔ اس سارے انٹرویو میں جوش صاحب نے ہندوستان سے محبت کا تو ضرور اظہار کیا لیکن پاکستان اور پاکستان کی حکومت کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا۔''(۱۲۴)

جوش کے نواسے فرخ جمال ملیح آبادی نے اپنی کتاب ''جوش... میرے بابا، شخص اور شاعر'' میں حقیقت حال کی پردہ کشائی کچھ اور کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''اب جو بات میں بتاؤں گا وہ شائد بابا نے خاندانی شرافت یا شرمساری میں نہ کہی ہو۔ دور ایوبی میں جب بابا ہندوستان گئے تھے، اُس وقت وہاں کے اخبارات نے حضرت جوش کا وہ انٹرویو شائع کیا، جس میں انہوں نے ''فیلڈ مارشل'' جنرل محمد ایوب خاں کے بارے میں کہا تھا ''کہ ہمارا صدر جاہل ہے۔ اس کا تلفظ ٹھیک نہیں ہے، وہ علم کو عَلم کہتا ہے'' واپسی پر ہوا یہ کہ بابا کا پاسپورٹ ضبط کر لیا گیا۔ انہیں ترقیٔ اردو بورڈ سے جہاں وہ اردو لغت کی تصحیح کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ ہٹا دیا گیا، ان کی سیمنٹ کی ایجنسی ضبط کر لی گئی۔ یعنی اپنے تئیں جنرل ایوب نے رزق کے تمام دروازے بند کر دیئے۔(۱۲۵)

جوش سے جو معاندانہ سلوک ہوا اس سے بہت پہلے ہی جوش کی ہجرت نے ہندوستان اور پاکستان کے ادبی حلقوں میں جوش کے خلاف لاوا پکنا شروع ہو چکا تھا۔ اس بارے میں مظہر امام رقم طراز ہیں۔

> ''نقل وطن سے کچھ پہلے جوش کو پدم بھوشن کا خطاب ملا تھا۔ محفلوں میں خوب چہ میگوئیاں ہوئیں۔ عموماً تمسخرانہ انداز میں، اُن کی پاکستان کی ہجرت نے ہندستان اور پاکستان کے ادبی و سیاسی اور سماجی حلقوں میں ایک زلزلہ سا پیدا کر دیا تھا۔ جواہر لال نہرو اور ابو الکلام آزاد سے اُن کے ذاتی تعلقات کی تشہیر ہوئی۔''(۱۲۶)

یعنی جوش کے خلاف معاندانہ رویے کی ایک وجہ ہے کہ جوش کو ہندوستان نے سر آنکھوں پر بٹھایا لیکن جوش نے پھر بھی وطن چھوڑ دیا اور پاکستانی بھی ایسے کسی شخص کو برداشت نہیں کرنا چاہتے تھے جو دشمن کی تعریف میں ہمیشہ رطب اللسان رہا ہو اور حکومت سے اعلیٰ سرکاری اعزاز لے کر اُس کی دلکشی کے گیت گا تا رہا ہو۔ پاکستانی شاعر و ادیب اپنے قد سے اونچے شخص کو برداشت نہیں کرنا چاہ رہے تھے۔

ڈاکٹر انوار احمد و حماد رسول اُس زمانے کے لوگوں کی ذہنی کیفیت کے تجزیاتی مطالعے کے بعد اس نکتے پر پہنچے ہیں کہ:

> بلاشبہ قیام پاکستان کے بعد بھارت اور پاکستان میں اثاثوں پر فخر یا مان کے حوالے سے ایک مسابقت تھی اور جوش نے پاکستان آجانے کو اس زمین کی ثقافتی فتح قرار دیا گیا۔ تاہم یہ عجیب اتفاق ہے کہ انہوں نے پاکستان چلے آنے کے لیے وہ زمانہ منتخب کیا جس کے کچھ عرصے کے بعد جنرل محمد ایوب خان کی دس برس پر محیط حکومت کا آغاز ہو گیا تھا۔ تاہم یہ وہ وقت تھا کہ ایوب خان کے کم از کم دور تن بڑے

ادیبوں، شاعروں کو حکومت کے لیے درد سر بننے سے روکنے کے لیے کافی متحرک رہے اور اسی دور میں وہ اردو ڈکشنری بورڈ سے وابستہ رہے ان کی انا نے مولوی عبد الحق، شاہد احمد دہلوی اور شان الحق حقی کو بھی قبول نہ کیا۔"(۱۲۷)

کنور مہندر سنگھ نے اپنی آپ بیتی میں عیش ٹونکی کو جوش صاحب کا امیج خراب کرنے کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ جو جوش کے نام پر ہر روز شراب کی بوتل لا کر بازار میں فروخت کر دیا کرتے تھے اور موقعہ پا کر جوش کی جیب سے چار ہزار روپیہ بھی نکال لیا جس پر جوش نے علیحدگی اختیار کر لی لیکن بسمل سعیدی کے کہنے پر معاف کر دیا۔ جوش نے لاہور پہنچ کر جب اپنے خلاف فضا ناہموار پائی تو انہیں افسوس ہوا لیکن انہوں نے سوچا کہ جب حدیث اور قرآن کو اپنے سانچے میں ڈالنے کے لیے تاویلات کے ذریعے سے بدل دیا جاتا ہے تو میرا انٹرویو کیا چیز ہے۔ لاہور میں اخباروں کا ابطال کروا کر کراچی گئے تو دفتر میں شان الحق حقّی نے بڑے گستاخانہ انداز میں مراسلت شروع کر دی۔ نتیجتاً جوش کو توسیع نہ دی گئی اور دفتر سے قطع تعلق ہو گئی جب ہندوستان کے ریڈیو سے جوش کی برطرفی کی خبر نشر ہوئی تو پاکستان کے اخبار نے خبر کو غلط قرار دیا۔ جوش کی سیمنٹ کی ایجنسی چھن گئی، پاسپورٹ ضبط ہو گیا، باغوں کا جو روپیہ جو ہندوستان کے ریزرو بنک میں جمع تھا وہ بھی یہاں نہیں مل سکتا تھا۔ جوش نے صدر پاکستان، محمد موسیٰ خان اور فدا حسین صاحب کو خط لکھ کر غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی کہ وہ صدر پاکستان یا پاکستان کے مخالف نہیں ہیں وگرنہ پاکستان میں ٹکے نہ رہتے۔

> فرخ جمال ملیح آبادی نے لکھا ہے کہ جب ہر طرف سے جوش پر رزق کے دروازے بند کر دیئے گئے تو سیکرٹری اطلاعات الطاف گوہر جوش کے پاس آئے اور کہا کہ "آپ کی وہ تمام مراعات بحال کی جاسکتی ہیں جن پر پابندیاں ہیں کہ اگر آپ ایوب خان صاحب کی شان میں ہر ماہ ایک قصیدہ لکھ دیا کریں" اور کوئی ہوتا تو سودے بازی کر لیتا مگر انہوں نے فاقوں مرنا گوارا کیا اور انہیں یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ "آپ کا فیلڈ مارشل اگر مجھے ایک لاکھ روپیہ بھی دے گا تو میں اصولوں پر اور اپنے نظریات پر سودے بازی نہیں کروں گا۔(۱۲۸)

ایوب خان کے دور کا خاتمہ ہوا تو یحییٰ خان مسند نشین ہوا اس نے جوش کا ضبط شدہ پاسپورٹ واپس کر ایا۔ سجاد حیدر خروش (فرزندِ جوش) کی چھینی ہوئی سیمینٹ کی ایجنسی بحال کر دی اور جوش سے وعدہ کیا کہ ان کا تقرر دوبارہ کر دیا جائے گا۔ سقوط بنگال کا سانحہ پیش آیا۔ پھر الیکشن ہوئے۔ جماعت اسلامی کے مقابل پاکستان پیپلز پارٹی میدان میں آئی اور بھاری اکثریت سے فتح یاب ہوئی۔ عنانِ اقتدار وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے سنبھالی۔ مولانا کوثر نیازی نے وزارت اطلاعات میں تقرر فرما دیا۔ بھٹو نے وزارت اطلاعات سے ہٹا کر وزارت تعلیمات میں تقرر کر دیا۔

جوش ملیح آبادی جب پاکستان آئے تو پاکستان میں ان کی عمر کا زیادہ تر حصہ آمرانہ دور حکومت میں بسر ہوا۔ عمر کے آخری حصے میں انہیں جس قسم کی مارشل لاء حکومت کے تحت وقت گزارنا پڑا وہ جوش جیسے آزاد اور بغاوت پسند نثر نگار اور شاعر کے لیے انتہائی اذیت ناک تھا۔ جوش جیسے حساس شخص پر جو قدغنیں لگائی گئی تھیں اس کے پس پشت ایک انٹرویو کار فرما تھا جو کہ ایک منظم سازش کے تحت لیا گیا تھا۔ جوش کو جان بوجھ کر ایک ایسے ٹرننگ پوائنٹ پر لایا گیا جہاں وہ بولے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ ۱۹۷۴ء میں جبکہ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت تھی۔ ریڈیو پاکستان والوں نے جوش سے ایک انٹرویو اس وعدے پر ریکارڈ کیا تھا کہ اس کو جوش کی وفات کے بعد نشر کیا جائے گا کیونکہ اس انٹرویو کا موضوع ایسے حساس مسائل پر مشتمل تھا جہاں کوئی مصلحت بین شخص لب کشائی کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ جوش نے اختصار کے ساتھ جو جوابات دیئے وہ بلا سیاق و سباق اور تشریح کے سخت غلط فہمی پیدا کرنے کے موجب بن سکتے تھے۔ ہندوستان میں مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط ایک عرصے تک منظر عام سے غائب رہے اور ان کی متعینہ مدت کے بعد انہیں لوگوں کے سامنے لایا گیا۔ ایک سیکولر حکومت نے وعدے کی پاسداری کی جبکہ ایک اسلامی مملکت میں وعدہ خلافی کرتے ہوئے انٹرویو کو جوش کی زندگی میں ہی نشر کر کے انہیں آخری عمر میں ایک ذہنی کرب اور جذباتی بحران

کے ساتھ ساتھ معاشرتی و معاشی محاذ پر بھی تنہا کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان کے لیے تمام دروازے بند کر دیئے گئے۔ ان پر ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبارات کے ذریعے اپنی بات پہنچانے کے تمام راستے مسدود کر دیئے گئے۔ انٹرویو کرنے والے تین افراد تھے۔

۱۔ شاہ حسن عطا جو ریڈیو پاکستان کی خارجہ سروس کے سپروائزر تھے۔ ۲۔ عبدالحمید اعظمی جو کنٹرولر پروگرام پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن راولپنڈی تھے۔ ۳۔ سعید نقشبندی جو پروگرام مینیجر راولپنڈی تھے۔

پہلے جوش کی تعریف و توصیف کر کے نفسیاتی فضا ہموار کی گئی پھر سوالات کو گھما پھرا کر پوچھا گیا۔ جوش کے سوال دہرانے پر حسن عطا نے سوال دہرایا۔

''میرا سوال جو ہے وہ یہ ہے کہ جو تصورات انقلاب ہوئے تھے۔ سیاسی جس کے نتیجے میں پاکستان معرض ظہور میں آیا۔ اس سلسلے میں آپ کا ذاتی ردِ عمل کیا ہے؟ یعنی آپ نے اس کو مستحسن نگاہ سے دیکھا اور آپ کے نزدیک برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک بڑا کام ہوا یا نہیں ہوا یا اس کے کیا اثرات ہونے چاہئیں تھے جو نہیں ہوئے اور خود آپ کا ردعمل اس سلسلے میں کیا ہے؟

جوش، اگر آپ میری بات کو نشر نہ فرمائیں کیونکہ یہ وہ بات ہے کہ ''فاش اگر گویم جہاں برہم زدم'' میں قلیل الاحباب اور کثیر الاعداء ہوں۔ میں اگر کھل کر کہوں گا اور آپ نے اس کو نشر کر دیا تو میرے دشمن اور بڑھ جائیں گے۔ آپ اس کا وعدہ فرمائیں کہ میرے انتقال کے بعد میری اس آواز کو سنائیں گے تو میں عرض کروں۔

حسن عطا... میں سمجھتا ہوں کہ ایک سچی بات کہنے میں آپ جیسے ایک بڑے شاعر کو کوئی تکلّف نہیں ہونا چاہیے اور ظاہر ہے کہ یہ جو کچھ کہلوایا جارہا ہے اس کا قطعاً کوئی غلط استعمال نہیں ہوگا، یہ قطعاً اس لیے نہیں ہے کہ آپ کی پوزیشن نازک ہو کسی مرحلہ پر بھی۔ لیکن اب یہ کہ ایک واقعہ ہوا ہے۔ پاکستان بنا ہے۔ اتنی بڑی تحریک سامنے آئی ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک واقعہ ہوا ہے تو آپ کا ردعمل تو جاننا تاریخ کا ایک بڑا ہی اہم ضروری اور ناگزیر سا فعل ہے اس لیے آپ بلا تکلف فرمائیں۔ جوش: میرے نزدیک پاکستان جو بنا ہے اس سے نقصان پہنچا ہے ہندو کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ مسلمان کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ ہم نے جو ایک گنگا جمنی تہذیب بنائی تھی ایک ہزار برس میں وہ پاش پاش ہو گئی۔ ہم نے جو اقدار بنائے تھے شرافت اور تہذیب کے، وضع داری کے وہ سب ختم ہو گئے۔ مذہب کی بنا پر اقوام نہیں بنتی ہیں۔ اگر میں عیسائی ہو جاؤں تو کیا پاکستانی نہیں رہوں گا۔''(۱۲۹)

خورشید علی خاں نے جوش جیسے عظیم مفکر اور مشہور شاعر پر جو کہ وزارت اطلاعات میں ملازمت کرتے تھے، ایسے الزامات لگوانا حکومت وقت کا کارنامہ قرار دیا ہے۔(۱۳۰)

ڈاکٹر عقیل احمد نے جوش کی رائے اس طرح رقم کی ہے کہ

''تقسیم کے نتیجے میں جو افراتفری مچی، اس سے وضعداری، شرافت اور تہذیب کی وہ عظیم روایات برباد ہو گئیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر ایک ہزار برس کے دوران پروان چڑھائی تھیں... علامہ اقبال نے صرف مسلمانوں کے لیے اپنے کو وقف کر کے اپنے ساتھ زیادتی کی۔''(۱۳۱)

مفاد یافتہ طبقہ نے اس انٹرویو کو بھی اس کے سیاق و سباق سے الگ کر کے جوش کے خلاف پراپیگنڈے کا ذریعہ بنایا اور وزارت اطلاعات و نشریات نے جس پر اس زمانے میں ایک اسلام نواز جماعت کا اقتدار تھا اور جوش کے خیالات سے اختلاف رکھتی تھی۔ جوش کو سرکاری ذرائع ابلاغ سے بلیک لسٹ کروا دیا۔ ان کی شاعری یا نثر کو ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سرکاری مطبوعات میں اشاعت کے لیے ممنوع قرار دیا۔ جوش کی مدافعت میں روزنامہ ڈان نے اپنے اداریے میں لکھا۔

''۱۹۷۸ء کے آخری لمحات میں ایک ایسے شاعر کے خلاف یہ اقدام کئی دہائیاں پیشتر جس کی آواز تاجِ برطانیہ کو للکارتی رہی تھی ایک تاریخی ستم ظریفی قرار دیا جائے گا... ہم ان حالات سے بھی واقف ہیں جن کے تحت یہ انٹرویو لیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ انٹرویو بعد از رحلتِ نشر ہونے کے لیے تھا اور جوش صاحب کی زندگی میں اسے منظر عام پر نہیں لانا چاہیے تھا اگر یہ درست ہے تو پھر اس کی اشاعت

ایک غیر اخلاقی حرکت ہے۔ حضرت جوش ملیح آبادی ایک شاعر ہیں۔ عظیم شاعر اور ان کا مرتبہ سرکاری ذرائع ابلاغ سے انہیں خارج کر کے کم نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہ اقدام نتیجتاً ان کے لیے ایک اعزاز بن جائے گا کیونکہ انسانی تہذیب کی تاریخ ایسے شاعروں، ادیبوں، صوفیوں اور فلسفیوں سے بھری پڑی ہے جو انتظامیہ کے ہاتھوں پستے رہے مگر جن کے نام اپنے الزام دہندگان کی نسبت آج بھی زندہ ہیں۔"(۱۳۲)

(بحوالہ ہمارے جوش صاحب ص ۵۷۳)

ہر کسی نے اس واقعے کے تناظر کو اپنے مخصوص نکتہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی اور پاکستان کے قیام کے ساتھ ایک طبقے نے محسوس کیا کہ جن تصورات و نظریات کی بنا پر پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا وہ پاکستان میں پورے ہوتے دکھائی نہیں دے رہے تو ان کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ جو جس تہذیب و ثقافت کو بچانا چاہتے تھے وہ برصغیر کے ہندو اور مسلمان دونوں کی میراث تھی۔ اردو زبان کا تحفظ جہاں ضروری تھا۔ انسانیت جہاں سب سے بڑا مذہب تھی۔ جہاں وہ قباحتیں نہ تھیں جو لسانی اور صوبائی عصبیتوں کو جنم دیتی ہیں۔ جہاں مغربی اور مشرقی پاکستان ایک جسم کے دو حصے تھے اور جہاں مسلمان فرقوں، درجوں اور طبقوں میں بٹا ہوا نہ ہو۔ لیکن جب ایسا نہ ہوا تو جوش جیسا حساس شخص بھی زبان کھولنے پر مجبور ہو گیا اور یہ کہنے لگا کہ پاکستان بننے سے مسلمانوں کا نقصان ہوا۔ یہی بات فیض نے بھی کہی تھی۔

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

حسن منتظر نے اس معاملے کو اس طرح دیکھا کہ انہیں جوش کے حمایتی جوش کے خلاف بولنے والے اور اس معاملے میں غیر جانبدار رہنے والے افراد تین دھڑوں میں بٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ:

..."اس خبر کے بعد کہ جوش ملیح آبادی نے اپنے جن خیالات کا اظہار اسلام، قرآن، پاکستان، قائد اعظم اور علامہ اقبال کے بارے میں کیا ہے۔ اس کے پس منظر میں آئندہ ان کو ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں شریک نہیں کیا جائے گا۔ دو ایک دن تو خاموشی رہی اور ایسا لگتا تھا کہ غیر اہم خبر تھی جس کا چھپنا نہ چھپنا برابر تھا لیکن اس کے بعد جو اداریے اور اخبار پڑھنے والوں کے خطوط کا سلسلہ ہے تو ایک سمجھدار قاری اس سے اندازہ کر سکتا ہے کہ یہاں معاملہ جوش پر قدغن کا نہیں ہے بلکہ مختلف نظریات کے ٹکراؤ کا ہے اور ہر نظریہ کو پیش کرنے والے اپنے نظریے کی بقا کے بارے میں وسوسے میں تھے۔"(۱۳۳)

اکثر احباب اور حلقوں نے اس رائے کا بھی اظہار کیا ہے کہ کیا ہوا پابندی صرف ٹی وی اور ریڈیو پر ان کا کلام پیش کیے جانے پر نہیں، یہ احباب نہیں جانتے کہ فن اور سائنس دونوں اس کے خلاق اور عوام یا دیگر مخلوق کے توسل سے پیدا ہوتے ہیں۔" اس زمانے میں جنرل ضیاالحق مطلق العنان فوجی صدر تھے مگر وہ بھی جوش صاحب کی فکری عظمت کے معترف تھے۔ انہوں نے خود اپنی وزارت اطلاعات کی پالیسی کے علی الرغم جوش کو ملنے والی مراعات میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں ہونے دی اور وہ تمام سہولتیں جو ان کو پہلے حاصل تھیں، حاصل رہیں۔ اسی دوران جب مخالفین کا پراپیگنڈہ حد سے بڑھ گیا تو کراچی پریس کلب نے اپنی حریت فکر کے ثبوت میں جوش ملیح آبادی کی خدمات کے اعتراف میں انہیں کراچی پریس کلب کی دوامی رکنیت کی پیشکش کی۔ ۱۸ جون ۱۹۷۹ء کو یہ پیشکش ایک خطبہ صدارت میں کلب کے صدر نے کی۔ جبکہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ اصولاً اس عمل کو حکومت وقت کے اعمال نامے میں لکھا جانا چاہیے لیکن سب جانتے ہیں کہ اس کے محرک و معاون وہ لوگ تھے جو خود کو اہل قلم کہلواتے ہیں۔ مفاد پرستوں نے جوش کے انٹرویو کو ان کی زندگی میں نشر و شائع کر کے جوش کا نام اکادمی ادبیات پاکستان کے اساسی ارکان کی فہرست سے نکلوا کر جوش کو رسوا کرنے کی کوشش کی لیکن ایسا کرنے والے خود ہمیشہ کے لیے رسوا ہو گئے۔ ڈاکٹر فرمان لکھتے ہیں۔

"ضیائی مارشل لاء کی آمد اور اکادمی کی پہلی کانفرنس کے انعقاد سے کچھ دنوں پہلے جس وقت اکادمی کی بنیاد رکھی جارہی تھی اور اس کے لیے فاؤنڈنگ فیلوز (اساسی ارکان) کی جو فہرست تیار کی گئی تھی، اس میں جوش کا نام شامل تھا۔ لیکن جیسے ہی مارشل لاء نافذ ہوا اس کے حمایتی حلقے کے چھٹ بھیّوں نے اساسی ارکان کی فہرست سے جوش جیسے عظیم شاعر کا نام خارج کرا دیا، حالانکہ صرف فرانس کی اکادمی نہیں بلکہ سارے مہذب ممالک کی ادبی اکادمیوں کا قاعدہ ہے کہ جو شخص ایک بار اکادمی کا فاؤنڈنگ فیلو نامزد ہو جاتا ہے، پھر اس کا نام خارج نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن جوش کے سلسلے میں اس کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔(۱۳۴)

اور جس وقت اکادمی ادبیات پاکستان کی طلب کردہ پہلی اہل قلم کانفرنس کا انعقاد ہو رہا تھا اور صدر پاکستان ایک ہوٹل میں اس تقریب کا افتتاح فرما رہے تھے تو جوش جیسا بڑا ادیب و شاعر اسلام آباد کے ایک گوشے میں قید تنہائی بھگت رہا تھا۔ جوش وہ شخص تھا جس نے اکادمی کے لیے بھاگ دوڑ کی تھی اور ایک جامع لائحہ عمل پیش کیا تھا۔ صرف دو چار ادیبوں نے حکومت وقت اور ابن الوقت شاعروں اور ادیبوں کی اس ناانصافی کے خلاف آواز بلند کی تھی جن میں احمد ندیم قاسمی پیش پیش تھے۔ انہوں نے احتجاجی کالم بھی تحریر کیے لیکن جوش پر بے دینی کا فتویٰ لگا کر ان کو تنہا کر دیا گیا تھا۔ تبسم اخلاق نے اپنے مصمون میں جوش کی تنہائی کا بیان کچھ یوں رقم کیا ہے کہ

"یوں تو حضرت جوش کو اپنی ناقدری کا گلہ تھا ہی اور وہ برسوں سے خود کو (مرحوم) لکھا کرتے تھے لیکن اپنی زندگی کے آخری چند برسوں میں یہ احساس شدید ہو گیا تھا۔ انہوں نے کسی پر کچھ بھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ اپنے دوستوں کی محفلیں سجاتے، ہنستے بولتے اور بڑے سے بڑے دکھ کو قہقہوں میں اڑا دیتے تھے۔ جب ایک حکومت نے انہیں بلیک لسٹ قرار دیا تھا جوش کی شامیں جو دوستوں کی محفلوں اور قہقہوں سے رنگین ہوتی تھیں اب سناٹوں میں تبدیل ہو گئی تھیں وہ ہر آہٹ پر دروازے کی طرف دیکھتے مگر ہر بار ان کی نگاہیں مایوس لوٹتیں۔"(۱۳۵)

ہم اب احوال ایک انٹرویو کا درج کرتے ہیں جو کہ مشہور ٹیلی ویژن پروگرام "ضیاء محیی الدین شو" میں لیا گیا۔ جوش صاحب سے سوالات کے لیے ضیاء جالندھری کو موقع دیا گیا۔ دوران پروگرام زبان کی بات چلی تو سوال ہوا کہ "آپ کافی عرصے سے شعر کہہ رہے ہیں، پھر بھی زبان کے معاملے میں آپ اتنے سخت گیر کیوں ہیں۔ اگر کوئی شخص دوران گفتگو معمولی سی غلطی بھی کر دیتا ہے تو آپ فوراً ٹوک دیتے ہیں؟ جوش نے فوراً سوال کرنے والے کی زبان کی غلطی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا"میں کافی عرصے سے نہیں بہت عرصے سے شعر کہہ رہا ہوں۔ زبان کی غلطی کو جائز سمجھتا ہوں۔ بشر طیکہ وہ حسن کے ساتھ ہو۔ اس صورت حال کے پیش نظر خامہ بگوش نے اپنے کالم میں لکھا کہ

..."ہمیں اندیشہ ہے کہ کہیں ایک نئے لسانی جھگڑے کا دروازہ نہ کھل جائے۔ اب جوش صاحب جس کو بھی زبان کی غلطی پر ٹوکیں گے، وہ یہی کہے گا کہ حضرت میں نے بڑے حسن کے ساتھ غلطی کی ہے، جوش صاحب زندگی بھر حسن سے محظوظ ہوتے رہے، لیکن اب زبان کے معاملے میں یہ حسن بلائے جان بن جائے گا۔(۱۳۶)

دوران گفتگو جب یادوں کی بارات کا ذکر ہوا تو ضیا محیی الدین نے سوال کیا کہ آپ نے اپنی کتاب میں اپنے دوستوں کے بارے میں ایسی باتیں لکھی ہیں، جن سے ان کی رسوائی کا اندیشہ ہے۔ دوستوں کے راز تو ان کی امانت ہوتے ہیں۔ آپ نے اپنے گناہوں کی تشہیر تو کی ہی تھی، لیکن ان بے چاروں کے گناہوں کو بھی خوب اچھالا۔ کیا اس طرح آپ نے اپنے دوستوں کے اعتبار کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔ جوش نے اس سوال کا اس قدر جواب دیا کہ کیا گناہ بھی کوئی چیز ہوتی ہے؟

اب ہم ایک اور انٹرویو پر نظر دوڑاتے ہیں جو کہ مصطفیٰ زیدی نے جوش سے لیا تھا۔ اس میں انہوں نے جوش سے لسانیات، مذہب، شاعری، فلسفہ، عشق، محبت اور جنس جیسے موضوعات ڈسکس کیے ہیں ان موضوعات کے حوالے سے اگر جوش کی رائے کو طشت ازبام کیا جاتا تو بھی فساد ہو سکتا تھا کیونکہ یہ انٹرویو جوش کی وفات کے بعد بھی ۱۵ سال تک غیر مطبوعہ تھا۔ اس لیے کہ اس میں جوش نے حضرت عیسیٰ کے بارے

میں امریکہ کی ایک خاتون Medeline Murray کے نظریہ کو درست قرار دیا ہے کہ جس کی تحقیق کے مطابق حضرت عیسیٰؑ یعنی Jesus Christ کی کوئی Real Identity نہیں ہے اور آج ہمارے پاس کوئی تحقیق کا ذریعہ نہیں ہے جس کی بنا پر ہم ان کی بات کو پرکھ سکیں۔ یہاں ہم آپ کے ملاحظہ کے لیے سوال اور ان کے جواب درج کرتے ہیں۔

مصطفیٰ زیدی: ابھی Jesus christ کے سلسلے میں ایک سوال جو Medeline Murray سے کیا گیا تھا۔ یہ ہے میں انگریزی میں پڑھ دیتا ہوں۔ Do you also reject the idea of virgin birth یعنی حضرت مریم علیہ السلام کے متعلق جو تصور ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جوش Virgin birth : کوئی چیز نہیں ہے۔ Non sense ہے۔

مصطفیٰ زیدی: لیکن اردو زبان نے اس کو بطور استعارہ استعمال کیا ہے اور آپ نے بھی کیا ہے۔

جوش: جی ہاں، شاعری میں تو اپنی قوت کو حاصل کرنے کے لیے لیلیٰ اور مجنوں سبھی کچھ زورِ بیاں کے لیے لاتے ہیں۔ اس میں کوئی تحقیقی کام تو ہوتا نہیں، زورِ بیان کے لیے ان الفاظ کو لاتے ہیں۔

مصطفیٰ زیدی: اچھا جوش صاحب! جس جنسی جذبے کی تکمیل کے لیے آپ کوئی حرج اپنی ذات کے لیے نہیں سمجھتے اگر اس قسم کی آزادی ایک پورے معاشرے کو دے دی جائے، تو آپ کا کیا خیال ہے اس کے اثرات سے ایک Chaos معاشرے میں نہیں پیدا ہو جائے گا؟

جوش: اس وقت جبکہ جہل ہے اور تنگ نظری ہے اور انا میں گھساوٴ ہے اس وقت تو قتل ہو گا اور فساد ہو گا لیکن جب نوع انسانی میں ہر شخص ایک Minimum حکیم ہو جائے گا تو اس وقت یہ بڑی دولت ہو جائے گی۔

مصطفیٰ زیدی: صاحب آپ تو خود اس قتل اور فساد کو ایڈر کیٹ کرتے ہیں۔ آپ تو محبوب کو اگر تشدد سے بھی حاصل کیا جائے تو کہتے ہیں کہ کرنا چاہیے۔

جوش: ہاں اس وقت جو کہہ رہا ہوں ایک حکیم کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں اور اُس وقت ایک لذت پسند انسان کی حیثیت سے کبھی کبھی ایسے موڈ بھی طاری ہوتے ہیں لیکن یہ کہ ٹھہری ہوئی زندگی میں ٹھنڈے دل سے جب غور کرتا ہوں تو فساد کو پسند نہیں کرتا۔

مصطفیٰ زیدی: جوش صاحب! میرا سوال بہت سیدھا ہے کہ جس جذبے کی اجازت آپ اپنے آپ کو دیتے ہیں کیا اس کی اجازت آپ مجھے بھی دیں گے۔ کیا اس کی اجازت اپنے بچوں کو بھی دیں گے۔

جوش: جی ہاں۔" (۱۳۷)

آج تک جوش نے کھل کر کسی انٹرویو میں اتنی وضاحت نہیں کی اور اپنے نظریات کو اس طرح بیان نہیں کیا اس لیے ہم نے آپ کے ملاحظے کے لیے چند سوالات مع جوابات درج کیے ہیں۔ جوش ایک مشہور شخصیت تھے۔ بے شمار مصاحبے ہوئے۔ ہم سب کو یہاں درج نہیں کر سکتے، جوش کے یارِ دیرینہ راغب مراد آبادی نے ۱۹۶۷ تا ۱۹۷۷ء جوش ملیح آبادی سے کل ۵۵۵ سوالات کیے۔ جوش نے کل ۵۴۸ سوالات کے جوابات دیئے (سات) سوالات کے جواب گول کر دیئے۔ راغب مراد آبادی کا قاعدہ تھا کہ سوالات کے سامنے جوش کے جوابات لکھ کر ان سے دستخط کروالیا کرتے تھے۔ جوش نے اگر کبھی تبدیلی کرنی ہوتی تو کاٹ کر جواب درست کر دیتے تھے۔ وگرنہ دستخط کر کے تاریخ ڈال دیتے تھے۔ ایک مرتبہ راغب نے جوش سے پوچھا"آپ کو کونسی دال پسند ہے۔ جواب میں لکھا کہ ماش کی دھلی ہوئی دال جب جوش دستخط کرنے لگے تو ہوئی کاٹ دی اور لکھا ماش کی دھلی دال۔ علاوہ ازیں راغب مراد آبادی نے ۳۰۔۳۵ گھنٹوں پر محیط جوش کی سمعی ریکارڈنگ کی تھی جسے انہوں نے ایک ٹرسٹ کی تحویل میں دے دیا ہے۔ جوش و راغب کے کچھ سوال و جواب ملاحظہ فرمایئے:

"سوال: تلفظ کی صحت کے لیے آپ مستند لُغت سے رجوع کریں گے یا فصحائے اردو نے جو تلفظ کیا ہے اُسے صحیح قرار دیں گے جیسا کہ امیر مینائی نے کہا ہے۔ ہم سند کے لیے لغت میں امیر۔ فصحا کی زبان لیتے ہیں۔

جوش: فصحا کی زبان

راغب: اردو زبان کے کون کون شعرائے کرام آپ کے نزدیک مستند ہیں۔ ہر دو لحاظ سے

جوش: شعریت کے اعتبار سے یا بیان کے اعتبار سے سب سے پہلے نظیر اکبر الٰہ آبادی پھر میر اور غالب، انیس بس

راغب: عصر حاضر کے شعراء محاوروں اور روز مرہ کے اس قدر پابند نہیں جس قدر عہد ماضی کے شعراء تھے اور ایک دور ایسا آئے گا جب محاوروں اور روز مرہ کا معیار بدل جائے گا اور یہ تغیر و تبدل کیا شاعری اور زبان کے حق میں مفید ہو گا یا مضر۔

جوش: کچھ نہیں کہہ سکتے کہ کیا ہو گا لیکن اندیشہ یہ ہے کہ بگاڑ زیادہ پیدا ہو گا۔"(۱۳۸)

۸: مرکباتِ جوش

جوش کے ہاں عربی، فارسی اور ہندی تراکیب ملتی ہیں اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے تراکیب سازی میں نئے نئے تجربے بھی کئے ہیں۔ انہوں نے تراکیب کے موزوں اور بر محل استعمال کے ذریعے سے اردو میں نئی نئی تراکیب کے عمل دخل کو فروغ دیا۔ تراکیب کو اگر توڑا جائے تو اصل لفظ تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اردو کیونکہ لشکری زبان ہے اس لیے اس میں لفظوں کو قبول کرنے کی صلاحیت بھی بہت زیادہ ہے۔ جاگہ لفظ تراکیب سازی سے وجود میں آیا ہے۔ جا فارسی زبان کا لفظ ہے گہ کو ملا کر ترکیب بنالی گئی۔ ابتداء میں جاگہ بنا اور آہستہ آہستہ جگہ ہو گیا۔ جوش کے حوالے سے فارسی تراکیب اردو کا حصہ بنیں۔ مفرّس ترکیب بھی اردو میں موجود ہے جس کا ایک حصہ عربی ہوتا ہے۔ مثلاً ارادت کیش، عقیدت مند، آج کل انگریزی سے مل کر بنائی گئی تراکیب بھی موجود ہیں۔ کارکنانِ کانفرنس، لیڈرانِ ملک وغیرہ، جوش کی تراکیب میں لکھنوی ثقافت کا عمل دخل بہت ہے۔ زمینی حوالہ صاف نظر آتا ہے۔ جنگل کی شہزادی، کوہستان دکن کی عورتیں، شبِ نشاط، قصر سحر وغیرہ۔ مناظرِ فطرت کے حوالے سے بھی تراکیب موجود ہیں۔ جوش کے توانا جمالیاتی ذوق نے تراکیب سازی میں اہم کردار ادا کیا۔ صدائے آبشار، بھینی بھینی خوشبو، احباب کی لَو، ہوائے مشکبار، نسیم دلربا، صبوحی، مغموم درخت، پیغمبر فطرت، البیلی صبح، التفات کی رات، شعر گوئی کی رات، شاہد و شراب کی رات، انگاروں کی دھنک، سجود آسماں، سرود و خروش وغیرہ سیاسی تراکیب میں نعرۂ انقلاب، قوتِ فولاد، برقِ شرار، اور خفیہ شہر موجود ہیں۔

مذہبی حوالے سے ترکیب سازی کے ساتھ ساتھ پہلے سے موجود تراکیب کو نئی معنویت بھی دی۔ واعظ و ناصح، شیخ شہر، خانقاہ کو فتنہ قرار دیا۔ عاشقانہ تراکیب میں بربطِ کاکلِ زیبا، آئینہ دار عروسِ گل، رنگِ نرگسِ خوباں، پیرِ مغاں، موجۂ کیف پرور، زاہد گل فریب، سمن بو، رنگین جمال، کشتۂ تیغ حسن، ماہِ درخشاں، آہوئے دشتِ خطا، جوہر گیتی بہا، جیسی تراکیب چُستی سے استعمال کیں۔ ان کی تراکیب میں فارست کا غلبہ ہے۔ جوش فارسی میں حافظ و خیام کے پیچھے چلے۔ جوش نے عربی تراکیب کا استعمال بھی کیا ہے۔ جیسے مفلس کریم ابوالافلاس، درخستگی مفلساں، اقوالِ خفتہ پا وغیرہ۔

جوش نے جہاں ترکیب سازی کی کوشش کی ہے وہاں اعتراض کرنے والوں کے لیے موقع پیدا کر دیا ہے کہ یہ کس زبان کے الفاظ ہیں اور تراکیب کہاں کی ہیں۔ مسعود حسین خان لکھتے ہیں۔

''الفاظ کا یہ عام اصول ہے کہ وہ کثرت استعمال سے بے رس ہو جاتے ہیں۔ جوش ترشی ترشائی ترکیبوں پر اکتفا کرتے۔ طوافِ کعبہ، حسنِ مجاز، محروم سوز و گداز، شمیم کاکل پیچاں، گل بنیر، گل افشاں، گوہر بار وغیرہ اس قسم کی تراکیب سے نہ رس ٹپکتا ہے اور نہ رنگ بلکہ گہرے سچے جذبات کی تربت بنتی ہے''(۱۳۹)

۹: محاوراتِ جوش:

سب سے پہلے ہم دیکھتے ہیں کہ محاورہ کی تعریف کیا ہے؟ یحییٰ احمد محاورہ کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ:

''محاورہ ایسے کلام (تراکیب) کو کہتے ہیں جو غیر وضعی یا مجازی معنوں میں مستعمل ہو اور اس زبان کو بولنے والے صدیوں اسی طرح بولتے آئے ہوں۔(۱۴۰)

محاورہ صدیوں کی تہذیب کو پیش کرتا ہے۔ لکھنوی تہذیب و معاشرت میں محاورہ موجود ہے۔ میلے ٹھیلے، دربار داری، زیورات، لباس، رقص و سرود سب کچھ محاورات میں موجود ہے۔ جوش ایک جاگیر دار گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ گھر میں شاعرانہ ماحول تھا۔ لغات پر بحث و مباحثہ ہوتا تھا۔ روز مرہ محاورات میں لکھنوی تہذیب و ثقافت جھلکتی تھی۔ جوش نے علاقائی بول چال سے محاورہ سازی کی جس کی بنا پر انہیں تنقید کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ محاورہ جب ایک مرتبہ بن جائے تو اس میں تبدیلی روا نہیں ہے۔ جوش نے عربی، فارسی، اودھی کے ساتھ ساتھ لکھنوی محاورے پر بھی عبور حاصل کیا۔ جوش کی عبارت کو نثری غزل کہا گیا۔ انہوں نے عورتوں کی زبان کو بھی اپنے محاروں میں محفوظ کیا۔ جوش نے محاوروں میں کہیں کہیں بے احتیاطی بھی برتی ہے۔ انہوں نے ''دودھ کی خوشبو آنا'' محاورہ باندھا ہے حالانکہ محاورہ ہے ''دودھ کی بو آنا'' ہے ایک مرتبہ ''جنگ'' میں کالم لکھا تو محاورتاً اونچوں اونچوں اور ''اچھوں اچھوں'' باندھ دیا۔ جب ان کی توجہ اونچے اونچوں کی طرف دلائی گئی تو انہوں نے مان لیا کہ محاورہ غلط باندھا گیا ہے۔(۱۴۱) اپنے مضمون ''ضرب شاہد بفرق شاہد باز'' میں انہوں نے ''سیاہ روئی'' محاورہ لکھا ہے جبکہ ''منہ کالا کرنا'' مستند محاورہ ہے۔ اسی طرح انہوں نے ''شرم سے آب آب ہونا'' محاورہ تحریر کیا ہے۔ حالانکہ ''شرم سے پانی پانی ہونا'' محاورہ ہے۔

جوش نے کسی ایک علاقے کی زبان نہیں استعمال کی بلکہ اس قسم کی تراکیب جوش کی اپنی اختراع ہیں۔ شاہد احمد دہلوی نے اپنے مضمون ''نہ جنتی نہ ڈھول بجتے'' میں جوش کی محاوراتی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''نشہ تو ہرن ہوتا ہے'' نشے بھی ہرن ہوتے ہیں۔ ان میں نازک سا فرق ہے جس کے سمجھنے کے لیے آپ سے بہتر دماغ کی ضرورت ہے۔ اب دیکھئے نفیس کیا فرما گئے۔

اڑنے میں گر ہیں ضیغم تو دمِ ستیز
نشے ہرن ہوں دیکھے جو آہو یہ جست خیز(۱۴۲)

اس کے دفاع میں ڈاکٹر یحییٰ احمد لکھتے ہیں:

''جوش نے کسی ایک جگہ کا محاورہ نہیں لیا تھا۔ دوم بچپن میں وہ لکھنوی سکول سے متعلق رہے۔ ساتھ میں وہ فارسی محاورات و تراکیب کا فزانہ اردو میں منتقل کر رہے تھے اور چوتھی بات یہ ہے کہ وہ محاورات میں ترمیم کے خواہش مند تھے۔ انہی حوالوں سے جوش کے محاورات کا تجزیہ ہو سکتا ہے۔''(۱۴۳)

جوش کے محاوروں میں ان کا غیض و غضب ہے، رعب و دبدبہ ہے، یا کسی رجحان کے آئینہ دار ہیں ان کے محاورے جوش نے مقامی محاورے کو بھی بہتر طریقے سے استعمال کیا اور غیر موزوں لفظوں کے محاورے بھی استعمال کیے ہیں اور ترجمہ کرتے ہوئے فارسی آمیز اردو محاورے بنا ڈالے۔ کہیں کہیں فارسی محاورات کا ترجمہ بھی کر گئے ہیں۔ چند محاورے بطور مثال پیش ہیں۔

سر بہ زانو ہونا، رام ہو جانا، شرم سے آب آب ہونا، گھٹی پینا، دھونی رمانا، دامنِ گل چاک، قرآن پہ دھول، گیتا پہ خاک، ڈائن اجل، گریبان سینا، مسیں بھیگنا، کانٹوں پر کروٹ بدلنا، خون فشانی وغیرہ۔

ذیل میں ہم جوش کے کچھ تحریر کردہ کچھ محاورات درج کر رہے ہیں جن کا معانی بھی درج ہے اور ان کا عنوان جوش نے ”غیر مرتب“ (محاورے و معانیٰ) درج گیا ہے۔

۱۔ موت کے ہاتھ سے روٹی کھانا... بدترین شدائد کو برداشت کر کے وجہِ معاش حاصل کرنا (میں دن بھر مشین چلاتا ہوں اور موت کے ہاتھ سے روٹی کھاتا ہوں)

۲۔ محمد ہیں قندیل عرب نہ کہ بولہب... ایسے موقع پر بول سکتے ہیں جب شہر کے ان دو بڑے آدمیوں کے درمیان تقابل کیا جائے جن میں ایک کو دوسرے پر بمراحل تفوّق حاصل ہو۔

۳۔ آٹا چکی میں داڑھی سفید کرنا... دُھنیے کے روبرو بیٹھ کر داڑھی سفید کرنا۔

۴۔ کسی کی ٹوپی میں سر رکھ دینا... مطیع و مقلّد ہونا۔

۵۔ سر کو چُرا لینا... عقل کے راستے سے ہٹا دینا۔(۱۴۴)

ڈاکٹر ہلال نقوی نے بیڑہ اٹھایا ہے۔ جوش کے غیر مطبوعہ کلام و مواد کو طبع کرانے کا۔ جوش کے متعلقین ان سے تعاون کر رہے ہیں اور ڈاکٹر صاحب کے ذریعے جوش کا ادبی سرمایہ منظر عام پر آ رہا ہے۔ جن میں محاورات، مترادفات، فلسفہ و فکر (مذہبی مباحث پر مضامین) تنقیدی سرمایہ وغیرہ۔

۱۰: مترادفاتِ جوش:

جوش لفظ شناس تھے اور الفاظ کے حسن کی تاثیر سے آگاہ تھے۔ مترادفات سے عبارت کا حسن، تاثر اور شدت بڑھ جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ صرف ایسے الفاظ کو مترادف کہا جائے گا جو ہر سیاق و سباق میں ایک دوسرے کی جگہ لے سکیں۔ الفاظ کے نازک فرق کو مدنظر رکھتے ہوئے جوش نے مترادف الفاظ کو استعمال کیا۔ جوش کے ہاں لفظ کا مترادف استعمال تاثر کی شدت میں کمی نہیں کرتا بلکہ بڑھا دیتا ہے۔ ”یادوں کی برات“ میں مترادفات کا ایک خزینہ ہے انہوں نے اگر رنگوں کو بیان کرنے کی سعی کی تو مترادفات کے ذریعے سے کئی تنوع سامنے لے آئے۔ لاجوردی، نیلا، سرمئی، اودا، غرض ایک نئی دھنک تخلیق کر دی۔ مولانا کوثر نیازی نے جوش کے مترادف الفاظ کے استعمال کے بارے میں اس طرح اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

”جو نئے الفاظ جو آہنگ اور مترادفات جوش نے دیئے۔ اردو زبان کبھی ان کے بارِ احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔“(۱۴۵)

مترادفات سے ایک ایک لفظ کی کئی متعلقات سامنے آ جاتی ہیں۔ جوش نے نثر کے ساتھ ساتھ نظم نگاری میں بھی مترادفات کو استعمال کیا ہے۔ جوش کے مترادفات سے ہم اک الگ لغت تیار کر سکتے ہیں۔ صوتی آہنگ نے فروغ پایا۔ مترادفات سے کسی زبان کی ترقی اور تشکیل کا اندازہ ہوتا ہے۔ انگریزی زبان میں ایک ایک لفظ کے کئی کئی مترادفات نے انگریزی زباندانی کے علم کی گرفت کا کسی مصنف یا شاعر کے تحریر سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ نیاز فتح پوری نے کہا۔

”جوش الفاظ کا بے تکان استعمال کرتے ہیں اور اکثر بے محل استعمال کر جاتے ہیں۔ وہ اتنے مترادفات استعمال کرتے ہیں کہ اصل مطلب خبط ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی بیان میں تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔“(۱۴۶)

جوش نے ترکی، فارسی، ہندی اور مقامی بولیوں کو خود میں جذب کیا ہے۔ جس کے نتیجے میں لفظوں کی فراوانی اور مترادفات کا ایک لامتناہی خزانہ موجود ہے۔ بیوہ، رانڈ اور گھر اور مکان دونوں مترادفات جوش نے خوبصورتی سے برتتے ہیں۔ دریا دلی اور سخاوت ہم معنی لفظ ہیں۔ ہم جوش کے ہاں استعمال ہونے والے کچھ مترادفات درج کرتے ہیں۔ سینچنا اور پروان چڑھانا، سکون اور راحت، الٹنا اور پلٹنا، جانچنا اور پرکھنا، ٹھونکنا اور بجانا، چھاننا اور پھٹکنا، اُچھل کود، کاسہ گدائی بڑھایا اور بھیک مانگی، ناک رگڑی اور گڑگڑایا وغیرہ۔

۱۱: لغت سازی:

وزیر اعظم پاکستان سہروردی کے زمانہ میں جوش نے کسی طرح ان کی خدمت میں باب قرطاس و قلم (اکیڈمی آف لیٹرز) کے نام سے ایک منصوبہ تیار کرکے پیش کیا۔ بیگم شائستہ اکرام اور آفتاب احمد خان نے وزیر اعظم سے ملاقات کا اہتمام کیا تھا۔ سہروردی نے جوش کی لٹریری فنڈ سے پانچ ہزار روپے امداد بھی کی۔ زبیری صاحب سیکرٹری تعلیمات کی سفارش پر جوش کی کارروائی فنانس بھیج دی گئی۔ فنانس سیکرٹری ممتاز حسن نے جوش کو مشورہ دیا کہ آپ کی اکادمی کی تجویز لمبی چوڑی ہے۔ اگر اس کو تدوینِ لغت تک محدود کر دیا جائے تو فنانس اس کی منظوری دے دے گا۔ جوش کو مانتے ہی بن پڑی اور ترقیٔ اردو بورڈ کا قیام عمل میں آ گیا۔ انجمن ترقیٔ اردو کے صدر مولوی عبدالحق کو رکنیت کی دعوت دی گئی۔ انہوں نے جواب دیا کہ اگر مجھ کو لغت کا چیف ایڈیٹر نہیں بنایا گیا تو میں رکنیت کی دعوت ٹھکرا دوں گا۔ عبدالحق چیف ایڈیٹر ہو گئے اور انجمن ترقیٔ اردو کے دفتر میں لغت کا کام ہونے لگا۔ جوش نے کوشش کرکے بورڈ کے لیے جو عمارت کرائے پر لی تھی وہاں صرف چند کلرک رہ گئے۔ ممتاز حسین نے جوش کو مشیر ادب کا عہدہ دے دیا لیکن ڈیڑھ سال تک مولوی صاحب نے جوش سے کوئی کام نہیں لیا تو انہوں نے ممتاز صاحب کو لکھا کہ مجھ سے لغت نویسی کا کام لیا جائے۔ جب ممتاز صاحب نے جوش کو لغت نویسی پر مامور کر دیا تو غصے کے عالم میں مولوی عبدالحق ادارت و رکنیت سے دستبرداری پر آمادہ ہو گئے۔ مولوی عبدالحق کے انتقال کے بعد لغت کا کام بورڈ کے دفتر میں ہونے لگا۔ جوش کو تدوین لغت کا کام سونپا گیا تو یکسوئی کے طالب ہوئے اور شان الحق حقی سے درخواست کی کہ ضروری ملاقاتیوں کو ملنے کی اجازت دی جائے۔ اس حوالے سے حقی صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''ایک بار جب وہ انہماک سے لفظ ''اللہ'' اور ''آنکھ'' کے تابع محاورات و امثال کی تشریح لکھ رہے تھے (کہ ہر ایک کی تعداد سینکڑوں ہے) فرمایا کہ لوگ ملنے بہت آتے ہیں، کام نہیں ہو سکتا، کسی کو باہر ٹھہرائے کہ جسے کوئی ضروری کام، صرف وہی اندر آئے باقی اصحاب سے معذرت کر لی جائے۔(۱۴۷)

جوش ملیح آبادی نے ترقیٔ اردو بورڈ، سندھ کراچی سے اردو لغت تاریخی اصول پر مرتب کرنے کے حوالے سے کام کیا اور اولین جلدوں کو مرتب کرنے میں حصہ لیا۔ جوش نے اس سے پہلے دارالترجمہ حیدر آباد میں انگریزی ادب کے مترجم کی حیثیت سے ڈیڑھ سال تک کام کیا تھا۔ اور علامہ حیدر طباطبائی کی پنشن کے بعد جوش کو مشیر ادب کے عہدے پر ترقی دے دی گئی تھی۔ جوش نے یادوں کی برات میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ دارالترجمہ سے تعلق نے ان کو بہت فائدہ پہنچایا۔ جوش لکھتے ہیں۔

'میری یہ بڑی ادبی نمک حرامی ہوگی کہ اگر میں اس امر کا اعتراف نہ کروں کہ شعبۂ دارالترجمہ کی وابستگی نے مجھے بے حد علمی فائدہ پہنچایا۔ اور خصوصیت کے ساتھ، علامہ عمادی، علامہ طباطبائی اور میرزا احمد ہادی رسوا کے فیضان محبت نے مجھ بے سواد آدمی کو، میرے جہل پر مطلع کرکے، مجھ کو ذوق مطالعہ پر مامور کر دیا اور صحت الفاظ و نجابت لہجہ کا جو پودا میرے باپ اور میری دادی نے میرے وجود کی سرزمین پر لگایا

تھا، اگر طباطبائی، میرزا محمد ہادی رسوا اور عمادی کی مسلسل دس برس کی ہم نشینی کا مجھ کو موقع نہ ملتا تو وہ پودا کبھی شاداب اور بار آور نہ ہوتا۔"(۱۴۸)

اگست ۱۹۶۷ء میں ہندوستان میں دیئے جانے والے انٹرویو کو بنیاد بنا کر جوش صاحب کو ملازمت میں توسیع نہیں دی گئی اور وہ ترقیٔ اردو بورڈ سندھ، کراچی سے الگ کر دیئے گئے۔ جوش نے اس علیحدگی کا ذمہ دار شان الحق حقّی، الطاف گوہر اور "نوائے وقت" کو ٹھہراتے ہیں جن کی دشمنی نے جوش کی ملازمت ختم کروادی۔ جوش ملیح آبادی اردو لغت کے کاموں میں اس قدر مصروف ہو گئے تھے کہ دفتری اوقات کے علاوہ بھی دیر تک بیٹھے رہتے تھے۔ ان کی اس دلچسپی اور لگن کا قصہ ان کے ایک معاون خواجہ حمید الدین شاہد لکھتے ہیں کہ:

"بسا اوقات دوسروں سے پہلے بورڈ کے دفتر پہنچ جاتے ہیں اور کبھی کبھی دفتر کے وقت کے بعد بھی اپنے کمرے میں بیٹھے کام کرتے رہتے تھے اور اپنے مفروضہ کام کو بڑی دلچسپی اور انہماک کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ ان کی محویت اور انہماک کا یہ عالم ہوتا ہے کہ کوئی ان کے کمرے میں داخل ہو جائے انہیں خبر تک نہیں ہوتی۔ ان کی میز پر کئی کتابیں کھلی اور بند پڑی رہتی ہیں۔ مختلف کتابوں کو پڑھتے اور کام کی باتیں کاغذ پر لکھتے جاتے ہیں۔(۱۴۹)

صہبا لکھنوی نے افکار جوش نمبر میں لکھا کہ:

> جوش نے مشیر ادبی کی حیثیت سے دو ڈھائی سال کے مختصر سے عرصے میں اپنے رفقائے کار کے تعاون سے تدوین لغت کا جو صبر آزما کام شبانہ روز کی محنت کے بعد سر انجام دیا ہے، وہ دس سال میں بھی ممکن نہ تھا(۱۵۰)

جوش ملیح آبادی بے رس اور خشک محقق نہیں تھے بلکہ ان کی شاعرانہ طبع لفظ کی تہہ تک پہنچ کر اس کے لفظی اور معنوی استعمال کی کئی جہتیں بیان کر جاتی تھی۔ ڈاکٹر ہلال نقوی نے نسیم امروہوی کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ لغت بورڈ میں جب کسی لفظ کی مثال نہیں ملتی تھی تو جوش صاحب سے شعر کہلوالیا جاتا تھا۔(۱۵۱)

جوش نے ترقیٔ اردو بورڈ میں تدوینِ لغت کے لیے جو محنت کی اس کا نتیجہ لغت کی صورت میں موجود ہے۔ حالانکہ مخالفین یہ بھی کہتے پائے گئے کہ جوش خوش گپیوں میں وقت گزار کر دفتر سے روانہ ہو جایا کرتے تھے۔ لیکن جب مولوی عبدالحق نے ڈیڑھ سال تک کوئی ذمہ داری جوش کو تفویض نہ کی تھی، یہ صورت حال اس وقت پر تو منطبق کی جاسکتی ہے علاوہ ازیں اس وقت پر نہیں جب تدوین لغت کا اہم کام انجام دیا جا رہا تھا۔

جوش کے استاد مولوی قدرت اللہ بیگ ماہر لسانیات اور استاد فن تھے انہوں نے پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ایک مثنوی غیر منقوط تحریر کی۔ یادوں کی برات میں جوش نے تذکرہ کیا کہ یہ مثنوی اب بھی ان کے پاس موجود ہے۔ ڈاکٹر ہلال نقوی لکھتے ہیں۔

صنعتِ غیر منقوط میں یہ فنی شاہکار ذخیرہ الفاظ پر ان کے استاد کی گرفت کو ظاہر کرتے ہیں۔ لغات پر جوش صاحب کو جو دسترس حاصل رہی ہے ممکن ہے اس کی پہلی کرن استاد کی انہی محفلوں میں پھوٹی ہو"(۱۵۲)

۱۲: جوش کے پیش لفظ

جوش ملیح آبادی نے اپنی کتابوں کا تعارف کروانے کے ساتھ ساتھ دوسرے اصحاب کی کتب پر بھی پیش لفظ تحریر کر کے کتاب کی ادبی قدر و قیمت کے تعین اور صاحب کتاب کے تعارف کا فریضہ اکثر ادا کیا ہے۔ جوش نے جے کرشن چوہدری کی کتاب " بھرتری ہری" کے پیش لفظ میں سنسکرت کے مشہور شاعر "بھرتری ہری" کے بارے صاحب کتاب کا نظریہ بیان کیا ہے۔ "بھرتری ہری" کے کلام کا ایسا ترجمہ ابھی تک نہیں ہوا کہ جسے ادبی شاہکار ترجمہ قرار دیا جاسکے۔ اپنی بلند خیالی، محاکات، اختصار، حقائق اور تاثر میں یہ اپنی مثال آپ ہے۔ اقبال نے بھی

اپنے فارسی کلام میں بھرتری ہری کی تعریف کی ہے۔ جے کرشن نے اپنی اس جامع کتاب میں فلسفی ادیب کے افکار و نظریات پر نہایت صفائی اور سلیقے سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ نثر اور نظم دونوں پر قادر ہیں۔ سخن گوئی اور سخن سنجی میں بہت کمال ہیں۔ بھرتری ہری کے بارے میں جوش رقمطراز ہیں کہ:

واضح رہے کہ بھرتری ہری کی زندگی تین ادوار پر مشتمل تھی ا۔ حسن و عشق ۲۔ تفکر و تدبّر ۳۔ عبادت و ریاضت

میرا خیال ہے کہ بھرتری ہری کے پہلے دور حیات سے وہ نوجوان متاثر ہوں گے جن کے دلوں میں جذبات موجزن رہتے ہیں۔ اُن کے دوسرے دور سے وہ پختہ عمر کے حضرات فائدہ اٹھائیں گے جن کے دماغ میں عقل کا فانوس جل رہا ہے۔ اور ان کے تیسرے دور زندگی سے ان افراد پر وجد کی کیفیت طاری ہو گی جو شاعرانہ جذبات اور حکیمانہ عقل سے دور رہتے ہوئے وجدان و عشق سے قریب رہنے ہی کو سب کچھ سمجھے بیٹھے ہیں۔(۱۵۳)

دوسرا پیش لفظ جوش نے نہال سیوہاروی کے مجموعہ کلام شباب و انقلاب کا تحریر کیا ہے۔ جو کہ نہال سیوہاروی کے ۱۹۴۳۔ ۱۹۲۷تک کے کلام پر محیط ہے۔ نہال سیوہاروی ابھی جوان ہیں لیکن ان کے کلام کی پختگی ان شعراء کو پیچھے چھوڑ رہی ہے جو اس کوچے کی خاک چھانتے ہوئے بوڑھے ہو چکے ہیں۔ نہال سیوہاروی کا ایک وصف جو سب پر بھاری ہے وہ یہ کہ ہر حیثیت سے اچھے آدمی ہیں۔ جوش لکھتے ہیں کہ:

"نہال صاحب کی شاعری رسمی شاعری اور غیر فطری غزل گوئی سے کوئی دور کا علاقہ نہیں رکھتی ہے۔ اُن کی شاعری زندگی اور زندگی کے حقیقی پہلوؤں کی ترجمانی کرتی ہے۔ ان کا بیشتر کلام رومانی دھندلکوں اور متصوفانہ کنجوں میں سُلا دینے کے عوض، حیات کی کش مکشوں اور زندگی کے ہنگاموں میں مردانہ وار شریک ہونے اور نامساعد حالات کے فتح کرنے کی دعوت دیتا ہے۔"(۱۵۴)

نہال سیوہاروی نے خود بھی نامساعد حالات کا مقابلہ کیا اور دوسروں کو بھی اپنے کلام میں مقابلہ کرنے کی دعوت دی۔ حوصلہ مندی فراہم کی۔ جوش نے یہ پیش لفظ دہلی میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۴ء کو تحریر کیا تھا۔

۱۳: جوش کی اصلاحات

جوش اردو کی ترویج و ترقی کے ساری عمر خواہاں رہے۔ ان کے سامنے اگر کوئی غلط اردو بولتا تھا تو ٹوکے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ جوش جب اسلام آباد میں قیام پذیر تھے تو ایک مرتبہ ان کے بھتیجے کلام خان اپنے ساتھ دو دوستوں کو لے آئے۔ معلوم ہوا کہ کسی کالج کے استاد ہیں۔ وہ صاحبان اپنے ساتھ اردو کے الفاظ اور جملوں کی فہرست لائے تھے تاکہ جوش سے اصلاح لے سکیں۔ جوش کی اجازت سے انہوں نے دریافت کرنا شروع کیا۔ سب سے پہلے سوال کیا گیا کہ جوش صاحب یہ بتایئے کہ زبان کی "ز" پر زبر ہے یا پیش جوش نے جواب دیا۔ فصیح زبر ہے ہم "زبان" کہیں گے۔

پھر کہا گیا کہ ان الفاظ کا تلفظ بتایئے۔ امر، ترس، رقم، چرس، غلط، شرف، عرق، غرض، ولد

جوش نے جواب دیا ان تمام الفاظ میں پہلا اور دوسرا حرف متحرک ہے۔ شافع، شائع، ضائع، لاحق، مائع ان الفاظ میں تیسرے حرف کے نیچے زیر ہے۔ افراط، اخراج، اقدام، نکات ان الفاظ میں پہلے حرف کے نیچے زیر ہے۔ المیہ، طربیہ، نظریہ، پہلے تینوں حروف متحرک ہیں، مگر غلطی سے دوسرا حرف ساکن کر دیا جاتا ہے۔ "محبت" میں "م" پر "زبر" ہے۔ مگر غلطی سے پیش بولتے ہیں۔ "مروت" چہرہ دیکھ کر رعایت کرنا "م" پر پیش ہے۔ سارا دن، سارا مہینہ، سارا سال خوش رہا، یہ جملہ غلط ہے۔ اس کے بجائے سارے دن، سارے مہینے، سارے سال خوش رہا، درست ہے جس حرف کے آخر میں "الف" یا "ہ" ہو جب جملے میں استعمال کریں تو "الف" یا "ہ" کو "ے" سے بدل دیں گے۔ اس طرح ڈھاکہ کو ڈھاکے گیا تھا۔ کلکتہ کو کلکتے گیا تھا اور پونا کو جملے میں پونے استعمال کریں گے۔

جہاں تک ممکن ہو سکا یا ہو سکے" غلط ہے، اس کے بجائے "جہاں تک ممکن ہو یا ممکن ہوا" ۔ درست ہے۔ کارخانے کے مالک کو گرفتار کر لیا گیا کی جگہ، کارخانے کا مالک گرفتار کر لیا گیا، درست ہے۔ "گھی کی صنعت کو قومیانے کے باوجود"، غلط ہے۔ اس کے بجائے گھی کی صنعت کے قومی ملکیت میں لیے جانے کے باوجود، درست ہے۔

ڈاکٹر عالیہ امام کے ہاں ایک محفل میں جوش نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ غلط اردو برداشت نہیں کر سکتے۔ مشفق خواجہ نے اپنی کتاب "جوش اور خامہ بگوش" میں اس کا تذکرہ یوں کیا ہے، لکھتے ہیں:

"جوش صاحب نے کہا" میں غلط اردو برداشت نہیں کر سکتا "

عالیہ نے کہا" اگر کوئی محبوبہ غلط اردو بولے تو؟" کہنے لگے "اسے بھی قبول نہیں کروں گا" ایک مرتبہ ایک محبوبہ نے "ہوشنگ آباد" کی بجائے "ہسنگ آباد" کہا۔ میں فوراً اس کے پاس سے چلا آیا۔"(۱۵۵)

فیض احمد فیض نے جوش کے بارے میں لکھا

"ان کی اداہی یہ تھی کہ کم لکھنے والوں پر شفقت بھی فرماتے ہیں۔ ڈانٹ بھی دیتے ہیں۔ شعر کی داد دینے میں جتنے فراخ دل تھے زبان پر گرفت کرنے کے معاملے میں اتنے ہی سخت گیر۔ جب وہ اسلام آباد وارد ہوئے تو ہم کہیں پوچھ بیٹھے۔ جوش صاحب آپ کی رہائش کہاں ہے؟ فوراً تنک کر کہا، ہائیں کیا فرمایا، یہ رہائش کون زبان کا لفظ ہے۔ اب آپ کہیں گے آپ کی لٹائش کہاں ہے؟(۱۵۶)

جوش نہ صرف دیگر افراد کی اغلاط درست کیا کرتے تھے بلکہ اپنے افراد خانہ کی زبان کی اصلاح بھی کرتے تھے۔ جوش کے نواسے فرخ جمال ملیح آبادی لکھتے ہیں۔

بابا، الفاظ کو غلط ادا کرنے پر بہت برہم ہوتے اور خصوصاً اپنے اہل خانہ سے ہرگز یہ توقع نہ رکھتے کہ وہ غلط اردو بولیں گے۔ مثلاً 'نظم' کو کوئی شخص 'ظ' پر زبر لگا کر بول دیتا تو وہ سختی سے ٹوکتے اور کہتے 'ظ' اور 'م' پر زبر نہ لگایا کرو 'م' ساکن پڑھو۔ ٹھنڈ سن کر چراغ پا ہو جاتے اور کہتے کہ سردی کہو یہ ٹھنڈ کیا چیز ہے۔ فیلڈ مارشل ایوب خان، جو اُس وقت صدر پاکستان تھے، نے جب بابا سے کہا کہ آپ بہت بڑے عالم ہیں تو بابا نے وہاں بھی اردو کی توہین برداشت نہیں کی اور فوراً ہی ٹوکا کہ عالم نہیں عالِم ہوتا ہے۔ ایوب خان نے اس بات کو اپنی توہین کے مترادف سمجھا اور ان کی سیمنٹ کی ایجنسی کینسل کرنے کے احکامات جاری کر دیئے تھے۔ لفظ 'مصروف' سے الرجک رہتے اور کہتے کہ لفظ مصروف، صرف کا مفعول ہے اور صرف کا مطلب ہوتا ہے خرچ ہونا، کیا کوئی کام کرتے ہوئے خرچ ہوتا ہے۔ ہم پھر مصروف کا متبادل لفظ جاننا چاہتے تو فوراً ہی کہتے کہ کہو آج میں فلاں کام میں مشغول رہا۔ بابا نے ہمیشہ لغتی زبان کو اہمیت دیتے، وہ والا اور یہ والا بھی غلط گردانتے، کہتے کہ کہو یہ سا، وہ سا(۱۵۷)

جوش نے عام طور پر کسی کو شاگردی میں نہیں لیا۔ ڈاکٹر ہلال نقوی کی شاعری پر انہیں اصلاح دی اور ان کو اپنا شاگرد بھی تسلیم کیا ہے اور راغب مراد آبادی کو بھی ان کی رباعیات پر اصلاح دی ہے۔ لیکن اگر کوئی اُن سے کسی راہنمائی کا طالب ہوتا تھا اور جوش کی طبیعت بشاش ہوتی اور اصلاح کی طرف مائل بھی ہوتی تو وہ بتانے میں کوئی حرج نہ سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ کچھ استاد ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو جوش نے اساتذہ کے لیے کچھ اشعار خوانی کی کہ:

"مبارک بادیاں اے ذوقِ تحقیق ۔ کہ ہر معلول ہے علت بداماں
درخشاں ہے الوہیت کا دیہیم ۔ بہ فرقِ خادمانِ نوع انساں
رواقِ مصر کا طاقِ نگاریں ۔ مبارک اے چرخِ ماہِ کنعاں
تعال اللہ کہ جام زرفشاں میں ۔ صفات و ذات کا پرتو ہے غلطاں

(ہمارے جوش صاحب۔ ص۵۵۹)

اساتذہ میں سے ایک صاحب نے کہا جوش صاحب، ان میں سے بعض اشعار میری سمجھ میں نہیں آئے۔ مہربانی فرما کر ان کا مفہوم بھی بتا دیجئے۔

دوسرے شعر میں دیہیم کے معنی کیا ہیں؟

جوش صاحب: دیہیم کے معنی ہیں تاج شاہی اور الوہیت کا دیہیم کے معنی ہیں خلافتِ الٰہی کا تاج ان لوگوں کے سروں کی زینت ہوتا ہے جو انسانیت کی خدمت کرتے ہیں۔

استاد: تیسرے شعر میں رواق کے کیا معنی ہیں؟

جوش صاحب: رواق کے معنی تو مکان کا چھجہ اور خود مکان یا محل کے ہیں مگر یہاں مراد ہے کائنات اور طاقِ نگاریں سے مراد کائنات کا حسن ہے اور چراغِ ماہِ کنعاں سے مراد ''انسان'' ہے۔ اسی طرح چوتھے شعر میں ''جامِ زرفشاں'' سے انسان کی عقل کی طرف اشارہ ہے جو صفات وذاتِ خداوندی کی آئینہ دار ہے۔''(۱۵۸)

جوش کی زبان دانی کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ ہر کوئی جو جوش کی اصلاح پسندانہ طبیعت کا صید تھا۔ مدتوں اس واقعے کو دہراتا رہتا تھا۔ محمد ذکی الدہلوی نے اپنی کتاب ''گل ہائے خنداں'' میں ایک واقعہ تحریر کیا ہے کہ:

ایک دن حکیم اجمل خاں کے پوتے محترم حکیم نبی احمد سویدا اور جوش علاج معالجے کے علاوہ شعر و سخن پر بھی گفتگو کرتے رہے۔ جوش جب فارغ ہوئے تو حکیم صاحب نے جوش سے کہا ''آیئے، میں آپ کو موٹر تک چھوڑ آتا ہوں۔''

جوش نے حکیم صاحب کو تعجب سے دیکھا اور کہا ''آپ کی زبان کو کیا ہوا؟'' چھوڑ آنا نہیں'' پہنچا آنا کہتے ہیں''(۱۵۹)

جوش اردو زبان کے فروغ کے معاملے میں کانگریس اور ہندو دشمنی سے آگاہ تھے اور اکثر کانگریس کی اردو دشمنی پر تنقید کرتے رہتے تھے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین دوری کا ایک سبب ہندو کی اردو دشمنی بھی گردانتے تھے۔ حمید اختر نے اپنی ایک تقریر میں جوش کی زبان کی صحت کے معاملے میں کسی بھی قسم کے سمجھوتے کو تسلیم نہ کرنے کے واقعات بیان کیے ہیں وہ کہتے ہیں:

''جوش کے ہاں زبان کی صحت کے معاملے میں کسی رواداری کی گنجائش نہیں تھی... اردو کے معاملے میں جوش بہت سنجیدہ تھا۔ اردو، ہندی اور ہندوستانی کے متنازعہ مسئلہ پر جوش گاندھی مذاکرات بھی ہوئے۔ علی سردار جعفری انٹرپریٹر تھے۔''(۱۶۰)

''امانت کے دیوان''، ''خزائن الفصاحت'' میں ایک شعر درج ہے۔

لذتِ وصل میں دن رات بسر کرتے تھے
بس اسی شغل میں دن رات بسر کرتے تھے

جوش نے حاشیہ میں لکھا ''وصل اور شغل اچھے قوانی نہیں نہیں''(۱۶۱)

اسی اصلاح پسندی اور زباں دانی کی وجہ سے جوش کی آپ بیتی ''یادوں کی برات'' کئی مرتبہ لکھی اور رد کی گئی۔ زبان کی غلطیاں جوش کسی صورت پسند نہ کرتے تھے۔ کاتب کی غلطی سے اگر کوئی لفظ غلط چھپ جاتا تو جوش جب تک درست نہ کروالیتے چین سے نہ بیٹھتے۔

جوش شعر کو بار بار لکھ کر خوبصورت بنایا کرتے تھے۔ یعنی آمد کے ساتھ ساتھ آورد کے بھی قائل تھے۔ جب تک ہر لفظ انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ نہیں بیٹھتا تھا جوش مطمئن نہیں ہوتے تھے۔

فرخ جمال ملیح آبادی نے اپنی کتاب ''جوش ملیح آبادی، ملیح آباد سے اسلام آباد تک'' میں تحریر کیا ہے کہ جوش نے پیر نصیر الدین نصیر آف گولڑہ شریف کے فارسی کلام کی اکثر نظموں پر اصلاح دی ہے۔(۱۶۲)

فرخ جمال نے جوش کی اصلاح پسندی کا ایک اور واقعہ رقم کیا ہے۔

''ممتاز دانشور ضیاء محی الدین بھی محترم افتخار عارف کے ساتھ بابا کو اپنے پروگرام ''ضیاء محی الدین شو'' میں مدعو کرنے کے لیے تشریف لائے تھے۔ انہوں نے بابا سے کہا کہ ہم آپ کا اپنے پروگرام میں دس ایک منٹ انٹرویو کریں گے۔ بابا سے رہا نہ گیا اور فوراً ٹوک دیا کہ یہ دس ایک منٹ کیا ہوتے ہیں یا تو دس منٹ ہوں گے یا صرف ایک منٹ۔ محترم ضیا محی الدین بہت زور سے ہنسے اور اپنی غلطی تسلیم کرلی۔''(۱۶۳)

جوش اپنی زباندانی کی وجہ سے لوگوں کے کلام میں اور ان کی گفتگو میں غلطیاں نکالنے کی بنا پر کئی بار معتوب بھی ہوئے۔ اور کئی مرتبہ لوگوں کی پیش قاف درست کے چکر میں ان کی ناراضگی کے مرحلے سے بھی گزرے جوش خود لکھتے ہیں۔

''میں کیا کروں میرے سامنے جب کوئی غلط زبان استعمال کرتا ہے، میں اُس کو برداشت نہیں کر سکتا اور پھٹ سے ٹوک دیا کرتا ہوں۔ اور یہ نہیں دیکھتا کہ جس کو ٹوک رہا ہوں وہ سلطان ہے یا گدا۔
میں پنڈت جواہر لال نہرو، ابوالکلام آزاد اور آمر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان تک کو ٹوک چکا ہوں۔
چنانچہ نسیم احمد صاحب کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ جب انہوں نے اثنائے گفتگو میں ''رہائش گاہ'' کہا تو میں نے پھٹ سے ٹوک دیا کہ لفظ غلط اور بدنسلا ہے اور میرے ٹوکتے ہی نسیم صاحب کے چہرے سے اس طرح پل بھر میں تبسم غائب ہو گیا جس طرح بجلی کا رشتہ منقطع ہو جانے سے بلب کی روشنی اُڑ جایا کرتی ہے۔ میری اس ''گستاخی'' سے چراغ پا ہو کر انہوں نے میرے خلاف نہایت سخت الفاظ میں ایک نوٹ لکھا اور اس پر ''ٹاپ سیکرٹ'' کا لیبل لگا کر اس کو اپنے وزیراعظم بھٹو صاحب کے پاس بھیج دیا''

(یادوں کی برات ص۷۳۹۔۷۳۸)

معروف کالم نگار مشفق خواجہ ''خامہ بگوش'' اپنے کالم میں جوش کی زباندانی کی تعراف ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

''جوش کے کلام سے صحتِ زبان کی سند تو لی جاسکتی ہے۔
ذہنی صحت مندی کے لیے کوئی راہنمائی نہیں ملتی''(۱۶۴)

جوش کی اصلاح پسندی کا یہی عالم تھا کہ جب وہ ترقی اردو بورڈ سندھ، کراچی میں ملازمت کرتے تھے تو ان کے پاس ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کی کتاب ''منتخب الحکایات'' برائے ملاحظہ لائی گئی۔ آپ نے اس میں بھی غلطیاں نکالنے کی کوشش کی اور دہلوی اور لکھنوی زبان کے معیارِ اغلاط کو نظر انداز کر کے کتاب کو جگہ جگہ سے نشان زد کیا۔ اسی بنا پر جوش اور شاہد احمد دہلوی کے درمیان دشمنی کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور جوش دشمنی میں شاہد احمد دہلوی نے ''ساقی'' کا جوش نمبر نکالا اور چُن چُن کر جوش دشمن لوگوں کے مقالات اس رسالے میں شائع کیے۔ شاہد احمد دہلوی لکھتے ہیں۔

''آپ تو صرف ملیح آباد کی زبان کو اردو سمجھتے ہیں ناں؟
یہ میری بدقسمتی تھی کہ دلی میں پیدا ہوا۔ گھٹی میں اردو زبان پڑی۔ نذیر احمد اور بشیر الدین کے گھر ہوش سنبھالا۔ آپ کی طرف والوں نے سرور سے فسانہ عجائب لکھوائی اور منہ کی کھائی''(۱۶۵)

جوش کی مخالفت میں ساقی نمبر توہین کی حد تک چلا گیا۔ شاہد احمد دہلوی نے اعتدال کا دامن چھوڑ کر جوش کو اس طرح پیش کرنے کی کوشش کی کہ عام آدمی جوش سے کراہت محسوس کرے اور ان کے خیالات سے مستفید نہ ہو سکے۔ جوش ابوالکلام آزاد کو لفظ ''یگانگت'' اور جواہر لال نہرو کو ''مشکور'' لفظ پر ٹوک چکے تھے۔ یہ لوگ جوش کا احترام کرتے تھے اس لیے چپ رہے حالانکہ یہ عربی فارسی الفاظ ہیں۔
جگن ناتھ آزاد جوش کی زباندانی کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ:

"کچھ دن بعد کی بات ہے کہ میں اُن کے کمرے میں داخل ہوا اور حسب دستور ان سے کہا "آدابِ عرض جناب، مزاج اچھے ہیں" وہ بھی حسب معمول اپنی جگہ سے اُٹھے، ہاتھ ملایا لیکن فوراً ہی یہ جملہ کہا۔
دیکھئے جناب، مزاج اگرچہ مختلف کیفیتوں کا مجموعہ ہے لیکن ہے واحد، جمع نہیں ہے۔ میں نے کہا، اس اصلاح کا شکریہ۔ لیکن غالباً احترام کے خیال سے ہم لوگ "مزاج اچھے ہیں؟" کہتے ہیں۔ کہنے لگے احترام اپنی جگہ پر بجا ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ آپ واحد کو جمع بنادیں، زبان کے معاملے میں یہ پہلا درس تھا جو مجھے جوش صاحب سے ملا"(۱۶۶)

اردو سے محبت اور اصلاح پسندی کا ایک واقعہ جوش نے "یادوں کی برات میں رقم کیا کہ:

"میں نے پاکستان کے ایک منسٹر صاحب کو اردو میں خط لکھا، اور ان "صاحب بہادر نے انگریزی میں جواب مرحمت فرمایا تو میں نے جواب الجواب میں یہ لکھا تھا کہ جناب والا، میں نے تو آپ کو اپنی مادری زبان میں خط لکھا لیکن آپ نے اس کا جواب اپنی پدری زبان میں تحریر فرمایا ہے۔"(۱۶۷)

۱۴: خطباتِ جوش / تقاریر

جوش ملیح آبادی کی تقریروں سے کچھ اقتباسات پیش خدمت ہیں جو ان کے ذہنی رجحان کی عکاسی کرتے ہیں۔

ترقی پسند تحریک ایک ایسی تحریک تھی جس نے متعدد شعراء و ادباء کے دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ جوش بھی نظام نو کے خواہاں تھے وہ مارکسزم اور کیمونزم (نقطہ نظر) کو سمجھنے کی کوشش میں ترقی پسند مصنفین کے اجلاسوں میں شرکت کرتے۔ وہ 1937 میں الہ آباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایک کانفرنس میں شریک ہوئے اور مجلس صدارت کے ایک اہم رکن کی حیثیت سے انہوں نے تقریر بھی کی جس کا لب و لباب یہ تھا کہ فی زمانہ انقلاب زندگی کی ہر اک شے میں نظر آرہا ہے۔ آداب و رسوم میں انقلاب، نظریات و معتقدات میں انقلاب، مسلمات و کلیّات میں انقلاب، سیاست اور مذہب میں انقلاب بھوک، بیروزگاری، بیماری، جہالت، ایسی حقیقتیں ہیں جن سے آنکھیں نہیں چرائی جاسکتیں۔ یہ ضرورتیں قربانی کی خواہاں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ:

"میں ایک مدت سے سنتا چلا آرہا ہوں کہ ہر قوم کے ادیب اور شاعر انتہا درجے کے حساس، خود دار اور غیور ہوا کرتے ہیں۔ اگر میرے ہندوستان میں بھی یہی ہے تو میں اپنے شاعروں اور ادیبوں کے سامنے دوزانو ہو کر گڑ گڑاؤں گا کہ خدارا اپنے ادب میں غلبۂ انقلاب پیدا کر کے ان کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو خونی گرداب کے خوں آشام دانتوں سے چھڑا لیجئے... اور شباب و محبت کا واسطہ اپنے ادبیات میں حیات اور بیداری کا خون دوڑایئے اور وطن عزیز کے لیے دلوں کی طرح دھڑکتے ہوئے زندہ الفاظ کو جوڑ کر ایک نیا باب الہند تیار کیجئے جس کے سنہرے اور بلند محراب کے نیچے سے زندہ کر دینے والے انقلابات کے نقرئی جلوس فوج در فوج اور قطار در قطار ہندوستان میں داخل ہونا شروع ہو جائیں۔ یاد رکھئے کہ ایک صحیح جنبش قلم ستر ہزار برہنہ تلواروں کے مقابلے میں زیادہ کارآمد آلۂ جنگ ہے۔"(۱۶۸)

۱۹۴۳ء میں بھی جوش نے ترقی پسند مصنفین کی تیسری کانفرنس (ممبئی) میں مجلس صدارت میں شرکت کی تھی۔ اس میں جب سجاد ظہیر نے اعلان نامہ دستخط کے لیے پیش کیا تھا تو جوش نے اتفاق کے باوجود یہ کہہ کر انکار کیا تھا کہ خوبصورت سے خوبصورت لڑکی پر بھی کسی کی سفارش سے عاشق نہیں ہوا جاسکتا۔ غالباً ان کو یہ شکایت تھی کہ اعلان نامہ تیار کرتے وقت ان سے مشورہ نہیں کیا گیا تھا۔

جوش نے سولہ فروری انیس سو چوہتر (۱۹۷۴۔۲۔۱۶) کو کینٹ پبلک ہائی سکول، کینٹ کراچی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں شرکت کی اور کرسیٔ صدارت پر جلوہ افروز ہوئے۔ اسناد تقسیم کی گئیں اور طالبات سے خطاب کیا۔ جوش نے بچیوں کو کہا کہ تمہارے لہجے، نشست و برخاست کے طریقے، اور تمہاری خاموش نظریں وہ مدرسے ہیں جن کے سانچے میں ڈھل کر نئی نسلیں پروان چڑھیں گی۔ اپنی قدر پہچانو اور آنے والے

وقت کی ابھی سے تیار پکڑ لو۔ وقت کا دھارا تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ کھیل کود میں وقت ضائع کرنے کی بجائے حصول علم کے لیے کوشاں ہو جاؤ اور ہر لمحہ تحصیل علم کے لیے وقف کر دو۔ جوش نے کہا۔

"میں تم کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ علم سے جی چُرا کر اگر آج ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھو گی تو تمام عمر دھوپ تمہارا تعاقب کرتی رہے گی۔ لوگ کہتے ہیں کہ قدرت نے تم کو مردوں کی طرح قوی بنانے میں بخل سے کام لیا ہے لیکن ان کو اس حقیقت کا علم نہیں کہ تمہاری نزاکت کے اندر وہ سختی ہے جو مردوں کی فطرت کے لوہے کو گلا ڈالتی ہے۔ اگر تم نہ ہوتیں تو یہ کرۂ ارض تاریک رہتا۔ انسانیت و شرافت اور شاعری کو فروغ حاصل نہ ہوتا۔ اگر تم سیف ساں نگاہیں نہ چبھوتیں تو انسان کے دل سے فاسد مادہ نہ نکل سکتا اور نوع بشر کی آفاقی محبت کا چراغ حشر تک نہ جل سکتا۔

تم پر مردوں کو ترجیح دینے والے کہتے ہیں کہ قدرت نے آج تک تم میں سے کسی کو پیغمبری کا مرتبہ عطا نہیں کیا ہے اور میں یہ کہتا ہوں کہ اس کو پیغمبری کی حاجت کیا ہے جس کو جوہر تخلیق بخش کر خدائی کا منصب عطا کیا گیا ہے۔"(۱۶۹)

ذیل کی تقریر جوش نے متحدہ محاذ اردو کراچی کے ایک جلسے میں کی۔ سال خطابت ۱۹۷۹ء ہے۔ جوش نے کہا کہ اگر اردو سے ہماری غفلت کا یہی حال رہا تو ہندوستان کی مانند پاکستان میں بھی اردو فنا ہو جائے گی اور اردوئے معلیٰ اردوئے اسفل بن کر رہ جائے گی۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کریں کہ اردو کی بقا کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں اور اس کے لیے سرمایہ کیا حکومت فراہم کرے گی یا ہمیں اپنے ذرائع ابلاغ بروئے کار لا کر حاصل کرنا ہو گا۔ جوش نے اردو کی بقا کے لیے کچھ تجاویز دیں جو کہ درج ذیل ہیں:

- ☆ پہلی بات یہ کہ ہم حکومت کو مجبور کر دیں کہ وہ بہت جلد اردو کو دفتری زبان کا درجہ دے دے۔
- ☆ یونیورسٹی کو اردو کا پابند کر دیا جائے اور مستند ارباب علم و ادب سے نصاب تیار کرایا جائے۔
- ☆ ایک دارالترجمہ و تالیف قائم کر کے اعلیٰ تصنیفات کے ساتھ ساتھ دنیا کے تمام علوم اور تمام اصطلاحوں کا اردو ترجمہ کرایا جائے۔
- ☆ زبان میں جو اغلاط کا زہر سرایت کر چکا ہے اس کے ازالے کے واسطے ایک "قاموس الاغلاط" کو مرتب و مدون کیا جائے۔
- ☆ مستند ارباب علم و ادب اور ماہر لسانیات پر مشتمل صحت ادب و الفاظ کی خاطر ایک "دارالفتاوائے ادب" قائم کیا جائے تاکہ ادب و الفاظ کے اندر پراگندگی نہ پیدا ہو سکے۔
- ☆ فلموں، رسالوں، اخباروں، جلسوں، جلوسوں، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سالانہ اجتماعات کی وساطت سے اردو کو فروغ دیا جائے۔
- ☆ چونکہ زبان دماغ کی ترجمان ہوتی ہے اور ہم اپنے افکار و خیالات کو الفاظ کی سواریوں پر بٹھا کر سامعین کے احاطۂ فکر اور قارئین کتب کے دماغوں تک لے جاتے ہیں اس لیے جدید مفردات و مرکبات کی تعمیر کی جائے تاکہ الفاظ یعنی خیالات کی سواریوں کی قلت کی وجہ سے ہماری افکار و خیالات گھٹیا کے مرض میں گرفتار ہو کر نہ رہ جائیں۔"(۱۷۰)

جوش اردو کو پاکستان میں پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ پاکستان میں اردو کو فروغ ملے گا کیونکہ یہ مسلمانوں کے تشخص کی علمبردار ہے۔ اس لیے انہوں نے پاکستان ہجرت کی کہ انہیں ہندوستان میں اردو کا وجود ختم ہوتا دکھائی دیتا تھا۔

۱۵: جوش کی اصطلاحات

جوش کی اصطلاحیں ان کی تہذیبی و ثقافتی زندگی کی نمائندہ ہیں۔ ان کی اصطلاحوں سے تاریخ، تہذیب، معاشرت، مذہب، طرز حکومت اور رسم و رواج سے آگہی حاصل ہوتی ہے۔ ملیح آباد میں اصطلاحوں کی فراوانی تھی۔ جوش نے شعوری کوشش کی کہ اصطلاحوں کو نئے معنی و مفاہیم دیئے جائیں۔ فارسی اصطلاحوں میں اضافہ کر کے انہوں نے اصطلاح سازی کی۔ جوش کے ہاں مولوی، مُلّا، فقیہہ، ناصح، صوفی، مدرس

کی اصطلاحیں کامیابی سے برتی گئی ہیں۔ جوش نے مولوی اور مُلّا سے دشمنی میں تنقیدی رویے سے بڑھ کر رویے کا مظاہرہ کیا اور پنڈت اور مولوی کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا۔ سامراج دشمنی کے لیے انہوں نے سامراج، غلام، لیڈر، دربار، سوداگر اور بالخصوص خادم کی اصطلاحات استعمال کیں، حق و باطل کے معرکے کو ایک تازہ کربلا کا نام دیا۔ جوش نے "شخصی خدائی تصور کے باغی" کا لقب پایا۔ (خورشید علی خان کے بقول) رام اور رحمٰن، ہندو اور مسلم، خطبۂ ابلیس، مرتدِ ادیانِ صنم کاری، حیی الصلوۃ حیّ علی العبسو، رکوع و سجود، کعبۂ رندی، بے دینی کا مل غرفۂ اسلام جیسی اصطلاحات استعمال کیں۔

## ۱۶:	اغلاطِ جوش

جوش پر یہ الزام ہے کہ وہ برگزیدہ ہستیوں کی شان کا خیال نہیں رکھتے بالخصوص امام حسینؓ کی شان میں زیادہ الفاظ سے خراج عقیدت پیش کرنے کی دُھن میں حد سے گزر جاتے ہیں۔ تکرار اور طوالت ان کی تحریر کا ایک بڑا عیب ہے۔ جوش ''جیسا'' کو ''ایسا'' میں بدل دیتے ہیں اور متن سے نکال دیتے ہیں۔ نذیر احمد کی کتاب کے متن میں جگہ جگہ جیسا کو ایسا سے بدلا گیا۔ دہلی میں ''جیسا'' کا رواج ہے جبکہ لکھنؤ میں ایسا تحریر کیا جاتا ہے۔

جوش ''ہاتھ'' کو ہمیشہ ''ہات'' لکھتے۔ ''تیار'' کی جگہ ''طیار''، ''ذرا'' کو ''ز'' سے ''ڈگڈگی'' کو ''ڈگ ڈگی'' لکھتے۔ ''تراشتہ'' کو ''تراشا'' ''رجحان'' کو ''رحجان'' لکھتے، ''ہوئے، ہوئی'' پر ہمزہ نہ لگاتے۔ پاؤں کی جگہ پانوں لکھتے۔ پہنچانا کی جگہ پھنچانا لکھتے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''ناملائم مطبوعہ حروف نے مجھے ڈسا'' ڈسنا سانپ کا کام ہے۔ حروف کا یا لفظوں کا کام نہیں۔

جوش کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ محاورے کے استعمال میں غیر محتاط واقع ہوئے ہیں۔ جوش نے ''شرم سے آب آب ہونا'' تحریر کیا ہے حالانکہ ''شرم سے پانی پانی ہونا'' محاورہ ہے۔ ایک اور الزام یہ بھی لگایا جاتا ہے کہ وہ فارسی محاورے کا آدھا ترجمہ کر کے استعمال کرتے ہیں۔ مضمون ''ضرب شاہدباز'' میں ''سیاہ روئی'' محاورہ استعمال کیا ہے جو کہ غلط ہے کیونکہ ''منہ کالا کرنا'' محاورہ ہے۔ جوش نے جہاں ترکیب سازی کی ناقدین کو موقع مہیا کر دیا، اعتراض کرنے کا۔

مسعود حسین خان لکھتے ہیں۔

> ''الفاظ کا یہ عام اصول ہے کہ وہ کثرت استعمال سے بے رس ہو جاتے ہیں۔ جوش ترشی ترشائی ترکیبوں پر اکتفا کرتے، طوافِ کعبہ، حسنِ مجاز، محروم سوز و گداز، شمیم کاکل پیچاں، گل بنیر، گوہر بار وغیرہ اس قسم کی تراکیب سے نہ رس ٹپکتا ہے اور نہ رنگ بلکہ گہرے سچے جذبات کی تربت بنتی ہے۔(۱۷۱)

جوش کو الفاظ کے استعمال پر قدرت حاصل تھی لیکن ان کے ناقدین ان کو ناپسند کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی اس صلاحیت سے بھی نفرت کرتے ہیں۔ نیاز فتح پوری نے کہا تھا کہ جوش الفاظ بے تکان استعمال کرتے ہیں اور اتنے مترادفات لاتے ہیں کہ اکثر کلام میں مطلب خبط ہو جاتا ہے۔ ایک مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کی کوشش سے وہ عبارت کو مہمل بنا دیتے ہیں اور اسی سے طوالت پیدا ہو جاتی ہے۔

جوش کے ہاں تکرار لفظی سے صوتی، معنوی اور لفظوں کی جھنکار پیدا کرنے کی کوشش دکھائی دیتی ہے جس سے بے جا طوالت پیدا ہو جاتی ہے گوپی چند نارنگ نے کہا ہے کہ

> ''جوش کے ہاں تکرار لفظی سے ایسی صورت پیدا ہوتی ہے جس میں لفظ سے معنی کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے اور محض لفظیات کی ضربیں باقی رہ جاتی ہیں۔(۱۷۲)

طوالت کی وجہ سے جوش تضاد کا شکار ہو جاتے ہیں اور ناقدین کو ان پر ہنسنے کا موقع مل جاتا ہے۔ ڈاکٹر یحییٰ احمد جوش کی زبان و بیان کی غلطیوں کی توجیہہ یوں پیش کرتے ہیں کہ

> ''جوش زبان و بیان کے مجتہد تھے۔ اس سلسلے میں وہ ہمہ وقت اجتہادی کاموں میں مصروف رہا کرتے تھے۔ ان کی طبیعت لگے بندھے اصولوں اور روایتی حدود کی پابند نہ تھی۔ انہوں نے ''روایت'' کی روایات کا خیال رکھا لیکن خود کو قیدی نہیں سمجھا۔ ان کی تخلیقی اور فنی اپج بعض اوقات ثقہ طبیعتوں کے لیے گراں باری کا سبب بن جاتی تھی لیکن ان باتوں کے علی الرغم جوش ایک عظیم شاعر اور صاحبِ طرز نثر نگار کے طور پر سامنے آئے ہیں۔(۱۷۳)

۱۷:   جوش کی شاعری

دانائے رموز و این و آں ہوں اے جوش
مولائے اکابرِ جہاں ہوں اے جوش
کیوں اہل نظر پڑھیں نہ کلمہ میرا
میں شاعر آخر الزماں ہوں اے جوش

جدید اردو شاعری کا آغاز حالی اور آزاد سے ہوا جنہوں نے جدید اور موضوعاتی نظم کی داغ بیل ڈالی۔ انگریزی ادب کے اثرات سے ہیئت اور عنوان کے تجربے بھی روا رکھے جانے لگے۔ حالی، آزاد، مولوی اسماعیل میرٹھی، سرور جہان آبادی، اکبر الہٰ آبادی، چکبست لکھنوی، اقبال، فراق، جوش، نظم طباطبائی، وحید الدین سلیم، ساغر نظامی، حفیظ جالندھری، فیض، احمد ندیم قاسمی، اختر انصاری، ساحر لدھیانوی، ن م راشد، مجید امجد، مجاز لکھنوی، ناصر کاظمی، مجاز، تاثیر اور تصدق حسین خالد کے نام کے نام لیے جاسکتے ہیں جنہوں نے اردو شاعری کے مزاج کو بدلنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جوش نے شاعری میں سلام، منقبت، قصیدہ، مرثیہ، رباعی، غزل اور جدید نظم نگاری کو فروغ دیا۔ جوش نے واقعاتی نظم نگاری بھی کی اور تمثیلی طرز میں بھی نظمیں لکھی ہیں۔

جوش کی شاعری میں فطرت پرستی، عشق بازی، تعقل پسندی، انقلاب پرستی، قومی درد اور انسان پرستی کے جذبات و موضوعات ملتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اپنے مضمون جوش ملیح آبادی میں جوش کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”حضرت جوش شاعر انقلاب بھی اور شاعر آزادی بھی، وہ شاعرِ انسانیت بھی ہیں اور شاعرِ رومان بھی اور انہوں نے جس طور پر لفظوں کو رنگ و نور بخشا ہے اور جس سلیقے سے انہیں تخلیقی سطح پر برتا ہے اس دور کا کوئی دوسرا شاعر اس سطح کو نہیں پہنچتا۔ فراق گورکھپوری نے کہا تھا کہ میں جہاں احساس و جذبے کے اظہار کے لیے لفظ ڈھونڈ تارہ جاتا ہوں جوش انہیں آسانی سے شعر کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔(۱۷۴)

(ا)   غزل:

شاعری کی ابتداء میں جوش نے غزل گوئی اور نظم گوئی دونوں اختیار کیں لیکن بعد میں اپنا سارا دھیان نظم گوئی کی طرف منتقل کر لیا۔ یہ نہیں کہ جوش نے اچھی غزلیات نہ کہی ہوں بلکہ جوش کے ہاں ہمیں اچھی غزلیات ملتی ہیں۔ شہزاد محمود نے ”جدید اردو شاعری کا انسائیکلوپیڈیا (الف سے ی تک)“ میں جوش کی کچھ غزلیات درج کی ہیں چند شعر ملاحظہ فرمایئے:

ملا جو موقعہ تو روک دوں گا جلال روزِ حساب تیرا
پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا

ایک اور غزل ملاحظہ فرمایئے۔ جوش کا رنگ بیاں اور طرز ادا کس طرح جوش کی قادر الکلامی کی جھلک دکھلا رہا ہے۔

سوز غم دے کے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا
مجھ کو تو ہوش نہیں تم کو خبر ہو شائد
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا

ایک اور جگہ جوش کے رنگ تغزل نے کیا نقشہ کھینچا ہے۔

کوئی حد ہی نہیں اس احترامِ آدمیت کی!
بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں

جوش کی غزلیات کی تعداد ڈیڑھ سو اور دو سو کے درمیان بتائی جاتی ہے۔(۱۷۵) جوش ملیح آبادی روایتی طرز کی ماضی پرستی اور جامد تصورات سے انکار کی بنا پر غزل گوئی اور خاص طور پر دہلوی طرز کی غزل گوئی سے منحرف ہوئے۔ جوش نے مصنوعی پن، نشاطیہ لب و لہجے، تمکنت، سرکشی اور مردانہ بانکپن کی بنا پر غزل کی داخلیت، سرنگوں نسائیت اور خلوت نشینی کا انکار کیا۔ جوش کی غزل سے فراریت کے بارے میں ڈاکٹر محمد حسن نے اظہار خیال کیا۔

جوش کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ انہوں نے چھوٹے دائرے میں رہنے سے انکار کیا۔ ذاتی اور نجی مسائل میں الجھے رہنے یا غزل کی روایتی بندشوں میں محدود رہنے کی بجائے انہوں نے فکر کی نئی شمع روشن کی۔(۱۷۶)

جوش غزل کی روایتی بندشوں کے خلاف تھے۔ وہ غزل کے گھسٹے پٹے مضامین اور فرسودہ خیالات سے بدظن ہو گئے تھے۔ جوش نے اپنی غزلوں میں مسلسل مضمون بیان کیے ہیں اور ”حرف و حکایت“ میں شامل ایک 9 اشعار کی غزل کو انہوں نے ”پیارے“ کا عنوان بھی دیا تھا۔ جوش کے ہاں غزل کے اسلوب میں نظم کے خصائص ملتے ہیں اور نظموں میں غزل کی وسعت پائی جاتی ہے۔ فضل امام جوش کی غزل گوئی کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”جوش کی غزل میں بادۂ شبانہ کی سرمستیاں ہیں، لذتِ خوابِ سحر نہیں بلکہ رنگینی شام اور طلوع جام کا نشہ ملتا ہے۔ اس لیے غزل میں بھی شوکت الفاظ سے کام لیتے ہیں۔ اگرچہ غزل میں شوکتِ الفاظ وہ تاثیر و کسک نہیں پیدا ہونے دیتی جو غزل کا خاصہ ہے۔(۱۷۷)

جبکہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے مضمون ”جوش ملیح آبادی، غزلوں کی روشنی میں“ جوش کی غزلیہ شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

جوش غزل کے مزاج کے دشمن نہ تھے بلکہ وہ معنی کی سطح پر غزل کو نظم جیسی وسعت اور نظم کو غزل جیسی اثر پذیری دینا چاہتے تھے اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔ ان کا مزاج سراپا تغزل تھا۔ البتہ ان کے دل و دماغ میں اس تغزل کی لہریں اتنی دور رس، بلند آہنگ اور پُرخروش تھیں کہ غزل میں ان کی سماعی بہت مشکل تھی اس لیے انہیں نظم کا سہارا لینا پڑا۔“(۱۷۸)

ڈاکٹر سید عبداللہ جوش کی غزل گوئی کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

جوش ملیح آبادی (جو بعد میں شاعر انقلاب کہلائے) پہلے غزل گو شاعر تھے۔ انقلاب زمانہ سے ان کی شاعری میں بھی انقلاب آیا... غزل اچھی لکھتے ہیں لیکن غزل کو ناقص و ناتمام صنف سمجھتے ہیں۔“(۱۷۹)

جوش نے جب یہ محسوس کیا کہ بقدر ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل ”تو انہوں نے اپنے بیان کی وسعت کی خاطر نظم گوئی اختیار کی اور نامور شعراء میں ان کا شمار ہوا۔ جوش اگر غزل گوئی کی طرف متوجہ رہتے تو شائد شاعر انقلاب نہ بن سکتے۔ کیونکہ غزل گو شعراء کی تعداد تو سینکڑوں تک ہے لیکن شاعر انقلاب کوئی ایک بھی نہیں۔

جوش ایک ایسا شاعر ہے جس نے غالب، حالی، شبلی، اقبال، حسرت، داغ دہلوی، امیر مینائی تمام بڑے شاعروں کے رنگ میں غزلیں بھی کہی ہیں لیکن اس طرح کہ ان کی اپنی انفرادیت بھی کسی طرح کم نہ ہوئی۔ یہ کلاسیکی رنگ جگر، اصغر اور فانی کے ہاں بھی موجود تھا اور جوش

نے اپنے دور کے مروجہ رجحان کے تحت اس رنگ میں غزلیں کہی ہیں۔ جوش کے لہجے اور آہنگ کا اسلوب لکھنؤ اور دہلی دونوں کا ودیعت کردہ ہے۔ بعد میں یہی رنگ یگانہ، شاد عرفی، سلیم احمد اور سرشار صدیقی نے اپنایا۔

جوش کی شعر گوئی میں طنز لطیف و ملیح، بذلہ سنجی و شوخی اور شگفتگی و شرارت موجود ہوتی ہے۔ جوش کی غزل گوئی پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بتایا کہ شعر و ادب کی تفہیم میں لوگ سطح بینی سے کام لیتے ہیں، وہ لکھتے ہیں۔

> ''جہاں کوتاہ بینی، کج فہمی، تنگ نظری اور کور ذوقی کا یہ عالم ہو وہاں خیام و سرمد، رابعہ و طاہرہ اور جوش و یگانہ کی شاعری کو داد و استحسان کی توقع رکھنا مناسب نہیں۔ کسی کی شپرہ چشمی کا جوش کی عظمت و لسانی صداقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ اردو کے ان قادر الکلام شاعروں میں سے ہیں جن کا شمار اردو زبان کے محسنوں میں کیا جانا چاہیے۔''(۱۸۰)

(ب) نظم گوئی:

جوش ایک روشن خیال، انسان دوست اور وطن پرست شاعر تھے۔ ایک حساس شاعر ہونے کی حیثیت سے وہ اپنے ملک اور معاشرے کے نشیب و فراز پر نگاہ رکھتے تھے۔ اسی لیے ان کی شاعری ملک کی سیاسی صورت حال سے دامن نہ چھڑا سکی تھی۔ جوش کے سامنے حالی، شبلی، نظیر، انیس اور اقبال کی شاعری تھی۔ ان کی قادر الکلامی، ان کا جذبہ اور غصہ سب مل کر ان کی باغیانہ نظموں میں جان پیدا کر دیا کرتے تھے۔ جوش نے انقلاب، انسان دوستی، انگریز دشمنی، فطرت پرستی، تعقل پسندی، روشن خیالی اور مذہبی پیشواؤں کے صبر و استحصال اور زمینداروں، ساہوکاروں کے ظلم و جور کو اپنی نظم کا موضوع بنایا۔ 1918ء میں ان کی نظم ''وطن'' کے نام سے منظر عام پر آئی۔ اس پر نوٹ میں لکھتے ہیں:

> ''میں تمام نوع بشر کو ایک خاندان سمجھتا ہوں۔ وطنیت کے اس ناپاک تخیل کو جو خود غرضی، تنگ نظری، منافرت اور دین آدم کی تقسیم چاہتا ہوں۔ انتہائی حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں لیکن اس قدر وطنیت پر ایمان ہے کہ اپنے گھر کو غاصبوں کی درندگی سے محفوظ رکھا جائے۔''

اس نظم میں جوش نے وطن کی عظمتوں کے گیت گائے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

اے وطن پاک وطن! روحِ روانِ اسرار
اے کہ ذروں میں تیرے بوئے چمن رنگ بہار
اے کہ خوابیدہ تیری خاک میں شاہانہ وقار
اے کہ ہر خار تیرا روکش صدروئے نگار
ریزے الماس کے تیرے خس و خاشاک میں ہیں
ہڈیاں اپنے بزرگوں کی تیری خاک میں ہیں

جوش کو ابتدا ہی سے فطرت سے محبت تھی۔ فطرت کی جزئیات پر غائر نظر ڈالی، کلیم الدین احمد اور سدم سندیلوی کہتے ہیں کہ ''جوش وڈس ورتھ کی طرح نظریں گاڑ کر دیکھتے ہیں۔

With his eyes straply fixed upon his object(۱۸۱)

جوش کو بچپن ہی سے سحر خیزی کی عادت تھی۔ مطالعۂ فطرت نے جوش سے صبح و شام، برسات، ساون کے مہینے، رات، گنگا کا گھاٹ پر نہایت خوبصورت نظمیں تحریر کروائیں۔ ٹیگور کے زیر اثر جوش کے ہاں نہایت رومان پرور اور جمالیاتی ذوق سے آراستہ نظمیں موجود ہیں جبکہ انیس کے زیر اثر جوش کے ہاں منظر نگاری موجود ہے۔ خلیل الرحمن اعظمی نے جوش کی مناظر فطرت سے محبت کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

"انہوں نے مناظر فطرت پر جس کثرت سے نظمیں لکھی ہیں اُس کی مثال پوری اردو شاعری میں نہیں ملے گی۔ صبح و شام، برسات، گھٹا، بہار، بدلی کا چاند، ساون کے مہینے، پچھلا پہر، گنگا کا گھاٹ، یہ تمام مناظر جوش کی نظموں میں رقصاں و جولاں ہیں۔ جنگل کی شہزادی، جامن والیاں، مہترانی، مالن سب کو جوش کے شعری ذوق نے گدگدایا ہے۔"(۱۸۲)

اپنے مجموعے نظم و نثر "روحِ ادب" میں جوش نے نظم کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی مشاہدہ فطرت کے زیر اثر نثر پارے تخلیق کیے ہیں جوش رقمطراز ہیں۔

تاریک رات کی پیشانی پر آفتاب کی نرم نرم شعاعیں چمکنا شروع ہوئیں۔ آفتاب تدریجاً بلند ہوتا چلا گیا۔ روشنی رفتہ رفتہ تیز ہوتی چلی گئی اور سیاہی کا گہرا رنگ آہستہ آہستہ ہلکا پڑتا گیا۔ اسی طرح ایک ایک کر کے رات کی تمام ساعتیں خاموشی کے ساتھ روشن ہوتی رہیں۔ آخر کار آفتاب پوری بلندی پر آ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سیاہی کا کرہ جگمگا اٹھا برکتیں بیدار ہو گئیں۔"

(روح ادب ص ۴۷)

جوش کے ہاں مشاہدۂ فطرت کے بعد جس چیز کی لے بلند ہے وہ ہے ان کی انقلابی و احتجاجی شاعری۔ بیسویں صدی کے اوائل کا وہ زمانہ جو پہلی اور دوسری جنگ عظیم کا زمانہ ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے اضطراب و انقلاب آفرین ہے۔ اس دور میں جوش بھی اپنا دامن نہ بچا پائے۔ قومی و ملکی معاملات پر صاحبان حکومت و اقتدار کی طرف سے کسی قسم کی رکاوٹ جوش کے قلم کو حرکت میں لانے کو کافی تھی۔ "شکستِ زنداں کا خواب، ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام، تلاشی" ایسی نظمیں ہیں جن میں جوش کا نظریۂ انقلاب جھلک دکھلاتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام جو نظم لکھی وہ سرکار نے ضبط کر لی۔ جوش کو گھر میں قید کر دیا اور "نیا ادب" جس میں یہ نظم چھپی تھی وہ نمبر بھی ضبط ہو گیا بعد میں اسے "آزادی کی نظمیں" کے نام سے ایک مجموعے میں شامل کیا گیا۔ وہ مجموعہ بھی بحقِ سرکار ضبط ہوا۔ کرشن چندر اس بارے میں لکھتے ہیں کہ

اس برصغیر میں انہوں نے (جوش) اس وقت حریت، صداقت اور آزادی کا علم بلند کیا جب دوسرے لوگ انگریزوں کی شان میں قصیدہ کہتے تھے۔"(۱۸۳)

جوش کے ہاں ظلم کی طاقتوں اور برسر اقتدار غاصبوں کے خلاف ایک نفرت اور احتجاج کا رویہ موجود ہے۔ وہ سرمایہ دار طبقے کو مزدور کا استحصال کرتے دیکھتے ہیں تو ان کا لہو کھول اُٹھتا ہے اور انہیں اپنے جذبات پر قابو نہیں رہتا۔ "آثار انقلاب، حیف اے ہندوستان، غلاموں سے خطاب، صدائے بیداریٔ بغاوت، مستقبل کے غلام، آدمی دے اے خدا، نوجوان سے خطاب، روحِ استبداد کا پیغام، سرمایہ دار شہریار، بارگاہِ قدرت میں ایک اشتراکی رند کا مشورہ، وفاداران ازلی کا پیغام"، جوش کی ایسی نمائندہ نظمیں ہیں جنہیں جوش کے انقلاب کی داعی نظمیں کہا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جوش نے ۱۹۴۱ء میں اپنا مرثیہ "حسین اور انقلاب" تحریر کیا اور انقلاب کا عالمگیر تصور پیش کیا۔ جب جوش کو گھر میں نظر بند کر دیا گیا تو ایک آفیسر اپنے چند ہرکاروں کے ساتھ گھر کی تلاشی لینے کے لیے آیا۔ اس وقت جوش نے یہ نظم قلم بند کی۔

گھر میں درویشوں کے کیا رکھا ہوا ہے بدنہاد!
آ مرے دل کی تلاشی لے کہ بر آئے مراد
موت جس میں دیکھتی ہے منہ اُس آئینے کو دیکھ
میرے گھر کو دیکھتی کیا ہے میرے سینے کو دیکھ(تلاشی)

ناقدین میں اس بات پر اختلاف ہے کہ جوش کسی انقلاب کے داعی ہیں یا نہیں۔ کچھ لوگ جوش کی شاعری میں انقلاب کی پکار محسوس کرتے ہیں اور کچھ انقلاب کی پکار کو رومانیت سے ملا دیتے ہیں اور جوش کو شاعرِ شباب اور شاعر شراب قرار دیتے ہوئے ان کی انقلابیت کا رد کرتے ہیں۔ فیض نے جب اشتراکی نقطہ نظر سے جوش کے تصورِ انقلاب کو جانچا تو انہیں تامل ہوا کہ جوش انقلابی شاعر ہیں۔

۱۹۲۰ء تک جوش ہر روایتی چیز سے بغاوت کرتے ہیں۔ روایتی قدریں، ادیان، اوہام، میلانات، رجحانات سب سے بغاوت ان کا مقصد ٹھہری۔ جوش ان حالات میں پھر اعلانِ بغاوت کرتے ہیں جب قحط، مفلسی، اور مفلوک الحالی کی کیفیت پورے ہندوستان میں ہر جگہ نمایاں تھی۔

۱۹۳۶ء میں جوش نے "کلیم" میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون "اردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت" میں ہندوستانی انقلاب اور انقلابی شاعری کو موضوع سخن بنایا ہے۔ جوش لکھتے ہیں

"میں حیران ہوں، کیا واقعی آپ نہیں دیکھتے کہ ہندوستان ننگا اور بھوکا ہے۔ دانے دانے کو ترس رہا ہے۔ کیا آپ کے علم میں اب تک نہیں آیا کہ اکثر و بیشتر ہندوستانی مائیں بھوک سے تنگ آکر اپنے کلیجوں کے ٹکڑوں کو خود اپنے ہی ہاتھوں سے ذبح کر ڈالتی ہیں۔ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ ہر سال آپ کے کتنے ہی گریجویٹ بیروزگاری سے گھبرا کر زہر کھا لیتے ہیں... لیکن ہندوستانیو! تمہاری سماعت کو کس طرح طوفانی بجلی کی کڑک اچک لے گئی۔ کیا واقعی تم نہیں سنتے۔ کہ ہندوستان کی ہواؤں میں انقلاب سانس لے رہا ہے۔ سنسنا رہا ہے... اور کیا تمہیں نہیں معلوم کہ جب رات کا پراسرار سناٹا پہنائے عالم کا احاطہ کر لیتا ہے تو نامعلوم سمتوں سے انقلاب، انقلاب کی دھیمی آوازیں صبح تک آتی رہتی ہیں۔"(۱۸۴)

جوش نے جس وقت یہ مضمون تحریر کیا اُس وقت جوش کے پاس اشتراکیت کا کوئی واضح تصور نہیں تھا۔ مارچ ۱۹۴۶ء میں جوش نے "مستقبلِ ہندوستان" کے عنوان سے جو نظم لکھی اس میں ہندوستان کی تقریر بدلنے کا اشارہ ہے۔

یہ کس نے چونک کر انگڑائی لی آسمانوں پر
زمین کا ذرہ ذرہ پرفشاں معلوم ہوتا ہے
بحمد اللہ کہ جوش، اس صبح نو کی تازہ کاری میں
مجھے مستقبلِ ہندوستان، معلوم ہوتا ہے
(مستقبل ہندوستاں)

جوش عملی سیاست کے آدمی نہ تھے لیکن انہوں نے ادہام، اور جہل کے خلاف بغاوت کی اور عقلی دلائل سے طلسم ادیان کے بتوں کو پاش پاش کرنے کی کوشش کی اور مذہبی بغاوت کے ذریعے مولویوں اور مذہبی ٹھیکیداروں کے بنائے ہوئے سانچوں کو توڑنے کی جرأت کی۔ لیکن جوش اعتراضات، طنز اور استہزاء کے سوا اور کچھ نہ کر سکے۔ سید محمد علی عقیل رضوی اپنے مضمون "جوش کے سیاسی افکار اور انقلابی شاعری، وقت کے آئینے میں" میں لکھتے ہیں۔

"جوش کی ایسی شاعری گہرائی نہ رکھنے کے باوجود اس قومی شاعری کو سہارا دیتی ہے جس نے ۱۹۴۷ء تک پہنچتے پہنچتے ملک کی تقدیر بدل دی۔ اس جوش کی یہ انقلابی شاعری انقلاب کی نقیب بھی ہے اور مددگار بھی اور جنگ آزادی میں جب اردو شاعری کے حصے کی بات چلے گی تو جوش کی شاعری کا حصہ اسی طرح اہم ہو گا جس طرح بنگال کے انقلابی شاعر قاضی نذر الاسلام کا حصہ، ہندی کے شعراء میتھلی شرن گپت اور نوین کا حصہ اور بس... جوش کی انقلابی شاعری کو یہیں تک محدود رکھنا چاہیے۔"

جوش کی سیاسی انقلابی نظموں میں گھن گرج ہے، موضوعات کے ساتھ انہیں پیش کرنے کی اُن میں بے پناہ صلاحیت بھی ہے مگر ان سے کسی گہری سیاسی بصیرت کا احساس نہیں ابھرتا۔(۱۸۵)

جوش کے ہاں انسانی ہمدردی، انسانیت، بطور انسان مذہب و ملت سے ماوراء ہو کر سوچنا، انسان کے لیے خدا سے بھی لڑ جانا جیسے جذبات ملتے ہیں۔ انہوں نے مزدور، کسان، محنت کش، غریب جامن والیاں، کوہستان دکن کی عورتیں، ضعیفہ نامی نظم میں بوڑھی عورت کی مشکلات کو اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ سماجی پستی، جور و ظلم، اور جبر و تشدد کے خلاف نہایت بے باکی سے اظہار کرتے ہیں اور سامراجیت و قصر شاہی کے

خلاف ڈٹ جاتے ہیں۔ انہوں نے کاشتکار کی غربت و فلاکت کا ذمہ دار میں سرمایہ دارانہ نظام کو قرار دیا ہے جس نے قوم و ملک کی معیشت کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ اپنی نظم "مہاجن اور مفلس" معاشرے کے ان دو طبقوں کے انداز و مزاج کو بیان کرتے ہیں۔ اپنی ان نظموں میں جوش صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ جوش ظالم اور سفاک قوتوں کو للکارنے کے ساتھ ساتھ مظلوموں اور مجبوروں کو بیدار بھی کرتے ہیں۔

جوش کی بعض نظموں میں ان کی ہنگامی نوعیت کے لحاظ سے خطابت کا عنصر موجود ہے لیکن کلیم الدین احمد نے "اردو شاعری پر ایک نظر" میں جوش کی نظموں میں خطابت کو شاعرانہ حدود سے باہر تصور کرتے ہیں۔(۱۸۶) درحقیقت جوش کی اکثر نظموں کا انداز خطابیہ ہے اور وہ شاعرانہ انداز خطابت سے واقفیت کی بنا پر تشبیہات و استعارات تجنیسی مہارت ے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ فضل امام خطابت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> خطابت صرف صدا لگانے یا نداد ینے کا نام نہیں۔ اس کے مطالبات اور نزاکتیں ہیں۔ جملوں کا در وبست، مضامین کی ترتیب، تراکیب کی بندش اور بر محل استعمال، لفظوں کی صوتی ہم آہنگی، مفہوم، معنی اور لفظی مناسبت، اتار، چڑھاؤ اور ٹھہراؤ سے ہی خطابت کا فن پیدا کیا جا سکتا ہے۔ خیالات اور عنوان کی گہرائیوں میں ڈوب کر جب بر محل اور موزوں لفظوں میں کوئی بات کہی جاتی ہے تو خطابت کا لطف آتا ہے"(۱۸۷)

سلیم احمد کے بقول اقبال اور جوش ہماری زبان کے ایسے شاعر تھے جنہوں نے اردو اور فارسی شاعری کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔(۱۸۸) ہمارے ناقدین کا یہ خیال ہے کہ جوش بطور شاعر ہی ہمیں متاثر نہیں کرتے ان کی لفاظی ان کے ایک ہی طرح کے مضمون سو رنگ سے باندھنے کا ڈھنگ، ان کی جذباتیت، ان کی خطابت، ان کی اشتعال پسندی، ان کا عتاب، ان کی طنز اور ان کا استہزاء یہ سب قاری کو متنفر کرتا ہے۔ لیکن وارث علوی جوش کا دفاع اپنے مضمون "جوش کی شاعری میں کلاسیکی اور جدید شعری اسلوب کی کشمکش" میں اس طرح کرتے ہیں کہ جوش کے مخالفین کو لاجواب کر دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> "جوش بے شک مغلوب الغضب آدمی تھے اور جوش کی اس کمزوری کا فائدہ خلیل الرحمن اعظمی نے اپنے جوش پر Damaging مضمون میں خوب اٹھایا ہے۔ جو بات اعظمی نہیں دیکھ سکے کیونکہ وہ دیکھنا نہیں چاہتے تھے وہ یہ ہے کہ جوش نے کیسے اپنے غیظ و غضب کو اپنی طبقاتی برتری، اپنی جاگیردارانہ نخوت اور اپنی شخصی انا کے منہ زور گھوڑے کو قابو میں رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اندر سے ایک نئی شخصیت پیدا ہوئی جو منکسر المزاج، شائستہ، روادار اور دلنواز تھی۔(۱۸۹)

جوش کی زیادہ تر شاعری بیانیہ ہے۔ جوش کی نظم "گرمی اور دیہاتی بازار" اس قسم کی بہترین نظم ہے۔ "مولوی اور مہاجن" میں جوش نے کیری کیچر کی عمدہ مثال پیش کی ہے۔ ان کی نظم "کسان" کا پہلا ٹکڑا، جس میں شام کا منظر بیان کیا گیا ہے، منظریہ شاعری کا دلکش نمونہ ہے۔ اس چیز کا اعتراف تورشید حسن خان بھی کرتے ہیں کہ حسن اور مزدوری، سرزمینِ دکن کی عورتیں اس لحاظ سے قابل ذکر نظمیں ہیں کہ ان میں جزرس مشاہدات کا بیان ہے۔ "جنگل کی شاہزادی" واقعہ نگاری کی بھی خوبصورت مثال ہے۔" جوش میں افسانہ نگاری کی جو صلاحیت تھی وہ ان تمام نظموں میں الگ الگ بکھری پڑی ہے لیکن کسی ایک نظم میں موجود نہیں۔ افسانہ نگاری کی بہترین مثال جوش کی طویل نظم "حرفِ آخر" ہے۔ یادوں کی برات میں بھی جوش کی افسانہ نگاری نظر آتی ہے۔ اگرچہ الگ سے کوئی افسانہ جوش نے تحریر نہیں کیا۔

(ج) گیت نگاری:

جوش نے فلمی گیت بھی لکھے پونا میں جوش ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۸ء تک قیام پذیر رہے۔ جوش کی گھریلو تنگ دستی انہیں فلمی دنیا تک لے گئی۔ "من کی جیت" فلم کے گیت جوش نے تحریر کیے۔ اس کے گیتوں نے شہرت حاصل کی۔

نگری میری کب تک یونہی برباد رہے گی

دنیایہی ہے تو کیا یاد رہے گی

کب ہو گا سویرا کوئی اے کاش بتادے

کس وقت ؟اے گھومتے آکاش!بتادے

انسان پر انسان کی بیداد رہے گی

(رامش ورنگ)

جوش فلمی معیار کو بلند کرنے کے واسطے پونا گئے تھے۔ لیکن بعد میں فلمی کمپنی کے مالکے ڈبلیو زیڈ احمد نے کہا کہ یہ فلم کمپنی ہے۔ کسی پارٹی کا دفتر نہیں ہے اور نہ اس کا مقصد کسی سماج کی اصلاح ہے۔(۱۹۰) من کی جیت کا ایک گانا بہت مشہور ہوا۔

میرے جو بنوا کا دیکھو ابھار

من کی جیت کے علاوہ ایک رات، سنجوگتا اور میر ابائی نامی فلموں میں گیت لکھے۔ پاکستان میں فلم ''آگ کا دریا'' کے لیے جوش کا لکھا ہوا گیت ''ہوا سے موتی برس رہے ہیں، فضا ترانے سنا رہی ہے'' بہت مشہور ہوا۔

(د) ملی نغمے / قومی ترانے

جوش صاحب کے وہ قومی گیت اور نغمے جو فلم کا حصہ بنے اس میں بھی انہوں نے انسانیت کے رشتے کو اہمیت دی ہے۔ جب ۱۹۷۱ء کا واقعہ ہوا تو ان سے پوچھا گیا کہ ان حالات میں کس قسم کے ترانے مفید کردار ادا کر سکتے ہیں، جوش نے جواب دیا۔

''وہ ترانے جو انسان کی عقل کو وسیع کریں اس کی انا کو کائنات پر حاوی کریں اور درسِ محبت دیں۔(۱۹۱)

جوش ملیح آبادی نے قومی نغمہ بھی لکھا جو بہت مشہور ہوا۔

اے وطن ہم ہیں تیری شمع کے پروانوں میں

زندگی جوش میں ہے ہوش ہے ایمانوں میں

جوش کو پاکستان دشمن کہنے والے ان کا یہ ترانہ دیکھ کر بھی ان پر الزام تراشی سے باز نہ آئے۔ بنا محبت کے ایسا ترانہ تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔

منور جمیل نے اپنی مرتب کردہ کتاب ''البم'' میں جوش ملیح آبادی کی ۱۹۳۳ء کی ایک نظم درج کی ہے۔(۱۹۲) جس میں جوش نے اپنا دن بھر کے اوقات کار کا ایک ''پروگرام'' صفحۂ قرطاس پر تحریر کر دیا ہے۔

اے شخص! اگر جوش کو تو ڈھونڈنا چاہے

وہ پچھلے پہر حلقۂ عرفاں میں ملے گا

اور صبح کو وہ ناظر نظارۂ قدرت

طرف چمن و صحن بیاباں میں ملے گا

اور دن کو وہ سرگشتۂ اسرار و معانی

شہر ہنر و کوئے ادیباں میں ملے گا

اور شام کو وہ مردِ خدا رندِ خرابات

رحمت کدۂ بادہ فروشاں میں ملے گا
اور رات کو وہ خلوتیِ کاکل ورخسار
بزم طرب و کوچۂ خوباں میں ملے گا
اور ہو گا کوئی جبر تو وہ بندۂ مجبور
مردے کی طرح کلبۂ احزاں میں ملے گا

(ر) جوش بطور مرثیہ نگار

جوش ملیح آبادی جدید اردو مرثیہ کے بانی تصور کیے جاتے ہیں۔ جوش نے فن مرثیہ نگاری میں نیا تصور پیش کیا اور خود بھی ان کے مطابق مراثی تخلیق کیے۔ ابتدا میں مرثیہ قصیدہ، غزل، مثنوی، مربع، مخمس اور مسدس ہیئت میں کہا جاتا تھا بعد میں مسدس کی ہیئت اس کے لیے مختص کر دی گئی۔ مرثیے کے اجزائے ترکیبی میں چہرہ، سراپا، رخصت آمد، رجز، جنگ، شہادت، بین اور دعا شامل ہوتے تھے اور تین بندوں سے لے کر تین سو بندوں تک مرثیے کہے گئے۔ بعض شواہد کی بنا پر منظر عباس نقوی نے جدید مرثیے کا بانی نسیم امروہوی کو قرار دیا ہے لیکن ڈاکٹر شاداب رضی نے اولیت کا سہرا جوش کے سر باندھا ہے۔(۱۹۳) سب سے پہلے جوش نے ہی جدید مرثیے کا معتبر جمالیاتی منشور مرتب کیا۔ جوش نے جب جدید مرثیے کا نیا منشور مرتب کیا تو کہا:

''مرثیہ گو کا مقصد یہ نہیں ہونا چاہیے کہ بُکا پر تان ٹوٹے (مرثیہ) لکھتے وقت کوئی مصرع یا بند رقتِ قلب کا آجائے تو وہ اور بات ہے لیکن اُس کی نیت یہ نہ ہو کہ لا کر اٹھائے بلکہ جھنجھوڑ کر اٹھائے... جذبہ تاسیٔ حسین پیدا کرے۔

مجھے اس سے سروکار نہیں کہ آپ اس کو مرثیے کو نام دیں یا نہ دیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میرے پیش نظر اس قسم کے مسدس لکھتے وقت مرثیہ ہی کا تصور رہتا ہے۔ میرا موضوع ان مرثیوں میں حبِ کربلا، عزم شہیدانِ کربلا، بے باکی اور حق گوئی ہوتا ہے تو پھر نقادروں کی رٹ کہ جوش کے مسدس جدید مرثیے نہیں ہیں سمجھ میں نہیں آتی۔(۱۹۴)

جوش نے اپنی زندگی میں کل نو مرثیے تخلیق کیے۔ پہلا مرثیہ آوازۂ حق کے نام سے ۱۹۱۸ء میں لکھا۔ اس کے بانوے (۹۲) بند ہیں۔ دوسرا مرثیہ حسینؓ اور انقلاب کے نام سے ۱۹۴۱ میں تحریر کیا اس کے بعد ۶۸ بند ہیں۔ تیسرا بمرثیہ موجد و مفکر ۱۹۵۶ء میں لکھا گیا اس کے بعد ۱۱۵ بند ہیں۔ چوتھا مرثیہ وحدتِ انسانی کے نام سے ۱۹۵۶ء میں لکھا اس کے ۶۷ بند ہیں۔ پانچواں مرثیہ ''طلوعِ فکر'' کے نام سے ۱۹۵۷ء میں قلمبند کیا۔ اس کے ۱۱۰ بند ہیں۔ چھٹا مرثیہ عظمت انساں / قلم کے نام سے لکھا اس کے بعد ۸۸ بند ہیں۔ ساتواں مرثیہ زندگی و موت (محمدؐ و آل محمدؐ کی نظر میں) ۱۹۶۵ء میں تحریر کیا، اس کے ۸۶ بند ہیں۔ آٹھواں مرثیہ ''آگ'' ۱۹۵۹ء میں لکھا اس کے ۱۳ بند ہیں۔ نواں مرثیہ پانی کے نام سے ۱۹۷۱ء میں لکھا اس کے کل بند ۵۹ ہیں۔

پروفیسر شفقت رضوی نے اپنی کتاب ''جوش ملیح آبادی تحقیق و تنقید کی زد میں'' جوش کے مراثی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

جوش کے مسدسوں میں سب کچھ ہے لیکن ''دین'' ہے۔ نہ امام حسین کی ''دین پناہی'' ہے۔(۱۹۵)

جبکہ سبط حسن جوش کی فکر پر بات کرتے ہوئے اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ:

''ان کی فکر (جوش) میں خلافتِ یزید سے انکار اور کربلا کا حادثہ کوئی وقتی نہیں بلکہ راہ حق میں جہاد کی ایک ابدی للکار ہے۔''(۱۹۶)

جوش کے ہم عصر مرثیہ نگاروں میں جمیل مظہری، سید آل رضا، اثر لکھنوی، نسیم امروہوی اور مانی جائسی اہم ہیں۔ جوش کے مراثی میں سب سے زیادہ سماجی، اور سیاسی شعور کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ جوش نے عہد حاضر کے ذہنی رویّے، روز بروز ہونے والی معاشی اور معاشرتی تبدیلیاں اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل اپنے مراثی میں عمدگی سے بیان کیے ہیں۔

آوازۂ حق کا ایک بند ہے

ہر دل کو یہاں کام ہے تسلیم و رضا سے۔ ہر لب کو یہاں عید ہے تسبیحِ خدا سے

کیا اس سے سروکار ہے بھوکے ہوں کہ پیاسے۔ پرہیز بڑا یہ ہے کہ نفرت ہو دوا سے

دعوت میں یہاں بھوک ہے خلعت میں کفن ہے۔ انعام یہاں سب سے برادار و رسن ہے (آوازۂ حق)

جوش کا دوسرا اہم مرثیہ، ''حسین اور انقلاب'' ہے۔ اس کے بارے میں فضل امام اپنی کتاب ''شاعرِ آخر الزماں جوش ''ملیح آبادی'' میں رقمطراز ہیں۔

> ''جوش کا دوسرا اہم مرثیہ ''حسین اور انقلاب'' ہے اس کا سن تصنیف ۱۹۴۱ء ہے۔ یہ جوش کا سب سے زیادہ انقلابی مرثیہ ہے اور اس نے اپنے عہد میں تہلکہ مچادیا تھا۔ ہندوستان کی جنگ آزادی کا بھرپور تاثر اس مرثیہ میں جھلکتا ہے۔ اور اسی بنا پر انگریز نواز حضرات نے جوش کے خلاف منظم سازش شروع کر دی تھی۔ اس نے برطانوی سامراج کے بہی خواہوں کے حوصلے پست اور ذہن مفلوج کر دیئے تھے۔''(۱۹۷)

جوش مرثیے کے لیے بین کو ضروری نہیں سمجھتے تھے کیونکہ جوش حسنیت اور پیغامِ حسینی کو انسانوں کی بہبود اور غیر انسانی ظلم و جبر کے خلاف استعمال کر کے قومِ افسردہ میں ایک نئی روح پھونکنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر ہلال نقوی اپنے مضمون ''جدید مرثیے کے تین معمار'' میں لکھتے ہیں پہلے مآل ہچکیاں ہوتی تھیں اب لوگ یہ کوشش کرتے ہیں کہ ہمت تازہ کریں اور باطل سے لڑنے کا ولولہ پیدا کریں۔(۱۹۸)

کربلا میں پیش آئے مصائب اور باطل قوتوں کی ظالمانہ حرکات کا بیان اور حضرت حسین کے عزم و حوصلے کا بیان جوش نے اپنے مرثیے حسین اور انقلاب میں بخوبی کیا ہے۔

وہ کربلا کی رات، وہ ظلمت ڈراؤنی

وہ مرگِ بے پناہ کے سائے میں زندگی

اک دین تازہ کا جو پیمبر تھا وہ حسین

جو کربلا کا داورِ محشر تھا وہ حسین

جس کی نظر پہ شیوۂ حق کا مدار تھا

جو روح انقلاب کا پروردگار تھا

(حسین اور انقلاب)

جوش کا یہ مرثیہ جوش کے سیاسی شعور کا آئینہ دار تھا۔ ڈاکٹر عقیل احمد اس مرثیے کی تصنیف کے دور کے بارے میں بتاتے ہیں کہ:

یہ زمانہ وہ ہے جب ہندوستان میں صنعتی نظام سامراج کی سرپرستی میں دھیرے دھیرے آرہا تھا۔ اب دو ظالم نمودار ہو گئے تھے۔ ایک سرمایہ دار، دوسرا انگیز حاکم ان کو جوش نے عہدِ نو کا شمر کہا اور اس دور کو کربلائے نو سے تعبیر کیا۔(۱۹۹)

ہم کہہ سکتے ہیں کہ تخلیقی سطح پر نسیم امروہوی، علامہ جمیل مظہری، سید آلِ رضا، ڈاکٹر سید صفدر حسین اور ڈاکٹر ہلال نقوی نے جوش کی آواز میں آواز ملائی اور مرثیے کے فن کو تقویت دی۔

(س) جوش بطور رباعی نگار

فارسی زبان میں رباعی کو زیادہ فروغ ملا۔ دوبیتی کے حوالے سے بابا طاہر عریاں، ابو سعید ابوالخیر، عمر خیام اور سرمد کے نام بطور خاص لیے جاسکتے ہیں۔ اردو میں بھی تقریباً ہر مقبول و معروف شاعر کے ہاں رباعی کی صنف موجود ہے۔ لیکن خواجہ میر درد، میر انیس، میرزا دبیر کے علاوہ بیسویں صدی میں جوش ملیح آبادی، امجد حیدر آبادی، فراق گورکھپوری، تلوک چند محروم کے ہاں رباعی کی صنف کا التزام بطور خاص موجود ہے۔

دوسرے اردو شعراء کی طرح جوش نے رباعیوں کو اخلاقی درس کا وسیلہ بھی بنایا لیکن اس میں بھی ان کی انفرادیت الگ ہے۔ جوش کی رباعیات انیس اور امجد کی ٹکر کی ضرور ہیں ہمارے بعض ناقدین کو رباعیات جوش کو عمر خیام کی رباعیات کے ہم پلّہ قرار دیتے ہیں۔ جوش نے اپنی رباعیات کو حمزیات کی نذر ہونے سے بچالیا۔ جوش کے ہاں شبلی اور اقبال کا سا مذہبی تصور نہیں ہے اس لیے انہوں نے اپنی رباعیات سے مذہبی درس کا کام نہیں لیا لیکن ان کے ہاں اخلاقی درس رباعیات میں ضرور ملتا ہے۔

جوش نے رباعی کی ہیئت میں ایک Qualitative change پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کی ایک رباعی ایک پورے مختصر ڈرامے یا ٹیبلو کی صورت ہمارے سامنے ایک پورا ماحول یا فضا بناتی ہے جس میں کرداروں کی ڈرامائی آمد، کرداروں کے مکالمے اور ڈرامے کا انجام دکھایا گیا ہے۔

کل رات عین طرب کے ہنگام
پرتو یہ پڑا پشت سے کس کا سر جام
"تم کون ہو؟" "جبریل ہوں" کیوں آئے ہو؟
سرکار! فلک کے نام کوئی پیغام

جوش کی رباعیات میں علامتی الفاظ کا استعمال اپنی تمام تر خوبصورتی اور شدت کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ جوش نے علامت کو اس کی تمام تر تہہ داری کے ساتھ اس طرح برتا ہے کہ معنویت قوموں کے نزاعی اور فکری میلانات کے تضاد کے باوجود ختم نہیں ہوسکی ہے۔ سید اقبال حیدر اپنے مضمون "جوش اور ان کی رباعیات" میں جوش کی علامت نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "جوش کی رباعیات میں علامتی شاعری اور الفاظ کی "Allusion" اپنے معراج پر پہنچتی دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے نہ صرف عمیق سے عمیق موضوعات کو نظم کیا بلکہ اس بلا کی علامت نگاری کے ساتھ کہ شائد ہی اردو ادب میں اس کی مثال پیش کی جاسکے۔"(۲۰۰)

جوش کی شاعری میں سب سے زیادہ جوش کی رباعیات میں ان کا رویہ اور فکر کھل کر سامنے آتے ہیں۔ ان کی مابعد الطبیعاتی فکر، مافوق الفطرت کے اطراف نہیں گھومتی بلکہ اس کا مرکزِ نظر بشر ہے۔ جوش کی تعقل پرستی ان میں غم و غصہ اور شدید جذباتی ردّ عمل کے جذبات پیدا کر دیتی ہے۔ وہ انسان کو اس کائنات کا محدود مرکز مانتے ہیں جو صرف اس کی عقل کی بدولت ہے۔ جوش کی رباعیات کے تین مجموعے جنون و حکمت، نجوم و جواہر اور قطرۂ قلزم ملتے ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جوش کی رباعیات کے بارے میں اس طرح اپنے خیال کا اظہار کرتے ہیں۔

> "جوش کی میزان قدر میں جس چیز کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی وہ ہے عقل۔ عقل، فرد، فکر، افکار، سوچ، شعور، انائے انسانی یہ الفاظ ان کے یہاں بار بار آتے ہیں۔ جوش کی عقل پرستی دراصل مابعد سرسید عہد کے اس Rationalism کا حصہ تھی جس کی وجہ سے

بیسویں صدی کی پوری Episteme یعنی علمیاتی و عقلی فضا بدل چکی تھی... کانٹ اور ہیگل سے چلی آ رہی روایت یہی تھی کہ انسان کی سب سے بڑی میراث اس کا عقلی وجود ہے۔"(۲۰۱)

جوش کی رباعیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سب سے بڑا مسئلہ مذہب اور خدا کا تصور ہے۔ وہ عقیدہ اور اس سے منسلک ہر چیز کو اپنی عقل پرستی کی ترازو میں تولنے کی کوشش کرتے تھے اور جوش و نیاز کو ملحد و دہریہ ان کی اسی عقل پرستی کی وجہ سے کہا گیا۔ ڈاکٹر فضل امام نے تمکین کاظمی کے حوالے سے ایک اقتباس درج کیا ہے جس میں مذہب کے بارے میں جوش کے خیالات کی وجہ سے لوگوں میں قائم ہونے والے جوش کے غلط تاثر کا ذکر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

بعض باتیں دنیا میں عجیب و غریب دیکھنے میں آتی ہیں۔ وحید الدین سلیم اور عبد الحق باوجودیکہ ملحد اور مکمل دہریہ ہونے کے مولوی اور مولانا اور مقدس بنے رہے اور لوگ ان کو مذہبی اور مسلمان سمجھ کر پوجتے رہے اور اب تک پوجتے ہیں اور نیاز فتح پوری اور جوش ملیح آبادی باوجود مسلمان اور پکے مسلمان ہونے کے ملحد اور دہریہ کہلاتے رہے اور اب بھی کہلاتے ہیں۔ میں چونکہ ان چاروں سے واقف ہوں بلکہ بہت زیادہ واقف ہوں۔ اس لیے حیران ہوں کہ یہ کیا بوالعجبی ہے۔"

اک گدا کی زباں پہ ہے قرآں
واہ کیا شانِ کبریائی ہے
کل جو دیہیم تخت شاہی تھا
آج وہ کاسۂ گدائی ہے(۲۰۲)

جوش کی رباعیات میں "توحید بشر" کا موضوع خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں انہوں نے انائے انسانی پر اظہار خیال کیا ہے۔ کچھ رباعیات میں کھوکھلی انانیت، بلند بانگ دعوے اور کہیں بیجا اتراہٹ ہے۔ جوش نے خود کو باشندۂ آفاق قرار دیا ہے۔

جوش نے اپنی رباعیات میں وقت یا زماں کے تصور کو بھی پیش کیا ہے۔

(ش) جوش ملیح آبادی کی قطعہ نگاری

جوش ملیح آبادی کے ہاں رباعی کے ساتھ ساتھ قطعہ نگاری بھی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے ہاں "روح ادب"، "نقش و نگار"، شعلہ و شبنم" اور "سیف و سبو" میں قطعات کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ رومانی تحریک کے زیر اثر ان کے ہاں بغاوت، فطرت پرستی اور جمال پرستی کے موضوع پر قطعات ملتے ہیں۔

رکھے ہوئے سونے کا طبق ناز سے سر پر
کہرے میں نظر آتی ہے یوں صبح درخشاں
ہو جاتی ہے جس طور سے انسان کی شرافت
ہنگامۂ افلاس میں کچھ اور نمایاں
(شعلہ و شبنم ص ۱۰۴)

جوش کے ہاں خمریات کا موضوع بھی قطعہ نگاری میں موجود ہے۔ جوش ہندوستانی سیاست میں اشتراکی رنگ کے غالب آنے پر آزادئ ہند کے پیامبر بنے۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بے نقاب کرنے اور سماج کی کمزوریوں کو اجاگر کرنے کے لیے انہوں نے ایک فلسفۂ زندگی اختیار کیا۔ انہوں نے مذہب سے بغاوت کی۔ رومانی شاعری ہو یا ترقی پسند شاعری جوش کے ہاں بغاوت اور انقلاب کی علمبردار ہے۔ انہوں نے انسانی آزادی

کا نعرہ لگایا۔ جوش کے ہاں رومانیت ایک فعال قوت کے طور پر ابھرتی ہے۔ مادیت کے خلاف حسن پرستی اور بالخصوص فطرت سے محبت ان کی شاعری کا نہایت خوبصورت و لطیف پہلو بن کر ابھرتی ہے۔ ان کے پہلے مجموعے ''روح ادب'' میں اخلاقی نوعیت کے قطعات ہیں جبکہ ''نقش و نگار'' شعلہ و شبنم اور سیف و سبو میں جوش کی رومانیت نے فطرت نگاری کا روپ دھارا ہے۔ زندگی کا حسن ان کی جمال پرستی کا مظہر بن جاتا ہے۔ جوش آزادی کے جذبے کو فطری حق سمجھ کر غلامی کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ عالمگیر آزادی کا جذبہ جو تہذیب و تمدن، زبان، علاقائیت اور مذہب و ملت سے ماورا ہو۔ جوش کے ہاں آزادی کا جذبہ شروع ہی سے ملتا ہے لیکن جب ہندوستان میں اشتراکی رنگ غالب ہوا تو یہ جذبہ اور بڑھ گیا۔ وہ سماج کی کمزوریوں کو سب کو دکھانے اور معاشرے میں مساوات، عدل و انصاف اور رواداری کے جذبات کو اجاگر کرنا چاہتے تھے۔ پھر جوش نے رومانیت سے گریز اور ترقی پسندی کے زیر اثر ایک نشاط انگیز کیفیت اور رنج و غم کے مناظر کو بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ نقش و نگار، عرش و فرش، فکر و نشاط اور آیات و نغمات میں جوش کے ہاں اس طرح کے قطعات ملتے ہیں۔

رو برو اس کے گیا میں اس قدر مدت کے بعد
اس کا کیا غم اُس نے ادنٰی سی عنایت بھی نہ کی
مجھ کو تو صرف اس کا شکوہ ہے کہ اس نے مجھ سے جوش
اتنے دن تک دور رہنے کی شکایت بھی نہ کی

(نقش و نگار ۱۵۴)

جوش کے ہاں انقلابی تصورات کو بیان کرتے ہوئے لہجے میں ایک للکار اور نعرہ بازی کا انداز ملتا ہے۔ انداز میں گھن گرج اور آہنگ بلند ہے۔ سنبل و سلاسل، سرود و خروش اور الہام و افکار میں انقلابیت نمایاں ہے۔ اس دور میں امید پرست شاعر کے روپ میں دکھائی دیتے ہیں۔

روحِ ادب اور سیف و سبو میں رباعی نما قطعات کی تعداد زیادہ ہے۔ چند قطعات طویل بھی ہیں لیکن مختصر قطعات کی تعداد زیادہ ہے۔

جوش کی قطعہ نگاری کے بارے میں ڈاکٹر منیبہ خانم اپنی کتاب ''اردو میں قطعہ نگاری'' میں اس طرح اظہار خیال کرتی ہیں۔

جہاں تک جوش کے اسلوب کا تعلق ہے کم و بیش ہر ناقد نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ جہاں تک ذخیرۂ الفاظ اور قدرتِ کلام کا تعلق ہے۔ جوش کا پایہ بہت بلند ہے۔ ان سے پہلے نظیر اکبر آبادی کی مثال دی جا سکتی لیکن ان کے ہاں روزمرہ کی زبان میں ادنٰی و اعلٰی کی تمیز نہیں ہے۔ دوسرے نمبر پر انیس کا نام آتا ہے۔ لیکن موضوعاتی سطح پر ان کا دائرہ کار مرثیہ تک محدود ہے۔ جوش کا دائرۂ فکر و فن انیس سے وسیع تر ہے۔ البتہ جوش کے ہاں بھی زبان و بیان کی رعنائی ان قطعات میں زیادہ نمایاں ہے جو رومانی ہیں۔ (۲۰۳)

جوش کے ہاں قطعات میں واقعیت اور حقیقت نگاری نے قطعہ نگاری کو فنکارانہ دلکشی عطا کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری میں چاہے خیال سیاسی ہو یا انقلابی، حسن و عشق کا بیان ہو یا معاشرتی و اخلاقی مسئلہ کی پیشکش ہو جوش جس شاعرانہ حسن بیاں اور لطافت و نزاکت کو مد نظر رکھتے ہیں۔ وہ کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ ان کے الفاظ و تراکیب، تشبیہات و استعارات قطعہ نگاری کو ادبیت کی شان عطا کرتے ہیں۔

۱۸: اسلوب:

کوئی شاعر یا ادیب اپنے معاشرے میں موجود ناآسودگی، ناہمواری، تنزلی، استحصال اور استبداد کو اپنے جذبات و احساسات سمیت جس انداز میں دوسروں تک پہنچاتا ہے اس کو اسلوب کہا جاتا ہے۔

اسلوب کے لیے رنگِ بیاں، انداز بیاں، انداز اور طرز بیاں کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ انگریزی میں اسے style اور عربی و فارسی میں اس کے لیے لفظ سَبک آتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں۔

''لفظ اسلوب انگریزی کے لفظ style سے مترادف ہے۔ یونانی میں stylos اور لاطینی میں اسٹائلش اسلوب کا ہم معنی ہے اور ہندی میں اس کو شیلی کہتے ہیں اور اسی طرح عربی اور جدید فارسی زبان میں اسلوب کے لیے سبک استعمال ہوتا ہے۔ اصل میں یہ عربی لفظ ہے۔ سَبَک یَسبَک (ضَرَب، یضرِبُ) کے وزن پر جس کے لغوی معنی ہیں دھات کو پگھلانا، اور سانچے میں ڈھالنا وغیرہ:'' (۲۰۴)

آکسفورڈ اردو انگلش ڈکشنری میں اسلوب کے مفہوم کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

۱۔ ''مومی تختوں پر کھرچ کھرچ کر لکھنے کا ایک قدیم زمانے کا نوک دار قلم جس کا ایک رخ حروف کو مٹانے کے لیے چپٹا ہوتا تھا یا کندہ کاری میں اس سے ملتا جلتا انداز۔ ۲۔ کسی خاص وضع میں بنانا، تشکیل دینا خصوصاً نفاست کے ساتھ یا پسندیدہ چلن کے مطابق (۲۰۵)

لغاتِ کستوری میں اسلوب کے معنی طریق، طور، راہ درج ہیں (۲۰۶)

رافع اللغات میں اس کی تعریف یوں درج ہے۔

اسلوب (ع / مذکر مؤنث) انداز، ڈھنگ، طور طرز، سلیقہ، طرز تحریر، اسٹائل، راہ صورت (۲۰۷)

نور اللغات میں اس کا مفہوم یوں درج کیا گیا ہے۔

اسلوب (ع۔ بالضم) مذکر، راہ، صورت، طور، طرز، روش، طریقہ، اسلوب بندھنا، لازم صورت پیدا ہونا۔

پہنچا جس وقت سے تیرا مکتوب
زندگی کا بندھا ہے کچھ اسلوب (۲۰۸)

چیمبر ڈکشنری میں اس کے معنی یہ درج ہیں۔

"Style a literary composition, manner of writing, mode of expressing thought in language or of expressions, execution, action, or bearing generally. The distinctive manner peculiar to an auther or other particular custom or form observed, as by a painting house in optional matters (style of the house) or by lawyers in drawing up deeds. Designation a manner 'form' fashion, an air of fashion or consequence kind of type in Botany, (in science) the slender of the gynaeceum, bearing the stigma, the gnomen of a dial, a hand painters.(209)

ڈکشنری آف ورلڈ لٹریری ٹرم میں اس کی یوں تعریف کی گئی ہے۔

"Style in (L) stilus an instrument used to write with upon waxed tablets. He who manipulated this instrument firmly and incisively to make a clear, shar impresion was deemed praise worthy (stilus exitelue) his opposite, worthy of blame.(210)

اصطلاح میں اسلوب کسی ادیب کے انفرادی انداز بیاں یا طرز اظہار کو کہتے ہیں جو اس کی پہچان بن جائے، مشہور صحافی بفن Buffon نے کہا۔ ''The style is the man himself''

آدمی کا انداز اس لب و لہجہ میں انفرادیت پیدا کر دیتا ہے اور یہی منفرد لب و لہجہ ہی کسی تخلیق کا انشاء پرداز یا نثر نگار کا اسلوب کہلاتا ہے۔ مثلاً غالب، سرسید، میر تقی میر، سودا، اقبال، محمد حسن آزاد سودا، نذیر احمد، حالی، شبلی اور ابو الکلام آزاد کو ہم فوراً ان کے اسلوب سے پہچان

جاتے ہیں۔ میر تقی میر کی غم پسندی، غالب کی بلند خیالی، آزاد کا تہذیبی متخیّلہ، حالی کی فطری سادگی، سودا کی عیش پسندی، نذیر احمد کی مقصدیت پرستی، ابوالکلام آزاد کی پیغمبرانہ ظرافت، اقبال کی اسلامی فکر و فلسفہ کی مراجعت وغیرہ۔

منظر عباس نقوی اپنی تصنیف اسلوبیاتی مطالعے میں لکھتے ہیں۔

" اسلوب سے مراد کسی انشاء پرداز کا وہ مخصوص فنکارانہ طریقہ کار ہے جس کی مدد سے وہ اپنے خیالات واحساسات قاری تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔"(۲۱۱)

عابد علی عابد اپنی کتاب "اسلوب" میں اس کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں۔

اسلوب سے مراد کسی لکھنے والے کی وہ انفرادی طرز نگارش ہے جس کی بنا پر وہ دوسرے لکھنے والوں سے متمیز ہو جاتا ہے "(۲۱۲)

نصیر احمد خان اسلوب کے بارے میں اپنے خیال کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

"اسلوب سے مراد ایک ایسی تحریر ہے جو ہر اعتبار سے منفرد ہے جو ادیب یا شاعر کی شخصیت کی مظہر ہو جو خارجی لسانی پہلوؤں کے علاوہ فنکار کے اندازِ بیاں، اندازِ فکر اور اندازِ تخلیق کی نمائندگی کرے۔"(۲۱۳)

اسلوب میں مناسب جگہ پر درست لفظ کے استعمال کا انتخاب اہم ہے۔ ایک طرف شخصیت، عہد اور ہیئت اہم ہیں تو دوسری طرف خیال اور الفاظ کا استعمال اہم ہے۔ عابد علی عابد نے لکھا ہے کہ اسلوب دراصل فکر و معانی اور ہیئت و صورت یا ماضی ہاو پیکر کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔(۲۱۴) اسلوب میں انسان کی انفرادیت اور ذہنی افتاد کا عکس موجود ہے۔ اس بارے میں ایمرسن کا قول موجود ہے۔ کہ "A man's style in his mind voice"(۲۱۵)

ایک بہترین تحریر کا اسلوب ہیئت و فکر، انفرادیت و شخصیت کی جھلک بھی ہونی چاہیے اور ایک خاص تناسب کے ساتھ شپلے نے اسلوب کے سات عناصر گنوائے ہیں ان میں مصنف، عہد، زبان، ذریعۂ اظہار، موضوع، جغرافیائی یا علاقائی مقام قارئین یا ناظرین اور مقصد شامل ہیں۔

منظر عباس نقوی نے پانچ عناصر گنوائے ہیں ان کے نزدیک مصنف، ماحول، موضوع، مقصد اور مخاطب اہم ہیں یعنی بات کون کہہ رہا ہے کس زمانے میں کہہ رہا ہے کیا کہہ رہا ہے۔ کیوں کہہ رہا ہے اور کس سے کہہ رہا ہے۔

ایک اچھی خوبصورت شستہ اور رواں تحریر محنت لگن اور مشق سے حاصل ہو سکتی ہے لیکن اسلوب ان سے ماوراء شے جس کا تعلق منفرد شخصیت اور تخلیقی تخیل سے ہے، عابد علی عابد نے اسلوب کے تشکیلی عناصر کو درج ذیل طریقے سے بیان کیا ہے۔ اسلوب کی چار صفات ہیں جن کی تفصیل یہ ہے!

اسلوب کی اساسی صفات میں سادگی، قطعیت اور اختصار شامل ہیں۔ اسلوب کی جذباتی صفات میں زور بیاں، گداز، مزاح اور بذلہ سنجی شامل ہیں۔ اسلوب کی تخیلی صفات میں تجسیم، تخیل، مجاز، تشبیہہ، استعارہ، خیال افروزی، تصویریت شامل ہیں جبکہ اسلوب کی جمالیاتی صفات میں ترنم، اضافت اور نغمہ شامل ہے۔

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے اپنی کتاب دید و دریافت میں اسلوب کے دو بنیادی عناصر کا ذکر کیا ہے۔ یعنی خیال اور الفاظ ان میں خیال کو ترجیح حاصل ہے۔ خیال کے زیر اثر اختصار، سلاست، صفائی، اور سادگی پیدا ہوتی ہے۔ اختصار سے قوت اظہار پیدا ہوتی ہے جس سے تحریر میں پختگی، پرکاری، عکاسی اور خوش آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ پختگی سے سنجیدگی اور پرکاری سے اعتماد اور اس سے لطیف مزاح جنم لیتا ہے۔ اعتماد سے انانیت اور لطیف مزاح سے شگفتگی پیدا ہوتی ہے۔ عکاسی سے صوتی کیفیات اور خوش آہنگی سے انتخابیت پیدا ہوتی ہے۔

الفاظ کے حوالے سے خطابت زورِ بیاں اور موسیقیت پر بحث کی جاتی ہے۔

خطابت کے زور سے ترجیح، ترکیب، الفاظ کے جوڑے، استفہامِ انکاری، استفہامِ اقراری اور لف و نشر کی صفات پیدا ہوتی ہیں۔ زورِ بیاں کی ذیل میں کنایہ، استعارہ، تشبیہہ و تمثیل اور مبالغہ پیدا ہوتے ہیں جبکہ موسیقیت کے حوالے سے آہنگ وصوت، ہم مخرج حروف اور وزن کی صفات آتی ہیں۔ آہنگ وصوت شعریت کو جنم دیتے ہیں۔

بعض اوقات روز بیاں اور خطابت کے زور پر لفظوں کی بھرمار سے مدعا ختم ہو جاتا ہے۔ ابوالکلام کی ابتدائی تحریروں میں یہ ملتا ہے۔ نثار احمد فاروقی نے ابوالکلام آزاد اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کی تحریروں کے ذریعے یہ بات ثابت کی ہے۔ ابوالکلام آزاد نے ایک ہی بات کو بار بار دہرایا ہے جبکہ مولوی عبدالحق کی تحریریں سلیس اور دلنشین نثر کا ایسا عمدہ نمونہ ہیں، جو اسلوب کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ ابوالکلام کے ہاں الفاظ زیادہ ہیں اور خیال کم جبکہ مولوی عبدالحق کے ہاں مفہوم زیادہ ہے اور الفاظ کم ہیں۔ اسی طرح محمد حسین آزاد کی انشاء پردازی کا بہترین نمونہ دربار اکبری ہے اور شبلی کی رنگین بیانی شعر العجم سے عیاں ہے لیکن حافظ محمود شیرانی آزاد کی آب حیات اور شبلی کی شعر العجم میں سینکڑوں تاریخی غلطیاں تلاش کر لیتے ہیں۔ حسرت، خواجہ عابد، داؤد رہبر، میر ناصر علی، مہدی افادی اور سجاد انصاری کی بعض تحریریں خوش آہنگ اسلوب کی بہترین مثال ہیں۔ جو شاعری سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔

اسلوبیات کا تعلق اسلوب سے ہے اس میں اسلوب کا مطالعہ لسانی حوالے سے کیا جاتا ہے اور اس کے لسانی خصائص کی وضاحت کی جاتی ہے۔ اسلوبیات کی اصطلاح بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں استعمال کی جانے لگی۔ محی الدین قادری زور، پروفیسر مسعود حسین خاں، نصیر احمد خاں، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمن فاروقی، پروفیسر مغنی تبسم، پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ نے اسلوبیات کے حوالے سے کام کیا ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی اسلوبیات کی تعریف کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ:

> "اسلوبیاتی تنقید میں صرف ایک بات نئی ہے کہ اسے اسلوبیاتی کہا جا رہا ہے لفظ "اسلوبیاتی" ایک انگریزی لفظ اسٹائیلسٹکس (Stylistics) کا ترجمہ ہے۔ بہر حال اسٹائیل یا اسلوب کا مطلب طرز بیاں ہے اور جو باتیں طرز بیاں سے متعلق ہوں انہیں اسلوبیات کہا جاتا ہے۔"(۲۱۶)

پروفیسر نصیر احمد خاں، ادبی اسلوبیات کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ اسلوب کے سائنٹیفک مطالعے کو اسلوبیات کہتے ہیں۔

> اسلوبیات ادبی اظہار کی مہلت، خصائص اور عوامل کا تجزیہ کر کے اس سے بر آمد ہونے والے نتائج کو عمومی شکل دیتی ہے۔ اس طرح کسی ادیب یا شاعر نے اپنے فن پاروں میں جو زبان استعمال کی ہے اس کے لسانی خصائص یا امتیازات کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔(۲۱۷)

گوپی چند نارنگ اپنی تصنیف ادبی تنقید اور اسلوبیات میں اسلوبیات کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ:

> اسلوبیات وضاحتی لسانیات (description Linguistics inguistics) کی وہ شاخ ہے جو ادبی اظہار کی ماہیت، عوامل، اور خصائص سے بحث کرتی ہے اور لسانیات چونکہ سماجی سائنس ہے اس لیے اسلوبیات اسلوب کے مسئلے سے تاثراتی طور پر نہیں بلکہ معروضی طور پر بحث کرتی ہے۔ نسبتاً قطعیت کے ساتھ اس کا تجزیہ کرتی ہے اور مدلل سائنسی صحت کے سخت نتائج پیش کرتی ہے"(۲۱۸)

گوپی چند نارنگ نے زبان کی چار سطحیں بیان کی ہے جن سے لسانیات میں بحث کی جاتی ہے۔ ا۔ صوتیات (Phonology)۲۔ لفظیات(Morphology)۳۔ نحویات(Syntax)۴۔ معنیات(Semantics)اسلوبیاتی تجزیے میں لسانی امتیازات کو نشان زد کیا جاتا ہے اور ان کا کلی تصور شامل رہتا ہے۔ پہلا صوتیاتی سطح پر ردیف قوافی، مخدرج، طریق ادائیگی، مختلف آوازوں کے امتیازات، ان کا تناسب، اور آوازوں کی تکرار، دوسرا تشکیلاتی یا نحوی سطح۔ لفظوں اور جملوں کی ساخت۔ ان کی تشکیل و ترتیب، لفظوں، کلموں، فقروں کی اقسام اور جملوں میں لفظوں کا دروبست وغیرہ۔ تیسرا لفظی سطح پر مصنف یا تخلیق کار کی مخصوص لفظیات، ان کی قواعد کے لحاظ سے درجہ بندی، انواع،

تواتر اور ترتیب اور تراکیب و مرکبات وغیرہ۔ چوتھا بدیہی سطح پر امتیازی شکلیں مثلاً پیکر تراشی، علامت، تمثیل، کنایہ، تشبیہ، استعارہ وغیرہ پانچواں عروضی سطح پر بحر اور وزن کے حوالے سے جائزہ لیا جاتا ہے۔

جوش کے اسلوب کی خصوصیات

یادوں کی برات اپنی دلچسپی کے لحاظ سے زیادہ پڑھی جانے والی خودنوشت سوانح عمری ہے۔ اس کی وجہ جوش کا شاعرانہ تخیل ہے۔ جس کی بنا پر اس میں انشاء پردازی کے دلچسپ نمونے پائے جاتے ہیں۔ رشید حسن خان اپنے مضمون "جوش بحیثیت انشاء پرداز" میں لکھتے ہیں۔

"یادوں کی برات کو خودنوشت سوانح عمری کے لحاظ سے خواہ اعلیٰ درجے کی کتاب نہ کہا جاسکے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ دلچسپی کے لحاظ سے اردو کی بہت کم کتابیں اس کے برابر رکھی جاسکتی ہیں" (۲۱۹)

خادم حسین یادوں کی برات کے اسلوب کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

یادوں کی برات میں اختصار، سادگی، روانی، قوتِ اظہار، سنجیدگی، اعتماد، انانیت، خطابت، زور بیاں اور لسانی آہنگ جیسی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ کچھ صفات کم ہیں اور کچھ زیادہ ان کا تعلق ادیب کی تخلیقی قوت اور اس کے تخیل کے ساتھ ہے۔ جوش ایک شاعر ہیں اور شاعرانہ نثر ان کے ہاں زیادہ پائی جاتی ہے۔ لفظوں کا انتخاب، تشبیہہ، استعارہ کا استعمال اور قافیہ بندی کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ ایجاز و اختصار اور جزئیات نگاری کے عمدہ نمونے ان کی اس کتاب (یادوں کی برات) میں ملتے ہیں۔ (۲۲۰)

ہر فرد ایک مخصوص لسانی مزاج کا حامل ہوتا ہے۔ لسانی مزاج کی تخلیقی اور فنکارانہ صورت اس کا ادبی ارتقاء ہے۔ یہی ارتقاء کسی بھی ادیب کو صاحب اسلوب بناتا ہے۔ جوش کا اسلوب دل کش، رنگین، مرصع اور آراستہ اسلوب ہے۔ لفظوں کی گھن گرج، زبان کا تاثراتی اور جمالیاتی استعمال اپنی بلندیوں پر نظر آتا ہے۔ جوش کو الفاظ پر زبردست عبور حاصل ہے۔ عربی اور فارسی الفاظ و تراکیب کے استعمال نے رنگینی و رعنائی اضافہ کیا ہے۔ زبان کے اسلوبیاتی جائزے کے ذریعے جوش کے ہاں صوتی، نحوی اور معنیاتی سطح پر بڑے اچھے نمونے ملتے ہیں۔

۱: صوتی تجزیہ

جوش کے اسلوب کی ایک نمایاں خصوصیت صوتی رمزیت (یعنی Sound Symbolim) ہے جس میں الفاظ کی صوتی ساخت اور صوتی دروبست سے ان کے معنی کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً

"اگر یہ گھر میں موجود ہو تو پھر مفلسی، مایوسی، محرومی، معذوری، مجبوری اور موت تک آپ کا دروازہ نہیں کھٹکھٹا سکتی۔

اس جملے میں م کی آواز چھ بار استعمال ہوئی ہے۔ مفلسی، مایوسی، محرومی، معذوری اور مجبوری کا نہ ہونا ثروت مندی اور عیش و نشاط کے مفہوم کو واضح کرتا ہے۔

اناروں کی رنگین اور طلسمی جگمگاہٹوں کے ساتھ ساتھ شائیں شائیں، غائیں غائیں، غوں غوں، سرسر، سراٹ، دھم دھم، دھماک، تڑتڑ، تڑاق، اور شرشر، شراق سے دور تک ایک قیامت خیز ہنگامہ برپا ہو جایا کرتا تھا۔" (۲۲۱)

یہاں پر ش، س اور غ جیسی صفیری (Fracative) آواز سے ماحول میں شور و غل کی عکاسی کی گئی ہے۔

جوش کی تحریروں میں تجنیس صوتی (Alliteration) کی مثالیں بھی بکثرت پائی جاتی ہیں۔ اس میں کسی جملے یا فقرے کے دو یا دو سے زیادہ قریب الواقع الفاظ ایک ہی آواز سے شروع ہوتے ہیں۔

"سوسائٹی بھی کتنی شقاوت آمیز شرارت کا نام ہے۔ (۲۲۲)

"تعمیری کاروبار صرف تکملۂ تخریب کے بعد ہی نہیں بلکہ کامیاب تخریب کے بعد شروع ہوتا ہے" (۲۲۳)

میرے ایمان میں اس طرح تنزل ہونے لگا جس طرح رات کی تیر گی، منھ اندھیرے کی روشنی میں آہستہ آہستہ کم ہوتی چلی جاتی ہے۔(۲۲۴)

۲:　　لفظیات

جوش کے اسلوب نثر کی ایک نمایاں صفت جملوں اور فقروں میں قافیے کا التزام ہے۔ ان کی نثر مقفیٰ ہوتی ہے یادوں کی برات مقالات اور خطوط اس کی مثال ہیں۔

"اُف وہ سولہ سترہ برس کا سن، وہ جوانی کی راتیں، مرادوں کے دن، وہ چھلہ سی کمر، وہ صراحی دار گردن، وہ کسمساتا بدن، کُھدبداتا جوبن، وہ سینے کا پاپی ابھار، وہ ریشمی پلو کی سطح ناہموار، وہ جلد کے نیچے سے چھنتا اور چہکتا ہوا گلابی رنگ، وہ ستوان ناک، سجل نقشہ، وہ دمکتی پیشانی پر وہ بولتا قشقہ (۲۲۵)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں

"خط ملا، نسیم کا جھونکا آیا، ذہن کی شاخوں کو لچکایا اور غنچۂ خاطر کو چٹکایا۔ جزائے خیر دے اللہ آپ کو"(۲۲۶)

۳۔　　نحوی تجزیہ

(الف)عکس ترتیب یاتقلیب:　　نحوی تجزیے میں سب سے پہلے عکس ترتیب یا تعلیب (Inversion) ۔ اردو جملے میں الفاظ بااعتبار فاعل / مفعول / فعل ترتیب دیئے جاتے ہیں مثلاً علی / فائل / پانی / مفعول پیتا ہے / فعل ہے۔ چامسکی کے نظریۂ نحو کے مطابق کسی جملے کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ فقرہ اسمیہ (Noun Phrase) اور فقرہ فعلیہ (Verb phrase) مثلاً اچھا لڑکا (فقرہ اسمیہ) اخبار پڑھتا ہے۔ (فقرۂ فعلیہ یہ ترتیب کا ایک خاص انداز ہے اور اس انداز سے ہٹ کر یا انحراف کر کے جو ترتیب مقرر کی جائے اس کو عکس ترتیب یا تقلیب کہتے ہیں۔

اس کا یہ اثر ہوا کہ میرا درد، میرے سر سے منتقل ہو کر دوڑنے لگا۔ میری پور پور میں"(۲۲۷)

"میرے کراچی آنے کے بعد آپ نے ایک سطر بھی نہیں لکھی۔ مجھ کو مبارک ہو یہ سرد مہری یہ طوطا چشمی"(۲۲۸)

(ب)ساختی متوازیت:　　جوش کے ہاں ساختی متوازیت کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ (Contractional parallelisim) کے نمونے وہاں پائے جاتے ہیں جب دو یا دو سے زیادہ جملے یا جملے کے قریب الواقع اجزا نحوی ساخت کے اعتبار سے متوازی Parallel ہوں۔ یعنی ان میں نحوی مماثلت یا مطابقت پائی جاتی ہو۔ ساختی متوازیت میں عام طور پر الفاظ اور حروف (حروفِ عطف، حرف ربط وغیرہ) کی تکرار پائی جاتی ہے لیکن خالص ساختی متوازیت کا انحصار ان چیزوں پر نہیں ہوتا بلکہ جملوں یا فقروں کے نحوی سانچوں اور شکلوں کی تکرار پر ہوتا ہے۔ ساختی متوازیت جزوی بھی ہوسکتی ہے اور کلی بھی۔ کل ساختی متوازیت کو توازن "Balance" بھی کہتے ہیں۔

دن ہے نہ رات، اندھیرا ہے نہ اجالا، اندھیرے میں اجالا، اجالے میں اندھیرا، صباحت میں ملاحت، علامت میں صباحت"(۲۲۹)

اپنی بیٹی کو ایک خط میں لکھتے ہیں

"میری بشاشتوں، میری سرور طلبیوں اور میرے قہقہوں سے دھوکہ نہ کھاؤ، بیٹی میں اندر سے اس قدر زخمی ہوں، جس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا"(۲۳۰)

(ج)　　تکرار

تکرار زبان میں جذباتی طرز پیدا کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے اس کا استعمال جذباتی کیفیات میں زیادہ ہوتا ہے۔ متکلم کی جذباتی کیفیت کا اندازہ تکرارِ الفاظ سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ جذباتی حالت میں لفظوں کے اتار چڑھاؤ، جملوں اور فقروں کی ترتیب ادائیگی اور گفتگو کے عام انداز

اور لب ولہجہ میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ الفاظ، تراکیب اور جملوں کی تکرار جذباتی تاثر کی شدت کو بڑھاتے ہیں۔ علاوہ ازیں غصہ، عمل کی یکسانیت، تھکن، بے زاری اور مایوسی کا اظہار بھی تکرار الفاظ کے ذریعے بخوبی ہوتا ہے۔

"ہتنی کی بار بار بڑھتی ہوئی سونڈ میں ٹوٹتے گنوں کی چٹاخ چٹاخ سننا، کورے پنڈوں کی کچی کچی لپٹوں میں جھومتا اور پیتل کی جھلکتی، چھلکتی گاگروں کے نیچے صراحی دار گردنوں اور پتلی پتلی کمروں کی لچک دیکھتا" (۲۳۱)

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ سرکار آج تشریف لائیں گی، آنکھوں کو مکھڑا دکھائیں گی، ہونٹوں کو آب حیات پلائیں گی اور حیف صد حیف کہ لاہور چلی جائیں گی۔ (۲۳۲)

(د) شماریت (Enumeration)

جوش ملیح آبادی کے اسلوب کی ایک خصوصیت شماریت بھی ہے۔ یہ طرز بیاں کا ایک انداز ہے جس میں مختلف اشیاء یا افعال کا نام ایک ایک کر کے گنوایا جاتا ہے جس کے ذریعے سے ایک زنجیر سی بن جاتی ہے اور اس سے جملے کی نحوی ترتیب میں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا ہے اور جن چیزوں کا نام یا ذکر کیا جاتا ہے وہ عموماً ایک ہی صنف یا قبیل سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے درمیان ایک طرح کا معنیاتی ربط پایا جاتا ہے اور اس طرح کے بیان کسی بھی طرح کے تسلسل بیان کو مجروح نہیں ہونے دیتے۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"مصنوعی مکان، مصنوعی لباس، مصنوعی غذا، مصنوعی پانی، مصنوعی روشنی اور مصنوعی ہوا نے اس طرح ہمارا محاصرہ کر لیا ہے کہ ہم فطرت کا تصور نہیں کر سکتے، ہمارا اٹھنا، ہمارا بیٹھنا، چلنا پھرنا، ملنا جلنا، کھانا پینا غرض زندگی کا ہر کام اس قدر بناوٹی اور غیر فطری ہو گیا ہے۔" (۲۳۳)

جوش کے ہاں خالص اسماء اور افعال کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔

(ہ) تضاد (Antithesis)

جوش ملیح آبادی تمام اشیاء یا مظاہر کو ایک منفرد انداز میں بیان کرنے کے لیے دوسری اشیاء میں یا مظاہر میں مماثلت یا تناسب کے علاوہ ان میں تضاد کو بھی پیش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں منطقی تضاد اور اسلوبیاتی تضاد کے نمونے ملتے ہیں۔ منطقی تضاد کسی بھی طرح کے دو لفظوں میں جو ایک دوسرے کی ضد ہوں، دیکھا جا سکتا ہے اور انہیں قواعد میں متضاد الفاظ (Antonyms) کہا جاتا ہے۔ مثلاً خیر و شر، نیک و بد، صبح و شام، شام و سحر، لیل و نہار، زمین و آسمان وغیرہ لیکن اسلوبیاتی تضاد صرف متضاد الفاظ کے استعمال سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ یہ ان کے استعمال میں جدت سے پیدا ہوتا ہے اور اس کا ایک مقصد دو چیزوں میں تقابل بھی ہے۔ جوش کی نثر میں سب تضاد کی مثالیں درج ذیل ہیں۔

"گدا سے لے کر شاہ تک اور خرابات سے لے کر خانقاہ تک، دنیا کے ہر سر اور ہر در پر موت کا خونی گدھ منڈلا رہا ہے۔" (۲۳۴)

ایک اور جگہ رقمطراز ہیں

"شائق صاحب اسما "غلط اور مزاجا" صحیح، مولانا زکریا صاحب بظاہر معمر و طبعاً معصوم اور جوش ملیح آبادی جسمانی زندہ و روحانی مردہ" (۲۳۵)

ذھین شاہ تاجی کو ایک جگہ لکھتے ہیں

آپ پانی بھری بوتلوں پر دم فرماتے ہیں، میں آگ بھرے ساغروں پر دم دیتا ہوں" (۲۳۶)

اگر ہم اس جملے پر غور کریں تو تقریباً اس متوازی ساختے میں ہر لفظ دوسرے کا متضاد ہے اور ہر لفظ ایک تضاد کو واضح کر رہا ہے۔

آپ... میں

پانی بھری بوتلوں... آگ بھرے ساغروں

دم فرماتے ہیں... دم دیتا ہوں

یہاں ہر متوازی ساخت ایک اسلوبیاتی تضاد کی عمدہ مثال ہے۔

۴۔ معنیاتی تجزیہ

جب کلام کرنے کے لیے لفظوں کا انتخاب کیا جاتا ہے تو انہیں آپس میں جوڑنا اور ترکیب دینا بھی پڑتا ہے۔ لیکن یہ عمل اتنا آسان نہیں کیونکہ ہر لفظ کو دوسرے لفظ کے ساتھ ترکیب دیتے وقت متکلم پر بہت ذمہ داریاں اور پابندیاں عائد ہوتی ہیں مثلاً ہمارا لسانی شعور یہ کہتا ہے کہ ''لمبی لڑکی''، ''اونچا گھر'' یا ''کالی قمیض'' بالکل درست تراکیب ہیں، اس کے برعکس اگر ہم ''لمبا گھر''، ''اونچی لڑکی'' یا ''کالا قمیض'' کہیں گے تو ہم لسانی نارم (Norm) کا انحراف کریں گے۔ ضابطے اور پابندیاں ہمیں معنیاتی اعتبار سے دو بے میل (Incompitable) الفاظ یا کلموں کو باہم ترکیب دینے سے روکتی ہیں۔ لیکن ادیب اور خصوصاً شعراء کے ہاں اس قسم کے انحراف کو پسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔ اظہار کی جدت، انوکھے پیرایۂ اظہار، الفاظ کے نئے تلازمات اور نئے لسانی سانچوں کی تشکیل سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہی چیزیں مصنف یا شاعر کے اسلوب کے انفرادیت کی ضامن قرار پاتی ہیں۔ جوش نے نثر میں انتخابی ضابطوں سے انحراف کر کے ان کے اندر شعر جیسی دلکشی پیدا کر دی ہے۔

''وہ غیور بڑی بی، جب کانپتے ہاتھوں سے دعائیں دے کر دور چلی گئیں تو میرے ایمان کی پنڈلیاں کانپنے لگیں۔'' (۲۳۷)

''آفتاب غروب ہوتے ہی ان کی انجمن میں صبح طالع ہو جاتی اور پیمانوں سے کرنیں پھوٹنے لگتی ہیں'' (۲۳۸)

۱۹: جوش کی نثر نگاری

جوش کی نثر نگاری کے بارے میں مختلف ادیبوں اور شاعروں نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ کچھ نے جوش کی نثر کی تعریف کی ہے اور کچھ نے تنقیص۔ پہلے ہم جوش کی نثر کی خوبیوں کے بارے میں مختلف لوگوں کی رائے کا جائزہ لیتے ہیں۔ خلیق انجم لکھتے ہیں کہ:

> ''اگر جوش شاعر نہ ہوتے اور صرف نثر لکھتے تب بھی اردو کے صف اول کے نثر نگاروں اور انشاء پردازوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جوش کو زبان پر جو قدرت حاصل تھی وہ میر انیس کے بعد صحیح معنوں میں جوش ہی کو نصیب ہوئی تھی۔ زبان و بیان پر یہ قدرت شاعری میں ہی نہیں نثر میں بھی اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔'' (۲۳۹)

جوش کی بعض تحریروں کے حصے اور کچھ مکاتیب کے حصے ادب لطیف کے ذمرے میں آتے ہیں۔ جوش فطری نثر کے مرقع پیش کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں تصنع اور تکلف نہیں ہوتا ہے۔ ان کا لہجہ توانا اور متاثر کن ہے۔ بعض تحریریں، دیکھ کر نثری نظم کا گمان گزرتا ہے۔ جوش کی بعض تحریری شگفتہ اور بعض سنجیدہ نثر کی عکاس ہیں اور کچھ میں طنز و مزاح کی فراوانی ہے۔ خطابیہ اندازِ بیاں نے جوش کے انداز میں کچھ تلخی اور آہنگ و تیزی بھر دی ہے۔ جوش کی بعض تحریریں نثر میں نظم کا آہنگ لیے ہوئے ہیں۔ وہ بابا ذہین شاہ تاجی اور اپنا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''کچھ ٹک ہے، جناب والا! مجھ رندِ خراباتی اور حضرت ذہین شاہ تاجی کے درمیان ارتباط و اختلاط کا، وہ غیب ہیں، میں شہود، وہ ذکر ہیں، میں فکر، وہ معتقدِ الہام میں منکرِ پیغام، وہ درود، میں عود وہ حرم، میں بیت الصنم، وہ محو نالۂ صباحی، میں غرقِ دجلۂ صراحی، وہ نقیب لا الہٰ میں خطیبِ منبرِ گناہ... وہ تصوف کی سہانی چاندنی میں مقامات معنوی کا درس دے رہے ہیں اور میں تجسس کی کڑی دھوپ میں کھڑا آواز دے رہا ہوں'' (۲۴۰)

جوش تشبیہ و استعارہ اور ذخیرۂ الفاظ و معنی کے ذریعے اردو ادب کا دامن بھر گئے۔ انہوں نے اپنی اٹھاسی برس کی عمر میں زبان شعر و ادب کو الفاظ و تراکیب کا گراں قدر خزانہ دیا۔ تبسم اخلاق ملیح آبادی اپنے مضمون "ماضی کا گودام" میں جوش پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

"جوش نے صرف اپنی شاعری میں اپنے قلم سے تلوار کا کام لیا بلکہ اپنی ۸۴ برس کی عمر تک کا وقت (۲۴۱) اردو زبان شعر و ادب کو بیش بہا تشبیہات و استعارات اور ذخیرۂ الفاظ و معنی کا بیش بہا خزانہ اردو ادب کی تجوریاں بھرنے میں صرف کر دیا۔ اب اردو زبان کسی بھی دوسری زبان کے مقابلے میں سر فخر سے بلند کر کے چل سکتی ہے۔ جوش نے دنیائے اردو کو اپنی پوری عمر صرف کر کے ۲۴ مجموعہ ہائے کلام اور خود نوشت سوانح عمری "یادوں کی برات" تحفے میں دی (۲۴۲)

جوش تشبیہات و استعارات کی زبان میں بڑے سے بڑے نکتے کو بہت عمدگی سے بیان کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔ شوکت الفاظ اور حشمت تراکیب ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں لیکن مقفیٰ عبارت کی وجہ سے قاری قافیے کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگتا ہے۔ جوش نے نثر نگاری میں طوالت پسندی سے جو جادو جگایا ہے وہ پُر تکلف انداز کے باوجود بُرا نہیں لگتا۔ دراصل اس کی وجہ جوش کا صاحبِ طرز انشاء پرداز کا سا انداز ہے۔ روحِ ادب اور "یادوں کی برات" میں جوش کے ہاں یہی انداز ابھر کر سامنے آیا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین "یادوں کی برات" کو جوش کی بہترین تصنیف قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"صرف اس کتاب کی وجہ سے جوش کو اردو کے صفِ اوّل کے انشاء پردازوں میں وجہی، امن، سرور، محمد حسین آزاد، سرشار، ابوالکلام، نیاز اور رشید احمد صدیقی وغیرہ کے ساتھ جگہ دی جائے گی۔ (۲۴۳)

جوش کی رنگینیٔ خیال نے نہ صرف ان کی شاعری میں رنگینی پیدا کی بلکہ ان کی نثر میں بھی اتنی رنگینی بھر دی کہ نثر کو شاعری بنا دیا۔ بات کو سیدھے سادے انداز میں کرنے کی بجائے نئی نئی تراکیب، تشبیہات و استعارات اور قافیے کی مدد سے اسلوب میں رعنائی اور رنگینی پیدا کر دیتے تھے۔ ڈاکٹر فضل امام جوش کی اسی قافیہ پیمائی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"جوش عموماً مقفیٰ زبان لکھتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعری ان کی رگ رگ میں رچ بس گئی ہے۔ ان کی بیشتر تحریریں ایسی ہیں جو قافیہ پیمائی کا اعلیٰ نمونہ کہی جا سکتی ہیں۔" (۲۴۴)

کوئی بھی ادیب یا شاعر اپنے دور میں رونما ہونے والے انقلابات و تغیرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جوش کی نثر میں اس کے عہد کے سیاسی، تہذیبی، ادبی، مذہبی اور سماجی انقلاب و تغیر کی واضح جھلک ملتی ہے۔ وہ نہ صرف اپنے دور کے تغیرات سے اثرات قبول کرتے ہیں بلکہ وہ اپنے پڑھنے والوں کو بھی اس تجربے میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ ادبی اور جمالیاتی قدروں پر جوش کا بہت جچا تُلا اندازِ نظر تھا۔ سیاسی معاملات پر انہوں نے نظمیں لکھیں اور اپنے مضامین میں انہوں نے تاریخی و سماجی شعور کا بڑا منطقی انداز میں تجزیہ پیش کیا ہے۔ واقعات کی پیشکش میں جزئیات نگاری سے کام لے کر بہترین مرقع کشی کی ہے۔ نزہت عباسی لکھتی ہیں۔

"ہر جگہ نثر میں ایک جوش اور طنطنے کا احساس ہوتا ہے۔ ایک ایک واقعے کی جزئیات کو اس طرح بیان کرتے کہ پورا مرقع کھل جاتا ہے۔ مذہب کی مخالفت اور اپنے ملحدانہ خیالات کے اظہار میں انہوں نے جس منطق یا استدلال کا سہارا لیا وہ ان کی اپنی اخذ کردہ تھیں اور ان صحبتوں میں چھیڑ چھاڑ و فقرہ بازی، پھبتی اور طعن ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا" (۲۴۵)

عام محفلوں میں جوش خود کو لیے دیئے رکھتے تھے۔ مگر بے تکلف محفلوں اور دوستوں کے سامنے جوش کھل جاتے تھے۔ چھیڑ چھاڑ اور فقرے بازی چلتی رہتی تھی۔ "یادوں کی برات" میں جوش نے انہی محفلوں کی شرارتوں کا کچھ احوال رقم کیا ہے۔ "روح ادب" کے صفحات کے علاوہ "مقالاتِ زریں" "اشارات" اور "یادوں کی برات" میں جوش کی نثری مہارت عیاں ہے۔ روح ادب کا نثری حصہ شاعرانہ نثر کی خوبی

سے عبارت ہے لیکن اشارات کے بیشتر مضامین اسلوب کے اس رنگ سے محروم ہیں کیونکہ اشارات ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف النوع موضوعات پر کلیم کی زینت بنتے ہیں۔ بعض مضامین میں تضحیک و تمسخر کا انداز ہے اور بعض میں تند و تیز تنقید بھی۔ بعض مضامین میں سیاست اور مذہب کو آڑے ہاتھوں لیا ہے اور بعض میں ادباء پر تنقید کی گئی ہے۔ جوش کا شاعرانہ تخیل رومانی فضا میں مسکراتا دکھائی دیتا ہے۔ جس پر ان کا حسین اسلوب جادو کر دیتا ہے۔ ٹیگور اور دیگر رومانی مصنفین کا اثر جوش کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ مناظرِ فطرت اور حسن و عشق کا بیان ابتدائی دور کی نثر میں دکھائی دیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ الفاظ ہاتھ باندھے جوش کے سامنے کھڑے رہتے تھے کیونکہ ایک مفہوم کو واضح کرنے کے لیے ان کا قلم جس طرح لکھتا چلا جاتا تھا اُس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ الفاظ کے انتخاب اور موقع محل کے مطابق استعمال میں کسی قدر مہارت نے عبارت کے صوتی آہنگ کو بڑھا دیا ہے۔ رشید حسن خاں جوش کی "یادوں کی برات" پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"جب میں نے پہلی بار اس کتاب کو پڑھا تھا تو بہت سے مقامات پر یہ محسوس ہوا تھا جیسے پہلے پہل یہ بات معلوم ہو رہی ہو کہ ہماری زبان میں الفاظ کا اس قدر ذخیرہ ہے اس میں ایسے ایسے لفظ ہیں۔ کمال کی یہ بات ہے کہ کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہاں لفظ ٹھونسے گئے ہیں یا یہ کہ کوشش کر کے ان کو کھپایا گیا ہے، یا پیوند کاری کی گئی ہے۔ مقابلہ مقصود نہیں صرف ادائے مفہوم کے لیے عرض کروں کہ مولانا آزاد کی نثر پڑھتے وقت بہت سے مقامات پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اشعار کی پیوند کاری کی گئی ہے۔ 'غبار خاطر' میں تو کثرت اشعار نے جگہ جگہ نثر کو چھلنی کر دیا ہے۔ کئی جگہ صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ کوئی عمدہ شعر یاد آ گیا اور پھر اس کو کھپانے کے لیے عبادت آرائی کی گئی ہے۔ جوش کی نثر میں یہ خامی نہیں لکھنے والا بلا تکلف لکھتا چلا گیا ہے۔ یہ نہیں ہوا کہ پہلے لفظوں کا پرا جمایا، پھر ان کو گن گن کر نکالا اور ادھر ادھر ٹانک دیا۔(۲۴۶)

جوش کی نثر میں آہنگ ساز لفظوں کا جو انداز ہے اس میں صوتی رابطہ اور تصویر کشی ہے۔ پیرایۂ اظہار غیر معمولی ہے۔ جزئیات نگاری نے واقعات کو غیر معمولی رنگ دیا ہے۔ جوش کی شاعری میں لفظوں کی کثرت، تشبیہات اور استعارات کا بے دریغ استعمال شاعری کے لیے نقصان کا باعث ہوا لیکن نثر میں یہی استعمال مفید ثابت ہوا۔ جوش نے اپنی نثر کو فلسفیانہ افکار اور نفسیاتی الجھاؤ کا گورکھ دھندہ بنانے کی بجائے عام بول چال کی زبان بنایا۔ لفظوں کو اس طرح برتا کہ ان کی رنگینی میں جوش کی شخصیت کی رنگینی و رعنائی سمائی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے بے جان لفظوں میں زندگی کی روح پھونک دی۔ انہوں نے کرداروں کے لحاظ سے گفتگو پیش کر کے حقیقی زندگی کے مرقعے کھینچ دیئے۔ جوش نے اودھی زبان میں اپنی مہارت دکھائی اور گھریلو ملازمین کی گفتگو پیش کی۔ فضل امام جوش کی تراکیب سازی میں ایمائیت اور رمزیت کو ان کی نثر نگاری کا ایک امتیاز قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"جوش لفظوں سے بہشت زار اور جہنم زار بنانے کا فن بخوبی جانتے ہیں۔ نئے نئے الفاظ اور نئی نئی تراکیب میں ایمائیت اور رمزی علامتوں کا رنگ بھر دینا ان کی نثر نگاری کا امتیاز ہے۔ اودھی زبان کے مقامی الفاظ بھی ان کے ہاں گہری معنویت کے حامل ہیں۔ ان لفظوں کا سیاق و سباق سمجھے بغیر خاص لطف نہیں آ سکتا مگر ان کو اس طرح سے استعمال کیا ہے کہ نہ جاننے والا بھی محل استعمال سے لطف اندوز ہو جاتا ہے۔"(۲۴۷)

جوش قومی درد سے معمور تھے اور اسی درد کی وجہ سے جوش خطابت میں سخت لہجہ اور طنز و تعریض پر بھی اتر آتے تھے۔ ان کا آتشیں لہجہ، اور الفاظ کی گرج چمک محض مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگانے اور بالخصوص ہندوستانی باشندوں میں غیرت و حمیّت پیدا کرنے کے لیے تھی۔ عبدالماجد دریا آبادی جوش کے رسالے کلیم اور جوش پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے رسالے صدق (لکھنؤ) ۱۱ مارچ ۱۹۳۶ء کی اشاعت میں لکھتے ہیں۔

"یہ جوش وخروش، غیظ وغضب اگر محض تخلص کی مناسبت سے ہے اور یہ گرج اور چمک اور یہ ہوشربا تجلیات، آتشیں اور سب سے بڑھ کر بقول ایک صاحب کے لن ترانیاں اگر اسم کلیم کی شاعرانہ رعایت سے ہیں تو اس حسن ادا کی داد نہ دینا ظلم ہے لیکن اس کے سوا کوئی اور صنعت ملحوظ رکھی گئی ہے تو اتنا رسا دماغ کوئی کہاں سے لائے...

...خود جوش صاحب بھی تو بہت اچھے ادیب بن سکتے ہیں۔ اگر چاہیں۔(۲۴۸)

جوش زندگی کے منفی رویوں پر جب قلم اٹھاتے ہیں تو ان کے ہاں طنز کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے وہ اپنے طنز سے اصلاح کا کام لینا چاہتے ہیں اور اسی کیفیت کے زیر اثر بعض اوقات شدت جذبات میں ان کا لہجہ تلخ ہو جاتا ہے۔ یہی تلخ نوائی دیرپا اثرات کی حامل دکھائی نہیں دیتی اور زندگی کی لطافت اور اثر آفرینی اس کی دبیز تہہ تلے کہیں کھو جاتی ہے۔ وقتی جوش وولولے سے بھرپور طنزیہ انداز قاری پر ایک نشہ طاری کرتا ہے لیکن جب نشہ اترتا ہے تو وہ حقیقت کی سنگلاخ وادیوں میں پڑا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی اس بارے میں لکھتے ہیں

"جوش ملیح آبادی کے ہاں طنز کی شدت ہے اور وہ زندگی کے منفی رویوں کے خلاف قلم اٹھاتے ہیں۔ ان کے ہاں جوش ہے مگر لطافت اور گہرائی کم ہے"(۲۴۹)

جوش کی نثر کی رنگین بیانی نے ان کی نثر کو شاعری سے قریب کر دیا۔ نثر میں بھی انہوں نے شاعری کی روش اپنائے رکھی۔ سکھ چین سنگھ ٹھاکر ان کی نثر کی خوبی یوں بیان کرتے ہیں۔

"رنگین بیانی جوش کی نثر کی بنیادی چیز ہے... وہ کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زبان استعمال کرتے ہیں۔(۲۵۰) خیالات کو سیدھے سادے انداز میں پیش کرنے کے قائل نہیں ہیں بلکہ گھما پھرا کر اور بندش الفاظ کو نگوں کی طرح جڑ کر اس طرح پیش کرتے ہیں جیسے کوئی نئی نویلی دلہن خرام کر رہی ہو"(۲۵۱)

سید حامد حسین جوش کی زبان کے بارے میں اپنی رائے یوں ظاہر کرتے ہیں۔

"جوش زبان کے بادشاہ ہیں۔ ان کے دربار میں الفاظ کے پرے کے پرے صف بستہ نظر آتے ہیں۔ ان میں فارسی الفاظ بھی ہیں اور ہندی بھی"(۲۵۲)

ڈاکٹر سہیل آغا جوش کی تعریف یوں کرتے ہیں۔

"ہر چند کہ محض لفظ کے لیے لفظ استعمال نہیں کرتے۔ نہ ذوق کی طرح روزمرہ اور محاورے پر جان چھڑکتے ہیں۔ بلکہ معانی و مفہوم کی خاطر الفاظ اور اظہار ومافی الضمیر کی ادائیگی کے لیے الفاظ کی یلغار ان کی متخیّلہ پر اس شدت سے ہوتی ہے کہ نپے تلے الفاظ چُن کر اور معانی و مفاہیم کے تعین کے بعد بقیہ لفظوں کو فوراً متخیّلہ سے خارج کر دیتے ہیں۔ یہ عمل اس قدر تیزی اور سرعت سے انجام پاتا ہے کہ عام اور معمولی شاعر کی متخیلہ اس کی پیائش تک سے عاجز و قاصر ہے۔"(۲۵۳)

انعام درانی اپنے کالم "تلخ وشیریں" میں لکھتے ہیں۔

"جوش کی زبان پر لغت بولتی تھی۔ وہ نعت گر نہ تھے۔ وہ اپنے لہجے کو سنوارتے، سنگھارتے مگر اسی حد تک کہ موجودہ لغت مجروح نہ ہونے پائے، جوش کئی لحاظ سے امر ہیں۔(۲۵۴)

جیلانی کامران لکھتے ہیں۔

"جوش کے الفاظ کا ذخیرہ ہماری کلاسیکی روایت اور ہمارے کلچر کے زمانہ ماضی کی نشاندہی کرتا ہے۔ جب لفظ کو سچائی کے طور پر قبول کیا جاتا ہے۔"(۲۵۵)

ڈاکٹر یحییٰ احمد نے اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے۔

"جوش کے ذخیرہ الفاظ کی وجہ سے انہیں لفظوں کا بادشاہ، قادر الکلام لفظوں کا حکمران اور انیسِ ثانی کہا جاتا ہے۔

انہیں مخالفت کی وجہ سے ڈکشنری کا شاعر بھی کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ لفظوں کے نباض ہیں۔ لفظ قطار در قطار ان کے حضور ہاتھ باندھ کر کھڑے رہتے ہیں۔ وہ تشکیل لفظ کرتے ہیں۔ ذخیرۂ الفاظ میں اپنے میدان کے شہسوار ہیں صرف ''یادوں کی برات کو لیجئے (فبایِّ الائِ ربکما تکذِبان) کے وزن پر چالیس الفاظ کا اندراج ہے۔''(۲۵۶)

ڈاکٹر ہلال نقوی لکھتے ہیں کہ:

''شاعری تخلیقی اظہار ہے اور نثر تعمیری اظہار جوش کی تعمیری نثر تخلیقی اظہار کے جادے پر قدم رکھتی ہوئی آگے بڑھی ہے''(۲۵۷)

رشید احمد صدیقی کی رائے بے پناہ وقعت کی حامل ہے لکھتے ہیں۔

زبان و بیان اور اظہار و ابلاغ پر آپ کو بے پناہ قدرت حاصل ہے۔ وہ نظم میں انیس اور نثر میں محمد حسین آزاد کے بعد اور ابوالکلام آزاد کے بعد شائد ہی کسی اور کے حصے میں آئی ہو''(۲۵۸)

جہاں جوش کی بہت زیادہ ستائش کی گئی ہے وہاں لوگوں نے تنقی تنقیص و تنقید بھی زیادہ کی ہے۔

اسرار الحق مجاز نے کہا کہ جوش ڈکشن کے نہیں ڈکشنری کے شاعر ہیں۔ کلیم الدین احمد نے انہیں لفظوں کے کھوکھلے ڈھول کو زور و شور سے بجانے والا شاعر قرار دیا ہے۔ نیاز فتح پوری نے جوش پر بے معنی لفاظی کا الزام عائد کرتے ہوئے جوش کو فن شعر سے نابلد قرار دیا۔ احتشام حسین نے کہا جوش صاحب صحت زبان اور انداز بیان پر توجہ کی وجہ سے موضوع کی اہمیت اور مواد کی صحت کی طرف سے بے پروائی کا شکار ہوئے ہیں۔ محمود الٰہی نے کہا کہ جوش اُس وقت تک گرجتے اور چیختے رہتے ہیں جب تک سامع یا قاری انہیں شاعر آخر الزماں تسلیم نہ کرلے۔ کمال احمد صدیقی نے کہا کہ الفاظ کی قوت جوش کی کمزوری بن گئی۔ مسعود حسین نے کہا کہ جذبے کی شدت اور تپش بے رس اور پٹے ہوئے الفاظ کے بس کی چیز نہیں ہوتی اور خطیبانہ طمطراق کی بھی متحمل نہیں ہوتی۔ وہ زیادہ دیر تخیل کے لالہ زاروں میں نہیں کھیل سکتی۔ اُن کے لفاظ کی دھمک زیادہ اور تاثیر کم ہے اور وہ اس لہجے سے مسلط ہونا چاہتے ہیں۔ عبد القادر حسن نے کہا کہ الفاظ کے بادشاہ بلکہ شہنشاہ کا ہی خزینۂ الفاظ پاکستان کے لیے بند ہی رہا۔ شاہد احمد دہلوی نے کہا قاآنی کے رنگ میں بہت سے قافیہ خوش آہنگ، زور دار الفاظ ایک جگہ جمع کر دینا زیادہ مشکل کام نہیں ہے کیونکہ اس کا تعلق شاعری سے زیادہ فرھنگ نویسی سے ہے اور ایک شاعر کا مرتبہ یقیناً فرہنگ نویس سے زیادہ بلند ہے۔ ملک راج آنند نے کہا کہ جوش کے پاس دھوم دھام بہت ہے۔ شوکت الفاظ کی فراوانی ہے۔ اگر جوش کا ترجمہ کیا جائے تو کچھ بات نہیں بنتی۔ ترجمہ کی شکل میں تو جوش کچھ رہ ہی نہیں جاتا۔ یگانہ نے کہا کہ جوش کی عادت ہے کہ وہ شاندار بھاری بھر کم الفاظ معنی و مفہوم میں اضافے کے لیے نہیں محض دکھاوے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جنہیں عبارت سے کوئی معنوی تعلق نہیں ہوتا... جوش کے مانگے ہوئے الفاظ تخیلی تجربہ نہیں بنتے۔ رشید حسن خاں نے بھی جوش پر اعتراضات کیے اور جوش کی زبان کی خامیوں کی طرف متوجہ کیا۔ نیاز فتح پوری نے کہا کہ جوش کے ہاں گالی دینے کا جذبہ گھٹ کر شاعری بن گیا ہے۔

نیاز کے رسالے ''نگار'' میں جوش سے مخالفت میں مضامین تحریر کیے گئے اور یہ سلسلہ ۱۹۳۷ء تک جاری رہا۔ ماہر القادری نے جوش کی مخالفت میں ایک دبستان بنایا۔ شاہد احمد دہلوی نے حد کر دی اور ساقی کا جوش نمبر شائع کیا۔ جوش کے خلاف مضامین اکٹھا کرنے کے لیے انہوں نے مختلف علاقوں کا دورہ کیا۔ نوائے وقت نے بھی جوش کی مخالفت میں مضامین کا سلسلہ جاری کیا۔ حفیظ جالندھری سے جو دشمنی کا رشتہ قائم ہوا وہ آخر تک جاری رہا۔

باب پنجم: حواشی و حوالہ جات

(۱) جامع اردو لغت از وارث سرہندی، لاہور، علمی کتاب خانہ ۲۰۰۵ ص ۶۶۳

(۲) Sally wehmeir, Oxford advance leasoners dictionary; Oxford Uni Press 2005, Sixth addition P 1205.

(۳) Oxford Encyclopedic Dictionary, PIP, 24, M3, Oxford University Press, 1983, P: 1586.

(۴) ہاشمی، رفیع الدین، اصنافِ ادب، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ ص ۱۷۲۔۱۷۱

(۵) صدیقی، ابوالاعجاز، کشاف تنقیدی اصطلاحات، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، س۔ن ص ۷۲

(۶) جمیل جالبی، ڈاکٹر (مرتبہ) مقدمہ مشمولہ گنجینۂ گوہر، مصنف، شاہد احمد دہلوی، کراچی، مکتبہ اسلوب ۱۵ جولائی ۱۹۱۲ء

(۷) تنویر حسین، اصنافِ ادب اردو، لاہور، اورینٹ پبلشرز ۱۹۹۳ ص ۱۲۹

(۸) انور سدید، ڈاکٹر، بر سبیل تنقید، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۰ء ص ۴۲۳

(۹) بحوالہ ضیاء الدین، ڈاکٹر، اسالیب، نثر پر ایک نظر، ادارہ فکر جدید، نئی دہلی ۱۹۸۹ ص ۱۵

(۱۰) سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، لاہور، سنگ میل، پبلی کیشنز ۲۰۰۰ء ص ۵۲۰

(۱۱) شمیم حنفی، پروفیسر آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ دہلی، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۱ء ص ۱۱

(۱۲) محمد طفیل، پاکستانی ادب شناخت کی نصف صدی، اگست ۲۰۰۰ء ص

(۱۳) تحسین فراقی، ڈاکٹر، عبد الماجد دریا آبادی، احوال و آثار، لاہور، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، طبع اول ۱۹۹۳ء ص ۴۰۴

(۱۴) محمد عباس، ڈاکٹر، اردو خاکہ نگاری میں تکنیک کے تجربات، معیار ۶، اسلام آباد، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی جولائی دسمبر ۲۰۱۱ء ص ۴۴۸

(۱۵) ہلال نقوی، ڈاکٹر قلمی نسخہ اور اس کے گمشدہ اوراق، جہلم، بک کارنر، اپریل ۲۰۱۳ء ص ۶۷

(۱۶) سحر انصاری، پروفیسر، یادوں کی برات محض دلچسپ واقعات، مشمولہ افکار، کراچی، شمارہ مارچ ۱۹۷۱ء ص ۳۸

(۱۷) علی عباس جلالپوری، جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات کے آئینے میں، مشمولہ فنون، لاہور شمارہ اپریل مئی ۱۹۷۲ء ص ۱۶

(۱۸) ڈاکٹر ہلال نقوی، قلمی نسخہ اور اس کے گمشدہ اوراق، جہلم، بک کارنر، اپریل ۲۰۱۳ء ص ۶۷

(۱۹) جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، لاہور، مکتبہ شعر و ادب، چوہدری اکیڈمی، سمن آباد، مئی ۱۹۷۵ء ص ۳۳۴

(۲۰) ہلال نقوی ڈاکٹر، قلمی نسخہ اور اس کے گمشدہ اوراق۔ ص ۱۳۷

(۲۱) ہلال نقوی ڈاکٹر، قلمی نسخہ اور اس کے گمشدہ اوراق۔ ص ۱۹۷

(۲۲) ارتقا جوش صدی نمبر کراچی، ارتقا مطبوعات، دسمبر ۱۹۹۹ء ص ۲۴۹

(۲۳) افکار سالنامہ ۱۹۶۰ء (د) کلیم ماہنامہ کلیم دہلی ۱۹۳۶ء

(۲۴) جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، لاہور، مکتبہ شعر و ادب ۱۹۷۵ء ص ۱۶۹

(۲۵) ہلال نقوی، ڈاکٹر یادوں کی برات قلمی نسخہ اور اس کے گمشدہ اوراق، ص ۱۸۱

(۲۶) جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات ص ۱۵۵

(۲۷) جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات ص ۵۰۹

(۲۸) جوش ملیح آبادی، حضرت نیاز فتح پوری، نگار پاکستان، سالنامہ ۱۹۶۳ء

(۲۹) جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، ص ۵۸۲

(۳۰) جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، ص ۶۱۳

(۳۱) جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، ص ۴۰۵

(۳۲) ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر، جوش کی خاکہ نگاری، مشمولہ جوش شناسی، یادوں کی برات نمبر، کراچی، الفاظ فاؤنڈیشن، س۔ن، ص ۲۸۶

(۳۳) رشید حسن خان، جوش ملیح آبادی کی نثر، مشمولہ آج کل، نئی دہلی، جوش نمبر اپریل ۱۹۹۵ء ص ۲۱۲

(۳۴) جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، ص ۵۴۱

(۳۵) یحییٰ احمد، ڈاکٹر، جوش شناسی، یادوں کی برات نمبر، ص ۳۰۰

(۳۶) منیر مسعود، ڈاکٹر، جوش کی خاکہ نگاری، یادوں کی برات نمبر، ص ۲۸۴

(۳۷) ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر، جوش کی خاکہ نگاری مشمولہ جوش شناسی، ص ۲۹۳

(۳۸) جمال نقوی، ڈاکٹر، خاکوں کی برات، مشمولہ جوش شناسی، ص ۳۰۸

(۳۹) بشیر سیفی، ڈاکٹر، خاکہ نگاری (فن و تنقید، لاہور، نذیر سنز پبلشر ۱۹۹۳ء ص ۱۷

(۴۰) للغاتِ نظامی، اردو، تالیف ڈاکٹر ناظر حسین زیدی، ڈاکٹر سید عبد اللہ، لاہور ۱۹۸۱ء ص ۲۱۶

(۴۱) فرہنگ کارواں، مرتبہ فضل الٰہی عارف، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۳۱۰

(۴۲) اردو لغت (تاریخی اصول پر) جلد پنجم، مدیر ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، کراچی ۱۹۷۴ء ص ۱۱

(۴۳) فرہنگ آصفیہ، جلد اوّل، مرتبہ سعید احمد دہلوی، لاہور، طبع چہارم، س۔ن، ص ۲۱۵

(۴۴) مرزا حامد بیگ، مغرب سے نثری تراجم، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸ء ص ۵

(۴۵) حاجی فخری احمد، دور تراجم مشمولہ، ترجمہ روایت اور فن، مرتب نثار احمد قریشی، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۵ء ص ۴۱

(۴۶) مظفر علی سید، فن ترجمہ کے اصولی مباحث، مشمولہ اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، مرتبہ، اعجاز راہی، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۶ء، ص ۳۳

(۴۷) سہیل احمد خان، طرزیں، لاہور، قوسین، ۱۹۸۲ء ص ۱۲

(۴۸) (Encyclopedia Americano, Vol # 27, Denbury (USA), 1992, Page # (10

(۴۹) مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، ترجمے کا فن، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۷ء ص ۱۱

(۵۰) مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، ترجمے کا فن، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۷ء

(۵۱) آغا سلیم مترجم، لوک داستانیں، لوک ورثے کا قومی ادارہ، اسلام آباد، مئی ۱۹۸۷ء مئی ۱۹۸۷ء ص

(۵۲) نثار احمد قریشی، اردو میں نثری تراجم کی روایت کا مختصر جائزہ، مشمولہ ترجمہ، روایت اور فن، مرتبہ نثار احمد قریشی، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۷۵ء ص

(۵۳) مرزا حامد بیگ، اردو زبان میں ادبی تراجم کا جائزہ، مشمولہ اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۶ء۔ ص ۱۰۱

(۵۴) ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی شخصیت اور فن ص ۱۲۶

(۵۵) ہلال نقوی، ڈاکٹر، یادوں کی برات کا قلمی نسخہ اور اُس کے گمشدہ غیر مطبوعہ اوراق جہلم بک کارنر، ۲۰۱۳ء ص ۵۷۔۳۵۶

(۵۶) سید باقر حسین، ترجمے کے اصول (مقالہ) کراچی یونیورسٹی ستمبر ۱۹۵۰ء ص

(۵۷) جوش ملیح آبادی، مسائل حیات (ترجمہ) مشمولہ کلیم، دہلی، جنوری ۱۹۳۶ء ص ۲۰

(۵۸) جوش ملیح آبادی، مسائل حیات (ترجمہ) مشمولہ کلیم، دہلی، فروری ۱۹۳۷ء، ص ۱۰۹

(۵۹) جوش ملیح آبادی، غزل مسلسل (ترجمہ) مشمولہ کلیم، دہلی، جون و جولائی ۱۹۳۷ء، ص ۱۱۵

(۶۰) سید باقر حسین، ترجمے کے اصول (مقالہ) کراچی یونیورسٹی، ستمبر ۱۹۵۰ء، ص

(۶۱) جوش ملیح آبادی، ''مسائل حیات'' ترجمہ مشمولہ کلیم، دہلی، جنوری، ص ۱۹۳۶ء، ص ۱۷

(۶۲) جوش ملیح آبادی، ''مسائل حیات'' ترجمہ مشمولہ کلیم، دہلی، فروری ۱۹۳۷ء ص ۱۰۶

(۶۳) جوش ملیح آبادی، ''مسائل حیات'' ترجمہ مشمولہ کلیم، دہلی، جنوری ۱۹۳۶ء، ص ۱۷

(۶۴) جوش ملیح آبادی، ''مسائل حیات'' ترجمہ مشمولہ کلیم، دہلی، جنوری ۱۹۳۶ء، ص ۱۷

(۶۵) جوش ملیح آبادی، ''مسائل حیات'' ترجمہ مشمولہ کلیم، دہلی، فروری ۱۹۳۷ء، ص ۱۱۱

(۶۶) جوش ملیح آبادی، "مسائل حیات" ترجمہ مشمولہ کلیم، دہلی، فروری ۱۹۳۷، ص ۱۰۷

(۶۷) فرخ جمال ملیح آبادی، جوش میرے بابا، شخص اور شاعر، اسلام آباد، یورپ اکادمی، طبع اوّل فروری ۲۰۱۰ء ص ۱۵۷۔۱۵۶

(۶۸) ہلال نقوی، ڈاکٹر جوش ملیح آبادی، شخصیت اور فن، ص ۱۲۶

(۶۹) نور الحسن نقوی، فنِ تنقید اور اردو تنقید نگاری، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۰ء ص ۷

(۷۰) آل احمد سرور، تنقید کیا ہے؟ کراچی، اردو اکیڈمی، سندھ جنوری ۱۹۵۲ء ص ۲۱۲

(۷۱) سید عبد اللہ، ڈاکٹر، اشاراتِ تنقید، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، فروری ۱۹۹۳ء ص ۲

(۷۲) محیی الدین قادری زور، ڈاکٹر، روحِ تنقید، لاہور، مکتبہ معین الادب، ۱۹۵۴ء ص ۳۹

(۷۳) کلیم الدین احمد، تنقید اور ادبی تنقید، مشمولہ تنقیدی نظریات، مرتبہ احتشام حسین، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۱۹۶۸ء ص ۸۹

(۷۴) الطاف حسین حالی، مولانا، مقدمہ شعر و شاعری، پاپولر پبلشنگ ہاؤس ۱۹۸۹ء ص ۷۷

(۷۵) جمیل جالبی، ڈاکٹر، نئی تنقید، مرتبہ خاور جمیل، کراچی، رائل بک کمپنی، بار اوّل، ۱۹۸۵ء ص ۷۴

(۷۶) بحوالہ ڈاکٹر نگیندر، تحقیق و تنقید، مترجم بدیع الزمان مشمولہ اردو میں اصول تحقیق مرتبہ ایم سلطانہ بخش، اسلام آباد، مغربی پاکستان اکیڈمی، ۱۹۹۸ء ص ۶۷

(۷۷) عبادت بریلوی، ڈاکٹر، اردو تنقید کا ارتقاء کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۹ء ص ۹

(۷۸) سید اعجاز حسین، ڈاکٹر، مختصر تاریخ ادب اردو، سندھ، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ تیسرا ایڈیشن، ۱۹۷۱ء ص ۲۱۳

(۷۹) بحوالہ لاہور رپورٹ، جوش صدی انٹرنیشنل سیمینار، بسلسلہ صد سالہ یوم پیدائش (۱۸۹۷۔۱۹۸۲ء) ارتقاء ۲۴ دسمبر ۱۹۹۹ء ص ۳۸۱

(۸۰) جمیل جالبی، ڈاکٹر تاریخ ادب اردو، جلد سوم، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۶ء ص ۸۶۹۔۸۶۸

(۸۱) شان الحق حقّی، تاثرات: خود نوشت سے چند اقتباسات، مشمولہ آج کل (جوش نمبر) دہلی، ہند، پبلی کیشنز، ڈویژن حکومت ہند، ۱۹۹۵ء ص ۲۷

(۸۲) خلیق انجم، جوش ملیح آبادی، تنقیدی جائزہ (حرفِ آغاز)، دہلی، انجمن ترقی ادب، ۱۹۹۱ء ص ۱۱

(۸۳) جوش ملیح آبادی، مقالاتِ جوش، مرتبہ سحر انصاری، لاہور، جنگ پبلی کیشنز ۱۹۹۳ء ص ۵۲

(۸۴) کلیم، دہلی، مئی ۱۹۷۳ء ص ۴۵۵۔۴۵۴

(۸۵) کلیم، دہلی، مئی ۱۹۷۳ء ص ۴۵۵

(۸۶) کلیم، ملیح آباد، مئی، جون ۱۹۳۹ء ص ۴۳۳

(۸۷) کلیم، ملیح آباد، مئی، جون ۱۹۳۹ء ص ۴۳۵

(۸۸) کلیم، دہلی، مئی ۱۹۳۷ء ص ۴۶۶

(۸۹) جوش ملیح آبادی، دیباچہ سیف و سبو، لاہور، مکتبہ اردو، س ن ص ۱۰۔۹

(۹۰) کلیم، ملیح آباد، مئی جون ۱۹۳۶، ص ۴۳۵

(۹۱) شہناز انجم، ڈاکٹر، ادبی نثر کا ارتقاء (شمالی ہند میں ۱۸۰۰ سے ۱۸۵۷ء تک)، لاہور، پروگریسو بکس، ۱۹۸۹ء ص ۳۰۷

(۹۲) (2) Encyclopedia, Americana volume 16. Denbury Grolier, incorporated, USA 1992-P.183.

(۹۳) (3) The world book encyclopedia, volume 11 USA world book inc, chicago, London, Sydney, Toronto, 1988, Page 168.

(۹۴) شہناز انجم، ڈاکٹر ادبی نثر کی تاریخ، ص ۳۰۹

(۹۵) (5) Encyclopaedia Britamica P-334-Vol-16.

(۹۶) غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، محاسن خطوط غالب، لاہور، مکتبہ خیابان ادب، بار اوّل، ۱۹۶۹ء ص ۱۸

(۹۷) انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء ص ۲۶۸

(۹۸) نادر علی خاں، اردو صحافت کی مختصر تاریخ، لاہور، بک ٹاک پبلشرز، ۲۰۱۶ء ص ۳۷

(۹۹) گوپی چند نارنگ، ادبی تنقید اور اسلوبیات، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء ص ۱۸

(۱۰۰) جمیل اختر (مرتب) اشاریہ آج کل، دہلی، اردو اکادمی، ۱۹۸۸ ص ۳۵

(۱۰۱) راحت سہیل، اردو اداریہ کا ارتقاء، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ ص ۱۶

(۱۰۲) راحت سہیل، اردو اداریہ کا ارتقاء، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ ص ۵۵

(۱۰۳) ماہنامہ "کلیم" دہلی، اکتوبر ۱۹۳۸ء ص ۲۶۲

(۱۰۴) ماہنامہ "کلیم" دہلی، اکتوبر ۱۹۳۸، ص ۲۶۲۔۲۶۱

(۱۰۵) ماہنامہ کلیم، ملیح آباد، مئی جون ۱۹۳۹ء ص ۴۷۷

(۱۰۶) ماہنامہ کلیم، دہلی، اکتوبر ۱۹۳۸ء ص ۳۶۰

(۱۰۷) ڈاکٹر ستیہ پال آنند، انٹرویو، ۱۵ نومبر ۲۰۱۵ بذریعہ انٹرنیٹ،

(۱۰۸) ماہنامہ کلیم، دہلی، مئی ۱۹۳۷ء ص ۳۹۰۔۳۸۹

(۱۰۹) ماہنامہ کلیم، ملیح آباد، مئی ۱۹۳۹، ص ۴۰۲

(۱۱۰) جوش ملیح آبادی، علم و فکر (کالم) روزنامہ جنگ، کراچی، ۳ ستمبر ۱۹۶۳ء ص ۵

(۱۱۱) شفیع عقیل، تلاش و انتخاب مشہور اہل قلم کی گمنام تحریریں، لاہور، بک ہوم، ۲۰۰۴ء ص ۳۰

(۱۱۲) جوش ملیح آبادی، "یاایہاالناس" کالم مشمولہ روزنامہ جنگ، کراچی، ۱۷ ستمبر ۱۹۶۳ء ص ۵

(۱۱۳) ہلال نقوی، ڈاکٹر، اوراق جوش، ۲۰۱۰ء ص ۱۶۱۔۱۶۰

(۱۱۴) اکبر حمیدی، جوش صاحب سے کچھ ملاقاتیں... کچھ باتیں، مشمولہ ماہِ نو، لاہور، ادارہ مطبوعات پاکستان، فروری ۲۰۰۳ء ص ۸۴

(۱۱۵) ہلال نقوی، ڈاکٹر، اوراقِ جوش، لاہور، اظہار سنز، ۲۰۱۰ء ص ۱۲۳

(۱۱۶) عام طور پر ہم لوگ "طاری" کی املاء یوں کرتے ہیں جبکہ جوش نے "تاری" لکھا ہے۔

(۱۱۷) ہلال نقوی، ڈاکٹر، اوراقِ جوش، لاہور، اظہار سنز، ۲۰۱۰ء ص ۱۲۲

(۱۱۸) جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، لاہور، مکتبہ شعر و ادب، چوہدری اکیڈمی، ۱۹۷۵ء ص ۵۵۹

(۱۱۹) ہلال نقوی، ڈاکٹر، اوراق جوش ۱۹۷۵ء ص ۱۲۴

(۱۲۰) خورشید علی خاں، ہمارے جوش صاحب، کراچی، ذیشان کتاب گھر، جنوری ۱۹۹۶ء ص ۲۸۲

(۱۲۱) راغب مراد آبادی، اقبال حیدر، مکالمات جوش و راغب، کینیڈا، جوش لٹریری سوسائٹی، البرٹا، طبع اول، جون ۱۹۸۸، ص ۱۴۱

(۱۲۲) جوش نے ض۔ انصاری لکھا ہے جبکہ مہندر سنگھ بیدی نے ظ۔ انصاری لکھا ہے۔

(۱۲۳) خلیق انجم، مرتبہ، جوش ملیح آبادی کے خطوط، نئی دہلی، بھارت، انجمن، ترقی اردو ۱۹۹۸ء ص ۲۰

(۱۲۴) کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، یادوں کا جشن، کراچی، پاک اور نٹئل پبلیکیشنز، ۱۹۹۲ء ص ۲۸۸

(۱۲۵) فرخ جمال ملیح آبادی، جوش... میرے بابا، شخص اور شاعر، اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۱۰ء ص ۱۰۳۔۱۰۲

(۱۲۶) مظہر امام، ایک لہر آئی ہوئی، دہلی، معیار پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء ص ۵۲

(۱۲۷) انوار احمد، ڈاکٹر حماد رسول، نثر جوش ایک مزّین تصنع یا آزادی فکر کی مثال، مشمولہ جرنل آف ریسرچ (اردو) فیکلٹی آف لنگویجز اینڈ اسلامک سٹڈیز، ملتان، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، جون ۲۰۱۲ شمارہ ۲۱ ص ۱۲

(۱۲۸) فرخ جمال ملیح آبادی، جوش، میرے بابا، شخص اور شاعر، ص ۱۰۳

(۱۲۹) خورشید علی خاں، ہمارے جوش صاحب، کراچی، ذیشان کتاب گھر، جنوری ۱۹۹۶ء ص ۵۶۴۔۵۶۳

(۱۳۰) خورشید علی خاں، ہمارے جوش صاحب، کراچی، ذیشان کتاب گھر، جنوری ۱۹۹۶ء ص ۵۶۵

(۱۳۱) عقیل احمد، ڈاکٹر، جوش کی شاعری کا تنقیدی تجزیہ، نئی دہلی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۳ء ص ۶۵

(۱۳۲) خورشید احمد خان، ہمارے جوش صاحب، ص ۵۷۳

(۱۳۳) حسن منظر، برداشت کا فقدان مشمولہ ارتقاء ۲۴ دسمبر ۱۹۹۹ء ص ۵۷۳

(۱۳۴) فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری، لاہور، الوقار پبلی کیشنز ۲۰۰۶ء ص ۳۱

(۱۳۵) تبسم اخلاق ملیح آبادی، جوش کی شخصیت اور شاعری کی مختلف جہتیں مشمولہ ماہِ نور، لاہور، ادارہ مطبوعات پاکستان، فروری ۲۰۰۳ ص ۹۴

(۱۳۶) خواجہ عبدالرحمن طارق، مرتب، جوش اور خامہ بگوش، کراچی، فضلی سنز، س۔ن ص ۶۶

(۱۳۷) مصطفیٰ زیدی، جوش کا ایک غیر مطبوعہ انٹرویو، مشمولہ ارتقاء ۲۴، دسمبر ۱۹۹۹ء ص ۴۶۲، ۴۵۷، ۴۵۵

(۱۳۸) راغب مراد آبادی و اقبال حیدر، مکالماتِ جوش و راغب، کینیڈا، جوش لٹریری سوسائٹی، کیلگری، جون ۱۹۸۸ء ص ۹۳

(۱۳۹) مسعود حسین خان، مشمولہ جوش ملیح آبادی، تنقیدی جائزہ مرتب خلیق انجم، دہلی، انجمن ترقیٔ ادب ۱۹۹۱ء ص ۲۸

(۱۴۰) یحییٰ احمد، اردو محاورات کا تہذیبی و لسانی مطالعہ، اسلام آباد، مقالہ ایم فل، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ۱۹۹۵ء ص ۱۴

(۱۴۱) کالم جنگ، روزنامہ، میر خلیل الرحمن، راولپنڈی ۲۴ فروری، ۱۹۸۲ء ص ۴

(۱۴۲) شاہد احمد دہلوی، نہ جنتی نہ ڈھول بجتے، مشمولہ ساقی ۱۹۶۳ء ص ۵۲۲

(۱۴۳) یحییٰ احمد، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی، شخصیت، افکار اور زبان و بیان، لاہور، نیازمانہ، پبلی کیشنز، اپریل ۲۰۰۹ء ص ۳۲۱

(۱۴۴) ہلال نقوی، ڈاکٹر، اوراق جوش ۲۰۱۰ء

(۱۴۵) (i) کوثر نیازی، مولانا، مشمولہ مجلہ محراب و مضراب، اسلام آباد، جوش میموریل کمیٹی، ۸۶، ص ۶۶

(ii) جوش ملیح آبادی، محراب و مضراب، لاہور، جنگ پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء ص ۸

(۱۴۶) خلیق انجم، مرتب جوش ملیح آبادی تنقیدی جائزہ، دہلی، انجمن ترقیٔ ادب، ۱۹۹۱ء ص ۴

(۱۴۷) شان الحق حقی، سوانح عمری، مشمولہ جوش نمبر، ہند، دلی، پبلی کیشنز، ڈویژن، اپریل ۱۹۹۵ء ص ۳۲

(۱۴۸) جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، ص ۲۲۲

(۱۴۹) حمید الدین شاہد، خواجہ، جیسا دیکھا جیسا پایا، مشمولہ ماہنامہ افکار، جوش نمبر ۱۹۶۱ء ص ۲۳

(۱۵۰) صہبا لکھنوی، افکار جوش نمبر ۱۹۶۱ء ص ۲۳

(۱۵۱) ہلال لکھنوی، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی، شخصیت اور فن، ص ۲۳

(۱۵۲) ہلال لکھنوی، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی، شخصیت اور فن، ص ۴۶

(۱۵۳) جے کرشن چوہدری، بھرتری ہری، الٰہ آباد، ادارۂ انیس اردو، جون ۱۹۵۹ء ص ۶

(۱۵۴) نہال سیوہاروی، شباب و انقلاب، دہلی، مشہور پبلشنگ، ہاؤس، ۱۹۴۴ء ص ۲

(۱۵۵) خواجہ عبدالرحمن طارق (مرتب) جوش اور خانہ بگوش، کراچی، فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، س۔ن، ص ۱۲۴

(۱۵۶) فیض احمد فیض، جوش و فراق کی یاد میں، مشمولہ مقالات فیض مرتبہ، شیما مجید، لاہور، فیروز سنز لمیٹڈ، ۱۹۹۰ء ص ۱۱۷

(۱۵۷) فرج جمال ملیح آبادی جوش... میرے بابا شخص اور شاعر، اسلام آباد، پورب اکادمی ۲۰۱۰ء ص ۲۱۔۲۰

(۱۵۸) خورشید علی خاں، ہمارے جوش صاحب، کراچی، ذیشان کتاب گھر، جنوری ۱۹۹۶ء ص ۵۶۰۔۵۵۹

(۱۵۹) محمد ذکی الدہلوی، گل ہائے خنداں، کراچی، ایوان علم و ادب، ۱۹۹۳ء ص ۵۷

(۱۶۰) بحوالہ جوش صدی، انٹر نیشنل سیمینار، بسلسلہ صد سالہ یوم پیدائش (۱۸۹۷۔۱۹۸۲) لاہور رپورٹ، ارتقاء ۲۴ دسمبر ۱۹۹۹ء ص ۳۸۱

(۱۶۱) جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، جلد سوم، لاہور، مجلس ترقی ادب ۲۰۰۶ء ص ۸۶۸

(۱۶۲) فرخ جمال ملیح آبادی، جوش ملیح آبادی، ملیح آباد سے اسلام آباد تک، اسلام آباد، پورب اکیڈمی، جنوری ۲۰۱۴ء ص ۵۷

(۱۶۳) فرخ جمال ملیح آبادی، جوش ملیح آبادی، ملیح آباد سے اسلام آباد تک، اسلام آباد، پورب اکیڈمی، جنوری ۲۰۱۴ء ص ۶۹

(۱۶۴) بحوالہ اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، خامہ بگوش، خنجر بکف، مشمولہ، دبستان، لاہور، الرزاق پبلی کیشنز، فروری تا اپریل ۲۰۰۵ء ص ۵۰

(۱۶۵) شاہد احمد دہلوی، نہ جنتی نہ ڈھول بجتے، مشمولہ ساقی جوش نمبر ۱۹۶۳ ص ۵۴۰

(۱۶۶) منظر حسین، ڈاکٹر، جگن ناتھ آزاد، ایک کثیر الجہت فنکار، جموں وکشمیر، ایور گرین کمپوزر اینڈ پبلشرز، ۲۰۰۳ء ص ۱۵۸

(۱۶۷) جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، لاہور، مکتبہ شعر و ادب ۱۹۷۵ ص ۵۱۶

(۱۶۸) علی سردار جعفری، جوش کی معنویت (ایک مکتوب) مشمولہ جوش ملیح آبادی، خصوصی مطالعہ، مرتب، قمر رئیس، دہلی، جوش انٹرنیشنل سیمینار کمیٹی، ۱۹۸۳ء ص ۱۴۵

(۱۶۹) خورشید علی خاں، ہمارے جوش صاحب، کراچی، ذیشان کتاب گھر، جنوری ۱۹۹۶ء ۳۳۹

(۱۷۰) ہلال نقوی، ڈاکٹر، اوراق جوش (تحقیق و ترتیب)، لاہور، اظہار سنز، ۲۰۱۰ ص ۱۱۶۔۱۱۵

(۱۷۱) مسعود حسین خان، مشمولہ جوش ملیح آبادی کا تنقیدی جائزہ از خلیق انجم، دہلی، انجمن ترقیٔ ادب ۱۹۹۱ ص ۲۸

(۱۷۲) گوپی چند نارنگ، مشمولہ جوش ملیح آبادی کا تنقیدی جائزہ ص ۱۰۰

(۱۷۳) ڈاکٹر یحییٰ احمد، جوش ملیح آبادی، شخصیت، افکار اور زبان و بیان، لاہور، نیا زمانہ پبلیکیشنز، ۲۰۰۹ء ص ۴۱۱

(۱۷۴) جمیل جالبی، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی، مشمولہ معاصر ادب، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۱ء ص ۲۰۰

(۱۷۵) ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی، شخصیت اور فن (پاکستانی ادب کے معمار) اسلام آباد، اکادمی ادبیاتِ پاکستان ۲۰۰۷ء ص ۱۰۵

(۱۷۶) محمد حسن، ڈاکٹر، شناسا چہرے، کراچی، غضنفر اکیڈمی، ۱۹۸۷ء ص ۲۴

(۱۷۷) فضل امام، ڈاکٹر، شاعر آخر الزماں، جوش ملیح آبادی، دہلی، موڈرن پبلی کیشنز، ۱۹۸۲ء ص ۶۷

(۱۷۸) فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی: غزلوں کی روشنی میں، مشمولہ ارتقاء ۲۴، کراچی دسمبر ۹۹ تا مارچ ۲۰۰۰ء ص ۵۸

(۱۷۹) سید عبد اللہ، ڈاکٹر، اردو ادب ۱۹۵۶ء تا ۱۹۶۶ء، لاہور، مکتبہ خیابان ادب، ۱۹۶۷ء ص ۱۴۲۔۱۴۱

(۱۸۰) فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی کی غزل مشمولہ ماہِ نو، لاہور، فروری ۲۰۰۳، ص ۶۷

(۱۸۱) سلام سندھیلوی، اردو شاعری میں منظر نگاری، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۸ء ص ۴۰۳

(۱۸۲) خلیل الرحمن اعظمی، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی، مشمولہ ماہنامہ ساقی، کراچی، جوش نمبر ۱۹۶۳ء ص ۱۷۳

(۱۸۳) کرشن چندر، پیغامات و تاثرات، مشمولہ افکار، جوش نمبر ۱۹۶۱ ص ۶۳۵

(۱۸۴) جوش ملیح آبادی، اردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت، مشمولہ کلیم، دہلی، ۱۹۳۶ء ص ۱۰۲

(۱۸۵) محمد علی عقیل رضوی، سید، جوش کے سیاسی افکار اور انقلابی شاعری وقت کے آئینے میں، مشمولہ جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ، مرتب قمر رئیس، دہلی، تخلیق کار پبلشرز ۲۰۰۵ء ص ۶۹

(۱۸۶) کلیم الدین احمد، اردو شاعری پر ایک نظر، حصہ دوم، تیسرا ایڈیشن پٹنہ، اردو مرکز، ۱۹۵۶ء ص ۳۰۵

(۱۸۷) فضل امام، ڈاکٹر، شاعر آخر الزماں جوش ملیح آبادی، ص ۶۸

(۱۸۸) بحوالہ ہلال نقوی، ڈاکٹر جوش ملیح آبادی شخصیت اور فن ص ۳۰۶

(۱۸۹) وارث علوی، جوش کی شاعری میں کلاسیکی اور جدید شعری اسلوب کی کشمکش، مشمولہ جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ، ص ۱۳۱۔۱۳۰

(۱۹۰) بحوالہ جوش بنام ساغر، مرتبہ خلیق انجم، مونو مینٹل پبلشرز، نئی دہلی ۱۹۹۱، ص ۲۱، ۲۰

(۱۹۱) خلیق انجم، جوش بنام ساغر ص (۲۱)

(۱۹۲) منور جمیل، البم، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء ص ۱۳

(۱۹۳) شاداب رضی، ڈاکٹر، جوش کے مرثیے: چند مباحث، مشمولہ جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ مرتب، قمر رئیس، ڈاکٹر دہلی، تخلیق کار پبلشرز، ۲۰۰۵، دوسرا ایڈیشن ص ۲۴۲

(۱۹۴) سید تقی عابدی، ڈاکٹر، جوش کی مرثیہ نگاری، مشمولہ ارتقاء ۲۴ دسمبر ۱۹۹۹ء، ص ۸۸

(۱۹۵) شفقت رضوی، پروفیسر، جوش ملیح آبادی، تحقیق و تنقید کی زد میں، کراچی، فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، جون ۲۰۰۱ء ص ۹۴

(۱۹۶) سبط حسن، تعارف مراثی عزم جون پوری، کراچی، ۱۹۸۵ء ص ۵

(۱۹۷) فضل امام، ڈاکٹر، شاعر آخر الزماں جوش ملیح آبادی، دہلی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۲ء ص ۱۲۶

(۱۹۸) بحوالہ تقی عابدی، ڈاکٹر، جوش کی مرثیہ نگاری مشمولہ ارتقاء ۲۴ دسمبر ۱۹۹۹ء ص ۹۸

(۱۹۹) عقیل احمد، ڈاکٹر، جوش کی شاعری کا تنقیدی تجزیہ، نئی دہلی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۳ء، ص ۲۰۶

(۲۰۰) اقبال حیدر، سید، جوش اور ان کی رباعیات، مشمولہ، جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ، مرتب ڈاکٹر رئیس قمر، دہلی، تخلی کار پبلشرز، دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۵، ص ۱۷۷

(۲۰۱) گوپی چند نارنگ، تپش نامہ تمنا، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء ص ۸۶۔۸۵

(۲۰۲) فضل امام، جوش کا عقیدۂ مذہب مشمولہ جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ از قمر رئیس، دہلی، تخلیق کار پبلشرز، ۲۰۰۵ء (سیکنڈ ایڈیشن) ص ۸۲

(۲۰۳) منیبہ خانم، ڈاکٹر، اردو میں قطعہ نگاری، لاہور، بیکن بکس ۲۰۰۹ء ص ۱۶۲

(۲۰۴) فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی اور نیاز فتحی پوری، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء ص ۷۷

(۲۰۵) شان الحق حقی، آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء ص ۱۷۳

(۲۰۶) مولوی سید تصدق حسین رضوی، لغات کشوری، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۸۶ء ص ۲۳

(۲۰۷) فرمان فتح پوری، رافع اللغات، لاہور، الفیصل ناشران و تاجران کتب ۲۰۰۵، ص ۵۷

(۲۰۸) نور الحسن نیر، مولوی، نور اللغات، کراچی، جنرل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۵۷ء ۳۳۵

(۲۰۹) ڈکشنری آف ورلڈ لٹریری ٹرمز میں اس کی تعریف یوں درج کی گئی ہے۔

(۲۱۰) Joseph.T.Shipley, A Dictionary of world literary terms (writer-1970) 134

(۲۱۱) منظر عباس نقوی، اسلوبیاتی مطالعے، علی گرھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۹ء ص ۱۴

(۲۱۲) سید عابد علی عابد، اسلوب، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۱ء ص ۴۳

(۲۱۳) نصیر احمد خان، ادبی اسلوبیات، نئی دہلی، اردو محل پبلی کیشن، ۱۹۹۳ء ص ۹

(۲۱۴) عابد علی عابد۔ اسلوب ص ۳۸

(۲۱۵) بحوالہ خادم حسین، جوش ملیح آبادی کی نثر کا اسلوبیاتی جائزہ، غیر مطبوعہ مقالہ ایم کل، ایجوکیشن یونیورسٹی ۲۰۰۸ ص ۲۱

(۲۱۶) عبد المغنی، پروفیسر، ابو الکلام آزاد کا اسلوب نگارش، لاہور، مکتبہ اخوت، ۱۹۹۴ء ص ۱۰

(۲۱۷) نصیر احمد خان، پروفیسر، ادبی اسلوبیات، ص ۲۴

(۲۱۸) گوپی چند نارنگ ادبی تنقید اور اسلوبیات لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۱ ص ۱۵

(۲۱۹) قمر رئیس، مرتب، جوش ملیح آبادی، خصوصی مطالعہ دلی سیمینار کمیٹی ۱۹۹۳ ۲۸۷

(۲۲۰) خادم حسین، مقالہ نگار ایم فل اردو، جوش ملیح آبادی کی نثر کا اسلوبیاتی مطالعہ، لاہور، ایجوکیشن یونیورسٹی ۲۰۰۸ء ص ۱۰۰

(۲۲۱) سحر انصاری، مرتب، مقالاتِ جوش، کراچی، اردو محل، ۱۹۸۲ء ص ۱۴۳

(۲۲۲) جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، ص ۲۷

(۲۲۳) سحر انصاری، مقالات جوش، ص ۲۲۴

(۲۲۴) سحر انصاری، مقالات جوش، ص۱۸۷

(۲۲۵) جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، ص۱۷۵

(۲۲۶) جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، ص۱۸۰

(۲۲۷) جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، ص۶۴۴

(۲۲۸) جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، ص۶۳۱

(۲۲۹) راغب مراد آبادی، خطوط جوش ملیح آبادی، کراچی، ویلکم بک پورٹ، ۱۹۹۸ء ص۱۴۱

(۲۳۰) جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، ص۴۸

(۲۳۱) راغب مراد آبادی، خطوط جوش ملیح آبادی، ص۱۴۵

(۲۳۲) جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، ص۵۰

(۲۳۳) سحر انصاری، مقالاتِ جوش، ص۱۷۲

(۲۳۴) سحر انصاری، مقالاتِ جوش، ص۲۲۳

(۲۳۵) جوش ملیح آبادی، یادوں کی برات، ص۲۵

(۲۳۶) راغب مراد آبادی، خطوط جوش ملیح آبادی، ص۹۷

(۲۳۷) جوش، یادوں کی بات، ص۴۹۷

(۲۳۸) جوش، یادوں کی بات، ص۱۷۳

(۲۳۹) خلیق انجم، (مرتب) جوش ملیح آبادی کے خطوط، ہند (حیدر آباد) انجمنِ ترقی اردو، ۱۹۹۸ء ص۲۵

(۲۴۰) اخلاق احمد دہلوی، یادوں کا سفر، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱ء ص۱۰۲-۱۰۰

(۲۴۱) جوش ملیح آبادی نے افکار کے جوش نمبر اور ''یادوں کی برات'' میں اپنی تاریخ پیدائش ۱۸۹۸ء درج کی ہے جبکہ ڈاکٹر ہلال نقوی نے مختلف شواہد کی روشنی میں جوش کی تاریخ پیدائش ۵ دسمبر ۱۸۹۴ء متعین کی ہے۔

(۲۴۲) تبسم اخلاق ملیح آبادی، ماضی کا گودام، مشمولہ ماہ نو جوش نمبر جلد ۶۹، شمارہ ۳، ۲۰۱۶ء ص۴۲

(۲۴۳) گیان چند جین، ڈاکٹر، تجزیے، دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۷۳ء ص۳۶۹

(۲۴۴) فضل امام، شاعر آخر الزماں جوش ملیح آبادی، نئی دہلی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۲ء ص۳۵

(۲۴۵) نزہت عباسی، جوش ملیح آبادی کی اردو نثر، مشمولہ جوش شناسی، جوش سیمینار نمبر کراچی، الفاظ فاؤنڈیشن، ۲۰۱۳ء ص

(۲۴۶) رشید حسن خان، یادوں کی برات پر ایک نظر، مشمولہ جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ مرتب قمر رئیس دلی، سیمینار کمیٹی، ۱۹۹۳ء ص۲۹۱

(۲۴۷) فضل امام، شاعر آخر الزماں جوش ملیح آبادی، نئی دہلی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۲ء ص۱۷۲

(۲۴۸) عبد الماجد دریا آبادی، مقالاتِ ماجد، لاہور، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور طبع دوم س۔ن ص۲۹۲-۲۹۴

(۲۴۹) طاہر تونسوی، ڈاکٹر، تحقیق و تنقید، منظر نامہ، لاہور، گورا پبلشر، لوئر مال، ۱۹۹۵ء ص۹۳

(۲۵۰) چونکہ سکھ چین سنگھ ٹھاکر ہیں اور سکھ ہے اس لیے کوثر و تسنیم کا صحیح مفہوم ان پر واضح نہیں ہے۔ عام طور پر ہم پاکیزہ اور مطہر اسلوب کے لیے یہ ترکیب استعمال کرتے ہیں جبکہ جوش کے ہاں پاکیزگی کا تصور کچھ اور ہے۔ عشق بازی اور عیش کوشی کا تصور ان کی تحریروں سے بھی جھلکتا ہے۔

(۲۵۱) سکھ چین، سنگھ ٹھاکر، جوش بحیثیت نثر نگار، مشمولہ جوش ملیح آبادی تنقیدی جائزہ، مرتبہ خلیق انجم، نئی دلّی، ہند، انجمن ترقی اردو ۱۹۹۲ء ص۲۲۸۔ مشمولہ نگار خانہ، رقصاں دہلی، تاج کمپنی، ۱۹۸۴ء ص۹۰

(۲۵۲) سید حامد حسن قادری، جوش کی شخصیت یادوں کی برات کے آئینے میں، مشمولہ نگار خانہ، رقصاں دہلی، تاج کمپنی، ۱۹۸۴ء ص۹۰

(۲۵۳) بحوالہ جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ مرتب قمر رئیس، دہلی، جوش انٹرنیشنل سیمینار کمیٹی ۹۳، ص۱۸۶

(۲۵۴) افکار بیاد جوش نمبر، کراچی، ۱۹۶۳ء ص ۳۳۹

(۲۵۵) بحوالہ جیلانی کامران بشمولہ افکار بیاد جوش نمبر ص ۱۸۶

(۲۵۶) یحییٰ احمد، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی، شخصیت، افکار اور زبان و بیان، لاہور، نیازمانہ، پبلی کیشنز، اپریل ۲۰۰۹ ص ۲۰۲

(۲۵۷) ہلال نقوی، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی، شخصیت اور فن، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۷ء ص ۱۰۰

(۲۵۸) رشید احمد صدیقی، خطوط رشید احمد صدیقی، جلد سوم، مرتبین، مہر الٰہی ندیم، لطیف الزمان خان، کراچی، میکبرن ایجنسیز لمیٹڈ، اشاعت اوّل، اکتوبر ۱۹۹۸ء ص ۸۶

محاکمہ

جوش ملیح آبادی کی شعری بلند قامتی کے مدِ نظر دنیانے انہیں بطور شاعر ہی پرکھا لیکن ان کے نثری ادب کا جائزہ لینے سے گریز کیا گیا۔ میدانِ نثر میں جوش کے مخصوص طرزِ فکر و نظر پر بہت کم لکھا گیا، جوش کی نثر میں ان کے مخصوص فلسفیانہ طرز کا اظہار ہے۔ ان کی تصانیت میں ادبی، سیاسی، سماجی، معاشرتی اور مذہبی موضوعات پر ان کے نظریات کا اظہار جگہ جگہ دکھائی دیتا ہے۔ جوش نے اپنی خود نوشت سوانح اور خطوط میں خود کو ایک شرابی، زانی، ہم جنس پرست اور ڈال ڈال پر منڈلانے والا بھونرا، رافضی، ضدی اور سخت گیر نواب زادے کے طور پر پیش کیا ہے اور اپنی شخصیت کو خود مجروح کیا ہے لیکن جہاں وہ ایک جمال پرست رومانی کے طور پر ابھرتے ہیں وہاں وہ دوستی نبھانے والے، وعدہ پورا کرنے والے، محنتی، انقلابی، ادبِ لطیف پر گرفت رکھنے والے، انشاء پرداز، ناقدِ حیات، قومی درد رکھنے والے ادیب، مسلمانوں کے غم خوار، وطن پرست، بے باک سیاسی ورکر اور خود دار و ترقی پسند ادیب و شاعر دکھائی دیتے ہیں۔ انگریزوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بغاوت کا علم بلند کرنا جوش ہی کا کام تھا۔ جوش نے نظام حیدر آباد کی شان میں ہجویہ نظم تک لکھ ڈالی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اپنے ایک مضمون میں جوش کو فلسفی، ماہرِ عمرانیات، علم نفسیات سے آگاہ، مورخ، ادب اور جمالیات کے علم سے آشنا، زبان اور لسانیات کے ماہر کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہ محض ڈاکٹر صاحب کا ذاتی و تاثراتی بیان نہیں ہے بلکہ جوش کے نثر کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ان کی نثر میں یہ خوبیاں موجود ہیں، اگرچہ زیادہ نمایاں نہیں ہیں مگر جوش کے ادبی سرمائے میں ان کی جھلک ہمیں ملتی ہے۔ لکھنے والے کی شخصیت کے تناظر میں اُس کی تخلیقات کو جانچنا عام بات ہے۔ لوگوں نے جوش کے کردار کے حوالے سے ان کی نثر کو جانچنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ بھول گئے کہ اولیت کام کی ہوتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ روحِ ادب، مقالاتِ جوش، یادوں کی برات، خطوطِ جوش، مضامینِ جوش اور دیگر ادبی سرمائے کو تعصب کی عینک اتار کر پرکھا جائے۔

جوش نے ۵ دسمبر ۱۸۹۴ء میں ایک آفریدی خاندان میں جنم لیا جو کہ ملیح آباد کے نواح میں ایک قصبے کنول ہار سے تعلق رکھتا تھا۔ جوش کے جد امجد فقیر محمد خان گویاؔ صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ جوش کے دادا اور والد بھی صاحبِ دیوان شاعر گزرے ہیں۔ فن سپہ گری میں مہارت اس خاندان کا طرۂ امتیاز رہا۔ حکومتِ وقت کی طرف سے انعام میں جاگیریں، اور فقیر محمد گویا کو انعام میں سرکار خیر آباد کی گورنری ملی۔ جوش کے دادا نواب محمد احمد خاں بہادر تعلقہ دار کسمنڈی تھے اور آنریری مجسٹریٹ کے فرائض بھی ادا کرتے تھے۔ جوش کے والد بشیر احمد بھی ایک شریف اور اصول پسند رئیس تھے ان کی سخت گیری کی وجہ سے جوش میں بغاوت کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس بغاوت کی وجہ سے جوش شیعہ مذہب کی طرف راغب ہوئے اور شراب نوشی شروع کر دی۔ جوش نے بچپن ہی سے شعر گوئی شروع کر دی تھی اور مشاعروں میں جانے لگے تھے۔ ۱۹۲۰ء جوش کی نظم و نثر پر مشتمل کتاب "روحِ ادب" کے نام سے طبع ہوئی۔ اس کے بعد نظم میں جذباتِ فطرت، آوازۂ حق، شاعر کی راتیں، پیغمبر اسلام، نقش و نگار، شعلہ و شبنم، جوش کے سو شعر، فکر و نشاط، جنون و حکمت، حرف و حکایت، حسین اور انقلاب، آیات و نغمات، عرش و فرش، رامش و رنگ، سنبل و سلاسل، سیف و سُبو، سرود و خروش، سموم وصبا، طلوعِ فکر، موجد و مفکر، قطرۂ و قلزم، الہام و افکار، نجوم و جواہر اور جوش ملیح آبادی کے مرثیے نامی کتابیں طبع ہوئیں۔

نثر میں مقالاتِ زریں، اوراقِ سحر، اشارات، نقد اخلاص، اور یادوں کی برات طبع ہوئیں۔

جوش کی بہت سی کتب ایسی ہیں جو اُن کی وفات کے بعد طبع ہوئیں ان میں جوش کے خطوط کے مجموعے جوش بنام ساغر، خطوطِ جوش ملیح آبادی، اور جوش ملیح آبادی کے خطوط شامل ہیں، مضامین کے مجموعوں میں مقالاتِ جوش، جوش ملیح آبادی کی نادر اور غیر مطبوعہ تحریریں اور

اشاراتِ جوش (دوسرا ایڈیشن) شامل ہے۔ شعری انتخاب و مجموعوں میں انتخابِ کلام جوش از عصمت ملیح آبادی کے عروسِ ادب حصہ اوّل و دوم، انتخاب کلام جوش از نریش کمار، انتخاب کلیاتِ جوش، عرفانیاتِ جوش اور محراب و مضراب شامل ہے۔

جوش کا زمانہ مسلمانوں کے سیاسی ادبار کا زمانہ تھا۔ بین الاقوامی سطح پر ادب، سیاست اور معیشت میں تبدیلیاں نمودار ہو رہی تھیں۔ مسلمان آنے والے وقت سے آنکھیں میچے بیٹھے تھے۔ رومانی تحریک، ترقی پسند تحریک اور آزادی کی تحریک میں شرکت سے کوئی بھی ادیب اور شاعر اپنے کو روک نہیں پایا تھا۔ اقبال اپنے وقت کی توانا آواز بن کر ابھرے۔ ٹیگور نے فطرت پرستی کا درس دیا تو اقبال نے حرکت و عمل کو بقا کے لیے لازم قرار دے دیا۔ ایسے میں جوش نے بغاوت کی مذہب سے، سیاست سے، رسم و رواج سے اور انسانیت کو اپنا مطمعٔ نظر ٹھہرایا اور ''میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب'' کی صدا بلند کی۔

جوش نے اپنی تخلیقات اور بالخصوص ''یادوں کی برات'' کو بہت محنت و کاوش کے بعد زیورِ طبع سے آراستہ کیا۔ کئی کئی بار کی نظر ثانی کے بعد بھی مطمئن نہیں ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ پانچواں مسودہ طبع کروایا تھا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کا خیال ہے کہ اقبال کے بعد جوش نے علم و ادب کے مطالعے کے لیے جتنی محنت کی ہے شاید ہی کسی اور نے اتنی کی ہو، اس لیے اُن کا ہر لفظ ہیرے کی طرح ترشا ہوا معلوم ہوتا ہے۔(۱)

جوش کے نثری سرمائے میں ''یادوں کی برات'' ایک متنازعہ خود نوشت سوانح ٹھہری۔ اس میں جوش نے بے باک انداز بیاں میں اپنی سرگذشتِ حیات قلمبند کی ہے۔ جوش ایک باغی کے روپ میں دکھائی دیتے ہیں جو کسی قدغن کو خاطر میں نہیں لاتا جس کے زندگی کے چار بنیادی میلانات شعر گوئی، عشق بازی، علم طلبی اور انسان دوستی ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام جو کہ ایک جونک کی مانند انسانوں کا لہو چوس رہا ہے۔ انسان کو غلامی اور بھوک کے اندھیروں میں دھکیل رہا ہے۔ جوش نے ایسی سرمایہ داری سے نفرت کی ہے۔

والد کی وفات کے بعد جب جوش کے ہوش ٹھکانے آئے تو معلوم ہوا کہ جائیداد کا زیادہ حصہ بڑے بھائی نے ہتھیالیا ہے۔ جوش روز گار کی تلاش میں حیدر آباد گئے۔ دس برس وہاں عیش سے گزارنے کے بعد معتوب ہو کر واپس آئے اور اپنا رسالہ کلیم کے نام سے نکالا۔ چار سال تک رسالہ کامیابی سے چلانے کے بعد پونے فلمی دنیا کا رخ کیا۔ وہاں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد ممبئی چلے آئے اور پھر حکومت کے سرکاری رسالے ''آج کل'' کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے فرائض سنبھالے ۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۵ء یہ فرائض بخوبی ادا کیے اس دوران پدم بھوشن کا سرکاری اعزاز بھی ملا لیکن اردو کی بقا اور اپنے خاندان کی معاشی تبدیلی کے لیے پاکستان کا رخ کیا اور یہاں انجمن ترقیٔ اردو، سندھ کراچی میں مشیر ادبی کے فرائض سنبھالے۔ اردو لغت کی تیاری میں مدد دی لیکن ایک انٹرویو کو بنیاد بنا کر جوش کو اس ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔

اس کے بعد جوش اسلام آباد چلے آئے۔ اطلاعات و نشریات کی وزارت میں جوش کا تقرر ہو گیا۔ اسی زمانے میں جوش نے ''Academy of letters'' کا منصوبہ پیش کیا۔ سقوطِ بنگال کا واقعہ پیش آیا اور الیکشن کے ہنگامے اٹھ کھڑے ہوئے۔ بھٹو نے اقتدار سنبھالا اور جوش کی مراعات بحال رکھیں، فتنہ آخر الزماں سے عشق ہوا اور جوش عشق کے سیلاب کی نذر ہو گئے۔ اسی دوران جوش کی بیگم دماغی خلل میں مبتلا ہوئیں اور ایک دن کمبل میں آگ لگ جانے سے جھلس کر انتقال کر گئیں۔

اسلام آباد کی تنہائی میں کسمپرسی کے عالم میں ۲۲ فروری ۱۹۸۲ء کی رات کو جوش کا انتقال ہوا۔ جوش نے اپنی خود نوشت سوانح میں اپنی زندگی کے حالات و واقعات کو کھول کر قارئین کے سامنے رکھ دیا ہے یہاں تک کہ انہوں نے اپنی کج روی، شراب نوشی، اعتقاد، میلان، سیاست، حکومت اور معیشت سب سے متعارف کروایا ہے۔ جس ماحول میں جوش کا سماجی شعور بیدار ہوا برطانوی اقتدار قائم تھا۔ جوش نے اپنے عہد کے سماجی، معاشرتی، اقتصادی مسائل کو موضوع بنایا۔

جوش نے جب کلیم نکالا تو مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ انہوں نے چار سال تک کلیم میں جو مضامین تحریر کیے وہ اشارات کے نام سے طبع ہوئے۔ روحِ ادب کا نثری حصہ، مقالاتِ زریں اور مقالاتِ جوش نے جوش کی مضامین نگاری کی صلاحیت پر روشنی ڈالی، جوش کے مضامین نے قومی درد، مسلمانوں کی پستی، کانگریس کی عیاری، مُلّا کی مکاری، انسانیت سے دوری، سرمایہ داری سے نفرت، ہندو دشمنی اور غزل کے گھسے پٹے موضوعات، اردو ادبیات میں انقلاب کی ضرورت پر روشنی ڈالی ہے۔ جوش نے بعض اوقات طنز و تعریض سے کام لیا ہے۔ کبھی خطابیہ لہجے کی وجہ سے ان کے لہجے میں تلخی آ گئی ہے۔ بالخصوص اُس وقت جب جوش محسوس کرتے ہیں مسلمان فرقوں اور ذاتوں میں تقسیم ہو گئے ہیں ان میں سب کچھ ہے بس اسلام نہیں ہے۔

مکتوب نگاری کے حوالے سے نقدِ اخلاص، خطوطِ جوش ملیح آبادی، جوش ملیح آبادی کے خطوط اور جوش بنام ساغر کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ خط آدھی ملاقات ہوتا ہے۔ انسان اپنے مخلص دوستوں اور عزیزوں کو خطوں میں وہ باتیں کہہ دیتا ہے جو ملاقات ہونے پر کہتا ہے۔ غالب نے سادہ نگاری کا رواج دیا۔ جوش نے بھی اپنے خطوں میں مکتوب الیہ کو اختصار و ایجاد کے پردے میں سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ اپنی بات پہنچائی ہے۔ مراسلے کو مکالمے میں بدلا ہے اور اپنے بے تکلف دوستوں کو گفتنی ناگفتنی سب کہہ دی ہے۔ کیونکہ انہیں یقین تھا کہ ان کے عزیز دوست ان کے راز کو راز ہی رکھیں گے۔ جوش کے خطوط نہ صرف اس زمانے کے حالات پر روشنی ڈالتے ہیں بلکہ جوش کی سوانح بھی اس کے ذریعے مرتب کی جا سکتی ہے۔

جوش نے اپنے دوستوں کے جو خاکے اپنی آپ بیتی ''یادوں کی برات'' میں کھینچے ہیں انہیں پینسل سکیچ کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ جوش نے ترجمہ نگاری کے حوالے سے جو تراجم کئے ہیں انہوں نے جوش کی مہارت فرہنگ پر عبور، سادہ نگاری، بے غرضی، ترجمہ کے لیے آسان و شگفتہ اندازِ بیاں، مقصدیت، غیر متنازعہ ادب کا ترجمہ کرنا ثابت کیا ہے۔ عربی، فارسی اور انگریزی کی روح کو سمجھ کر ترجمہ نگاری کرنا جوش کی خصوصیت ہے۔ تنقید نگاری میں مختلف مضامین کے حوالے سے جوش کے تنقیدی انداز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جوش نہ صرف دوسروں پر تنقید کرتے تھے بلکہ ایک سخت محتسب کی طرح اپنا محاسبہ بھی کرتے تھے۔

متفرقات میں جوش بطور صحافی (''کلیم'' اور ''آج کل'') کے حوالے سے، کالم نگار جنگ کی حیثیت سے، بطور تقریظ نویس جوش کے مصاحبوں کے حوالے سے، لغت نویسی میں مہارت، محاوراتِ جوش، جوش کی اصطلاحات، جوش کی اصلاحات، جوش کے خطبات اور اغلاطِ جوش کا جائزہ لیا گیا ہے۔ نیز جوش کی شاعری میں جوش بطور مرثیہ نگار، رباعی نگار، اور قطعہ نگار، تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اسلوبِ جوش کے حوالے سے نثر کی مختلف اصناف میں جوش کے اسلوب کو پرکھا گیا ہے۔ (د) جوش کی نثر نگاری کے ذریعے مختلف ناقدین کی آراء (تنقیص و تحسین) پر روشنی ڈالی گئی ہے اور جوش کا مقام و مرتبہ متعین کیا گیا ہے۔

جوش ملیح آبادی نے اپنی آپ بیتی، مقالات، خطوط، خاکہ نگاری، ترجمہ نگاری، تنقید نگاری اور متفرقات میں حق گوئی اور بے باکی کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اپنی بات کہنے کی ابتدا کی۔ کسی نے اسے منٹو اور میرا جی کی حقیقت نگاری سے جا ملایا تو کسی نے فحاشی اور برہنہ گفتاری کا الزام عائد کیا۔ ادب میں انقلابی نظریات کا پرچار جوش نے اپنی تحریروں کے ذریعے کیا انہوں نے شاعری کی ہیئت کے حوالے سے رباعی مسدس اور قطعہ کا استعمال کیا ہے۔ تراکیب سازی میں اجتہادی کوششیں جوش کی ادبیات پر گرفت کو واضح کرتی ہیں۔ جوش ملیح آبادی کی خود نوشت بلا شبہ اپنے ہم عصروں میں سے لکھی گئی خود نوشتوں میں سب سے اہم ہے۔ یہ خود نوشت اپنی مقبولیت میں ایسی ہی ہے جیسی ممتاز مفتی کی رپور تاژ'' لبیک'' اس تصنیف نے دیگر لکھاریوں کو ایک اسلوب سے آشنا کروایا اور اپنی ذات کی کجیاں اور اچھائیاں دونوں جرأت اور بے باکی سے عیاں کرنے کی ہمت دی۔ اردو ادب میں لکھی جانے والی آپ بیتیوں کا عمومی مزاج یہی رہا ہے کہ ایک اعلیٰ اوصاف کا انسان، جس نے زندگی میں بے پناہ

ہ مصائب جھیلے۔ پھر بھی پایہ استقامت میں لغزش نہ آئی۔ ایک ایسا انسان جو صرف فرشتوں جیسی خصائل کا مالک ہے۔ بشری کمزوریوں کا کہیں شائبہ نہیں۔ جب یادوں کی برات چھپتی ہے تو وہ قارئین کو چونکا دیتی ہے۔ عام قاری کو اس خود نوشت میں موجزن بے باکی ورطہ حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ اس کا نثری اسلوب جہاں قاری کے ذوق کی تسکین کرتا ہے وہاں اس کے صفحات میں موجزن ایک مکمل آدمی بھی سطر بہ سطر اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس کے اثرات ادیبوں نے قبول کیے۔ اس کے بعد لکھی جانے والی آپ بیتیوں میں اس کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ مندرجہ ذیل ادیبوں پر واضح طور پر یادوں کی برات کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔

''نشانِ جگرِ سوختہ'' ڈاکٹر سلیم اختر نے نفسیاتی حوالے سے اپنے بچپن ایام جوانی درس و تدریس کے زمانے کے احوال کو تفصیل سے تحریر کیا ہے۔ انھوں نے قناعت پسند انسان خود کو ظاہر کیا ہے۔ اور اپنی دلچسپیوں پر بھی کھل کر لکھا ہے۔ وہ اپنی ذات کو ایک آدمی بنا کر پیش کرتے ہیں۔

''گھونگرو ٹوٹ گئے'' یہ قتیل شفائی کی خود نوشت ہے۔ آپ بیتی میں فلمی دنیا سے وابستہ افراد کا ذکر بڑے دلنشیں انداز میں رقم کیا ہیں۔ انھوں نے جوش کی مانند آپ بیتی میں پاک و بھارت کے شعرا و ادبا اور فلمی ستاروں کے خاکے بھی خوب پیش کیے ہیں۔ انھوں نے جوش کی طرح اڈھیر عمری کے معاشقوں کو بھی بلا کم و کاست تحریر کیا ہے۔ اور اپنی ذات کی دیگر خامیوں پر بھی خامہ فرسائی کراتے ہوئے کسی جھجک یا خوف کا شائبہ اپنے اوپر طاری نہیں کیا ہے۔ انھوں نے واقعات کی سچائی اور شاعرانہ اسلوب دونوں سطح پر یادوں کی برات کے اثرات قبول کیے ہیں۔

''اس آباد خرابے میں'' یہ اختر الایمان کی خود نوشت ہے۔ اختر نظم کے حوالے سے الگ شناخت کے حامل ادیب ہیں۔ انھوں نے خود نوشت میں واقعات کو مکمل سچائی، روانی اور کھرے انداز کے ساتھ لکھا ہے۔ انھوں نے اپنی ذات کے ساتھ ساتھ اپنے عزیز و اقارب کی ذات کے خصائص بھی بیان کیے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کے یتیم خانہ میں گزارے گئے ایام اور ان کی تلخیوں کو دل گداز انداز میں تحریر کیا ہے۔ اپنے باب کی عدم توجہی سے پیدا کردہ حالات کا بھی خوب نقشہ کھینچا ہے۔ پیسے کی بے باکی اور شاعرانہ اسلوب دونوں جوش کی تقلید کے مظہر ہیں

''میرے ماہ و سال'' جاوید شاہین کی آپ بیتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد معروف ہونے والے شعرا میں ان کا نام بھی شامل ہے۔ میرے ماہ و سال جاوید شاہین کی شخصیت اور عہد کا عمدہ تعارف ہے۔ جاوید شاہین نے اپنے استاد کی برستی شراب نوشی اور معروف شاعرہ میں جذبہ موانست کو کھل کر بیان کیا ہے۔ انھوں نے اپنے دور کے ادیبوں کے مرقعے بھی پیش کیے ہیں۔ جو دلچسپی کے حامل ہیں۔ اس خود نوشت کا مجموعی تاثر بلاشبہ یادوں کی برات —جیسا مرتب ہوتا ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی ''اپنا گریبان چاک'' میں اپنی جوانی کے دور کو کھرے انداز میں بیان کیا ہے۔ اور اپنی نوجوانی کے مشاغل کو کھل کر بیان کیا ہے۔ شورش کاشمیری کی کتاب بوئے گل نالہ ءدل دودِ چراغِ محفل ان کے متلون مزاج اور سیاسی افکار کی حامل کتاب ہے ان کی کتاب ''پسِ دیوارِ زنداں'' بھی خاصے کی چیز بن گئی۔ ان کی شخصیت بے لچک اکھڑ بن کر ابھرتی ہے۔ بری عورت کی کتھا میں کشور ناہید نے اپنی روایتی صاف گوئی سے کام لیا ہے اس میں ہمارے معاشرے کی تمام آسودہ اور مظلوم عورتوں کی کہانی ہے۔ جو مرد کے پھر معاشرے کے اور پھر اپنے عقائد کے جبر کا نشانہ بنتی ہیں اور بے باک ٹھہرائی جاتی ہیں۔

حمید نسیم کی سرگذشت ''ناممکن کی جستجو'' اگرچہ زمانے کے لحاظ سے تاخیر سے آئی مگر آل انڈیا ریڈیو سے ریڈیو پاکستان کی کہانی ہے۔ حمید نسیم نے صاف ستھری باتیں صیغہ ءغائب میں کی ہیں۔

وزیر آغا کی خود نوشت شام کی منڈیر سے ایک ایسے شخص کی خود نوشت ہے۔ جسے جتنا متنازع بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کی شخصیت اتنی ہی نکھر کر سامنے آگئی ہے۔ سعیدہ بانو کی ''ڈگر سے ہٹ کر'' میں جنوبی ایشیا کی روایتی عورت کی پردہ داری کی بجائے اپنے حالات کو

بڑی جرات سے بیان کر دیا۔ عصمت چغتائی نے ”کاغذ ہے پیپر ہن“ میں ایک پابند ہندوستانی معاشرے میں جہاں عورت کی عزت نہیں ہے۔ اپنی کمزوریوں اور اپنے نہاں خانہ دل میں پوشیدہ جذبات کھل کر بیان کئے ہیں۔ کملاداس (ثریا) کی مائی سٹوری اور تہمینہ کھر کی ”مینڈ اسائیں“ بھی اپنے نے بے باکانہ انداز کی وجہ سے مشہور ہوئیں۔ انتظار حسین نے ”چراغوں کا دھواں“ میں ۵۰ سالہ دور کو قلمبند کیا ہے اس دوران جو کچھ انھوں نے محسوس کیا لگی لپٹی رکھنے بغیر قاری تک پہنچایا ہے۔

گیان سنگھ شاطر کی ”گیان سنگھ شاطر“ عبادت بریلوی کی ”عہد رفتہ“ میں بھی جوش کی طرح سچائی بے باکی اور بطور انسان کمزوریوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔

مضمون نگاری کے حوالے سے درج ذیل لوگوں نے جوش کا تتبع کیا۔ سبط حسن ”موسیٰ سے مارکس تک“ ”وزیر آغا“ ”دوسرا کنارا“ انور سدید ”ذکر اس پری وش کا“ فکر تونسوی کی ”فکر نامہ“ مشتاق قمر کی ”ہم ہے مشتاق“ میں قطعیت، استدلال اور منطقیت میں جوش کا سا انداز ہے۔ اقبال حیدر، خلیق انجم، نے بھی اسی انداز میں مضموں لکھے ہیں۔

خاکہ نگاری کے حوالے سے درج ذیل لوگوں نے جوش کا اثر قبول کیا۔ سحاب قزلباش، عبادت بریلوی، احمد بشیر، شہرت بخاری، شوکت تھانوی، فراق گورکھپوری، محمد طفیل وغیرہ۔

مکتوب نگاری میں خلیق انجم، راغب مراد آبادی، ساغر نظامی، مشفق خواجہ، ڈاکٹر معین الرحمن، رشید حسن خان، شمس الرحمن فاروقی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور خورشید حسن خان نے جوش کا سا انداز اپنایا۔

جوش نے اگرچہ اقبال کی طرح کوئی ایسا مکتبہ فکر نہیں دیا کہ بہت سے لوگوں کی سوچ کا انداز بدل دے لیکن جوش نے اپنی تحریروں سے بہت سے لوگوں کو متاثر ضرور کیا ہے۔ بالخصوص احسان دانش، سجاد ظہیر، سبطِ حسن، اکبر حمیدی، ڈاکٹر ہلال نقوی، حیدر اقبال، کشور ناہید، قدرت اللہ شہاب وغیرہ۔ ہم جوش کو رجحان ساز نثر نگار اس حوالے سے کہہ سکتے کہ انہوں نے اردو ادب میں بے باکی، جرات رندانہ، اور سچائی کے ساتھ اپنے موقف کو بیان کرنے کی روایت ڈالی۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ جوش: ایک رجحان ساز نثر نگار ہے زمانہ ان کے کام سے صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ جب بھی خود نوشت سوانح نگاری کی بات ہو گی، جوش کا نام لیا جائے گا اور ”یادوں کی برات“ کو میزان میں رکھا جائے گا۔ اگرچہ جوش میموریل کمیٹیاں اسلام آباد، کراچی، کینیڈا اور بھارت میں کام کر رہی ہیں اور جوش کی تخلیقات کو منظرِ عام پر لانے اور جوش شناسی کی خدمت انجام دے رہی ہیں اور فکرِ جوش کو قارئین تک پہنچانے کی خدمت ادا کر رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آنے والے دور میں جوش کا وہ سرمایہ جو گوشہ گمنامی میں ہے، منظرِ عام پر آ جائے اور فکرِ جوش کے روشن پہلوؤں کو دنیا کے سامنے لے آئے۔ اور زمانہ ہمارے ساتھ کہہ اٹھے کہ ”واقعی جوش ایک رجحان ساز نثر نگار ہے“۔

حوالے و حواشی

۱۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی کے شخصیت کے چند اہم پہلو، مشمولہ افکار جوش نمبر شمارہ نمبر ۱۲۳۔ ۱۴۲، اکتوبر، نومبر ۱۹۶۱ء ص ۱۶۷

بنیادی ماخذ

جوش ملیح آبادی کے شعری مجموعے

۱ i)روحِ ادب، لکھنؤ، میتھوڈیسٹ پریس، ۱۹۲۰ء
(ii)روحِ ادب، لاہور، مکتبۂ اردو، ۱۹۴۲ء
۲۔ آوازۂ حق، لکھنؤ، اصح المطابع، تھوئی ٹولہ، ۱۹۲۱ء
۳۔ شاعر کی راتیں، دہلی، کلیم بک ڈپو، ۱۹۳۰
۴۔ پیغمبرِ اسلام، دہلی، قرول باغ مکتبہ جامعہ، ۱۹۳۶ء
۵۔ نقش و نگار، دہلی، مکتبۂ جامعہ قرول باغ، ۱۹۳۶ء
۶۔ شعلہ و شبنم، ممبئی، کتب خانۂ تاج آفس، ۱۹۳۶ء
۷۔ جوش کے سو شعر، دہلی، کلیم بک ڈپو، قرول باغ، ۱۹۳۶ء
۸۔ فکر و نشاط، دہلی، کلیم بک ڈپو، ۱۹۳۷ء
۹۔ جنون و حکمت، دہلی، کلیم بک ڈپو، محبوب المطابع، ۱۹۳۷ء
۱۰۔ حروف و حکایت، دہلی، کتب خانۂ رشیدیہ، ۱۹۳۸ء
۱۱۔ حسین اور انقلاب، لکھنؤ، سرفراز قومی پریس ۱۹۴۱ء
۱۲۔ آیات و نغمات، لاہور، لکھنؤ، مکتبۂ اردو، ۱۹۴۱ء
۱۳۔ عرش و فرش، ممبئی، کتبِ خانہ، تاج آفس، ۱۹۴۴ء
۱۴۔ رامش و رنگ، ممبئی، قومی دارالاشاعت، ۱۹۴۵ء
۱۵۔ سنبل و سلاسل، ممبئی کتب خانہ تاج آفس، ۱۹۴۷ء
۱۶۔ سیف و سُبو، لاہور، مکتبۂ اردو، ۱۹۴۷ء
۱۷۔ سرود و خروش، دہلی، مفیدِ عام پریس، ۱۹۵۳ء
۱۸۔ سموم و صبا، دہلی، سفید عام پریس، ۱۹۵۵ء
۱۹۔ طلوعِ فکر، کراچی، ادارہ یادگار مرتضوی، ۱۹۵۷ء
۲۰۔ موجد و مفکر، مکتبہ ملیح آباد، س۔ن
۲۱۔ قطرۂ و قلزم، دہلی، دریا گنج، ۱۹۶۳ء
۲۲۔ الہام و افکار، کراچی، جوش اکیڈمی، ۱۹۶۶ء
۲۳۔ نجوم و جواہر، کراچی، جوش اکیڈمی، ۱۹۶۷ء
۲۴۔ جوش ملیح آبادی کے مرثیے، کراچی، ادارہ فیض ادب، ۱۹۸۰ء،
۲۵۔ ''صابر کے موتی'' صابر تھاریانی کی گجراتی شاعری اور جوش ملیح آبادی کی منظوم ترجمہ نگاری، ڈاکٹر، کراچی، الفاظ فاونڈیشن، ۲۰۱۳ء

جوش کے نثری مجموعے

۱۔ روح ادب (نثری حصہ) لکھنؤ، میتھوڈیسٹ پریس، ۱۹۲۰ء، جوش

۲۔ مقالاتِ زریں، لکھنؤ، اصح المطابع، تھوئی ٹولہ، ۱۹۲۱ء

۳۔ اوراق سحر، لکھنؤ، اصح المطابع، تھوئی ٹولہ، ۱۹۲۱ء

۴۔ اشارات، دہلی، نگارستان ایجنسی، ۱۹۴۲ء

۵۔ یادوں کی برات، کراچی، جوش اکیڈمی، ۱۹۷۰ء

۶۔ نقد اخلاص، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، (مرتبہ) ۱۹۷۶ء

۷۔ مقالاتِ جوش، کراچی، اردو محل پبلشرز، (مرتبہ) ۱۹۸۲ء

۸۔ مکالمات جوش وراغب، کینیڈا، جوش لٹریری سوسائٹی (مرتبہ) ۱۹۸۸ء

۹۔ جوش بنام ساغر (مرتبہ) دہلی، مونومینٹل پبلشرز، ۱۹۹۱ء

۱۰۔ جوش ملیح آبادی کی نادر وغیر مطبوعہ تحریریں، کراچی، حیات اکیڈمی، ۱۹۹۲ء

۱۱۔ خطوط جوش ملیح آبادی، مرتب راغب مرادآبادی، کراچی، ویلکم بک پورٹ، ۱۹۹۳ء

۱۲۔ جوش ملیح آبادی کے خطوط، مرتب خلیق انجم، علی گڑھ، انجمن ترقی ہند، ۱۹۹۸ء

۱۳۔ اوراقِ جوش، مرتب ہلال نقوی، ڈاکٹر، لاہور، اظہار سنز، ۲۰۱۰ء

۱۴۔ قلمی نسخہ یادوں کی برات، جہلم بک کارنر، ۲۰۱۳ء

ثانوی ماخذ

۱۔ احمد، عقیل، ڈاکٹر، جوش کی شاعری کا تنقیدی تجزیہ، نئی دہلی، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۳ء

۲۔ احمد، سلیم، ادھوری جدیدیت، کراچی، ایجوکیشنل پریس، فروری، ۱۹۷۷ء

۳۔ احمد، یحییٰ، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی، شخصیت، افکار اور زبان و بیان، لاہور، نیازمانہ پبلی کیشنز، اپریل ۲۰۰۹ء

۴۔ احمد، کلیم الدین، اردو شاعری پر ایک نظر، حصہ دوم، تیسرا ایڈیشن، پٹنہ، اردو مرکز، ۱۹۵۶ء

۵۔ اختر، جمیل (مرتب) اشاریہ، آج کل، دہلی، اردو اکادمی، ۱۹۸۸ء

۶۔ اختر، سلیم، ڈاکٹر، عورت جنس کے آئینے میں، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء

۷۔ اختر، سلیم، ڈاکٹر، جوش کا نفسیاتی مطالعہ اور دوسرے مضامین، لاہور، فیروز سنز، س۔ن

۸۔ اختر، سلیم، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۰ء

۹۔ احسن، ذوالفقار علی، اردو سفر نامے میں جنس نگاری ۱۹۴۷ء کے بعد، لاہور، مغربی پاکستان، اردو اکیڈمی، اکتوبر ۲۰۰۸ء

۱۰۔ الغنی، حکیم نجم، تاریخ اودھ، جلد چہارم، لکھنؤ، مطبع نولکشور، ۱۹۱۹ء

۱۱۔ امام، فضل، ڈاکٹر، شاعر آخرالزماں جوش ملیح آبادی، دہلی، ماڈرن پبلی کیشن، ۱۹۸۲ء

۱۲۔ امام، مظہر، اک لہر آئی ہوئی، کراچی، معیار پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء

۱۳۔ انجم، خلیق، (مرتبہ) جوش بنام ساغر، نئی دہلی، مونو مینٹل پریس، ۱۹۹۱ء

۱۴۔ انجم، خلیق، (مرتبہ)، جوش ملیح آبادی کے خطوط، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۸ء

۱۵۔ انجم، خلیق، (مرتبہ)، جوش ملیح آبادی تنقیدی جائزہ، نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۲ء، ۱۹۹۱ء

۱۶۔ انجم، شہناز، ڈاکٹر، ادبی نثر کا ارتقاء شمالی ہند میں (۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک) لاہور، پروگریسو بکس، ۱۹۸۹ء

۱۷۔ انصاری، اسلم، ڈاکٹر، تکلمات، لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۰۰ء

۱۸۔ انصاری، سحر، مکالاتِ جوش، لاہور، جنگ پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء

۱۹۔ انور، صبیحہ، اردو میں خود نوشت سوانح حیات، لکھنؤ، نامی پریس، اگست ۱۹۸۲ء

۲۰۔ آزاد، محمد حسین، رنگِ خیال، لاہور، مجلسِ ترقیٔ ادب، ۱۹۸۵ء

۲۱۔ آغا، سلیم، (مترجم) لوک داستانیں، اسلام آباد، لوک ورثے کا قومی ادارہ، مئی ۱۹۸۷ء

۲۲۔ آغا، وزیر، نئے تناظر، بیسویں صدی کی ادبی تحریکیں، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۱ء

۲۳۔ بخش، ایم سلطانہ، اردو میں اصولِ تحقیق، اسلام آباد، مغربی پاکستان اکیڈمی، ۱۹۹۸ء

۲۴۔ بریلوی، عبادت، ڈاکٹر، اردو تنقید کا ارتقاء، کراچی، انجمنِ ترقیٔ اردو، ۱۹۷۹ء

۲۵۔ بریلوی، محمود، مختصر تاریخ ادبِ اردو، (باتصویر) لاہور، س۔ن

۲۶۔ بیگ، مرزا حامد، ترجمے کا فن، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء

۲۷۔ بیگ، مرزا حامد، مغرب سے نثری تراجم، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء

۲۸۔ پروازی، پرویز، پروفیسر، پس نوشت، پس پس نوشت، لاہور، نیازمانہ پبلی کیشنز، س۔ن

۲۹۔ تونسوی، طاہر، ڈاکٹر، تحقیق و تنقید، منظر نامہ، لاہور، گوراپبلشرز، ۱۹۹۵ء

۳۰۔ جالبی، جمیل، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، جلد سوم، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ۲۰۰۶ء

۳۱۔ جالبی، جمیل، ڈاکٹر، معاصر ادب، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء

۳۲۔ جعفری، علی سردار، ترقی پسند ادب، علی گڑھ، انجمنِ ترقی اردو، ہند، ۱۹۵۷ء

۳۳۔ جمیل، منور، البم، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء

۳۴۔ جمیل، خاور، مرتب، نئی تنقید، کراچی، رائل بک کمپنی، بارِ اول، ۱۹۸۵ء

۳۵۔ جین، گیان چند، ڈاکٹر، تجزیے، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۷۳ء

۳۶۔ چوہدری، جے کشن، بھرتری ہری، الٰہ آباد، ادارہ انیسِ اردو، جون ۱۹۵۹ء

۳۷۔ حالی، مولانا الطاف حسین، مقدمہ شعر و شاعری، لاہور، پاپولر پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۹ء

۳۸۔ حسن، سبطِ، تعارف مراثیٔ عزم جون پوری، کراچی، مکتبۂ ادب، ۱۹۸۵ء

۳۹۔ حسن، محمد، ڈاکٹر، اردو ادب میں رومانوی تحریک، ملتان، صدر، کاروانِ ادب، اشاعت ۱۹۸۶ء

۴۰۔ حسن، محمد، ڈاکٹر، شناسہ چہرے، کراچی، غضنفر اکیڈمی، ۱۹۸۷ء

۴۱۔ حق، عبدل، ادبی تبصرے، طبع دوم، لکھنؤ، دانش محل، ۱۹۶۴ء

۴۲۔ حنفی، شمیم، پروفیسر، آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ، دہلی اردو اکادمی، ۱۹۹۱ء

۴۳۔ حسین، احتشام، پروفیسر، تنقیدی نظریات، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۱۹۶۸ء

۴۴۔ حسین، احتشام، پروفیسر، جوش ملیح آبادی، انسان اور شاعر، لکھنؤ، اترپردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۳ء

۴۵۔ حسین، تنویر، اصنافِ ادبِ اردو، لاہور، اورینٹ پبلشرز، ۱۹۹۳ء

۴۶۔ حسین، منظر، ڈاکٹر، جگن ناتھ آزاد، ایک کثیر الجہت فنکار، جموں و کشمیر، ایور گرین کمپوزر اینڈ پرنٹر، ۲۰۰۳ء

۴۷۔ خاتون، طیبہ، ڈاکٹر، اردو میں ادبی نثر کی تاریخ، (۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء)، لاہور، خان بک کمپنی، ۲۰۱۳ء

۴۸۔ خان، خورشید علی، ہمارے جوش صاحب، کراچی، ذیشان کتاب گھر، ۱۹۹۶ء

۴۹۔ خان، سہیل احمد، طرزیں، لاہور، قوسین، ۱۹۸۲ء

۵۰۔ خان، عبدالودود، ڈاکٹر، اردو نثر میں ادبِ لطیف، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۷ء

۵۱۔ خان، نصیر احمد، ادبی اسلوبیات، نئی دہلی، اردو محل پبلی کیشنز، ۱۹۹۳ء

۵۲۔ خان، مظفر حسین سلیمانی، منشی، نامہ مظفری، حصہ دوم، لکھنؤ، مکتبہ مجتبائی، ۱۳۲۶ھ بمطابق ۱۹۱۷ء

۵۳۔ خانم، منیبہ، ڈاکٹر، اردو میں قطعہ نگاری، لاہور، بیکن بکس، ۲۰۰۹ء

۵۴۔ خواجہ، عبدالرحمن طارق، (مرتب) جوش اور خامہ بگوش، کراچی، فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، س۔ن

۵۵۔ خواجہ، محمد زکریا، مدیرِ عمومی، تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک وہند، جلد اول، (۱۸۰۳ء تا ۱۸۵۷ء)، پنجاب یونیورسٹی ۲۰۰۸ء

۵۶۔ خواجہ، محمد زکریا، مدیرِ عمومی، تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک وہند، جلد سوم، پنجاب یونیورسٹی ۲۰۱۰ء

۵۷۔ خواجہ، محمد زکریا، مدیرِ عمومی، تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک وہند، جلد پنجم، بیسویں صدی، پنجاب یونیورسٹی ۲۰۱۲ء

۵۸۔ خان، کاظم علی، جوش شناسی، لکھنؤ، نظامی پریس، ۱۹۸۶ء

۵۹۔ خان، نادر علی، اردو صحافت کی مختصر تاریخ، لاہور، بک ٹاک، ۲۰۱۶ء

۶۰۔ دہلوی، اخلاق احمد، یادوں کا سفر، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱ء

۶۱۔ دہلوی، شاہد احمد، گنجینۂ گوہر، کراچی، مکتبہ اسلوب، ۱۵ جولائی ۱۹۱۲ء

۶۲۔ دہلوی، ضیاء، ڈاکٹر، اسالیبِ نثر پر ایک نظر، نئی دہلی، ادارۂ فکرِ جدید، ۱۹۸۹ء

۶۳۔ دہلوی، محمد ذکی، گلہائے خنداں، کراچی، ایوانِ علم و ادب، ۱۹۹۳ء

۶۴۔ ذوالفقار، غلام حسین ڈاکٹر، محاسنِ خطوطِ غالب، لاہور، مکتبہ خیابانِ ادب، بارِ اول، ۱۹۶۹ء

۶۵۔ ذوالفقار، غلام حسین ڈاکٹر (ترتیب و مقدمہ)، مضامین سرسید، لاہور، مکتبہ خیابانِ ادب، جنوری ۱۹۶۷ء

۶۶۔ راہی، اعجاز، اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء

۶۷۔ رضا، محمد عمر، ڈاکٹر، اردو میں سوانحی ادب، فن اور روایت، لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲ء

۶۸۔ رضوی، پروفیسر، شفقت، جوش ملیح آبادی، تحقیق و تنقید کی زد میں، کراچی، فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، جون ۲۰۰۱ء

۶۹۔ رئیس، قمر، جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ، دہلی، جوش انٹرنیشنل سیمینار کمیٹی، ۱۹۹۳ء

۷۰۔ زیدی، اظہر، (مرتب) متاعِ ادب، لاہور، مکتبہ میری لائبریری، جنوری ۱۹۶۵ء

۷۱۔ سید، زوار حسین، اردو شاعروں کا البم، لاہور، مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۹۴ء

۷۲۔ سدید، انور، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء

۷۳۔ سدید، انور، ڈاکٹر، نئے جائزے (۱۹۷۸ء تا ۱۹۸۸ء) لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، بارِ اول، نومبر ۱۹۸۹ء

۷۴۔ سدید، انور، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، کراچی، انجمنِ ترقیٔ اردو، ۱۹۸۵ء

۷۵۔ سدید، انور، ڈاکٹر، بر سبیلِ تنقید، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۹ء

۷۶۔ سرور، آلِ احمد، تنقید کیا ہے؟، کراچی، اردو اکیڈمی، سندھ، جنوری ۱۹۵۲ء

۷۷۔ سندھیلوی، سلام، اردو شاعری میں منظر نگاری، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، فروری ۲۰۰۳ء

۷۸۔ سندھیلوی، سلام، ادبی اشارے، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۱ء

۷۹۔ سندھیلوی، سلام، ڈاکٹر، ادب کا تنقیدی مطالعہ، لاہور، مکتبۂ میری لائبریری، طبع چہارم، ۱۹۷۱ء

۸۰۔ سنگھ، مہندر سنگھ کنور، یادوں کا جشن، کراچی، اورنٹیل پبلی کیشنز، ۱۹۸۳ء

۸۱۔ سہیل راحت، اردو ادارے کا ارتقا، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء

۸۲۔ سید، اعجاز حسین، ڈاکٹر، مختصر تاریخ ادب اردو، سندھ، کراچی، اردو اکیڈمی، تیسرا ایڈیشن، ۱۹۷۱ء

۸۳۔ سید، عابد علی عابد، اسلوب، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء

۸۴۔ سید، صفدر حسین، ڈاکٹر، نقدِ اخلاص (مرتب) لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۶ء

۸۵۔ سید، عبد اللہ، ڈاکٹر، اردو ادب (۱۹۵۷ء تا ۱۹۶۶ء) لاہور، مکتبۂ خیابانِ ادب، ستمبر ۱۹۶۷ء

۸۶۔ سید، عبد اللہ، ڈاکٹر، اشاراتِ تنقید، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، فروری ۱۹۹۳ء

۸۷۔ سید، عبد اللہ، ڈاکٹر، اشاراتِ تنقید، لاہور، مکتبۂ خیابانِ ادب، ۱۹۷۲ء

۸۸۔ سید، نور الحسن، طورِ کلیم، آگرہ، مطبع مفید عام، ۱۲۹۸ھ

۸۹۔ سیدہ، جعفر، ڈاکٹر، اردو مضمون کا ارتقاء ۱۹۵۰ء تک، حیدر آباد، بھارت نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، ۱۹۷۲ء

۹۰۔ سیفی، بشیر، تنقیدی مطالعے، لاہور، نذیر سنز پبلشرز، ۱۹۹۴ء

۹۱۔ سیفی، بشیر، خاکہ نگاری (فن و تنقید) لاہور، نذیر سنز، ۱۹۹۳ء

۹۲۔ سیوہاروی، نہال، شباب و انقلاب، دہلی، مشہور پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۴۴ء

۹۳۔ شرر، عبد الحلیم، مضامینِ شرر، جلد اوّل، حصہ دوم، لاہور، مبارک علی اینڈ سنز، س۔ن

۹۴۔ شیرازی، حیدر، جوش میری نظر میں، لاہور، اظہار سنز، س۔ن

۹۵۔ صدیقی، ابو الاعجاز، کشاف تنقیدی اصطلاحات، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، س۔ن

۹۶۔ صدیقی، محمد عتیق، ہندوستانی اخبار نویسی، علی گڑھ، انجمنِ ترقیٔ اردو ہند، دسمبر ۱۹۵۷ء

۹۷۔ صدیقی، محمد علی، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی ایک مطالعہ، کراچی، ارتقاء مطبوعات، ۲۰۰۲ء

۹۸۔ صدیقی، نذیر، پروفیسر، ادبی جائزے، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء

۹۹۔ ظہیر، سجاد، روشنائی، نئی دہلی، سیما پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء

۱۰۰۔ ظہیر، سجاد، روشنائی، مکتبۂ دانیال، کراچی، ۱۹۸۶ء

۱۰۱۔ عابدی، پروفیسر، رضی، تیسری دنیا کا ادب، لاہور، مکتبۂ فکر و دانش، ۱۹۸۸ء

۱۰۲۔ عقیل، شفیع (تلاش و انتخاب) مشہور اہلِ قلم کا گمنام تحریریں، لاہور بک ہوم، ۲۰۰۴ء

۱۰۳۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، انجمنِ ترقیٔ اردو، پاکستان، ۱۹۷۶ء

۱۰۴۔ علی، شاہ، ڈاکٹر، اردو میں سوانح نگاری، کراچی، گلڈ پبلشنگ ہاؤس، بارِ اوّل، جولائی ۱۹۶۱ء

۱۰۵۔ علوی، وہاج الدین، اردو خود نوشت: فن و تجزیہ، نئی دہلی، مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، بارِ اوّل، ۱۹۸۹ء

۱۰۶۔ فاروقی، ساقی، آپ بیتی / پاپ بیتی، کراچی، اکادمی بازیافت، جنوری ۲۰۰۸ء

۱۰۷۔ فتح پوری، فرمان، ڈاکٹر، اردو نثر کا فنی ارتقاء، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۹ء

۱۰۸۔ فتح پوری، فرمان، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی اور نیاز فتح پوری، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء

۱۰۹۔ فراقی، تحسین، ڈاکٹر، عبدالماجد دریا آبادی، احوال و آثار، لاہور، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، ۱۹۹۳ء

۱۱۰۔ قادری، مولانا حامد حسن، داستانِ تاریخ اردو، سندھ، اردو اکیڈمی، تیسرا ایڈیشن، ۱۹۶۶ء

۱۱۱۔ قادری، مولانا حامد حسن، نگار خانۂ رقصاں، دہلی، تاج کمپنی، ۱۹۸۴ء

۱۱۲۔ قادری، محی الدین زور، ڈاکٹر، روحِ تنقید، لاہور، مکتبۂ معین الادب، ۱۹۵۴ء

۱۱۳۔ قاسم، غفور شاہ، پاکستانی ادب، شناخت کی نصف صدی، (تحقیق و تنقید)، راولپنڈی، ریز پبلی کیشنز، اگست ۲۰۰۰ء

۱۱۴۔ قدوائی، جلیل، مکتوبات عبدالحق، کراچی، مکتبۂ اسلوب، ۱۹۶۳ء

۱۱۵۔ قریشی، نثار احمد (مرتب) ترجمہ روایت اور فن، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء

۱۱۶۔ قزلباش، سحاب، میرا کوئی ماضی نہیں، کراچی، فضلی سنز لمیٹڈ، ۱۹۹۵ء

۱۱۷۔ کاسگنجوی، حسرت، ڈاکٹر (مرتب)، پرکھ، کراچی، سندھ ایجوکیشنل اکیڈمی، مئی ۱۹۸۱ء

۱۱۸۔ مجید، شیما (مرتبہ) مقالاتِ فیض، لاہور، فیروز سنز لمیٹڈ، ۱۹۹۱ء

۱۱۹۔ مراد آبادی، راغب، جامع و مرتب، خطوط جوش ملیح آبادی، کراچی، ویلکم بک پورٹ، ۱۹۹۸ء

۱۲۰۔ مغنی، عبدل، ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۱ء

۱۲۱۔ ملیح آبادی، مائل، جوش اور دیارِ دکن، لکھنؤ، اردو پبلشرز، نظیر آباد، جون ۱۹۸۴ء

۱۲۲۔ فرخ جمال، جوش میرے بابا، شخص اور شاعر، اسلام آباد، پورب اکیڈمی، جنوری ۱۹۹۶ء

۱۲۳۔ ملیح آبادی، فرخ جمال، جوش ملیح آبادی: ملیح آباد سے اسلام آباد تک، اسلام آباد، پورب اکیڈمی، ۲۰۱۴ء

۱۲۴۔ مہدی، باقر، آگہی و بے باکی، ممبئی، گوشۂ ادب، ۱۹۶۵ء

۱۲۵۔ مہدی، بیگم (مرتبہ) مکاتیب مہدی، گورکھ پور، ۱۹۳۸ء

۱۲۶۔ میرٹھی، نعیم، حیاتِ جاوداں، کراچی، کل پاکستان حلقۂ ادب، اپریل ۱۹۷۳ء

۱۲۷۔ نارنگ، کے ایل (مرتب) ادیبوں کے لطیفے، لاہور الحمد پبلی کیشنز، اپریل، ۱۹۸۳ء

۱۲۸۔ نارنگ، گوپی چند، ادبی تنقید اور اسلوبیات، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء

۱۲۹۔ نارنگ، گوپی چند، تپش نامہ تمنا، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء

۱۳۰۔ نشتر، کلیم، ادبی شرارتیں، لاہور، ابلاغ پبلشرز، ۲۰۰۰ء

۱۳۱۔ نقوی، نورالحسن، فنِ تنقید اور اردو تنقید نگاری، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۹۰ء

۱۳۲۔ منظر، عباس، اسلوبیاتی مطالعے، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۹ء

۱۳۳۔ نقوی، ہلال، ڈاکٹر، قلمی نسخہ اور اس کے گمشدہ اوراق، جہلم، بک کارنر، اپریل ۲۰۱۳ء

۱۳۴۔ نقوی، ہلال، ڈاکٹر (مرتب) صابر کے موتی، کراچی، الفاظ فاؤنڈیشن، ۲۰۱۳ء

۱۳۵۔ نقوی، ہلال، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی کی نادر و غیر مطبوعہ تحریریں، کراچی، حیات اکیڈمی، ۱۹۹۲ء

۱۳۶۔ نقوی، ہلال، ڈاکٹر، جوش ملیح آبادی، شخصیت اور فن، اسلام اباد، اکادمی ادبیاتِ پاکستان، ۲۰۰۷ء

۱۳۷۔ نواز، حق، پروفیسر، اردو ادب بیسویں صدی میں (مرتب)، لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۸۸ء

۱۳۸۔ ہاشمی، رفیع الدین، اصنافِ ادب لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

لغات / Dictionary

۱۔ اردو لغت، (تاریخی اصول پر) جلد پنجم، مدیر، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، کراچی ۱۹۷۴ء

۲۔ آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری، شان الحق حقی (مرتب) کراچی، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۲۰۰۳ء

۳۔ جامع اردو لغت، وارث سرہندی، لاہور، علمی کتاب خانہ، ۲۰۰۵ء

۴۔ فرہنگ آصفیہ، جلد اوّل، مرتبہ سعید احمد دہلوی، لاہور، طبع چہارم، س۔ن

۵۔ فرہنگِ آصفیہ، جلد چہارم، لاہور، مکتبہ حسن سہیل، طبع اوّل، ۱۹۰۱ء، علمی اردو لغت، (جامع) وارث سرہندی، لاہور، علمی کتب خانہ، ۲۰۰۵ء

۶۔ فرہنگِ آصفیہ، سید احمد دہلوی، جلد اوّل، طبع دوم، لاہور، مکتبہ حسن سہیل لمیٹڈ، ۱۹۷۵ء، طبع چہارم، س۔ن

۷۔ فرہنگِ کارواں، مرتبہ، فضل الٰہی عارف، لاہور، ۱۹۹۳ء

۸۔ کفایت اردو لغت، از کفایت اللہ، لاہور، کراچی، کفایت پبلشرز، اشاعتِ دوم، مئی ۲۰۰۹ء

۹۔ لغاتِ کشوری، (مرتب) مولوی سید تصدق حسین رضوی، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء

۱۰۔ لغات نظامی، اردو (تالیف) ناظر حسن زیدی، ڈاکٹر سید عبد اللہ، لاہور، ۱۹۸۱ء

۱۱۔ نور اللغات، مولوی نور الحسن نیرؔ، کراچی، جنرل پبلشنگ ہاؤس ۱۹۵۷ء

۱۲۔ نور اللغات، (مرتب) مولوی نور الحسن نیر (مرحوم) لاہور، نیشنل بک فاؤنڈیشن، طبع اوّل، ۱۹۸۵ء طبع دوم ۱۹۸۹ء

۱۳۔ Chambers Dictionary, by Brooks UK, Chambers Press, 2003

۱۴۔ Dictionary of World Literary Terms by Joseph, T Shiplay, UK, 1971-vol-1

۱۵۔ Fallow English Urdu Dictionary by DR, SW, Fallow, Lahore, Urdu Science Board, 1982

۱۶۔ The Concise English Dictionary, Oxford English Press, 7th Addition, New York, 1993

۱۷۔ Oxford advanced Leasoners Dictionary by Sally Wehmeir, Oxford Uni Press, 2005.Sixth addition

۱۸۔ Oxford Encyclopedic Dictionary, PIP, ZYM3, Oxford University Press, 1983

اخبارات

۱۔ روزنامہ امروز، لاہور، ۱۸ فروری، ۱۹۵۷ء

۲۔ روزنامہ جنگ، کراچی، ۳ ستمبر ۱۹۶۳ء

۳۔ روزنامہ جنگ، کراچی، ۱۷ ستمبر، ۱۹۶۳ء

۴۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور، ۲۶ جنوری ۲۰۱۵ء

رسائل / مجلے

۱۔ ادبِ لطیف، لاہور، اپریل ۱۹۸۲ء

۲۔ ادبیات، شمارہ نمبر ۸۷، اسلام آباد، اپریل تا جون ۲۰۱۰ء

۳۔ ارتقاء جوش سیمینار نمبر، کراچی، دسمبر ۱۹۹۹ء

۴۔ اردو ادب، فراق نمبر، شمارہ نمبر ۴، مدیر خلیق انجم، نئی دہلی، انجمنِ ترقی اردو، ۱۹۸۳ء

۵۔ اردو دنیا، کراچی، اپریل ۱۹۸۲ء

۶۔ اردو دنیا، کراچی، اپریل ۱۹۶۱ء

۷۔ افکار، جوش نمبر، پہلا حصہ، صہبا لکھنوی، کراچی، ۱۹۶۱ء

۸۔ افکار، جوش نمبر، دوسرا حصہ، شہبا لکھنوی، کراچی، جولائی، ۱۹۶۲ء

۹۔ افکار بیادِ جوش، جولائی ۱۹۸۲ء

۱۰۔ آج کل، جوش نمبر، دہلی پبلی کیشنز، ڈویژن، حکومت ہند، ۱۹۹۵ء

۱۱۔ بازیافت ۲۶، لاہور اور نٹیل کالج، پنجاب یونیورسٹی، جنوری تا جون ۲۰۱۵ء

۱۲۔ جرنل آف ریسرچ، والیم ۱۲، ملتان، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۰۷ء

۱۳۔ جوش شناسی، چھٹا شمارہ، کراچی یونیورسٹی، الفاظ فاؤنڈیشن، دسمبر ۲۰۰۹ء

۱۴۔ جوش شناسی، چھٹا شمارہ، کراچی یونیورسٹی، الفاظ فاؤنڈیشن، ۲۰۱۰ء

۱۵۔ جوش شناسی، یادوں کی برات نمبر، کراچی یونیورسٹی، الفاظ فاؤنڈیشن، ۲۰۱۳ء

۱۶۔ دبستان درس، لاہور

۱۷۔ ساقی، جوش نمبر، کراچی، ۱۹۶۳ء

۱۸۔ صدق، جلد اوّل، نمبر ۳۱، لکھنؤ، ۱۱ مارچ، ۱۹۳۶ء

۱۹۔ صدق جدید، ۳۶۔۳۵، جلد ۲۱، ۲۲، ۲۸، لکھنؤ، ۱۹۷۲ء

۲۰۔ صدقِ جدید، جلد اوّل، لکھنؤ، ۴ مئی ۱۹۷۳ء

۲۱۔ صدق جدید، جلد دوم، لکھنؤ، یکم جون ۱۹۷۳ء

۲۲۔ فانوس، اشاعت خاص، لکھنؤ، ۱۹۸۲ء

۲۳۔ فنون شمارہ ۵۔۶، لاہور، اپریل۔ مئی ۱۹۷۲ء

۲۴۔ فنون شمارہ ۵۔۶، لاہور، اپریل ۱۹۹۷ء

۲۵۔ کلیم، دہلی، جنوری ۱۹۳۶ء

۲۶۔ کلیم، دہلی، فروری ۱۹۳۷ء

۲۷۔ کلیم، دہلی، مئی ۱۹۳۷ء

۲۸۔ کلیم، ملیح آباد، دہلی، اکتوبر ۱۹۳۸ء

۲۹۔ ماہِ نو، جوش ملیح آبادی نمبر، لاہور، ۲۰۱۶ء

۳۰۔ مخزن، جلد نمبر ۶، لاہور، ستمبر ۱۹۱۰ء

۳۱۔ نقوشِ مکاتیب نمبر، لاہور، ۱۹۵۷ء

۳۲۔ نقوش طنز وظرافت نمبر ۷۲۔۷۱، دوسرا ایڈیشن، لاہور، ۱۹۵۹ء

۳۳۔ نقوش آپ بیتی نمبر، جلد اوّل، لاہور، جون ۱۹۶۴ء

۳۴۔ نقوش سالنامہ، شمارہ ۱۲۲، لاہور، ۱۹۸۵ء

۳۵۔ نگار سالنامہ، کراچی، ۱۹۷۶ء

۳۶۔ ہم قلم، کراچی، اپریل تا جون ۱۹۹۱ء

انسائیکلوپیڈیا

۱۔ اردو انسائیکلوپیڈیا، نیا ایڈیشن، لاہور، فیروز سنز لمیٹڈ، ۱۹۶۸ء

۲۔ اردو جامع انسائیکلوپیڈیا، مرتب، مولانا حامد علی خان، لاہور، شیخ غلام علی، اینڈ سنز، ۱۹۸۶ء

۳۔ Encyclopedia, Americano, volume 16, Denbury Grolier, Incorporated, USA 1992.

۴۔ Encyclopedia Americano, Vol # 27, Denbury, USA-1992

۵۔ Encyclopedia Britannica, vol-16, UK. 2008

۶۔ (Encyclopedia Britannica (Vol: I and II

۷۔ The world book Encyclopedia, Volume, II, USA, World book inc, Chicago, London, Sydney, Toranto, 1988.

مقالات

۱۔ احمد، یحییٰ، ڈاکٹر، اردو محاورات کا تہذیبی و لسانی مطالعہ، اسلام آباد، مقالہ، ایم۔ فل، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۱۹۹۵ء

۲۔ اختر تسنیم، سرسید کی مضمون نگاری، مقالہ ایم اے اردو، لاہور اور نٹیل کالج، پنجاب یونیورسٹی، غیر مطبوعہ ۱۹۷۰ء

۳۔ ارشد، ثمینہ، بُری عورت کی کتھا (تجزیاتی مطالعہ) مقالہ، ایم۔ فل، غیر مطبوعہ، لاہور، اورنٹیل کالج، پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۰۶ء

۴۔ تونسوی، طاہر ڈاکٹر، مسعود حسین رضوی، ادیب و حیات و خدمات، مقالہ ایم۔ اے اردو، لاہور، اورنٹیل کالج، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۴ء

۵۔ حسین، خادم، جوش ملیح آبادی کی نثر کا اسلوبیاتی مطالعہ، مقالہ ایم فل، غیر مطبوعہ، لاہور، ایجوکیشن یونیورسٹی ۲۰۰۸ء

۶۔ سید، شبیر حسین، جوش ملیح آبادی کی شاعری میں عصری و سیاسی شعور، تحقیقی مقالہ، ایم اے، (غیر مطبوعہ) اورنٹیل کالج، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۹ء

۷۔ سید باقر حسین، ترجمے کے اصول، (مقالہ) ایم اے کراچی، کراچی یونیورسٹی، ستمبر ۱۹۵۰ء

۸۔ عدیل، جمیل احمد، عدیل، تقسیم کے بعد اردو ادب میں خود نوشت سوانح عمری، (تحقیقی مقالہ ایم اے) لاہور، اورنٹیل کالج، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۸۸ء

۹۔ قاسمی، ناہید ڈاکٹر، جدید اردو شاعری میں فطرت نگاری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، سال ۱۸۰۴ تا حال، مقالہ پی۔ ایچ۔ ڈی، غیر مطبوعہ، لاہور، اورنٹیل کالج، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۹۶ء

۱۰۔ ماجد، حمیرا، پاکستان میں اہم آپ بیتیوں کی تاریخ کا تنقیدی جائزہ، مقالہ ایم فل (غیر مطبوعہ) لاہور، جی سی یو، ۲۰۰۱ء

ٹیلی فون پر گفتگو

۱۔ ڈاکٹر ہلال نقوی سے ٹیلی فون پر گفتگو، لاہور سے کراچی

۲۔ ڈاکٹر یحییٰ احمد، لاہور سے پشاور

۳۔ وسیم عباس، لاہور سے فیصل آباد

انٹرنیٹ

۱۔ حسین سہروردی، لاہور سے انڈیا

۲۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند، لاہور سے انگلینڈ

۱۔ U-hoo-sukhanwar - Page 2

۲۔ Josh Maleehabadi h#P, W.W.W. Josh Maleehabadi

۳۔ Website by Bazar-e-Josh, Canada1,2,3,4,5, 5/0

۴۔ www Josh Maleehabadi.com

۵۔ ht mail / 05/ 1,2,3,4,5, Urdustan, net/u

English Books

۱۔ Cythia Ozick, The best American essays, edited by robert alwan, baston, New york, Houghton, Miffen Company, 2008

۲۔ Sadiq, DR Mohammad, A History of Urdu Literature, Second Addition, Karachi, Oxford Press, 1980

ضمیمہ جات

1- جوش کے غیر مطبوعہ خطوط احسان دانش کے نام

2- جوش کے مراثیٔ از احسان دانش

3- جوش کی ایک مداح کا ایک مراسلہ "کیا یہ فتنۂ آخر الزماں ہے"

جوش ملیح آبادی

احسان

حضرت جوش ملیح آبادی سے شرف ملاقات

ستر کی دہائی کے آخری سالوں میں ہوا۔ لاہور
میں وہ اپنی بھانجی قدسیہ بیگم کے ہاں بھی قیام
پذیر ہوتے تھے۔ جن کی بیٹیاں میری قریبی دوست تھیں۔
اس ناطے سے وہ انتہائی شفقت اور محبت
سے پیش آتے۔ اور اکثر میری اردو کی اصلاح کرتے۔
کیونکہ میرا تعلق ایک پنجابی گھرانے سے تھا۔ لاہور میں
قیام کے دوران وہ یہاں کی ادبی محفلوں، مشاعروں
اور موسیقی کی محفلوں میں رونق افروز ہوتے۔ ہر وقت
ان سے ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ چند اہم نام جو
ذہن میں نقش رہ گئے ہیں ان میں ملکہ ترنم نورجہاں،
شوکت حسین رضوی، فیض احمد فیض، مصطفیٰ زیدی،
محمد علی اور زیبا بیگم، مہدی حسن، استاد امانت علی،
احسان دانش، احمد ندیم قاسمی شامل ہیں۔
ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ اپنی بھانجی کو لینے کے لئے لاہور
کالج فار ویمن تشریف لائے۔ تھوڑی ہی دیر میں
طالبات کا ایک جم غفیر گاڑی کے گرد جمع ہو گیا۔
جوش صاحب بہت
محظوظ ہوئے اور نہایت شفقت سے آٹوگراف دیئے اور

طالبات سے ہاتھ ملایا۔

اپنی عمر کی آخری دہائی میں بھی وہ ایک انتہائی سحر انگیز، خوبارعب اور خوبصورت شخصیت کے حامل تھے۔ آواز میں ایک دبدبہ، آنکھوں میں چمک، چہرے کے خدوخال میں تازگی اور بات کرنے کا انداز انتہائی متاثر کن۔ ان کی ہر بات اور انداز گفتگو اتنا متاثر کن ہوتا کہ ہم اپنے گرد و نواح سے بے خبر ہوکر اُن کی شخصیت کے حصار میں کھو جاتے اور وقت ٹھہر سا جاتا۔ بیسویں صدی کے عظیم مفکر، شاعر انقلاب کے ساتھ گزرے ہوئے قیمتی لمحات میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔ امید، محبت، زندہ دلی اور جوش و جذبہ کا جو درس حضرت جوش ملیح آبادی صاحب سے سیکھا وہ آج تک میری زندگی کی انتہائی متاع ہے۔

Fauzia Naeem
رخشانہ ہاشمی

رفعت پروین
رفعت دربیز

[illegible]